

زکوٰۃ کے جدید مسائل

اور اس کے شرعی احکام

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی مدظلہ

اس کتاب میں جن اہم مسائل سے بحث کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ہیں:
زکوٰۃ کا مفہوم، نصاب زکوٰۃ، مصارف زکوٰۃ، کمپینرز پر زکوٰۃ، اموال تجارت پر
زکوٰۃ، ہیرے اور جواہرات پر زکوٰۃ، شیئرز پر زکوٰۃ، اُن قرضوں کی تفصیل جو
وجوب زکوٰۃ سے مانع ہوں، رفاہی اداروں کی املاک پر زکوٰۃ، مال حرام پر زکوٰۃ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی
تاثرات || مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ العالی
شیخ الاسلام حضرت مولانا جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

جلد اوّل

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ

کاشی مقبول کراچی فون 34965877

.....جملہ حقوق محفوظ ہیں.....

Islamic Fiqh Academy (India)

مجمع الفقہ الاسلامی (الہند)

اجازت نامہ سلسلہ مطبوعات اسلامی فقہ اکیڈمی

محترمی نعیم اشرف نور، نعیم اشرف نور سلمہم اللہ تعالیٰ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

وہائے عافیت دارین اللہ تعالیٰ آپ حضرات کی دینی و علمی خدمات کو قبول فرمائے اور دینی و دنیاوی ترقیات سے نوازیں، آمین۔
اسلامی فقہ اکیڈمی کی جملہ مطبوعات کی پاکستان میں اشاعت و طباعت و تقسیم کے لیے آپ کے ادارے ”ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ“ کو اجازت دی جاتی ہے، اور پاکستان میں یہ حق صرف آپ کے ادارے کو حاصل رہے گا۔ تمام پرسان احوال کو میرا سلام پہنچاویں۔
والسلام: مجاہد الاسلام قاسمی

صدر اسلامی فقہ اکیڈمی

.....نعیم اشرف نور.....

باہتمام

.....ادارۃ القرآن گلشن اقبال.....

ناشر

کراچی، فون: 021-34965877

.....۲۰۰۹ء.....

اشاعت

ڈسٹری بیوٹرز

۰۲۱-۳۴۸۵۶۷۰۱ مکتبۃ القرآن، بنوری ٹاؤن کراچی

۰۲۱-۳۲۶۲۴۶۰۸ مرکز القرآن اردو بازار کراچی

ملنے کے پتے

۰۴۲-۳۷۳۵۳۲۵۵ مکتبۃ دارالاسلامیات ۹۰ انارکلی لاہور

۰۲۱-۳۲۶۳۱۸۶۱ مکتبۃ الاشاعت اردو بازار کراچی

۰۴۲-۳۷۳۵۲۴۸۳ بیت العلوم مکتبہ رواد پرانی انارکلی لاہور

۰۲۱-۳۲۶۳۰۷۴۴ بیت القرآن اردو بازار کراچی

۰۴۲-۳۷۳۳۴۲۲۸ مکتبہ رحمانیہ لاہور

۰۲۱-۳۵۰۳۲۰۲۰ ادارۃ المعارف و العلوم ورنگی

۲۶۶۸۶۵۷ مکتبہ رشیدیہ، سرگئی روڈ کوئٹہ

۰۲۱-۳۵۰۳۱۵۶۵-۶ مکتبۃ معارف القرآن و العلوم

۰۲۱-۳۵۰۳۱۵۶۵-۶ مکتبۃ معارف القرآن و العلوم، اسلام آباد



فہرست مضامین مسائل زکوٰۃ

۹۵۷	حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی	(۱) ابتدائی
۱۸۵۱۰	حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی	(۲) سوال نامہ
۳۳۵۱۹	مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی الجامعة العربیہ بتورانہ	(۳) جوابات سوال نامہ بابت زکوٰۃ
۳۹۵۳۳	مولانا برہان الدین سنبھلی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ	(۴) سوال نامہ کا اجمالی جواب
۳۸۵۳۰	مفتی نظام الدین دارالعلوم دیوبند	(۵) سوال نامہ کا جواب
۶۲۵۳۹	مولانا نعمت اللہ قاسمی	(۶) سوالات کے جوابات
۷۳۵۶۳	مفتی حبیب الرحمن خیر آبادی	(۷) زکوٰۃ کے شرعی احکام
۹۹۵۷۵	محمد طیب الرحمن امیر شریعت شمال مشرقی ہند	(۸) زکوٰۃ کے چند اہم مسائل
۱۱۰۵۱۰۰	زبیر احمد قاسمی صدر المدرسین اشرف العلوم کنھواں	(۹) زکوٰۃ کے مسائل
۱۱۸۵۱۱	مفتی عزیز الرحمن مدنی دارالافتاء بجنور	(۱۰) اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت
۱۲۵۵۱۱۹	مفتی عبدالرحمن صاحب دہلی	(۱۱) سوالات کے جوابات
۱۳۰۵۱۲۶	عبد الجلیل قاسمی مدرسہ اسلامیہ قرآنیہ سہرا چپارن	(۱۲) سوالات کے جوابات
۱۳۸۵۱۳۱	حضرت مولانا عبدالرحمن قاسمی چھاپنی، گجرات	(۱۳) سوال نامہ کا جواب
۱۵۷۵۱۳۹	اشرف علی صاحب	(۱۴) سوال نامہ کا جواب
۲۱۲۵۱۵۸	مفتی نسیم احمد قاسمی رفیق اسلامک فکد اکیڈمی	(۱۵) اسلام کا نظام زکوٰۃ
۲۵۱۵۲۱۳	محمد جنید عالم ندوی قاسمی مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ	(۱۶) مسائل زکوٰۃ

- (۱۷) جوابات بابت سوالات محمد رضوان القاسمی ناظم دارالعلوم سبیل الاسلام حیدر آباد ۲۵۶۵۲۵۲
- (۱۸) زکوٰۃ اعجاز احمد اعظمی مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپورہ، اعظم گڑھ ۲۷۹۵۲۵۷
- (۱۹) اسلام میں زکوٰۃ کا مصرف شبیر احمد قاسمی دارالافتاء مدرسہ شاہی مراد آباد ۳۰۳۵۲۸۰
- (۲۰) زکوٰۃ عبد اللہ قاسمی استاذ جامعہ اسلامیہ بنارس ۳۴۲۵۳۰۵
- (۲۱) سوال نامہ کا جواب محمد نعیم الدین جامعہ عربیہ اسلامیہ کریم گنج، آسام ۳۶۷۵۳۳۳
- (۲۲) زکوٰۃ مفتی محمد عبدالرحیم قاسمی جامعہ حسینہ خیر العلوم نور محل روڈ بھوپال ۳۸۷۵۳۶۸
- (۲۳) مسئلہ زکوٰۃ پر ایک نظر مفتی حبیب اللہ قاسمی جامعہ عربیہ ریاض العلوم جوہپور ۳۰۳۵۳۸۸
- (۲۴) سوال نامہ کا جواب مولانا محمد سلیمان بلند شہری، ہریانہ ۳۱۱۵۳۰۴
- (۲۵) زکوٰۃ کے متعلق سوالات کے جوابات مولانا افضل الحق مہتمم دارالعلوم گورکھپور ۳۱۵۵۳۱۲
- (۲۶) زکوٰۃ محمد نجی الدین بزودوی دارالعلوم فلاح دارین ترکسر ۳۳۲۵۳۱۶
- (۲۷) جمع قبل القبض کی زکوٰۃ مولانا نور علی الاعظمی دارالعلوم مئو، یو۔ پی ۳۳۹۵۳۳۳
- (۲۸) نصاب زکوٰۃ مولانا ثناء اللہ صدیقی قاسمی مدرسہ احمدیہ ابابکر پور، ویشالی ۳۴۴ ۳۴۰
- (۲۹) نصاب زکوٰۃ مولانا فضل حسین صاحب بستی۔ پو، پی ۳۴۸۵۳۳۵
- (۳۰) زکوٰۃ محمد افضل الحق مہتمم دارالعلوم گورکھپور ۳۵۹۵۳۳۹
- (۳۱) سوالات کے جوابات حضرت مولانا علاء الدین ندوی فاضل دیوبند، کھگڑیا ۳۶۲۵۳۶۰
- (۳۲) سوال نامہ کا جواب عبد القیوم صاحب پالن پوری ۳۷۳۵۳۶۳



چند تاثرات برائے اسلامی فقہ اکیڈمی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

”اسلامک فقہ اکیڈمی ہند“ ایک ایسا ادارہ اور تنظیم ہے جس پر ہندوستانی مسلمانوں..... بالخصوص علماء اور دینی غیرت و فکر رکھنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو فخر اور فخر سے زیادہ خدا کا شکر کرنے کا حق حاصل ہے، یہ ایک خالص تعمیری و فکری، علمی اور فقہی تنظیم اور اجتماعیت ہے جس میں ملک کے ممتاز، صحیح العقیدہ و صحیح الفکر اور وسیع العلم علماء اور کارکن شامل ہیں۔“

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ العالی

صدر دارالعلوم کراچی

”مجھے بے انتہا مسرت بھی ہے اور کسی قدر حسرت بھی، مسرت اس بات کی کہ ہندوستان کے علماء کرام نے وہ عظیم الشان کام شروع کیا ہے جس کی پورے عالم کو اور اقلیت والے ملکوں کو شدید ضرورت ہے۔ اور حسرت یہ ہے کہ ہم پاکستان میں ہونے کے باوجود منظم اور بڑے پیمانہ پر یہ کام شروع نہیں کر سکے..... فقہ اکیڈمی نے بڑا اہم قدم اٹھایا ہے، مدت سے اس کا انتظار تھا۔“

چند تاثرات

شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

نائب رئیس مجمع الفقہ الاسلامی جده

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم سے میرا خائبانہ تعارف ایک طویل مدت سے ہے۔ لیکن میں ان کو ایک فقیہ ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ایک مخفی جوہر، مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بھی ودیعت کر رکھا ہے۔ آج اس محفل میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان کے علماء اور علم و فضل کے پیکر حضرات سے ملاقات کر کے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ انہوں نے اس اکیڈمی کو قائم کر کے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کے اس کارنامے کو قبول فرمائے اور اس کے اغراض و مقاصد کو اپنی رضا کے مطابق پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس موقع پر اس اکیڈمی کے اغراض و مقاصد کو مد نظر رکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس اکیڈمی کا قیام جناب نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد کی تعمیل ہے۔ وہ ارشاد مجسم طبرانی میں ایک روایت ہے جسے علامہ بیہقی نے مجمع الزوائد میں بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ!

”اذا جاءنا امر ليس فيه امر ولا نهى فماذا تأمرنا فيه“

یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا سوال آجائے، ایسا قضیہ سامنے آجائے جس کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو تو اس صورت حال میں آپ ہمیں کس بات کا حکم دیتے ہیں ایسے موقع پر مجھے کیا کرنا چاہئے۔ حضرت نبی کریم سرور عالم نے ارشاد فرمایا:

”شاوروا الفقهاء العابدین ولا تمضوا فيه برأى خاص“

کہ ایسے موقع پر فقہاء عابدین سے مشورہ کرو، اور اس میں انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو، محض انفرادی فتویٰ کو، محض انفرادی رائے کو لوگوں پر مسلط کرنے کی بجائے فقہاء عابدین سے مشورہ کرو، اور اس مشورہ کے نتیجے میں جس مقام پر پہنچو اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم سمجھو، یہ ہے وہ ارشاد جس کے ذریعہ نبی کریم سرور عالم ﷺ نے قیام قیامت تک پیدا ہونے والے تمام نئے مسائل کا حل ہمارے لئے تجویز فرمایا اور وہ یہ کہ آخری وقت میں جب کہ اجتہاد مطلق کا تصور تقریباً مفقود ہو گیا ہے اس دور میں نئے مسائل کو حل کرتے کا راستہ یہ ہے کہ فقہاء عابدین کو جمع کیا جائے۔ مگر اس میں نبی کریم ﷺ نے دو صفیں بیان فرمائی۔ ایک یہ کہ جن لوگوں کو جمع کیا جائے وہ تفقہ فی الدین رکھنے والے ہوں۔ دین کی صحیح سمجھ رکھنے والے ہوں۔ دین کے مزاج و مذاق کو اچھی طرح محفوظ کرنے والے ہوں، اور دوسری قید یہ لگا دی کہ وہ فقہاء محض فلسفی قسم کے نہ ہوں، جو نظریاتی طور پر فقیہ ہوں، نظریاتی طور پر اسلام کے احکام کو جانتے ہوں، جو محض علم رکھتے ہوں، لیکن اس علم پر خود عمل پیرا نہ ہوں۔ اس علم کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہ ہوں، اور اس علم کو اپنی زندگی کا منہجائے مقصود نہ بنایا ہو، تو ایسے فقہاء سے مشورہ کرنے کا کوئی حاصل نہیں، اس لئے کہ دین، یہ محض ایک نظریہ اور فلسفہ نہیں کہ ایک شخص محض فلسفہ کے طور پر اس کو اپنالے، اس کے حکم بیان کر دے اور پھر بھی اس کا ماہر کہلائے۔ بلکہ یہ ایک عمل ہے۔ ایک پیغام ہے، ایک دعوت ہے۔ جب تک اس پر عمل صحیح طور پر نہیں ہوگا، اس وقت تک دین کی صحیح سمجھ حاصل نہیں ہو سکتی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ابستدائیہ

الحمد للہ اس وقت پانچویں فقہی سیمینار منعقدہ اعظم گڑھ ۳ اکتوبر تا ۲ نومبر ۱۹۹۲ء کے مقالات و مباحث پر مشتمل مجموعہ کی دوسری جلد ہدیہ ناظرین کر رہے ہیں۔ پہلی جلد میں زکوٰۃ سے متعلق ایک اہم موضوع مصارف زکوٰۃ میں فی سبیل اللہ کے مفہوم کی تعین سے متعلق جملہ مقالات شائع کئے جا چکے ہیں جو اپنے موضوع پر انتہائی جامع اور بڑا علمی ذخیرہ ہے۔

اب دوسری جلد پیش خدمت ہے جس میں مسائل زکوٰۃ سے متعلق حاجتِ اصلیہ دین کی زکوٰۃ تجارت میں پیشگی دی ہوئی قیمت، اور کرایہ دکان و مکان میں دی گئی رقم پر زکوٰۃ، ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ کا مسئلہ پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ، مدارس اسلامیہ میں طلبہ کو دئے جانے والے وظائف، مدرسے کے اموال پر زکوٰۃ، مالِ حرام کی زکوٰۃ، سفراء و مصلین و ہتم مدرسہ کی حیثیت، جیسے اہم جدید مسائل پر تحقیقی مقالات شائع کئے جا رہے ہیں۔

ہندوستان کے خاص پس منظر میں انشورنس کی گنجائش کے مسئلہ پر جو فقہی سیمینار منعقدہ حیدرآباد ۹ تا ۱۲ اگست ۱۹۹۱ء میں تفصیلی بحث ہوئی، اور پھر پندرہ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کو تجویز مرتب کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ ان حضرات نے غور کرنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ فسادات کی صورت میں انشورنس کے ذریعہ رقم ملنے کی ضمانت ہے یا نہیں؟ اس کی وضاحت ضروری ہے، چنانچہ سترہ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی سیمینار کے اجلاس عام میں تشکیل دی گئی، جنہیں مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے اور ماہرین سے پوری معلومات حاصل کر کے کوئی قطعی رائے قائم کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس دوران انشورنس سے متعلق اصل قوانین منگوائے گئے اور پھر مسئلہ پانچویں فقہی سیمینار منعقدہ اعظم گڑھ میں اس کمیٹی کی نشست میں پیش ہوا اور اس وضاحت کے بعد کہ انشورنس کی اسکیمیں بنیادی طور پر فسادات میں ہونے والے

حادثات کو کو در کرتی ہیں۔ البتہ بعض اضافی مفادات اس صورت میں نہیں ملتے۔ کمیٹی نے باتفاق رائے ہندوستان کے مخصوص پس منظر میں انشورنس کی اجازت دی، علما میں سے حضرت مولانا مفتی لغمت اللہ صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا مفتی حبیب اللہ قاسمی مفتی ریاض العلوم گربنی، حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا عتیق احمد قاسمی صاحب استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا زبیر احمد قاسمی اشرف العلوم کنہواں سیتلڑھی، مولانا انیس الرحمن قاسمی نائب قاضی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، مولانا رفیق المنا قاسمی احیاء العلوم مبارکپور، مولانا سید مصطفیٰ رفاعی ندوی صدر الاصلاح بنگلور، مولانا معاذ الاسلام مراد آباد، مولانا عبداللہ جراثہ میرٹھ، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی حیدرآباد، مولانا سلطان احمد اصلاحي ادارہ تحقیق اسلامی علی گڑھ، مفتی محمد بنید عالم ندوی قاسمی دارالافتاء امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، مولانا صدر الحسن ندوی وغیرہ نے اس تجویز پر دستخط کئے۔

مولانا مفتی اشفاق احمد صاحب مہتمم جامعہ شرعیہ فیض العلوم سرائے میر نے اس تجویز کی تائید اس نوٹ کے ساتھ کی کہ :

”مبتلی بہ کی صوابدید پر اجازت کی گنجائش ہے“

گویا اصولی طور پر اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہ انشورنس کرایا جائے یا نہیں ہر شخص کو اپنی انفرادی حالات کے مطابق طے کرنے کا اختیار رکھوں نے دیا، ان کی رائے اصل تجویز سے متصادم نہیں ہے۔ مولانا مفتی شبیر احمد مفتی مدرس شاہی مراد آباد نے املاک کے بیمہ کی اجازت دیتے ہوئے زندگی کے بیمہ کی اجازت سے اختلاف کیا، انہی نوٹس کے ساتھ یہ تجویز شائع ہوئی۔

انسوس ہے کہ فقہ و فتاویٰ کے اس مسئلہ کو میدان سیاست کی گیند بنادیا گیا، اور مفتی اشفاق احمد صاحب کی طرف سے شائع ہونے والے ایک اشتہار کو ہزاروں کی تعداد میں شائع کر کے ملک بھر میں تقسیم کیا گیا، حالانکہ یہ کوئی نیا فیصلہ نہیں تھا، مجلس تحقیقات شرعیہ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مورخہ ۱۶/۱۲/۱۹۶۵ء کو مندرجہ ذیل فیصلہ کیا ہے :

مجلس یہ رائے رکھتی ہے کہ اگرچہ انشورنس کی سب شکلوں کے لئے ”ربو او قمار“ (سود اور جوا) لازم ہے، اور ایک کلمہ گو کے لئے ہر حال میں اصول پر قائم رہنے کی کوشش کرنا ہی واجب

ہے، لیکن جان و مال کے تحفظ و بقا کا جو مقام شریعت اسلامیہ میں ہے مجلس اسے بھی وزن دیتی ہے، نیز مجلس صورت حال سے بھی صرف نظر نہیں کر سکتی کہ موجودہ دور میں نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی ریاستوں سے انشورنش انسانی زندگی میں اس طرح ذخیل ہو گیا ہے کہ اس کے بغیر اجتماعی اور کاروباری زندگی میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں، اور جان و مال کے تحفظ کے لئے بھی بعض حالات میں اس سے مفر ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے ضرورت شدیدہ کے پیش نظر اگر کوئی شخص اپنی زندگی یا اپنے مال یا اپنی جائیداد کا بیمہ کرے تو مذکورہ بالا ائمہ کرام کے قول کی بنا پر شرعاً اس کی گنجائش ہے۔

تنبیہ : اوپر کی عبارت میں لفظ ”ضرورت شدیدہ“ سے مراد یہ ہے کہ جان یا مال و عیال یا مال کے ناقابل برداشت نقصان کا اندیشہ قوی ہو۔ ”ضرورت شدیدہ“ موجود ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ مجلس کے نزدیک مبتلی بہ (جو شدید دشواریوں میں مبتلا ہو کر بیمہ کرنا چاہتا ہے) کی رائے پر منحصر ہے، جو خود کو عند اللہ جوابدہ سمجھ کر علما کے مشورہ سے قائم کرے۔“

ادارہ مباحث فقہیہ جمعیۃ علماء ہند نے ایک سوالنامہ جاری کیا تھا جس پر دارالعلوم دیوبند کے اکابر علمائے انشورنش کی موجودہ حالت میں اجازت کا فتویٰ دیا تھا جسے ادارہ مباحث فقہیہ جمعیۃ علماء ہند نے شائع کیا، اس فتویٰ کی نقل بھی ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

ان حالات میں مسئلہ باب حاجت و ضرورت اور ہندوستان کے مخصوص حالات سے متعلق ہے اور اس خالص فقہی مسئلہ کو کسی قیمت پر بھی سیاست کے میدان کی گیند نہیں بنایا جانا چاہئے۔

مجاہد الاسلام قاسمی
۲۹ جولائی ۱۹۹۹ء

سوالنامہ زکوٰۃ

(۱) محرر اول

زکوٰۃ کس قسم کے اموال میں واجب ہے؟
وجوب زکوٰۃ کی وہ شرطیں جن کا تعلق محل زکوٰۃ یعنی اموال سے ہے۔

پہلی شرط — ملک تمام

ملک تمام سے کیا مراد ہے؟ اس ذیل میں چند سوالات۔
سوال ۱: مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو، لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہوئی ہے، وہ قیمت جو ادا کی جا چکی اور وہ مال جو خریدار کے ملک میں آچکا لیکن قبضہ میں نہیں آیا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

سوال ۲: کرائے کی مد میں دی گئی پیشگی رقم یا ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہو جانے یا مدت پوری ہو جانے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے، اس نقد کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی، کرایہ دار پر یا مالک مکان پر؟

سوال ۳: جس مال کا کوئی مالک معین نہ ہو جیسے مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

سوال ۴: وہ مال جو کسی شخص کے قبضہ میں بطور حرام آتا ہے مثلاً رشوت کا مال، بینک کا سود وغیرہ

اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

اگر یہ اموال حرام حلال مال میں اس طرح مخلوط ہو گئے ہوں کہ ان میں باہم تمیز مشکل ہو تو اس صورت میں ان مخلوط اموال میں وجوب زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

سوال ۵: دین کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی، دائن پر جس کی ملک ہے لیکن قبضہ نہیں یا مدیون پر جس کے قبضہ و تصرف میں ہے لیکن اس کے ملک میں نہیں یا دین کی زکوٰۃ کسی پر واجب نہ ہوگی کیا اگر مدیون باوجود قدرت کے دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کر رہا ہو اور اس مال کو تجارت میں لگا کر استفادہ کر رہا ہو، ایسی صورت میں اس مدیون پر زکوٰۃ واجب قرار دی جاسکتی ہے۔ وصولیابی کی امید اور ناامیدی کے اعتبار سے دین کی قسین اور وجوب زکوٰۃ کا حکم اور اگر زکوٰۃ واجب ہوگی تو کب اور وصولیابی کے بعد سابق کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی یا وصول ہونے کے بعد مستقبل کی زکوٰۃ واجب ہوگی؟

سوال ۶: سرکاری محکموں اور مختلف پرائیویٹ کمپنیز میں جو لوگ ملازم ہیں ان کی ماہانہ یافت میں سے ایک حصہ وضع کر کے ان کے محفوظ کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے اور کچھ فی صد سرکاری کمپنی اپنے ملازم کے مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی طرف سے اس میں اضافہ کرتی ہے اور ریٹائرمنٹ کے وقت وہ پوری رقم ملازم کو دے دی جاتی ہے، دوران ملازمت بھی بعض خاص قواعد کی پابندی کرتے ہوئے ملازم کو اپنے اس محفوظ فنڈ سے کچھ حصہ نکالنے کا اختیار ہوتا ہے بعض اوقات ہر دو قسم کی مذکورہ رقم پر سرکاری کمپنی انٹرسٹ کے نام سے بھی کچھ اضافہ جوڑ کر آخر میں وہ مجموعی رقم ملازمین کو ادا کرتی ہے، یہ رقم عام اصطلاح میں پراویڈنٹ فنڈ کہلاتی ہے۔ پراویڈنٹ فنڈ کی مذکورہ بالا رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر ہوگی تو کب؟ اور اگر زکوٰۃ وصولیابی کے وقت واجب ہوگی تو سابق کی بھی واجب ہوگی یا آئندہ سال گزرنے پر؟

دوسری شرط نما — نما کی حقیقت اور اس کی صورتیں۔
تیسری شرط — حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا۔

حاجتِ اصلیہ کی تعریف اور اس کا دائرہ

(۱) کیا حاجتِ اصلیہ کا تعین ہر دور اور ماحول میں اس کے اعتبار سے کیا جائے گا؟
چوتھی شرط — دین سے محفوظ ہونا

کون سا دین مانعِ زکوٰۃ ہے، دین کی قسمیں اور ان کے احکام

(۱) دین طویل الاجل، آج کے دور میں زراعتی قرض Agricultural loan تعمیر مکان کے لیے قرض Building Construction Loan اور اس طرح کے مختلف قرض سرکار اپنے شہریوں کو دیتی ہے جن کے لیے ۵ سال سے لے کر ۳۰، ۴۰ سال کی طویل مدت مقرر کی جاتی ہے، اس مدت کے دوران قسط وار قرض کی ادائیگی واجب ہوتی ہے، اس قرض کی مقدار بھی عموماً بہت بڑی ہوتی ہے مثلاً زید نے اپنے کسی تجارتی کاروبار کے لیے پانچ کروڑ روپے قرض لیے جسے پچاس قسطوں میں ادا کرنا ہے یعنی سالانہ دس لاکھ روپے ادا کرنا ہے یا کسی شخص نے ٹریکٹر کی خریداری کے لیے ایک لاکھ روپیہ قرض لیا جسے دس سال میں دس دس ہزار سالانہ کے لحاظ سے ادا کرنا ہے، ان صورتوں میں وجوبِ زکوٰۃ کے لیے اموالِ زکوٰۃ سے پورے قرض کو منہا کیا جائے گا یا سالانہ واجب الادا قسط وضع کر کے باقی اموال پر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے گی؟

اسلام میں کن اموال میں زکوٰۃ واجب ہے پچند اور سوالات۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

کسی بھی کمپنی میں متعدد شرکا ہوتے ہیں اور اپنے اپنے حصہ کے مطابق اثاثے اور آمدنی کے مالک ہوتے ہیں، بعض ایسی صورتیں ہو سکتی ہیں جس میں کمپنی کا مجموعی اثاثہ اور مالیت کروڑوں روپے کو پہنچتا ہو جس میں نصابِ وجوبِ زکوٰۃ موجود ہے، لیکن اس کے شرکا، اور حصہ داروں کی تعداد اتنی بڑی ہے کہ کمپنی کی مجموعی مالیت کی تقسیم حصہ داروں پر کی جائے تو ان میں سے کوئی بھی صاحبِ نصاب

نہیں ہوتا یا کچھ لوگ صاحب نصاب نہیں ہوتے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار ہوگا یا ہر فرد کے انفرادی حصہ کا؟

ہمیرے اور جواہرات

(۱) ہمیرے اور جواہرات کی تجارت کی جاتی ہے، جو لوگ ہمیرے اور جواہرات کی تجارت کرتے ہیں یہ ظاہر مال تجارت ہونے کی وجہ سے ان پر تو زکوٰۃ واجب ہوگی ہی لیکن دوسرا سوال یہ ابھرتا ہے کہ جو لوگ انکم ٹیکس اور دیگر سرکاری قوانین کی زد سے بچنے کے لیے نقد روپیوں یا سونے چاندی کی صورت میں اپنے سرمائے کو محفوظ کرنے کے بجائے ہمیرے جواہرات لاکھوں روپے کے خسرید کر محفوظ کر دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ ہمیرے جواہرات حوالہ اصلہ میں نہیں ہیں اور بڑی مالیت رکھتے ہیں، مشرعاں پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ بعض اوقات خواتین محض تزئین و آرائش کے لیے ہمیرے جواہرات استعمال کرتی ہیں ان کا مقصد تمول نہیں ہوتا ہے وجوب زکوٰۃ کے بارے میں ان کا کیا حکم ہوگا؟

اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت جو تاجر کے قبضہ میں ہے ادائیگی زکوٰۃ کے دن ان کی مالیت کا تعین کس نرخ سے کیا جائے، اپنی لاگت کے حساب سے کریں یا اس دن کی قوت خرید کا اعتبار کیا جائے، پھر یہ کہ تحوٰک کے بھاؤ کا اعتبار ہوگا یا پھنکر فروختگی کا اعتبار ہوگا؟ جو لوگ اراضی کی خسرید و فروخت کو ایک تجارتی کاروبار کے طور پر کرتے ہیں، سال پورا ہونے پر نقد رقم کے علاوہ جو اراضی ان کی ملکیت میں ہیں وہ اراضی بھی اموال زکوٰۃ میں شمار ہوں گی؟ اور ان پر زکوٰۃ کا وجوب قوت خرید کے اعتبار سے ہوگا یا متوقع قیمت فروخت کا اعتبار ہوگا؟

شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

مختلف تجارتی کمپنیاں اپنے شیرز فروخت کرتی ہیں یہ شرکت کی ایک صورت ہے، کمپنی

قائم کرتے وقت کچھ اکائیاں ملے کر لی جاتی ہیں، ہر پونٹ (اکائی) ایک شیر ہوتا ہے اور اس کی ایک خاص قیمت ہوتی ہے، کمپنی جو کچھ منافع کمائے گی شیر ہولڈرس اس میں اپنے حصے کے تناسب سے نفع کے حق دار ہوں گے، شیر ذرا اصل کسی تجارتی کمپنی کے ایک خاص حصہ کی ملکیت ہے، واضح رہے کہ بعد کو ان شیرز کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور کمپنی کے نفع و نقصان اور اس کے ساکھ کے پیش نظر ان شیرز کی قیمت گھٹتی اور بڑھتی ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ ان شیرز پر ایک تجارتی سرمایہ ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت ان شیرز کی مالیت کا تعین ان کی بنیادی قیمت کو سامنے رکھ کر کیا جائے گا یا بہ وقت ادائے زکوٰۃ مارکیٹ میں اس کا جو نرخ ہو اس کا اعتبار کیا جائے گا؟

بونڈس سے مراد یہ ہے کہ اکثر حکومتیں یا مختلف کمپنیز لوگوں سے قرضے مانگتی ہیں اور ان قرضوں کی واپسی کے لیے کچھ مدت (۵ سال، دس سال وغیرہ) مقرر کرتی ہیں اور کچھ شرح فیصد سود کا بھی اعلان کرتی ہیں اور بطور ثبوت قرض دہندہ کو سارٹیفکیٹ ایشو کرتی ہیں وہی بونڈ ہے، سوال یہاں پر صرف اتنا ہے کہ جو کچھ سود کے نام پر دیا جاتا ہے اس کی حرمت میں تو کوئی شبہ نہیں؟ قرض دہندہ نے جو سرمایہ بونڈس پر لگایا ہے اس کی زکوٰۃ اسے ادا کرنی ہوگی یا نہیں؟ اور اگر ادا کرنی ہوگی تو سال بہ سال یا بونڈ کے کیش کرانے کے وقت، سبھی گزرے ہوئے برسوں کی یا صرف آئندہ کی؟

محتور ثانی — نصاب زکوٰۃ

چاندی اور سونے کے نصاب میں سے کون سا نصاب اصل تسلیم کیا جائے؟ آج کے دور میں جب کہ سونے اور چاندی کی نرخ میں زمین و آسمان کا فرق ہے، نصاب حرمت زکوٰۃ (غنا یعنی کسی شخص کو غنی قرار دے کر اس کے لیے زکوٰۃ لینا ممنوع قرار دیا جائے) اور اسی طرح نصاب موجب زکوٰۃ کی کم سے کم مقدار چاندی کے نصاب سے مقرر کی جائے گی یا سونے کے نصاب سے؟

محتور ثالث — مصارف زکوٰۃ (۱) کیا یہ صورت درست ہوگی کہ ایک طالب علم جو مستحق زکوٰۃ

ہے، ادارہ اس کے طعام، قیام، تعلیم اور دوسری سہولتوں کا انتظام کرتا ہے، اس کے طعام پر ماہانہ خرچ سو روپے آتا ہے، اس کی رہائش کے لیے جو مکان فراہم کیا گیا ہے (مکان کی تعمیر عام چندے سے کی گئی ہے) بازار نرخ کے حساب سے اس کا کرایہ ۲۵ روپے ماہانہ ہے، اساتذہ کے شہر یہ (ماہانہ تنخواہ) وغیرہ پر جو خرچ آتا ہے اس کو اگر طلبہ کی خدمت یا متعلق انتظامی امور پر مامور ہے ان کا مجموعی شہر یہ تقسیم کے جانے پر فی طالب علم ۲۵ روپے ماہوار پڑتا ہے، اس طرح ایک طالب علم پر کل اخراجات ماہانہ مثلاً ڈھائی سو (۲۵۰) روپے آتے ہیں، مدرسہ یہ نظام بناتا ہے کہ ہر طالب علم سے ڈھائی سو روپے ماہانہ لیے جائیں، مستطیع طلبہ اپنے پاس سے یہ اخراجات ادا کریں اور غیر مستطیع طلبہ کی طرف سے یہ مقررہ فیس مدرسہ مذکورہ سے ادا کرے یا مدرسہ اس رقم کا چیک اس طالب علم کے نام دیدے اور وہ چیک وصول کرنے کے بعد مدرسہ میں جمع کر دے، کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

ذیل میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ ہستم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے تحقیق زکوٰۃ کا؟
 (۲) سوال یہ ہے کہ مدارس کے لیے زکوٰۃ کی وصولی پر جو لوگ مقرر کیے جاتے ہیں وہ ماہانہ تنخواہ پاتے ہیں اور ساتھ ساتھ وہ عملہ جو حساب کتاب کے لیے مقرر ہوتا ہے اسے بھی ماہانہ تنخواہ دی جاتی ہے، یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ ماہانہ تنخواہ پر مقرر کیے ہوئے سفراء و مصلین کے ذریعہ جو آمدنی ہوتی ہے اور ان پر جو خرچ ہوتا ہے اس سے مدرسہ کو نقصان پہنچتا ہے، آمد کا تناسب کم اور خرچ کا تناسب زائد آتا ہے، بعض مدارس میں متعین شرح فی صد کمیشن دیا جاتا ہے، اس صورت میں خرچ کے تناسب کے مقابلہ میں آمد کا تناسب بہتر رہتا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا ایسا کرنا جائز ہوگا اور اسے السالمین علیہا کے تحت داخل مانا جائے گا؟ اگر کمیشن کی صورت کو جائز قرار دیا جائے تو کیا شرح فی صد کے تعین کی کوئی خاص حد شرعاً ضروری ہے؟

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ حساب آمد و خرچ کے اندراج پر جو عملہ مقرر ہے، کیا اس کی ماہانہ تنخواہ مذکورہ سے ادا کی جاسکتی ہے، جب کہ وہ لوگ دوسرے کام بھی انجام دیتے ہیں؟

ضمیمہ سوالات بابت زکوٰۃ

سوال ۱: کیا زکوٰۃ شیرز کی موجودہ مارکیٹ قیمت پر ادا کی جائے یا اس سے ہوئی آمدنی پر؟ اگر زکوٰۃ آمدنی پر واجب الادا ہے تو یہ غیر صافی آمدنی پر واجب الادا ہے یا صافی آمدنی پر یعنی وہ خالص آمدنی جس میں سے اخراجات منہا کر دیے جائیں؟۔

ہم نے یہ پڑھا ہے کہ اگر شیرز کو جنس تجارت (خرید و فروخت اور اس کی تجارت) کی طرح استعمال کیا جائے تو زکوٰۃ ان شیرز کی بازاری قیمت اور ان کی آمدنی پر واجب الادا ہوتی ہے میں اس نکتہ کی وضاحت چاہتا ہوں، مزید یہ کہ ایسی صورت میں کہ شیرز کو مسلسل خرید اور بیچا جاتا ہے، نفع بھی ہو سکتا ہے اور نقصان بھی۔ اس لیے زکوٰۃ کس اساس پر ادا کی جائے؟۔ شیرز کو اگر زیادہ مدت تک پاس رکھا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ زکوٰۃ صرف آمدنی پر واجب الادا ہے، اگر کسی وجہ سے مالک ان شیرز کو بیچنے پر مجبور ہو تو اس صورت میں کیا ہوگا؟ کیا اس کو ان کی بازاری قیمت پر ادا کرنا ہوگا یا ان کے نفع پر یا ان سے حاصل ہوئی آمدنی پر؟۔

سوال ۲: ایک کاروباری ادارہ میں کیا زکوٰۃ کاروبار سے ہوئے نفع پر واجب الادا ہے یا کسی مقررہ خاص طور پر موجودہ اسٹاک پر؟

میں نے افزائش جانوروں کے کیس میں پڑھا ہے کہ اگر جانور کی خرید و فروخت ہوتی ہو تو زکوٰۃ مقررہ خاص تاریخ پر فارم میں موجود جانوروں کی بازاری قیمت (Market rate) پر واجب الادا ہوگی۔ البتہ ایسی صورت میں کہ یہ جانوروں و اشیاء کی فروخت کا ذریعہ ہوں جیسے دودھ، انڈا، تب زکوٰۃ دودھ / انڈوں پر عائد ہوگی اور جانوروں پر نہیں۔

سوال ۳: سرمایہ اندوزی، تمسکات کی صورت میں زکوٰۃ خالص یا صافی آمدنی یعنی اخراجات کی

بعد پہنچنے والی آمدنی پر واجب الادا ہے۔ چوں کہ شخصی اخراجات، ہر فرد کے جدا اور ہر سماجی طبقہ کے الگ ہوتے ہیں اس لیے شخصی اخراجات کی تحدید کے لیے کیا کوئی معیار مقرر کیا جاسکتا ہے؟۔

انٹرسٹ اور یوزری اکثر ہم معنی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں

رنٹ ہاؤس ڈکشنری میں انٹرسٹ کی تعریف یہ کی گئی ہے..... کسی جائداد کی ملکیت یا تجارت یا کاروبار کی ملکیت میں قانونی حصہ، حق یا سند ملکیت..... رقم جو ادا کی جائے یا عائد کی جائے۔ پیسے کے استعمال پر یا کسی پراجیکٹ یا کاروبار شروع کرنے یا جاری رکھنے کے لیے لیے گئے قرض پر.....

یوزری کی ڈکشنری میں اس طرح تعریف کی گئی ہے..... ایک حد سے زیادہ بڑھے ہوئے شرح انٹرسٹ پر پیسے قرض دینا یا قرض دینے کی عادت۔

اسلام یوزری پر پابندی لگاتا ہے کیوں کہ مجبور افراد کے استحصال کا کھلا ہوا عمل ہے، آج کے معاشی نظام میں "انٹرسٹ" تمام کاروباری دین کے اندر موجود ہے، ایک شخص صرف اپنی بقا کی ضرورت کے لیے قرض نہیں لیتا بلکہ اس رقم کو بڑھانے کے لیے، دولت پیدا کرنے کے لیے اور قرض دار کے لیے اور معاشرے کے لیے عام طور پر مواقع پیدا کرنے کے لیے قرض لیتا ہے۔ قرض دار، قرض دینے والے فرد یا ادارے کو ایک مقررہ منافع کی طمانیت دیتا ہے، جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اور جہاں ہم کو گزر بسر کرنا ہے ایک شخص مقررہ شرح انٹرسٹ سے کچھ لیے یا دیے بغیرہ سکتا ہے۔

ہندوستان اسلامی ریاست نہیں ہے، ہر موڑ پر انٹرسٹ دینا پڑتا ہے یا لینا پڑتا ہے،

چند مثالیں درج ہیں :

(۱) زمین داری کے خاتمہ کے بعد، ان املاک کے مالکوں کو معاوضہ میں ۲ فی صد انٹرسٹ کے زمین داری بانڈ دیے گئے۔

(۲) اگر کوئی شخص اپنے اثاثہ کو فروخت کرتا ہے تو اس کو کچل دینے والا کیپٹل کینس Capitally

ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے، اس ٹیکس سے بچنے کے لیے وہ شخص مجبور ہے کہ اس رقم کو بعض

مقررہ سیکورٹیز، تمسکات میں جیسے کیپٹل کینس یونٹ میں لگائے جن پر کم شرح سے مگر مقررہ

شرح سے انٹرسٹ دیا جاتا ہے۔

(۳) شخصی آمدنی پریکس کی شرح ساری دنیا کے مقابلہ میں ہندوستان میں سب سے زیادہ اونچی ہے۔ کئی صورتوں میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کی ۵۰ فی صد سے زیادہ آمدنی ٹیکس والوں نے ہضم کر لی۔ اس ظالمانہ محسوس کی زد سے بچنے کا قانونی طریقہ یہ ہے کہ حکومت کے بعض اسٹاکس بانڈز میں رقم لگائی جائے جن پر کم مگر مقررہ شرح سے انٹرسٹ ملتا ہے۔

(۴) پراویڈنٹ فنڈ ہماری آمدنی سے کی جانے والی لازمی منہائیوں پر مشتمل ہوتا ہے جس پر کمپنی کم مگر مقررہ شرح سے انٹرسٹ ادا کرتی ہے۔ تنخواہ یاب لوگوں کے لیے پراویڈنٹ فنڈ ہی بڑھاپے میں بچت کا واحد راستہ ہوتا ہے۔

اگر کسی کے پاس پیسہ ہے تو اس کے تغیر پذیر آمدنی پیدا کرنے والے سرمایہ کاری کے مواقع ہیں۔ جائیداد یا شیرز میں رقم لگانا سرمایہ کاری کے دو اہم ذرائع ہیں جن میں تغیر پذیر نفع حاصل ہوتا ہے۔

مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں آج شیرز مارکیٹ جوئے کا اڈا بن گئی ہے جہاں مارکیٹ پر کنٹرول کرنے والوں کی من مانی سے یا سیاسی تبدیلیوں سے افواہوں سے قسمیں بنتی اور بگڑتی ہیں، شیرز کی قیمتوں کا کوئی تعلق متعلقہ کمپنی کی مالی حالت سے نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک شخص جائیداد خریدنے میں ایک مقررہ حد سے زیادہ کی جائیداد نہیں لے سکتا ورنہ اس حد سے زیادہ کی جائیداد سیلنگ (Ceiling) کے تحت حکومت لے لیتی ہے۔ ان حالات میں کیا حکومت کی سیکورٹیز / بانڈز میں اور کمپنیوں کی فکسڈ ڈپازٹس میں سرمایہ کاری جائز قرار دی جاسکتی ہے؟

جوابات سؤالنامہ بابت زکوٰۃ

اسی ————— مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی، الجامعة العربیة، ہتھورا باندہ۔

ملک تام سے کیا مراد ہے

ملک تام کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی کی کسی مال پر ملکیت اس طور پر ثابت ہو کہ وہ اس مال مملوک میں سب مرضی تصرف پر قادر ہو، یعنی شریعت کی حدود میں جب چاہے جو چاہے تصرف کر سکتا ہو، ہمارے فقہاء کی زبان میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رقبہ بھی اس کا مملوک ہو اور یداً بھی، یعنی اس شے کی ملکیت اور اس میں تصرف دونوں چیزیں جس آدمی کو حاصل ہوں اس کی ملک تام مانی جائے گی، اسی لیے ان اموال میں زکوٰۃ نہیں ہے کہ جس میں ملکیت تو پائی جائے مگر تصرف سے آدمی عاجز ہو، مثلاً جو مال کھو گیا ہو اور اس کا کوئی پتہ نہ چلتا ہو، اسی طرح جو سمندر میں گر گیا۔

پیشگی ادا کردہ قیمت اور غیر موصول مال تجارت کی زکوٰۃ

- ۱۔ فریدار نے اپنا مال کسی چیز کے خریدنے کے لیے فروخت کنندہ کے سپرد کر دیا وہ فریدار کی ملکیت سے نکل کر فروخت کنندہ کی ملک میں پہنچ گیا، لہذا اس کی زکوٰۃ فریدار پر نہیں ہوگی۔
- ۲۔ فرید و فروخت کا معاملہ مکمل ہو جانے اور مشتری (فریدار) کی طرف سے قیمت کے ادا کر دینے کے بعد اگرچہ مال تجارت پر فریدار کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے مگر جب تک قبضہ نہ ہو یہ ملک تام یا مطلق

نہیں ہوتی، اس لیے کہ قبضہ کے بغیر خریدار اس میں کسی تصرف سے عاجز ہوتا ہے، لہذا اس کی زکوٰۃ اس پر نہیں ہوگی۔

البتہ چوں کہ مدار اس کا اس پر ہے کہ آدمی ملک کے بعد بھی تصرف سے عاجز ہو، اس لیے اگر بدون قبضہ بھی آدمی تصرف کر سکتا ہو، یعنی بن اموال یا بن بلاد میں کسی شخص کو محض خریدنے کے بعد پورے مالکات تصرفات کا حق حاصل ہو جاتا ہو، ان میں چوں کہ اس شرط کا تحقق ہوگا، لہذا خریدار کو اس کی زکوٰۃ دینی ہوگی اگرچہ مال ابھی اس کے شہر یا اس کے گودام میں نہ پہنچا ہو۔

کرایہ دار کی طرف سے پیشگی رقم یا ڈپازٹ کی زکوٰۃ

۱۔ کرایہ دار جو رقم بطور کرایہ پہلے سے ادا کر دیتا ہے وہ اس کی ملک سے نکل کر کرایہ کے سامان کے مالک کی ملک میں داخل ہو جاتی ہے اور اس پیشگی کرایہ کی رقم پر اس کی ملک تمام ثابت ہوتی ہے۔ لہذا اس کی زکوٰۃ موجر یعنی کرایہ پر سامان دینے والے پر ہوگی۔

۲۔ جو پیسہ کرایہ دار بطور ڈپازٹ یعنی زر ضمانت ادا کرتا ہے وہ کرایہ دار کی ہی ملک ہوتا ہے، اس لیے اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر ہی ہوگی، فقہ حنفی کی کتابوں میں بیع و فاء کی جو صورت معروف ہے اس میں علامہ شافعی نے مشتری یعنی پیسہ دینے والے پر وجوب کو ترجیح دی ہے۔ اور بیع و فاء میں خریدار کی طرف سے دی گئی رقم کی حیثیت ڈپازٹ جیسی ہوتی ہے۔

البتہ اس زکوٰۃ کی ادائیگی معاملہ کے ختم ہونے سے پہلے کرایہ دار پر لازم نہیں ہوگی اس لیے کہ اس سے پہلے پہلے اس کی حیثیت قرض کے مال کی ہے، جس میں زکوٰۃ اگرچہ گزشتہ سالوں کی ادا کرنی پڑتی ہے مگر قبضہ میں آنے کے بعد اس سے پہلے نہیں۔

مدارس و اداروں کی املاک میں زکوٰۃ

زکوٰۃ کی شرطوں سے ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کا وجوب شخصی املاک میں ہوتا ہے خواہ یہ ملک

انفراداً ہو یا اجتماعاً، قومی و ملی املاک محل زکوٰۃ نہیں ہیں، اس لیے بیت المال میں جمع شدہ اموال میں زکوٰۃ نہیں ہے اور فقہاء نے تصریح کی ہے کہ مال وقف میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

جمع شدہ مال حرام پر زکوٰۃ

مال حرام پر اس شخص کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی جس کے قبضے میں وہ جمع ہو رہا ہے یا جو کسی طرح سے اس کو حاصل کر رہا ہے، جہاں تک سوال ہے غلط کا تو آج کل نوٹ ہی رشوت و سود میں آتے ہیں، ان کی جو میثیت ہے اس میں غلط کو مؤثر نہ ہونا چاہیے، اور اگر مؤثر بھی ہو تو بھی زکوٰۃ تو پاکیزہ کمائی والے حصہ میں ہوگی نہ کہ حرام میں جیسا کہ فقہاء کی تصریحات و تفصیلات سے ظاہر ہے۔

دین کی زکوٰۃ کس پر ہوگی؟

۱۔ دین کی زکوٰۃ دائن پر ہی ہوگی، اس لیے کہ دین کا مال اسی کی ملک ہوتا ہے۔ البتہ جب تک دائن کا قبضہ نہ ہو تب تک مطالبہ نہیں ہوگا اور قبضہ کے بعد مطالبہ میں تفصیل ہے اس لیے کہ دین کے مختلف صورتیں و اسباب ہوتے ہیں۔

۲۔ دین کی زکوٰۃ کسی بھی صورت میں مدیون سے لیے جانے کا سوال ہی نہیں ہے، اگرچہ مدیون اس سے کتنا ہی نفع اٹھائے۔ اس لیے کہ وجوب زکوٰۃ کے لیے ملک ایک بنیادی شرط ہے اور دائن کا مالک صرف دائن ہوتا ہے، مدیون اس پر قبضہ اور اس میں تصرف کے باوجود بھی اس کا بایں معنی مالک نہیں ہوتا کہ اس کی وجہ سے اس پر شرعی مطالبات عائد ہوں۔

۳۔ دین کی وصولیابی و نامیدگی کے مسائل کے سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ:

الف۔ چوں کہ ملک کے ساتھ "تام و مطلق" کی قید لگی ہے، اس لیے اصولی طور پر اسی دین کی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جس کی وصولیابی اور جس میں تصرف پر آدمی قادر ہو۔

ب۔ نیز دین پر زکوٰۃ کی بابت یہ بھی ایک اصولی بات ہے کہ کسی بھی قسم کے دین کی وصولیابی سے پہلے

اس کی زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں ہوتا، اگرچہ یہ وصولیابی جزئی ہو اور اسی جزئی وصولیابی پر اس وصول شدہ جزو کے زکوٰۃ لازم قرار دی جائے۔

ج:۔ اگر کسی دائن کے پاس اس کے دین کے علاوہ کوئی مال موجب زکوٰۃ موجود ہے جس پر سال گزر چکا ہے تو جو بھی دین آدمی کو وصول ہو موجود کے ساتھ ملا کر اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا، خواہ دین جس قسم کا ہو۔

د:۔ اور اگر قرض دائن کی رقم کے علاوہ کوئی مال نصاب و موجب زکوٰۃ دائن کے پاس موجود نہیں ہے تو۔

۱۔ جو قرض و دین اس کا تجارتی ہو یا نقد لیا دیا گیا ہو اگر وہ بقدر نصاب ہے اور اس پر سال گزر چکا ہے، پھر اس کے بعد اس کی وصولیابی ہو رہی ہے تو جو ملتا جائے اس کے نصاب سے زکوٰۃ نکالتا جائے، اس کے لیے نہ وصولیابی کے بعد سال گزرنے کی ضرورت ہے اور نہ بقدر نصاب وصولیابی کی، اور نہ ہی کسی مقدار خاص کی لیے

۲۔ جو غیر تجارتی دین ہے مثلاً اپنی ضرورت کا کوئی سامان بیچ دیا تھا تو اگر بقدر نصاب اور سال گزرا ہوا ہے تو جب پورے نصاب کی وصولیابی ہوگی تب ہی زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں، البتہ وصول ہونے کے بعد سال گزرنے کی شرط نہیں ہے۔

۳۔ اور بعض صورتوں میں وصولیابی کے بعد سال گزرنے کی بھی شرط ہے، اس کا مطلب یہ ہوا، عام طور سے جو لوگوں کا دوسروں پر قرض ہوتا ہے اور وہ تجارتی لین دین کا یا ضروریات کے لیے نقد کے لین دین کا ہوتا ہے، اس میں وصولیابی پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی۔ البتہ دین کی تیسری قسم جس میں مہر کو بھی شمار کیا گیا ہے اس میں وصولیابی کے بعد سال کا گزرنا بھی ضروری ہے

پراوڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ

اس فنڈ کی جو نوعیت ہے کہ وصولیابی سے پہلے آدمی کو اس میں تصرف کافی نہیں ہوتا، ہاں بطور قرض لے سکتا ہے، مگر پھر واپس کرنا پڑتا ہے اس لیے اس کی حیثیت ایک قسم کے دین کی ہے۔

لہذا وصولیابی سے پہلے اس پر کسی زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں ہوگا، اور وصولیابی کے بعد اگر آدمی کے پاس دوسرا نصاب موجود ہے تو اس کے ساتھ جوڑ کر بغیر حولان حول اور نصاب کی قید کے بغیر اس کی زکوٰۃ دینی ہوگی، اور اگر اس کے علاوہ کوئی مال نہیں تھا تو جب بقدر نصاب ہو اور سال گزر جائے تب زکوٰۃ ہوگی، اس لیے کہ فقہاء صنفیہ کے اصول کے مطابق یہ فنڈ دین کی قیسری قسم میں شامل ہے پھر یہ کہ ملک کے بغیر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی اور اجرت پر قبضہ کے بغیر ملکیت ثابت نہیں ہوتی۔ تو یہ فنڈ آدمی کا حق تو ہے اس لیے کہ معاملہ میں طے کیا گیا ہے مگر جب تک قبضہ میں نہ آئے یعنی وصول نہ ہو اس کی ملک نہیں قرار پائے گا۔

شرط مال

وجوب زکوٰۃ کے لیے وہ مال جس میں زکوٰۃ واجب ہو رہی ہو اس کا نامی ہونا ایک بنیادی شرط ہے، الفقہ الاسلامی میں ہے:

”لأن معنى الزكاة وهو التماء - لا يحصل إلا بلمال النامي“

یہ شرط اس لیے ہے کہ لفظ زکوٰۃ کے لغوی معنی ”زیادتی“ کا حصول ایسے ہی مال کے ذریعہ ہو سکتا ہے جو کہ بڑھنے والا ہو۔

البتہ اس شرط کے اعتبار کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ واقعہً و عملاً بڑھ رہا ہو بلکہ یہ بھی کافی ہے کہ بڑھنے کے حال میں ہو اس لیے کہ قدرت نے اس کو ایسا ہی بنایا ہے، جیسے کہ سونا و چاندی اور آج کل روپیہ و فیروزہ جو کہ سونے و چاندی کی جیسی حیثیت رکھتا ہے یا یہ کہ آدمی کی غرض اس مال کو اپنے پاس رکھنے سے یہی ہے جیسے مال تجارت خواہ وہ سال بھر کے عرصہ میں فروخت ہوا ہو اور کچھ بڑھا ہو یا یہ کہ اب بھی دوکان میں موجود ہو یا اس میں آدمی کو گھٹانا ہوا ہو۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ اس بڑھنے کا تعلق خود اس شئی سے ہو جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، نہ کہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے، یہ بات اس لیے کہی جا رہی ہے کہ آج کل بعض حضرات نے

کرایہ کا ذریعہ بنائی جانے والی املاک کو مال نامی میں شمار کیا ہے اور ان کی حیثیت دیگر اموال نامیہ کی قرار دی ہے حالانکہ عام طور سے فقہاء اس کی نفی کرتے رہے ہیں، یا کرتے ہیں، امام احمد نے اگر کرایہ کا ذریعہ بنائے جانے والے زیور پر زکوٰۃ واجب قرار دی ہے تو اس کے سونا اور چاندی ہونے کی وجہ سے اور ذاتی استعمال میں نہ ہونے کی وجہ سے، پھر یہ کہ فقہاء نے منصوص اشیاء کے علاوہ محض اموال تجارت میں زکوٰۃ کو ذکر کیا ہے اور اسباب نما میں تجارت کے ساتھ توالد و تناسل کو ذکر کیا ہے، کرایہ کا تذکرہ تو بظاہر کہیں ملتا نہیں ہے۔

تیسری شرط حاجت اصلہ

یہ صحیح ہے کہ شرعاً اسراف و تنعم پسندیدہ نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ کسی نص میں یہ بات نہیں آئی ہے اور نہ فقہاء کی تصریح میں کہ آدمی کے کھانے پینے کا اور پہننے واڑھنے کا ایک معیار متعین ہے وہی حاجت ہے اور ماسوا اس سے زائد ہے بلکہ تفصیلات سے یہ سمجھیں آتا ہے کہ مال زکوٰۃ میں سے ایجاب زکوٰۃ کے لیے دوسری شرطوں کے ساتھ یہ مطلوب ہے کہ کھانے و پینے، پہننے واڑھنے، رہنے و سہنے کی ضروریات میں سال بھر خرچ کرنے کے بعد آدمی کے پاس بقدر نصاب مال موجود ہو، شروء سال میں بھی اور اخیر میں بھی، یا یہ کہ سال بھر کی ضروریات میں صرف کیے جانے والے مال سے الگ نصاب اس کے پاس موجود ہو۔

مثلاً ایک آدمی کے پاس یکم محرم کو بقدر نصاب مال زکوٰۃ موجود ہے اور جب سال ختم ہوا تو سال بھر اسی مال کی آمدنی و نفع یا اصل کو خرچ کرنے کے بعد بقدر نصاب مال اس کے پاس موجود ہے یا یکم محرم کو اس کے پاس دو نصاب موجود ہیں، ایک اس نے رکھا ہے سال بھر کی ضروریات میں صرف کرنے کے لیے اور ایک زائد ہے تو دونوں صورتوں میں اس کے پاس ضرورت سے فاضل و فارغ

۱۔ فقہ الزکاة میں نما کی شرط پر گفتگو کرتے ہوئے ج ۱، ص ۱۳۹ پر سطر ۱۸ میں نما حقیقی کی تعریف میں شامی سے بحوالہ بحر نقل کیا ہے، العقیق الزیادۃ بالتوالد والتناسل والتجارات ونحوها۔ اس عبارت میں ونحوها کا لفظ نہ شامی میں آیا ہے اور نہ بحر میں اور نہ بظاہر یہ لفظ احناف کی دوسری کتابوں میں آیا ہے، الشد بہتر جانے کہ یہ کہاں سے آگیا؟

نصاب موجود ہے۔

نیز شریعت ایجاب زکوٰۃ کے لیے صرف یہ دیکھتی ہے کہ آدمی کے پاس شروع سال و اخیر میں بقدر نصاب مال زکوٰۃ موجود ہے، اس نے اس درمیان کتنا کمایا اور کہاں کہاں؟ کیا و کیسے صرف کیا اس سے بحث نہیں ہوتی البتہ دوسری صورت جو ذکر کی گئی ہے اس میں ضروریات کے لیے محفوظ کیے جانے والے سرمایہ میں آدمی کا جو واقعی معیار ہوا اسے اس کی رعایت کرنی ہوگی۔

اور ظاہر ہے کہ ہر شخص کے کھانے اور پینے کا معیار الگ الگ ہوتا ہے جب شریعت نے اس میں پابندی نہیں بنایا ہے تو کسی زمانہ و ماحول کی بھی پابندی نہیں ہوگی، کتب فقہ کی تصریحات سے ایسا ہی سمجھ میں آتا ہے۔

دین اور زکوٰۃ

اگر آدمی مالدار ہونے کے ساتھ مدیون ہو تو زکوٰۃ کا کیا حکم ہے تفصیل گزر چکی ہے۔ اور فقہاء کی تصریحات سے کوئی فرق اس اعتبار سے سمجھ میں نہیں آتا کہ قرض طویل المدت ہو تو سالانہ قسط کا شمار کر کے باقی پر زکوٰۃ ہو بلکہ دین کی پوری رقم سے زکوٰۃ ساقط ہوگی اگرچہ معاہدہ کے مطابق دسیوں سال بعد پورے قرض کی ادائیگی کی نوبت آئے۔

کمپنی پر زکوٰۃ

ایجاب زکوٰۃ کے لیے ہر فرد کے انفرادی حصہ کا بقدر نصاب ہونا ضروری ہے۔

ہمیرے اور جوہرات

ہمیرے وغیرہ جب تجارت کے لیے نہ ہوں تو بالاتفاق زکوٰۃ نہیں ہے اس لیے کہ یہ سونے و چاندی کی طرح طبعاً اموال نامیہ میں سے نہیں ہیں، لہذا ان میں نما کے تحقق کے لیے ان کی تجارت ضروری ہے،

اس کے بغیر یہ نامی نہ ہوں گے اور مال کا نما ہونا واجب زکوٰۃ کی ایک بنیادی شرط ہے۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

۱۔ اموال تجارت کی زکوٰۃ میں خرید و فروخت کے بجائے بازار کے بھاؤ و قیمت کا اعتبار ہوگا، اور جب زکوٰۃ ادا کرنے کی نوبت آئے اس دن جو قیمت ہو اس کا شمار کیا جائے گا لے اور ٹھوک و پھٹک میں تاجر کے حال کا لحاظ کیا جائے گا، اس لیے کہ بازار میں دونوں کا شرح الگ الگ ہوتا ہے۔

۲۔ جب زمین کی تجارت کی جائے تو وہ بھی دیگر اموال تجارت کا حکم رکھے گی لے اور اس میں بھی اگر علاقے کا کوئی معیار ہو تو اسی معیار کے مطابق زمین کی قیمت جوڑی جائے گی یا پھر کم سے کم داسم جو تاجر نے لے کر لیا ہے کہ اس سے کم نہیں کرنا ہے جیسے کہ عام اموال کی تجارت میں پھٹک و فروخت کرنے والوں کے حق میں اس کو معیار بنایا جاسکتا ہے لے

شیر زپر زکوٰۃ

شیر زپر بھی زکوٰۃ ہے اور بوقت ادا کی زکوٰۃ جو قیمت ہو اس کا اعتبار ہوگا، ادا کر دہ قیمت سے زائد ہونے والی رقم نفع ہے اور تجارتی سرمایہ و اموال میں اصل و نفع سب پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

البتہ عام رجحان یہ ہے کہ شیر ز کے صرف اس حصے پر زکوٰۃ ہوگی جو تجارتی کاروبار میں صرف کیا جا رہا ہو اور اس کا جو حصہ کمپنی کی ضرورت کی عمارت و آلات میں صرف ہو اور لگایا گیا ہو اس حصے میں زکوٰۃ نہیں ہوگی۔ اسی طرح انہیں کمپنیوں کے شیر زمین زکوٰۃ ہوگی جو کہ تجارت کرتی ہیں اور جو کمپنیاں شیر ز سے املاک حاصل کر کے ان کے ذریعہ کاروبار کرتی ہیں کہ ان املاک کو کرایہ پر دیتی ہیں

لے اس پر اہل فتویٰ اور فقہاء کا اتفاق ہے، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/ ۹۲۷ سواکان مال التجارۃ بموجباً اومقاراً الخ، بدائع ۲/ ۲۰، متفرق خریدار میں قیمت سے لیتے ہیں وہ معتبر ہے اور اس میں اگر اختلاف ہو تو اکثر اور اشہر کا اتھا ہے اور وہ قریب قریب متعین ہوتی ہے یعنی وہ قیمت کہ اگر کوئی تخفیف کی درخواست کرے تو اس پر فروخت کیا جائے، امداد الفتاویٰ ۲/ ۴۸۔

ان کے شیرز پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

دوسرا رجحان بعض علماء و عصر کا یہ ہے کہ شیرز پر زکوٰۃ بغیر کسی تفصیل کے ہے، اس لیے کہ اس وقت کے عرف میں "شیرز" خود ایک سامان تجارت کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اسی حیثیت سے ان کو خرید و فروخت ہوتی ہے، لوگ خرید و فروخت میں ان کی مجموعی حیثیت کو دیکھتے ہیں اور تفصیلات کے درپے نہیں ہوتے۔ اور واقعہ یہی ہے کہ اس وقت عرف نے خود شیر کو ایک مال و سامان کی حیثیت عطا کر دی ہے، اس لیے اس رجحان کو قبول کیا جاسکتا ہے، جب کہ اس کے مطابق زکوٰۃ کی ادائے گی میں سہولت بھی ہے اگرچہ تجارتی کمپنیاں کس قدر آلات و اسباب میں اور کس قدر سامان تجارت میں لگاتی ہیں، اس کے جاننے میں بھی اس لیے زہمت نہیں ہے کہ کمپنیاں پوری تفصیل شائع کرتی رہتی ہیں، اور شیرز کے مالکان کو پوری تفصیل سے باخبر رکھتی ہیں اس لیے آدمی آسانی کے ساتھ تفصیل سے واقف ہو کر شیرز کی زکوٰۃ دے سکتا ہے، لیکن زیادہ آسان یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیرز کی پوری رقم پر اجمالاً اور مجموعی طور پر زکوٰۃ نکالی جائے۔

باؤنڈس کی زکوٰۃ

باؤنڈس لگائی گئی رقم قرض ہوتی ہے اور فقہاء و صنفیہ کی تفصیل کے مطابق یہ دین دین قوی ہوگا، اس لیے وصولیابی پر بشرط نصاب گزرے ہوئے سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کر فے ہوگی، لیکن اس میں لگائے گئے اصل سرمایہ کی اس پر جو مزید رقم ادنیٰ کو ملتی ہے وہ سود ہے اس پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

سونے و چاندی میں سے اصل نصاب

زکوٰۃ سے متعلق نصوص اور عام فقہاء کی تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جیسے سونا و چاندی میں سے ہر ایک خلقة، طبعاً، اور استعمالاً ضمن ہے اسی طرح نصاب زکوٰۃ میں بھی دونوں

میں سے ہر ایک کا نصاب مستقل ہے، جیسے جانوروں کا نصاب مستقل ہے دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے پر متفرع نہیں ہے، دیت کی بابت بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اصل اونٹ تھا، لہذا اس کی قیمت کو معیار بنا کر کمی و بیشی کی گئی۔ مگر سونے و چاندی کے نصاب کے متعلق احقر کا خیال ہے کہ کوئی ایسی نص موجود نہیں ہے بلکہ صورت حال یہ ہے کہ چاندی کے نصاب سے متعلق نصوص زیادہ ہیں۔ اور وہ قوت میں بھی فائق ہیں، اسی لیے چاندی کا نصاب اتفاقی ہے اور سونے کے نصاب کی بابت کچھ اختلاف رہا ہے بلکہ مشہور تابعی حضرت عطاء کا بیان تو یہ ہے کہ اس عہد میں چاندی ہی زیادہ رائج تھی یعنی دراہم نہ کہ دینار تھے۔

بہر حال واقعہ یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک مستقل ہے لہذا جہاں جس کے نصاب میں فقراء کا فائدہ ہو یعنی آدمی صاحب نصاب قرار پائے وہیں اس نصاب کا اعتبار ہوگا، اگرچہ دونوں کے نصابوں کی قیمتوں میں تفاوت فاحش پایا جاتا ہو، جیسا کہ آج کل عام طور سے ہے اور چوں کہ چاندی کے نصاب کی مالیت ہر عہد میں کم رہی ہے (ابتدائی عہد کو چھوڑ کر) اس لیے علماء کا عام رجحان چاندی کے نصاب اور اس کی قیمت کے اعتبار کا رہا ہے، اور ہے۔ اور اس باب میں "نفع للفقراء" کے اعتبار کا قاعدہ کتب فقہ میں اور فقہاء کے یہاں عام ہے۔

مصارف زکوٰۃ

طلباء کو ماہانہ وظیفہ

س۔ سوال میں مذکور نظام کے مطابق طلبہ کو ماہانہ رقم بطور وظیفہ دینا اور پھر ان کے واجبہ مصارف میں صرف کے لیے اس رقم کا مدرسہ میں ان سے جمع کرانا۔ بظاہر اس میں کوئی اشکال معلوم نہیں ہوتا بلکہ زکوٰۃ کی رقم کو صحیح طور پر صرف کرنے کی اس سے بہتر و بے داغ کوئی شکل سمجھ میں نہیں آتی، آج کل

۱۔ ملاحظہ ہو: مشکاۃ، باب الدیات، الفصل الثانی ۳۲ و ۳۳، متعدد روایات ہیں جو کہ صراحۃً یا دلالتاً اس مضمون

کو بتاتی ہیں ۱۔ فقہ الزکوٰۃ ۲۴۶/۱ تا ۲۵۱۔ ۲۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۲، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸، ۱۵۱۹، ۱۵۲۰، ۱۵۲۱، ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ۱۵۲۶، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸، ۱۵۲۹، ۱۵۳۰، ۱۵۳۱، ۱۵۳۲، ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۳۶، ۱۵۳۷، ۱۵۳۸، ۱۵۳۹، ۱۵۴۰، ۱۵۴۱، ۱۵۴۲، ۱۵۴۳، ۱۵۴۴، ۱۵۴۵، ۱۵۴۶، ۱۵۴۷، ۱۵۴۸، ۱۵۴۹، ۱۵۵۰، ۱۵۵۱، ۱۵۵۲، ۱۵۵۳، ۱۵۵۴، ۱۵۵۵، ۱۵۵۶، ۱۵۵۷، ۱۵۵۸، ۱۵۵۹، ۱۵۶۰، ۱۵۶۱، ۱۵۶۲، ۱۵۶۳، ۱۵۶۴، ۱۵۶۵، ۱۵۶۶، ۱۵۶۷، ۱۵۶۸، ۱۵۶۹، ۱۵۷۰، ۱۵۷۱، ۱۵۷۲، ۱۵۷۳، ۱۵۷۴، ۱۵۷۵، ۱۵۷۶، ۱۵۷۷، ۱۵۷۸، ۱۵۷۹، ۱۵۸۰، ۱۵۸۱، ۱۵۸۲، ۱۵۸۳، ۱۵۸۴، ۱۵۸۵، ۱۵۸۶، ۱۵۸۷، ۱۵۸۸، ۱۵۸۹، ۱۵۹۰، ۱۵۹۱، ۱۵۹۲، ۱۵۹۳، ۱۵۹۴، ۱۵۹۵، ۱۵۹۶، ۱۵۹۷، ۱۵۹۸، ۱۵۹۹، ۱۶۰۰، ۱۶۰۱، ۱۶۰۲، ۱۶۰۳، ۱۶۰۴، ۱۶۰۵، ۱۶۰۶، ۱۶۰۷، ۱۶۰۸، ۱۶۰۹، ۱۶۱۰، ۱۶۱۱، ۱۶۱۲، ۱۶۱۳، ۱۶۱۴، ۱۶۱۵، ۱۶۱۶، ۱۶۱۷، ۱۶۱۸، ۱۶۱۹، ۱۶۲۰، ۱۶۲۱، ۱۶۲۲، ۱۶۲۳، ۱۶۲۴، ۱۶۲۵، ۱۶۲۶، ۱۶۲۷، ۱۶۲۸، ۱۶۲۹، ۱۶۳۰، ۱۶۳۱، ۱۶۳۲، ۱۶۳۳، ۱۶۳۴، ۱۶۳۵، ۱۶۳۶، ۱۶۳۷، ۱۶۳۸، ۱۶۳۹، ۱۶۴۰، ۱۶۴۱، ۱۶۴۲، ۱۶۴۳، ۱۶۴۴، ۱۶۴۵، ۱۶۴۶، ۱۶۴۷، ۱۶۴۸، ۱۶۴۹، ۱۶۵۰، ۱۶۵۱، ۱۶۵۲، ۱۶۵۳، ۱۶۵۴، ۱۶۵۵، ۱۶۵۶، ۱۶۵۷، ۱۶۵۸، ۱۶۵۹، ۱۶۶۰، ۱۶۶۱، ۱۶۶۲، ۱۶۶۳، ۱۶۶۴، ۱۶۶۵، ۱۶۶۶، ۱۶۶۷، ۱۶۶۸، ۱۶۶۹، ۱۶۷۰، ۱۶۷۱، ۱۶۷۲، ۱۶۷۳، ۱۶۷۴، ۱۶۷۵، ۱۶۷۶، ۱۶۷۷، ۱۶۷۸، ۱۶۷۹، ۱۶۸۰، ۱۶۸۱، ۱۶۸۲، ۱۶۸۳، ۱۶۸۴، ۱۶۸۵، ۱۶۸۶، ۱۶۸۷، ۱۶۸۸، ۱۶۸۹، ۱۶۹۰، ۱۶۹۱، ۱۶۹۲، ۱۶۹۳، ۱۶۹۴، ۱۶۹۵، ۱۶۹۶، ۱۶۹۷، ۱۶۹۸، ۱۶۹۹، ۱۷۰۰، ۱۷۰۱، ۱۷۰۲، ۱۷۰۳، ۱۷۰۴، ۱۷۰۵، ۱۷۰۶، ۱۷۰۷، ۱۷۰۸، ۱۷۰۹، ۱۷۱۰، ۱۷۱۱، ۱۷۱۲، ۱۷۱۳، ۱۷۱۴، ۱۷۱۵، ۱۷۱۶، ۱۷۱۷، ۱۷۱۸، ۱۷۱۹، ۱۷۲۰، ۱۷۲۱، ۱۷۲۲، ۱۷۲۳، ۱۷۲۴، ۱۷۲۵، ۱۷۲۶، ۱۷۲۷، ۱۷۲۸، ۱۷۲۹، ۱۷۳۰، ۱۷۳۱، ۱۷۳۲، ۱۷۳۳، ۱۷۳۴، ۱۷۳۵، ۱۷۳۶، ۱۷۳۷، ۱۷۳۸، ۱۷۳۹، ۱۷۴۰، ۱۷۴۱، ۱۷۴۲، ۱۷۴۳، ۱۷۴۴، ۱۷۴۵، ۱۷۴۶، ۱۷۴۷، ۱۷۴۸، ۱۷۴۹، ۱۷۵۰، ۱۷۵۱، ۱۷۵۲، ۱۷۵۳، ۱۷۵۴، ۱۷۵۵، ۱۷۵۶، ۱۷۵۷، ۱۷۵۸، ۱۷۵۹، ۱۷۶۰، ۱۷۶۱، ۱۷۶۲، ۱۷۶۳، ۱۷۶۴، ۱۷۶۵، ۱۷۶۶، ۱۷۶۷، ۱۷۶۸، ۱۷۶۹، ۱۷۷۰، ۱۷۷۱، ۱۷۷۲، ۱۷۷۳، ۱۷۷۴، ۱۷۷۵، ۱۷۷۶، ۱۷۷۷، ۱۷۷۸، ۱۷۷۹، ۱۷۸۰، ۱۷۸۱، ۱۷۸۲، ۱۷۸۳، ۱۷۸۴، ۱۷۸۵، ۱۷۸۶، ۱۷۸۷، ۱۷۸۸، ۱۷۸۹، ۱۷۹۰، ۱۷۹۱، ۱۷۹۲، ۱۷۹۳، ۱۷۹۴، ۱۷۹۵، ۱۷۹۶، ۱۷۹۷، ۱۷۹۸، ۱۷۹۹، ۱۸۰۰، ۱۸۰۱، ۱۸۰۲، ۱۸۰۳، ۱۸۰۴، ۱۸۰۵، ۱۸۰۶، ۱۸۰۷، ۱۸۰۸، ۱۸۰۹، ۱۸۱۰، ۱۸۱۱، ۱۸۱۲، ۱۸۱۳، ۱۸۱۴، ۱۸۱۵، ۱۸۱۶، ۱۸۱۷، ۱۸۱۸، ۱۸۱۹، ۱۸۲۰، ۱۸۲۱، ۱۸۲۲، ۱۸۲۳، ۱۸۲۴، ۱۸۲۵، ۱۸۲۶، ۱۸۲۷، ۱۸۲۸، ۱۸۲۹، ۱۸۳۰، ۱۸۳۱، ۱۸۳۲، ۱۸۳۳، ۱۸۳۴، ۱۸۳۵، ۱۸۳۶، ۱۸۳۷، ۱۸۳۸، ۱۸۳۹، ۱۸۴۰، ۱۸۴۱، ۱۸۴۲، ۱۸۴۳، ۱۸۴۴، ۱۸۴۵، ۱۸۴۶، ۱۸۴۷، ۱۸۴۸، ۱۸۴۹، ۱۸۵۰، ۱۸۵۱، ۱۸۵۲، ۱۸۵۳، ۱۸۵۴، ۱۸۵۵، ۱۸۵۶، ۱۸۵۷، ۱۸۵۸، ۱۸۵۹، ۱۸۶۰، ۱۸۶۱، ۱۸۶۲، ۱۸۶۳، ۱۸۶۴، ۱۸۶۵، ۱۸۶۶، ۱۸۶۷، ۱۸۶۸، ۱۸۶۹، ۱۸۷۰، ۱۸۷۱، ۱۸۷۲، ۱۸۷۳، ۱۸۷۴، ۱۸۷۵، ۱۸۷۶، ۱۸۷۷، ۱۸۷۸، ۱۸۷۹، ۱۸۸۰، ۱۸۸۱، ۱۸۸۲، ۱۸۸۳، ۱۸۸۴، ۱۸۸۵، ۱۸۸۶، ۱۸۸۷، ۱۸۸۸، ۱۸۸۹، ۱۸۹۰، ۱۸۹۱، ۱۸۹۲، ۱۸۹۳، ۱۸۹۴، ۱۸۹۵، ۱۸۹۶، ۱۸۹۷، ۱۸۹۸، ۱۸۹۹، ۱۹۰۰، ۱۹۰۱، ۱۹۰۲، ۱۹۰۳، ۱۹۰۴، ۱۹۰۵، ۱۹۰۶، ۱۹۰۷، ۱۹۰۸، ۱۹۰۹، ۱۹۱۰، ۱۹۱۱، ۱۹۱۲، ۱۹۱۳، ۱۹۱۴، ۱۹۱۵، ۱۹۱۶، ۱۹۱۷، ۱۹۱۸، ۱۹۱۹، ۱۹۲۰، ۱۹۲۱، ۱۹۲۲، ۱۹۲۳، ۱۹۲۴، ۱۹۲۵، ۱۹۲۶، ۱۹۲۷، ۱۹۲۸، ۱۹۲۹، ۱۹۳۰، ۱۹۳۱، ۱۹۳۲، ۱۹۳۳، ۱۹۳۴، ۱۹۳۵، ۱۹۳۶، ۱۹۳۷، ۱۹۳۸، ۱۹۳۹، ۱۹۴۰، ۱۹۴۱، ۱۹۴۲، ۱۹۴۳، ۱۹۴۴، ۱۹۴۵، ۱۹۴۶، ۱۹۴۷، ۱۹۴۸، ۱۹۴۹، ۱۹۵۰، ۱۹۵۱، ۱۹۵۲، ۱۹۵۳، ۱۹۵۴، ۱۹۵۵، ۱۹۵۶، ۱۹۵۷، ۱۹۵۸، ۱۹۵۹، ۱۹۶۰، ۱۹۶۱، ۱۹۶۲، ۱۹۶۳، ۱۹۶۴، ۱۹۶۵، ۱۹۶۶، ۱۹۶۷، ۱۹۶۸، ۱۹۶۹، ۱۹۷۰، ۱۹۷۱، ۱۹۷۲، ۱۹۷۳، ۱۹۷۴، ۱۹۷۵، ۱۹۷۶، ۱۹۷۷، ۱

دنوی تعلیم میں رہائش و تعلیم کا خرچ عام ہے، دینی تعلیم میں بھی بہت سے لوگ ان امور پر خرچ کرتے ہیں یا اس کا مزاج رکھتے ہیں، اس لیے مستطیع طلباء سے رہائش و تعلیم کے مصارف لیے جاسکتے ہیں نیز ان سے جو مصارف لیے جاتے ہیں ان کی استطاعت کے مطابق ان میں کمی بھی کی جاسکتی ہے، مثلاً یہ کہ وہ صرف طعام کے مصارف تو اپنے پاس سے دیں اور باقی مصارف مدرسہ سے لے کر جمع کریں۔

اہل مدرسہ کس کے وکیل

سٹل — عملاً اور واقعہً تو اہل مدارس کے لیے نہ زکوٰۃ دہندگان کی طرف سے تو کیل پائی جاتی ہے اور نہ مستحقین کی طرف سے، ہاں کبھی کبھی دینے والے ایسی باتیں مثلاً ہم آپ کو دیر ہے میں مصروف میں صرف کے آپ ذمہ دار ہیں، کہہ دیا کرتے ہیں اس لیے یہ تو کیل انتظاماً اور کام چلانے کے لیے ہے، بعض اکابر دیوبند کی تحریرات میں طلباء کی طرف سے تو کیل کی بات ملتی ہے، مفتی شفیع صاحب نے بھی اخیر میں اس کی طرف رجوع کر لیا تھا، لیکن اس کے بعد بھی اہل مدرسہ کی طرف سے طلباء کے ہر قسم کے مصارف میں براہ راست زکوٰۃ کی رقم کا لگانا محلّ تامل ہے مثلاً رہائشی ضرورتوں میں جب کہ وہ رہ کر چلے جائیں گے اور یوں وہ مالک تو بنیں گے نہیں۔ بیت المال کے نظام میں بظاہر اس انداز کی کسی شکل میں زکوٰۃ کے مال کا صرف کرنا معلوم نہیں ہوتا کم از کم مولانا غلیل احمد صاحب سہارنپوری کی تحریر کے مطابق دینے والوں کے بعد عدم واپسی اور جمع شدہ مال میں عدم وجوب زکوٰۃ کی حد تک تو یہ بات قبول کر ہی لینی چاہیے۔ اس طرح جب تک مال زکوٰۃ صرف نہ ہو تب تک عدم ادا کی زکوٰۃ کی مالیت بھی یعنی یہ کہ ذمہ داران وکیل طلباء ہونے کی وجہ سے ان کی طرف سے قابض ہوئے، لہذا دینے والوں کی زکوٰۃ ادا ہو گئی اور نہ ان کا کوئی حق باقی رہا اور نہ ہی ذمہ داری — باقی اس قبضہ کو مکمل طور پر طلباء کا قبضہ مان لینے اور پھر ہر قسم کے مصارف میں صرف کرنے میں ضرورت غور و تحقیق کی ہے، جن حضرات کی تحریرات سے سند پکڑی جاتی ہے، ان کی نیز دوسرے عام ارباب افتاء کی تصریحات تو یہی ہیں کہ اہل مدرسہ کو مال زکوٰۃ طلباء کے ہاتھ میں ہی ان کی ضروریات کی صورت میں دینا چاہیے، مثلاً کھانا و کپڑا وغیرہ اور ادارے کی دوسری ضروریات میں ان کے اسطے سے بطور تملیک رقم کو خرچ کرنا چاہیے۔

بہر حال یہ اہل مدارس کی ضروریات کے لیے غیر مفید و لغو میلے کے بجائے ایک مفید و مناسب

توجیہ ہے، کچھ لوگ اس پر عمل بھی کر رہے ہیں، مگر ضرورت تنقیح و تحقیق کی ہے۔

عالمین زکوٰۃ اور ان کا معاوضہ

س: (الف) — عالمین زکوٰۃ حکومتِ مُسلمہ کے کارندے ہوتے ہیں اور اس واسطے سے وہ فقراء کے وکیل ہوتے ہیں، اہل مدارس کو بھی اگر فقراء کا وکیل مان لیا جائے تو سفراء و مُصلین پندرہ ان کے کارندے ہوں گے، اور ان کو ان کے عمل کے عوض زکوٰۃ کا دینا درست ہوگا۔ مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی نے متعدد فتاویٰ میں اور قوت کے ساتھ سفراء کو مال زکوٰۃ میں سے ان کے عمل کا معاوضہ دینے کو ذکر کیا ہے۔ لیکن صرف اسی حد تک انہوں نے گنجائش دی ہے مزید صرف میں دیگر ارباب افتاء کی طرح انکار یا تملیک وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے یہ

(ب) — یہ معاوضہ متعین مشاہرہ ہونا چاہیے، کمیشن درست نہیں ہے، حدیث قفیز طمان کی صحت و قوت کی وجہ سے اور ان عقلی وجوہ کی بناء پر جو فقہاء نے قفیز طمان کی حدیث کے سلسلہ میں کمیشن پر چندہ سے متعلق احقر کے مبسوط مقلے کا مطالعہ کیا جائے۔

(ج) — مشاہرہ یا فیصد کی بنیاد پر معاوضہ اگر اس کی کوئی جائز شکل بنتی ہو اس کی شرعاً تحدید ہے وہ ہے کام کرانے والے کی ضرورت اور کفایت کی رعایت، اور اس بنیاد پر اس کو اس کے مال و معیار کے مطابق متوسط معاوضہ دیا جائے جس میں نہ تو انتہائی تنگی سے کام لیا جائے کہ معاملہ تقصیر کی حد میں داخل ہو جائے اور نہ اتنی سخاوت سے کہ معاوضہ تعذیر کی حدوں کو بھی تجاوز کرنے لگے، فقہاء و محققین نے عامل زکوٰۃ کے حق میں اس کی وضاحت کے ساتھ تصریح کی ہے بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ جو شخص متوسط معاوضہ لے کر کام کرنے پر تیار ہو اسی سے کام لیا جائے یہ

لے کفایت المفتی ۳/ ۲۶۱/ ۲۶۹ ۴۴ معارف القرآن ۴/ ۳۹۸ بحوالہ احکام القرآن للجصاص والقروطی۔ اہم طبری نے اپنی تفسیر میں حضرت عمرؓ وغیرہ سے اسی کو نقل کیا ہے اور اسی کو ترجیح دی ہے، تفسیر طبری ۱۲/ ۱۱۱، الفقہ الاسلامی ۲/ ۸۷۱-۸۷۲ البتہ احناف کے یہاں یہ قید ہے کہ اگر عامل کی ضروریات نصف سے زائد کی متقاضی ہوں تو نصف سے زائد نہیں دیں گے۔ مشامی ۲/ ۵۹/ ۶۰۔ ۴۴ مشامی ۲/ ۶۰۔

(د)۔ جو لوگ سفراء کو عالمین زکوٰۃ کے تحت داخل مانتے ہیں ان کے قول پر زکوٰۃ کی آمد و خرچ کا صاب کرنے والوں کو صرف اس کام کا معاوضہ زکوٰۃ کی رقم سے دیا جاسکتا ہے، مثلاً مفتی کفایت اللہ صاحب کے فتویٰ کی روشنی میں، نیز اہل مدرسہ کو طلباء کا وکیل قرار دینے پر بھی درست ہے۔

(ه)۔ اور احتیاط اس میں ہے کہ جب چندہ کرنے والوں اور صاب لکھنے والوں کا کام زکوٰۃ کے علاوہ دوسری مدوں کی رقوم سے متعلق بھی ہوتا ہے اور یوں بھی عالمین زکوٰۃ میں واقعہ جو بات پائی جاتی ہے وہ یہاں نہیں پائی جاتی۔ زکوٰۃ کی رقم سے براہ راست ایسا کوئی کام کرنے والوں کو ان کے کام کا معاوضہ نہ دیا جائے۔

خلاصہ زکاۃ

ملک تمام سے کیا مراد ہے اپنے مملوکہ مال میں سب مرضی تصرف پر قرار ہونا۔

پیشگی ادا کردہ قیمت کی زکوٰۃ خریدار پر نہیں ہوگی، بلکہ فروخت کنندہ پر۔

غیر موصول مال تجارت

کی زکوٰۃ ملک تمام نہ ہونے کی بناء پر خریدار پر نہیں ہوگی۔ اور یہ کہ وہ قبضہ کے بغیر تصرف میں آزاد ہو۔

پیشگی کرایہ کی رقم کی زکوٰۃ مالک مکان و سامان پر ہوگی۔

ڈپازٹ کی رقم کی زکوٰۃ کرایہ دار پر ہوگی مگر رقم کے واپس ہونے کے بعد۔

مدارس وغیرہ کی املاک پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

مالِ مِصرام پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

دین کی زکوٰۃ

صرف دائن پر ہوگی اور دین کی واپسی کے بعد اگر اس کے علاوہ اس کے پاس نصاب ہے تو اس کے ساتھ ملا کر اور اگر دین ہی نصاب ہے تو عام قرض و تجارتی دین میں جو وصول ہو اس پر گزشتہ تمام سالوں کی زکوٰۃ ہوگی۔ اور بعض صورتوں میں تفصیل ہے۔

پراوڈٹ فنڈ کا حکم زکوٰۃ میں قرض کا ہے اور اس قسم میں شامل ہے جس میں زکوٰۃ وصولیابی کے بعد سال گزرنے پر ہوتی ہے۔ اگر کوئی دوسرا مال موجب زکوٰۃ موجود نہ ہو۔

شرط نمکا موجب زکوٰۃ کے لیے نمکا یعنی مال کی بڑھوتری ایک بنیادی شرط ہے خواہ یہ بڑھوتری اس لیے مانی جائے کہ مالک نے مال کے ساتھ ایسی صورت و نیت اختیار کر رکھی ہے، مثلاً تجارت یا یہ کہ وہ طبعی طور پر ایسی ہو کہ تجارت و معاملات کی روح ہو، جیسے سونا و پاندی وغیرہ۔

تیسری شرط حاجتِ اصلیه

حاجتِ اصلیه کا مطلب ہے آدمی کی سال بھر کی کھانے، پینے و پہننے، اوڑھنے، رہنے، پہننے کی واقعی ضروریات میں جو کچھ صرف ہو جائے یا اعتدال کے ساتھ جو کچھ صرف کرنے کے لیے طے کیا جائے اس میں اشخاص و ازمان کا اختلاف ہو سکتا ہے۔

کمپنی پر زکوٰۃ

شرکاء پر ہوگی، جب کہ ہر ایک کی ملک بقدر نصاب ہو یا ان پر جن کی ملک بقدر نصاب ہو، میرے اور جو اہرات اور ان جیسی چیزوں پر جب استعمال ہوں تو نمکا کی شرط کے

فقدان کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں ہے۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ جو بھی مال تجارت ہو خواہ زمین و مکان بشرط نصاب اس پر زکوٰۃ۔
اور ادا کیے گی کے دن کی مالیت اور قیمت کے حساب سے۔

شیر پر زکوٰۃ شیر کی مالیت پر زکوٰۃ ہے مگر اس حصہ پر جو تجارت میں معروف ہو اور
آج کے عرف میں یہ خود مال تجارت ہیں اس لیے اجمالی و مجموعی رقم پر بھی زکوٰۃ ہو سکتی ہے۔

باونڈس پر زکوٰۃ

اصل رقم پر ہوگی اور مال قرض پر زکوٰۃ کے ضابطہ کے تحت، اس لیے کہ یہ رقم قرض ہوتی ہے
سونے و چاندی میں اصل نصاب سونے و چاندی میں سے ہر ایک نصاب کے باب میں مستقل
ہے اور شارع نے دونوں کی استقلالات تعین کی ہے ایک کی دوسرے پر بنا کرتے ہوئے نہیں۔

طلباء کو ماہانہ وظیفہ

کی شکل میں زکوٰۃ ان کے جملہ مصارف کو جوڑ کر دی جا سکتی ہے۔

بہل مدرسہ کی وکالت

یوں تو سرمایہ داروں کی طرف سے مافی جاتی ہے مگر اکابر کی ایک جماعت طلباء کا وکیل مانتی ہے۔

حاصلین زکوٰۃ (سفراء مدارس)

الف۔ کو مفتی کفایت اللہ صاحب زکوٰۃ سے تنخواہ و معاونہ دینا جائز کہتے ہیں اگر اہل مدارس کو فقراء و
طلباء کا وکیل مان لیں تو دوسرے حضرات کے نزدیک درست ہے۔ ب۔ لیکن معاونہ متعین ہرگز
ہونا چاہیے۔ ج۔ معاونہ کی تعین میں کام کرنے والوں کی ضرورت کا اور محنت کا لحاظ کیا جائے (د)
گنہائش دینے والوں کے قول پر زکوٰۃ کا حساب کرنے والوں کو بھی زکوٰۃ سے تنخواہ دی جا سکتی ہے۔

سوالنامہ کا اجمالی جواب

انا، مولانا برہان الدین منبہلی، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۱۔ محورا اول

جیسا کہ معروف ہے "اسوال نامی" میں زکوٰۃ واجب ہوئی ہے۔

ملك تام: جس پر آزاد بالغ مالک (غیر سفید اور غیر محجور) کو شرعاً تصرف کا پورا اختیار ہو اور اس میں وہ کسی دوسرے کی اجازت کا محتاج نہ ہو، اگر اس کے قبضہ میں مال بالفعل نہیں ہے مگر اس پر قبضہ ہو جانا منظور ہو۔

ذیلی سوال کا جواب

جس مال (بیع) کی قیمت ادا کر دی گئی اور وہ مال (بیع) قبضہ میں نہیں آیا، اگر عقد تام ہونے کے بعد قیمت ادا کی گئی ہے تو اس مال (بیع) کی چاہے ابھی قبضہ میں نہ آیا ہو، زکوٰۃ مشتری پر لازم ہوگی (اگر وہ مال تجارت ہے) ادا کردہ قیمت کی زکوٰۃ اب مشتری پر لازم نہ ہوگی، کیوں کہ وہ قیمت مشتری کی ملکیت سے نکل گئی، البتہ اس قیمت کی زکوٰۃ بائع پر، جو کہ اب اس قیمت کا مالک بن چکا ہے، لازم ہوگی۔ (اگر وہ صاحب نصاب ہے اور حوالان حول ہو چکا ہے)۔

۲۔ اگر کرایہ دار کی طرف سے مالک مکان (یا دکان وغیرہ) کو دی گئی رقم بہ طور اجرت (کرایہ) دی گئی ہے تو اس رقم کی زکوٰۃ (اسباب و شرائط و وجوب پائے جانے کی صورت میں) مالک مکان (یا دکان) پر لازم ہوگی، لیکن اگر یہ رقم (کرایہ دار نے) بہ طور ضمانت دی ہے تو اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر لازم ہوگی (اسباب و شرائط و وجوب کی موجودگی میں) کیوں کہ اس رقم کی حیثیت یا قرض کی ہے (اگر تصرف کا اختیار دیدیا

ہے) یا امانت کی، دونوں صورتوں میں اس کی زکوٰۃ رقم دینے والے پر لازم ہوگی۔

۲۔ جس مال کا کوئی مالک معین نہ ہو، کی مثال میں مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم کو پیش کرنا محل نظر ہے۔ علاوہ ازیں شریعت میں اس کی نظیر لمنا ہی مشکل ہے (سوائے بیع بشرط اختیار کی شکل کے، وہ بھی مختلف فیہ ہے) کہ ایسا مال بھی ہوتا ہے جس کا کوئی مالک معین نہ ہو، لہذا یہ سوال ہی خود محل سوال ہے۔ (ہاں یہ ممکن ہے کہ مالک معلوم نہ ہو)۔ مدارس میں جمع کی جانے والی رقم پر مدارس کے ذمہ داروں کی ملکیت کا قائم ہو جانا (طلبہ مستحق زکوٰۃ کی نیابت میں) اکابر علماء کا راجح قول ہے جسے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اختیار کیا ہے اور حضرت تھانویؒ کا بعد میں مختار ہونا بھی بتایا ہے، حضرت گنگوہیؒ و حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ کا محقق قول ہونا تو معروف ہی ہے۔ لہذا اس رقم کی۔ جو کہ مدارس کے ذمہ داروں کے قبضہ کے اندر طلبہ مستحق زکوٰۃ کی ملکیت میں ہے۔ زکوٰۃ کسی پر بھی واجب نہ ہوگی۔

۳۔ مال حرام و حلال کے مخلوط ہو جانے کی شکل میں بھی۔ چوں کہ بقدر حرام کا تصدق واجب ہے اور اس کے بقدر گویا دین واجب فی الذمہ ہے۔ صرف حلال مال کی مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور کل حرام مال کے بقدر تصدق واجب ہوگا۔ (جیسا کہ شامی کی مصادرة السلطان وغیرہ والی بحث سے مستفاد ہوتا ہے)۔

۵۔ دین کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہوگی (جیسا کہ ظاہر ہے) اگر مدیون ادائے گی میں دسعت کے باوجود مال منہول کر رہا ہو تو گناہ گار ہوگا، مگر زکوٰۃ کی ادائے گی اس کے ذمہ نہ ہوگی۔ ہاں! اگر اس نے دین سے تجارت کے ذریعہ نفع حاصل کیا تو نفع کے بقدر مال کی زکوٰۃ (اسباب و شرائط کے ساتھ) مدیون پر واجب ہوگا۔ (جیسا کہ مال مستفاد کی)۔

دائن دین کی وصولیابی کی امید کی صورت میں ہر سال کی زکوٰۃ چلے ہر سال ادا کرے یا وصول ہونے پر تمام گذشتہ سالوں کی اکٹھی، دونوں شکلیں جائز ہیں، لیکن اگر مال وصول ہونے کی امید بالکل نہ ہو اور مال ضمائر کے مثل ہو، تو اس کا حکم مال ضمائر جیسا ہوگا۔

رٹائرمنٹ کے بعد پراویڈنٹ فنڈ کے وصول ہو جانے کی صورت میں ہی اس پر ملکیت آئے گی اس سے قبل نہیں، لہذا اس سے متعلق تمام مالی ذمہ داریاں — وجوب زکوٰۃ وغیرہ — بعد میں ہی متعلق ہوں گی، اس سے پہلے نہیں، اس لیے زکوٰۃ بھی وصولیابی کے بعد ہی واجب ہوگی، گزشتہ مدت کی واجب نہ ہوگی۔

دوسری شرط نصاب یعنی اضافہ کی صلاحیت

اس کی دو قسمیں ہیں۔ حقیقی و حکمی۔ حقیقی کی مثال مال تجارت، سوائم وغیرہ۔ حکمی کی مثال نقدین یا اس کے قائم مقام کرنسی (خواہ وہ کاغذ کی ہو یا دھات کی)۔

تیسری شرط حاجت اصلیت سے فارغ ہونا

حاجت کا مفہوم تو معروف ہے اور تمام متعلق کتابوں میں موجود ہے۔ کتب فقہ کے مطالعہ سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ ہر دور اور ہر ماحول کے اعتبار سے ان چیزوں کا تعین ہوگا جن پر حاجیات کا اطلاق ہو سکتا ہے اور کتب فقہ کی تفصیلات پیش نظر رکھنے سے حیثیت کے فرق سے بھی حاجیات کے مصداق میں فسخ ہونا مفہوم ہوتا ہے۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ رہنا

کون سا دین مال زکوٰۃ ہے؟ اس کا جواب عام کتب فقہ میں ملتا ہی ہے، سوالنامہ میں کوئی نئی بات نہیں دریافت کی گئی ہے اس لیے اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں معلوم ہوا — دین کی معروف تین قسموں — قوی، متوسط، ضعیف — میں سے پہلی دو قسمیں متفقہ طور پر مال زکوٰۃ ہیں۔

ہر دین قوی مال زکوٰۃ ہے خواہ وہ طویل المیعاد ہو یا قصیر المیعاد، خواہ قلیل مقدار میں ہو یا کثیر میں، اس لیے پورا قرض منہا کرنے کے بعد — خواہ وہ لاکھوں میں ہو اور اس کی ادائیگی طویل مدت میں کیا جانا پڑے — اگر بقدر نصاب کا مالک رہتا ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

کمپنیز زکوٰۃ: کمپنی میں شریک ہر فرد کی انفرادی حیثیت کا اعتبار ہوگا، جس شریک کا حصہ یا اس کی

ملکیت میں کل مال (نصاب زکوٰۃ کے بقدر ہوگا) اس پر زکوٰۃ - اپنے حصہ کے بقدر - واجب ہوگی اور جس کا حصہ (اور ملکیت میں کل مال) نصاب سے کم ہوگا اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

ہیرے جواہرات

اگر تجارت کے لیے نہیں ہیں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، خواہ ان کی مالیت کتنی ہی ہو، اور خواہ وہ انکم نکس (یا زکوٰۃ) سے بچنے کی غرض سے ہی خریدے گئے ہوں، البتہ ہیرے جواہرات حوائج اصلیہ میں سے نہ ہونے کی بنا پر۔ ان کے مالکین پر صدقہ فطر اور قربانی کا وجوب ہوگا (بشرطے کہ جواہرات کی قیمت بھر نصاب ہو) اور ان کے مالکین مدقات و امیہ کا مصرف نہیں ہوں گے۔ یہی حکم ان خواتین کے بارے میں بھی ہوگا جن کے پاس ہیرے جواہرات ہیں خواہ وہ توہین کے لیے ہوں یا کسی اور غرض سے (بس تجارتی مقصد سے نہ ہوں)۔

ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کا ذکر تمام کتب فقہیہ حنفیہ میں ملتا ہے، مثلاً شامی میں ہے:

”لا زکاة فی اللآلی والجواهر الا ان تکون للتجارة“ (۱)

اموال تجارت پر زکوٰۃ

صاحب نصاب تاجر حوالان حول کے وقت جتنے مال کا مالک ہے اور اس وقت اس کی ملکیت میں موجود مال تجارت کی جو قیمت ہے (یعنی اس مال کی جو قیمت اسے ملے گی) اس کے بقدر پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تاجر اگر تھوک فروش ہے تو تھوک کی قیمت کے بقدر، اگر خوردہ فروش ہے تو خوردہ قیمت کے بقدر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

وہ تجارتی مال خواہ منقول ہو یا غیر منقول (اراضی وغیرہ) سب کا حکم یکساں ہوگا۔ یعنی وہی جو اوپر مذکور ہوا، کہ حوالان حول کے وقت تاجر کو جو قیمت ملے گی اس کے بقدر پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

شیرزا اور انٹس کی زکوٰۃ

تجارتی کمپنیوں کے شیرز پر زکوٰۃ واجب ہوگی، کیوں کہ وہ شیرز دراصل علامت (یا سند) ہوتے ہیں اس مال کی جو کمپنی کی ملکیت میں — مال تجارت — ہے۔

شیرز کے مالک کے پاس حوالان حوال کے وقت موجود جو قیمت شیرز کی ہوگی اسی کے بقدر پر زکوٰۃ واجب ہوگی، جس شخص نے جو قرضہ کسی کو — خواہ حکومت کو — دیا ہے اصل قرضہ پر — نہ کہ سود پر — زکوٰۃ واجب ہوگی، قرضہ دینے والے پر ان تمام سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی جو قرضہ کی ادائیگی میں لگیں گے، اب چلے ہر سال زکوٰۃ ادا کرتا رہے یا تمام سالوں کی — وصولی قرضہ کے بعد — اکٹھا کر دے۔

محور ثانی:

چاندی سونے میں سے جو نصاب بھی انفع للفقراء ہو وہی اصل تسلیم کیا جائے گا۔

محور ثالث:

مصارف زکوٰۃ

۱۔ طالب علم پر آنے والے کل اخراجات (بشمول رہائش و تعلیمی فیس) کے بقدر اگر مد زکوٰۃ سے مدرسہ کے ذمہ دار، مستحق زکوٰۃ طالب علم کو رقم پہلے دے دیں اور پھر وہ ان سے وصول کر لیں تو یہ شکل جائز ہے۔ چیک سے ادائے گی کی شکل میں ادائے گی اس وقت بھی جائز ہے جب کہ چیک کی رقم طالب علم کو وصول ہو جائے، اگر اس کا بینک میں کھاتہ ہے تو اس کے کھاتہ میں اندراج ہو جائے اس کے بغیر نہ ہوگی۔

(بحوالہ) اوپر گزر چکا ہے کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ، حضرت سہارن پوری رحمہ اللہ، حضرت تھانوی رحمہ اللہ اور مولانا مفتی محمد شفیع رحمہم اللہ کا آخری نقطہ نظر یہ رہا ہے کہ مدرسہ کے ذمہ داران (مہتمم وغیرہ) طلبہ کے وکیل ہوتے ہیں، لہذا ان کا قبضہ طلبہ کے قبضہ کے قائم مقام ہے۔

۲۔ زکوٰۃ وصول کرنے پر — مدارس کے سفراء وغیرہ کو — کمیشن دینا شرعاً درست نہیں، انھیں العالمین علیہا کے تحت داخل کرنا بھی مشکل ہے، کیوں کہ العالمین کی تعریف یہ کی گئی ہے،

”ہو الذی یبعث الیہ الامام لأخذ الصدقات“ (احکام القرآن للبخاری ۴/۱۲۳)

جصاص رازی نے جبری وصولی کا حق بھی امام کے لیے اسی سے ثابت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مدارس کے ذمہ دار نہ امام ہیں اور نہ انہیں جبری وصولی کا حق ہے۔ مدارس کے منشی وغیرہ جو زکوٰۃ کی آمد و صرف کے حساب کے علاوہ دوسرے کام بھی انجام دیتے ہیں، ان کو زکوٰۃ کی مد سے تنخواہ دینا — شرعاً — درست نہیں۔

فی سبیل اللہ کا مصداق صرف وہ ہے جسے خیر القرون میں مصرف قرار دیا گیا یعنی اصطلاحی جہاد میں مشغول افراد، بقیہ اقوال ضعیف اور بعض — مثلاً سوالنامہ میں مذکور دوسرا دتیسرا — تو نہایت ضعیف ہیں۔ ایسے کمزور دلائل جیسے کہ ان اقوال کے قائلین نے دے دیے ہیں ان کی بنیاد پر تو ہر غلط کو صحیح ثابت کیا جاسکتا ہے، اس طرح پوری شریعت ہی کو نسخ کیا جاسکتا ہے۔ یوں بھی جہود کے قول ہی میں سلامتی ہے اور بغیر شدید مجبوری کے اس سے عدول جائز نہیں سمجھا گیا۔ قرونِ اولیٰ میں اگر کسی آیت کی تشریح میں صرف دو قول پائے جاتے ہوں تو تیسرے قول کا اختیار کرنا درست نہیں، کیوں کہ یہ بھی ایک طرح کا خرقِ بطلان ہے (جسے اصولیین نے "لا قائل بالفصل" جیسی تعبیرات میں بیان کیا ہے) اور پھر اس طریقہ سے تو ہر غلط بات کو صحیح قرار دینے بلکہ ہر خواہش کے لیے سند دریافت کرنے کا دروازہ کھل جائے گا۔

الف۔ فی سبیل اللہ کا مصداق اصلاً تو غازی ہے، زیادہ سے زیادہ منقطع الحجاج (امام محمد رحمہ اللہ کے قول کی رو سے بھی شامل کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ اس کی شمولیت پر احادیث صحیحہ دال ہیں) جن کا ذکر سوالنامہ میں بھی ہے۔

ب۔ احناف کے نقطہ نظر سے ہر مصرف کے لیے (سوائے "العالمین علیہا" کے) فقر شرط ہے۔
 ۵۔ مصارف زکوٰۃ بھی — رکعاتِ صلوٰۃ کی طرح — قیاس کا محل نہیں۔ ظاہر ہے کہ فکری و قلمی جہاد نئی تعبیر میں ہیں، بنا بریں جہادِ قلمی و فکری فی سبیل اللہ کا مصداق نہیں بن سکتے اور ان میں مشغول لوگ (اگر وہ محتاج نہیں ہیں) مستحق زکوٰۃ نہیں۔

زکوٰۃ کے مصارف آٹھ ہی میں منحصر ہیں اور یہ حصہ اضافی نہیں حقیقی ہے کسی بڑے سے عالم — حتیٰ کہ صحابہ کے — تفردات اور شاذ اقوال پر مدار رکھنا سلف کے طریقہ کے خلاف ہونے کے ساتھ نہایت خطرناک اقدام ہے، جس سے بہت سی بے راہ رویوں — بلکہ گمراہیوں — کے لیے راستہ کھل سکتا ہے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ کا یہ قول "من أخذ بنواہل الإسلام خرج عن الإسلام قابل توجہ ہے:

سوالنامہ کا جواب

انہا — حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب، دارالعلوم دیوبند

الجواب وبالله التوفیق

زکوٰۃ ال نامی میں واجب ہوتی ہے، خواہ نامی بالذات ہو یا نامی بالفرع، اپنے قیود و شروط سے اس میں وجوب زکوٰۃ کا حکم ہے۔

پہلی شرط مملوک بہ ملک تام ہونا ہے، اور ملک تام سے وہ ملک مراد ہے جو مملوک پر بیاد و رقبہ دونوں طرح سے حاصل ہو، اور ملک رقبہ سے مراد خرید و فروخت کا مالک ہونا ہے۔ اور ملک بیاد سے مراد اپنے قبضہ و تصرف میں ہونا ہے۔

جواب (۱) ان مذکورہ دونوں صورتوں میں ادا۔ گئی زکوٰۃ واجب نہیں، اس لیے کہ ان صورتوں میں شئی مشترکہ پر ابھی ملک نہ تو رقبہ حاصل ہے اور نہ بیاد حاصل ہے، بہت سے بہت وعدہ تملیک ہے اور محض اس میں وجوب زکوٰۃ مستحق نہیں ہوتا۔

(۲) صرف کرایہ دار پر واجب ہوئی۔

(۳) ان اداروں و مدارس سے مراد اگر دینی تعلیم کے لوہارے و مدارس ہیں تو ان میں دینی تعلیم کے

لیے آئی ہوئی رقوم پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اس مسئلہ کی تفصیل و مدلل بحث متنبات نظام الفتاویٰ میں بہ زیر عنوان (مدارس میں آئی ہوئی رقوم کا شرعی حکم) آہکی ہے، وہاں

دیکھی جاسکتی ہے۔

(۴) جب کوئی حرام مال اپنی ملک میں آجائے تو چوں کہ یہ مال مملوکہ بہ ملک خبیث ہوگا اس لیے اس کا پہلا حکم یہ ہے کہ اس کو حسب ضابطہ شرع مالک تک پہنچا دے یعنی رد الی رب المال کر دیا جائے، جیسا کہ مذہبی کتب کی ان عبارتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً:

(الف) اذا علم المالك بعينه فلا شك في حرمة ووجوب رده عليه (ای علی لب المال) (۱)

(ب) واما اذا كان عند رجل مال خبيث (حرام) فاما اذا ملكه بعقد فاسد او حصل له بغير عقد ولا؛ كنه ان يردّه الى مالكه ويريد ان يدفع مظلّمته عن نفسه فليس له حيلة الا ان يدفعه الى الفقراء لانه لو اتفق على نفسه فقد استحکم ما ارتكبه من الفعل الحرام (ای قوله) ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه يدل مسائل اللقطة (۲)

(ج) ويبرأ بردها ولو يغير علم المالك وفي البزازية غصب دراهم انسان من كيه ثم ردها فيه بلا علمه برئ وكذا (برئ) لو سلمه اليه بجهة أخرى كهبة او ايداع (ولم يردّه) او شراء وكذا لو اطمعه فاكله (۳) وتحت قول رد المختار الشامي - وفيه جاء بما غصبه فلم يقبله مالک

فحمله الفاصب الى بيته برئ ولم يضمن (۴)

پھر چونکہ جائے اس کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے مسلم غریب و مساکین کو تمليگادے کر جلد سے جلد اپنی ملک سے نکال دیا جائے ہاں اس کو اگر رد الی رب المال کرنے میں کوئی شرعی یا قانونی رکاوٹ حائل ہو، مثلاً آج کل ہندوستان کے حکومتی یا نیشنل بینکوں سے سود میں ملنے والی رقوم کو اگر بینکوں ہی میں چھوڑ دیں تاکہ رد الی رب المال ہو جائے تو اگر اسباب بینک اس کو اپنے دھرم کھاتے میں ڈال دیں تو عموماً

(۱) ۱۳/۴ (۲) بذل المحجور ۳۷۱ (۳) درمختار علی هامش الشامي

نعمانی ۱۱۶/۵ (۴) شامی من کتاب الغصب ۱۱۶/۵

ایسے کاموں میں استعمال ہوں گی جس سے اسلام اور مسلمانوں کے نقصان کا غالب اندیشہ ہے اس لیے حکم شرعی یہ دیا جاتا ہے کہ وہاں نہ چھوڑ دے بلکہ وہاں سے نکال کر خود کسی مناسب سبیل سے رد الی رب المال کر دے۔ کما اشترت الیہ بقولی۔ یا کوئی اور واقعاتی پریشانی حائل ہو مثلاً کوئی جانی یا مالی پریشانی یا عزت نفس کی یا مالی کا قوی اندیشہ وغیرہ ہو تو اس طرح رد الی رب المال کر دے کہ مالک کو معلوم بھی نہ ہو اور وہ مال اس کی ملک میں پہنچ جائے اس کے فٹائر کتب فقہ میں بکثرت ملتے ہیں۔ کما ترائنا ایضاً۔ نیز اس کی تفصیل اور اس کا حکم شرعی ہندوستان کے ان بینکوں سے ملنے والی سودی رقم کا رد الی رب المال کے سلسلہ میں منجبات نظام الفتاویٰ کے درجہ میں احکام حوادث الفتاویٰ ملتا ہے کہ ان بینکوں سے ملنے والی سودی رقم کو بینک میں نہ چھوڑے بلکہ وہاں سے نکال کر خود پہلے حکومت کے غیر شرعی مطالبات میں جو واجب الادا ہے دے دے مثلاً روڈ ٹیکس، اؤس ٹیکس، کورٹ فیس وغیرہ۔ پانی یا بجلی کے مطالبہ میں نہ دے کیوں کہ وہ عقود مبادلہ کا ایک بدل ہے جو شرعاً بھی درست ہے۔

ایک شبہ

بعض حضرات شبہ یہ کرتے ہیں کہ بینک سے ملنے والی سودی رقم کا مالک حکومت کب ہوتی ہے کہ اس کو رد کیا جائے بلکہ ان رقم کا مالک تو بینک میں رقم جمع کرنے والے ہوتے ہیں، پس اگر رد کرنا ہی ہے تو ان کی طرف رد کیا جائے۔

شبہ کا ازالہ

جواب یہ ہے کہ بینک میں جو رقم رکھی جاتی ہے وہاں کو کسی قانونی مجبوری سے یا محض بغرض حفاظت داخل کی جاتی ہے، کسی عوض لینے کی نیت سے جمع کرنا درست ہی نہیں ہے، اسی لیے فلکس ڈپازٹ میں جمع کرنا ممنوع و ناجائز ہوتا ہے۔

اور جو رقم محض حفاظت کے لیے جمع کی جائے گی وہ بینک میں بعینہ امانت ہوگی اور اس پر بینک کا کئی تصرف کرنا شرعاً جائز نہ ہوگا اور جب ان داخل شدہ رقم کو بینک خلط ملط کر دے یا اس کو اپنے کام میں صرف کر دے تو وہ امانت شرعاً قرض بن جاتی ہے اور امانت کا معاملہ مبدل بہ معاملہ قرض ہو کر مستقرض مالک

ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ اس پر ضمان (واجب الاداء) ہو جاتا ہے۔ پس شرعی ضابطہ کے مطابق شرعاً بینک مقروض ہو کر اپنے ان تصرفات کی وجہ سے ان رقوم کا خود مالک ہو گیا، اور بینک حکومتی یا نیشنل ہو جانے کی وجہ سے حقیقتہً حکومت ان رقوم کی مالک ہو گئی اور یہ علم بینک حکومت کے محض نمائندہ اور وکیل ہوں گے، لہذا ان رقوم کا رد کرنا حکومت کی جانب لازم ہو گا نہ کہ رد کرنا جمع کرنے والوں کی طرف۔ کما لا یخفی علی من لد خیرۃ بالغتہ والامول۔
 رہ گئی یہ بات کہ اگر حرام مال حلال مال میں اس طرح مخلوط ہو جائے کہ اس میں تمیز و امتیاز مشکل و مستعذر ہو جائے تو اس میں وجوب زکوٰۃ کا کیا حکم ہو گا؟

اس میں شرعی حکم یہ ہے کہ کاغذات و اندراجات کے حساب و کتاب کے ذریعہ یا پھر اپنی یادداشت سے خوب غور و خوض سے جتنی مقدار حلال مال کی متعین ہو اس کی تو زکوٰۃ حسب ضابطہ شرع ادا کر دے اور اس سے زائد کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے بجائے زکوٰۃ ادا کرنے کے کل مال حرام بقسط واحد اگر قدرت میں ہو، ورنہ باقسط متعددہ حسب استطاعت جہاں تک جلد ہو سکے بطور تصدق فقراء و مساکین کو دے کر اپنی ملک سے نکال دے۔ فقط۔

سوال (۵) کا شرعی حکم: دین کی زکوٰۃ ادا کرنا دائن پر واجب ہے جس کی ملک وہ ہے اور حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگرچہ دین کی تین قسمیں ہیں، دین قوی، دین متوسط اور دین ضعیف اور ہر ایک کے احکام الگ الگ ہیں، مگر تسہیلاً للعلل اور انفع للفقراء ہونے کے پیش نظر راجح قول میں جتنی مقدار جس وقت وصول ہوتی جائے اسی وقت اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کرنا چاہیے اور اگرچہ دین قوی و غیر قوی کے اعتبار سے نفس وجوب میں کچھ تفصیل و اختلاف ہے مگر اس طریقہ عمل سے عمل کرنے میں کسی کے نزدیک وجہ اختلاف نہ رہے گی۔

سوال (۶) کا شرعی حکم: یہ ہے کہ ملازم کی تنخواہ سے جو جزو تنخواہ ملازم کے قبضہ میں جانے سے قبل محکمہ وضع کرتا ہے اور بعد ختم ملازمت وضع کی ہوئی رقم میں اضافہ کر کے رہتا ہے خواہ سود کے نام سے دے، مگر وہ زیادتی شرعاً سود نہیں ہوتی خواہ دوران ملازمت میں ملازم اپنے ہی جمع کردہ روپیہ سے کچھ روپیہ لے اور محکمہ اس کو قرض کے نام سے دے اور اس پر کچھ زائد رقم سود کے نام سے وصول کر کے اس ملازم کے فنڈ میں جمع کرے اس پر بھی شرعاً سود کی تعریف صادق نہ آنے سے سود کا حکم نہ ہو گا بلکہ اس کو محکمہ کا انعام قرار دیا جاتا ہے۔ کما حقہ العلامة السہانوی فی فتاواہ۔

کیوں کہ اپنے مملوک مال میں جب عقد معاوضہ کا معاملہ کرے تو فضل ربوا اور سود ہوتا ہے اور یہاں جو جزا تنخواہ کاٹی گئی ہے ابھی اس میں اجیر (ملازم) کا صرف استحقاق ملک ثابت ہوتا ہے اور استحقاق ملک دوسری چیز ہے اور تحقق ملک دوسری چیز ہے۔ اور تحقق ملک تو قبضہ کرنے کے بعد صادق آئے گی اور تحقق ملک سے قبل مملوک ہونا صحیح نہیں لہذا اس تحقق ملک سے قبل جتنا بھی دیں گے وہ بجائے سود ہونے کے شرعاً صرف انعام قرار پائے گا اور ملازم کا اس پر اپنے مملوک کی طرح تصرف کرنا درست رہے گا۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زکوٰۃ تو اپنے مملوک مال میں واجب ہوتی ہے لہذا قبضہ میں آنے سے قبل اس پر ای صاحب فطر پر زکوٰۃ کی ادائے گی کا وجوب بھی نہ ہوگا کیوں کہ شرعیہ اصول مسلم ہے کہ سبب وجوب کے تحقق سے پہلے نفس وجوب بھی نہیں ہوتا جیسا کہ زکوٰۃ کے وجوب کا سبب مقدار نصاب کا مالک ہونا ہے اور جب تک مقدار نصاب کا مالک نہیں ہوتا اس وقت تک نفس وجوب زکوٰۃ کا حکم بھی نہیں ہوتا۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وصول ہونے کے بعد سابق زمانہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگی، جیسا کہ مالک نصاب ہونا جو نفس وجوب زکوٰۃ کا سبب ہے۔ ۱۔ نفس وجوب سے قبل کوئی ادا کرے تو زکوٰۃ کی ادائے گی صحیح شمار نہ ہوگی جس طرح کسی معین وقت کی فرض نماز کے نفس وجوب کا سبب اس فرض کے وقت کا تحقق ہوتا ہے اور اس سبب (وقت نماز) کے تحقق سے قبل قبل فرض ادا کر دے تو فرض ادا نہ ہوگا، ہاں نفس وجوب کے تحقق ہو جانے کے بعد جب بھی ادا کرے تو ادائے گی صحیح ہوگی۔ اسی طرح یہاں بھی ایسا ہی ہوگا کہ نفس وجوب زکوٰۃ جب تک اس رقم کے پانے والے پر یعنی مقدار نصاب ملک ثابت ہونے پر ادائے گی زکوٰۃ بھی درست ہوگی ورنہ صحیح نہ ہوگی۔ پھر نفس وجوب کے تحقق کے بعد اگرچہ تو پیشگی ادائے گی بھی صحیح ہو سکے گی۔ فقط

رہ گئی یہ بات کہ زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے شرط ہے کہ نصاب زکوٰۃ کی مقدار ایسے مال نامی کا ملک ہو جو اس کی حاجت اصل سے اور بار دین سے فارغ ہو۔ لہذا ان تینوں (مال نامی کی اور حاجت اصل سے اور دین سے فارغ ہونے کی) متشرع تشریح کر دی جاتی ہے۔

مال نامی : مال نامی چند قسم پر ہوتے ہیں۔

(الف) خلق مال نامی ہونا جس کو اللہ نے پیدا ہی فرمایا نمو کے لیے جیسے سونا چاندی اور اس سے بنی ہوئی ہر وہ چیز خواہ زیور ہو یا اس کے علاوہ کوئی چیز ہو۔ اور چاندی یا سونے کا سکہ جیسے دینار و دھم

اشرفی یا چاندی کا روپیہ، اور اصطلاح میں اس کو سکہ نافقہ خلقیہ کہتے ہیں۔

(ب) وہ چیزیں جن کو اللہ نے نموکے لیے نہیں پیدا فرمایا ہے بلکہ لوگوں نے اس کو مال نامی کے قائم مقام قرار دے دیا ہے اور سونے چاندی کے علاوہ جاری سکے قرار دے دیا ہے جیسے غیر چاندی کا پیسہ روپیہ اور کاغذی نوٹ، پونڈ، ڈالر، ریال وغیرہ۔ اس کو اصطلاح میں سکہ نافقہ غیر خلقیہ کہتے ہیں۔

(ج) وہ مال جس کی تجارت کرتے ہیں۔

یہ تینوں قسمیں مال نامی کی ہیں؛ اول نامی خلقیہ، دوسری نامی حکماء و عرفاء، تیسری نامی عملاً۔

جب یہ تینوں باتوں میں سے کوئی ایک نصاب کی مقدار کے برابر ملک میں آجائے اور حاجت اصلہ سے اور بار دین سے فارغ ہو جائے تو نفس زکوٰۃ کا وجوب ہو جائے گا اور حاجت اصلہ سے وہ جائے مراد میں جو اپنے ذمہ میں داخل شدہ اہل و عیال کی روزمرہ کی ضروریات سے فاضل ہو کر سال بھر فاضل رہ جائے۔ اسی طرح دین سے فارغ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کی ضرورت سے جو دین لیا جائے اس سے فارغ ہو۔ اتنے مال کا نفس مالک ہو جانے سے زکوٰۃ کا نفس وجوب ہو جائے گا۔ اور جب اتنی مقدار پورے سال بھر مذکورہ ضروریات سے فارغ رہ جائے تو اس کے زکوٰۃ کی ادائیگی بھی واجب ہو جائے گی۔ البتہ بے ضرورت واقعی قرض لینا ممنوع ہے، کیوں کہ اصل یہ ہے کہ ہر انسان ہر ذمہ سے بری رہے اور جب ضرورت واقعی ہو تو قرض لینا درست رہے گا۔ اگر غیر سودی قرض نہ ملے تو حاجت شدیدہ میں سودی قرض لینا یا سودی معاملہ کر لینا بھی جائز ہو جاتا ہے جیسا کہ،

”ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (الاستباہ والنظر)“

کے جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کی مزید تشریح آئندہ آجائے گی۔

ہاں اس ضمن میں ایک یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ صاحب خود تو مقرض یا دین میں دبا ہوا نہیں ہیں بلکہ اپنی ملکیت اور سامان تجارت کے بعد قرض و دین دوسروں کو دے دیا ہے تو اس کا کیا حکم ہوگا۔ کیا ادائے زکوٰۃ میں یہ دینا تو حائل تو نہ ہوگا اگر ہوگا تو اس میں کیا تفصیل ہے۔ اس کو بعد ضرورت ہم پہلے ذکر کرتے ہیں اور وہ عمل کرنے کے لیے کافی ہے اس لیے اب اس پر مزید لکھنے کی حاجت نہیں۔

هذا ما تيسر لي الآن والباقي سيأتى على حسب الاستطاعة

فقط واللہ اعلم

سوالات ملبومہ کے صفحہ ۲ کے پچھلے حصہ میں طویل الاجل دین کی گفتگو ہے۔ اس دین کا حاصل تجارتی دین ہے۔ اس دین کو انسان خواہ قانونی مجبوری یا محض اپنے خالص اختیار سے کاروبار کرنے یا پھلانے کے لیے حاصل کرتا ہے، حاجتِ اصلہ کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی کما مثر انعام من تعریف الحاجتِ اصلہ۔ لہذا یہ قرض و وجوب زکوٰۃ کا حکم عائد ہونے میں مانع نہ ہوگا، بلکہ وہ حاجتِ اصلہ کی شرعی سابق تعریف میں قرض کی معنی مقدار حائل ہوگی اس کے وضع کرنے کے بعد باقی سب پر وجوب زکوٰۃ کا حکم عائد ہوگا۔

کمپنیوں کی حقیقت شرعیہ پہلے معلوم ہونی چاہیے پھر حکم شرعی لگانا چاہیے۔ کمپنیوں کی حقیقت شرعیہ اولاً شرکت عنان کی ہوتی ہے اور شیر ذر خریدنے والے سب شرکاء کمپنی اور شرعاً مالک ہوتے ہیں اور عملہ کمپنی یعنی کمپنی میں کام کرنے والے وکیل وہ مسئول ہوتے ہیں، مگر یہ لوگ بمقدار قانون وقت خود مالک بن جاتے ہیں، اور اس میں جمع شدہ حصص میں کچھ مقدار اپنا یا کمپنی کی بناءت (پونجی) قرار دیتے ہیں اور کچھ کو فرنیچر و آلات مشین وغیرہ میں شمار کرتے ہیں اور کچھ کو کاروبار میں لگاتے ہیں، ان سب واقعاتی امور میں بھی وہ شرعاً غصب ہی شمار ہوگا اور اس پر غصب ہی کے احکام جاری ہوں گے۔ اور ایمرِ مسلم ہے کہ شئی مغضوب پر جب تک مغضوب بعینہ یا اس کا بدل وصول نہ ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ کا وجوب یا رد کے احکام شرعاً درست نہیں ہوتے۔ اس لیے کمپنیوں کے ان حصوں کو جب تک بیع کر نقد نہ کر لیا جائے اس پر وجوب زکوٰۃ کا حکم متوجہ نہ ہوگا۔

ہمیرے جواہرات کی خرید و فروخت کا جب کاروبار کریں تو اموال تجارت میں ان کا شمار ہو کر سال پورا ہونے پر اس کا عام کاروبار کرنے والوں کے یہاں اس کی جو قیمت ہوگی اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں دینا ہوگا، اور اگر کاروبار نہیں کرتا ہے تو واجب نہ ہوگی۔ البتہ اگر زکوٰۃ سے بچنے کے لیے ایسا کرتا ہے تو سخت خطرناک جرم ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی وبال میں غیر شعوری طور پر سب ہلاک ہو جائے کہ یہ عمل ایک قسم کی نافرمانی کا اور شائبہ گستاخی کا درجہ ہو سکتا ہے۔

”واشار الیہ قولہ تعالیٰ: لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی

ولا تجہروا له بالقول کجہر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم

وانتم لاتشعرون۔

ہاں اگر وجوب زکوٰۃ کو ساقط کرنے کی نیت نہ ہو بلکہ محض تزئین و آرائش کے لیے ہو جیسا کہ عورتیں رکھتی ہیں یا کسی حادثہ یا چانک ضرورت پر کام آجانے کے لیے اپنے پاس رکھتے ہوں تو اس کی گنہائش

ہوگی۔ بالکل یہی حکم ارامنی کے خرب و فروخت و کاروبار کرنے کا ہوگا۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

اس میں یہ حکم ہے کہ تھوک یا پھٹکر جس طرح بیچیں اس کی عام قیمت فروخت کے وقت جو ہوگی اس کا اعتبار ہوگا۔ شیر و بونڈس کے فروخت کے وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ اس سوال کے بقیہ اجزاء کا جواب ادھر گزر چکا۔

محور ثانی کا حکم

اگر کسی کے پاس محض سونا ہے اور مال تجارت وغیرہ کچھ نہیں تو معیار و جوب زکوٰۃ محض سونے کے نصاب کا ہوگا۔ اور اگر محض چاندی ہے اور کوئی اور مال زکوٰۃ کی قسم کا نہیں ہے تو معیار و جوب زکوٰۃ محض چاندی کے نصاب کی قیمت کا ہوگا۔ اور اگر سونا چاندی دونوں ہیں تو جس طرح ان میں سے کسی کے ساتھ اموال تجارت ملنے سے جس نصاب کی قیمت پہلے آکر و جوب زکوٰۃ متوجہ ہو جاتا ہے اسی طرح یہاں بھی حکم ہے۔ اور سونے چاندی کی قیمت میں اگرچہ زمین آسمان کا فرق ہو جائے یہ حکم نہ بدلے گا، کیوں کہ یہ حکم خالق آسمان و زمین ہی کا ہے۔

مصارف زکوٰۃ

(۱) الف۔ محض مسلم غریب، مساکین ہیں اور ان میں طالبان علوم دینیہ کو جو مصرف زکوٰۃ ہیں عموماً ترجیح و تقدیم ہوتی ہے اس لیے کہ ان کو دینے میں دو چند ثواب ہو جاتا ہے اور مہتمم مدرسہ جس طرح زکوٰۃ دہندہ کا وکیل ہوتا ہے اسی طرح مستحقین زکوٰۃ کا بھی وکیل ہوتا ہے۔ اور مالک کسی جانب کا نہیں ہوتا اس لیے اس کا کوئی عمل منافی شرع کے خلاف درست نہیں ہوگا۔

(۲) ب۔ بانڈز وغیرہ کی زکوٰۃ کا حکم پہلے گزر چکا ہے۔ البتہ حکومتیں یا کمپنیاں جو لوگوں سے قرض لیتی ہیں اگر ان سے زبردستی لیتی ہے تو اس کی حقیقت قرض کی نہیں ہوگی کہ اس پر ملنے والی زیادتی سود ہوگی، بلکہ زیادتی کا حکم پراڈیڈٹ فنڈ کے یا انعام وغیرہ کا ہوگا، جس کا لینا اپنے جائز مال کی طرح

خرچ کرنا جائز ہے، ہاں اگر زبردستی نہ لیں بلکہ لوگوں کی مرضی و خوشی سے لیں تو یہ لینا اور اس کے عوض میں زیادہ دینا سود شمار ہوگا اور اس کو ان کے دہاں چھوڑنا جائز نہ رہے گا بلکہ ان سے لے کر عزا و مساکین میں صدقہ کر دینا چاہئے۔
محور ثانی کا حکم شرع یہاں گزر چکا۔

محور ثالث

الف ۱۔ یہ معاملہ شرعاً عادلانہ گی زکوٰۃ سے بری ہونے کے لیے کافی نہیں۔ اور محور ثالث (۲-ب) اس کی ساری گفتگو نا تجربہ کاری اور شرعی اصول سے ناواقفیت سے ناشی ہوگی۔ اس کی جائز اور مذکورہ خطرات سے محفوظ صورت یہ ہو سکتی ہے کہ سفرا کو بالمقطع تنخواہ مقرر کیا جائے، پھر ان کو جس علاقہ میں بغرض وصول چندہ بھیجا جائے اور اس علاقہ کی عام چندہ کا اندازہ کر کے اس طرح کہا جائے کہ آپ تمام وصول کردہ رقم مدرسہ کے خزانہ میں بھیجتے جائیں اور جب آپ سفر پورا کر کے واپس آئیں گے تو آپ کی تمام وصولی اس مذکورہ رقم سے جمنی زائد ہوگی اس کا اتنا فی صد آپ کو بطور انعام دیا جائے گا۔ اسی طرح مدرسہ کے لیے پیش از بیش رقم وصول کرنے کا شوق پیدا ہو کر خرچ کے اوسط کا زیادہ ہونا اور آمد کے کم ہونے کا خطرہ نہیں رہے گا۔ رہ گیا دیگر ملازمین کی تنخواہ تو اولاً اس کو عطیہ کی رقم سے دیا جائے گا اور اگر کم پڑے تو تملیک مستحق کے حیلہ سے دیا جائے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اور ملازمت مندرست سے زائد شعبوں کی قائم نہ کیا جائے کہ ملازم مدرسہ پر بار اور ان ملازمین وغیرہ کو عاملین علیہا کے تحت کرنے کی حاجت بھی نہ رہے گی۔

زکوٰۃ فی سبیل اللہ

اس میں شک نہیں کہ جناب نے اس سلسلہ میں بے انتہا محنت فرمائی ہے کہ تقریباً ہر مکتب فکر کی رائیں مع ان کے دلائل بھی بیان فرمادیا ہے۔ آپ کی چھان بین ذاتی کاوش ہے۔ فجزاکم اللہ۔

سوالات کے جوابات

از: — مولانا نعمت اللہ قاسمی، دارالعلوم، دہلی

ملک تام

(۱) ملک تام سے مراد جو رقبہ ویداً مملوک ہو۔

هو ما اجتمع فيه الملك والييد اما اذا وجد الملك دون الييد كالصدق
قبل القبض او وجد الييد دون الملك كملك المكاتب والمديون
لا تجب فيه الزكاة كذا في السراج الوهاج ۱

لان المراد بالتام المملوك رقبه ويدا ۲ — فلا زكاة على

مكاتب لعدم الملك التام اى لعدم اليد فى حق السيد وعدم

ملك الرقبة فى حق المكاتب ۳

(۲) جس مال تجارت کی قیمت ادا کر دی گئی ہے، مگر اب تک قبضہ نہیں ہوا، قبل القبض زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

ولا فيما اشتراه لتجارة قبل قبضه۔

اور قبضہ کرنے کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے یا نہیں تو اس میں اختلاف ہے۔ (۱)
 واما المبيع قبل القبض فقیل لا یكون نصاباً والصحيح ان یكون
 نصاباً کذا فی المحيط للرخسی۔
 اور صاحب بحر نے بھی لکھا ہے کہ سنین ماضیہ کی بعد القبض زکوٰۃ ادا کرے گا۔

ذكر فی المحيط فی بیان اقسام الدین ان المبيع قبل القبض
 قیل لا یكون نصاباً لان الملك فیه ناقص بافتقار الید والصحيح انه
 نصاباً لانه عوض مال وقد امکنه احتواء الید علی العوض فتعتبر
 یدہ باقیة علی النصاب باعتبار التمكن شرعاً فعلى هذا قولهم
 لاتجب الزکوۃ معناه قبل قبضه واما بعد قبضه فتجب الزکوۃ
 فی ما مضی كالدين القوی: (۲)

مگر علامہ شامی نے لکھا ہے کہ قاضی خاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر شین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب
 نہیں ہوگی۔

اما بعده فیزکیہ عما مضی کما فہمہ فی البحر عن عبارة المحيط
 فراجعہ لکن فی الخانیة رجل له سائمة اشتراها رجل للسیامة
 ولم یقبضها حتی حال الحول ثم قبضها لازکوۃ علی المشتري
 فیما مضی لانها كانت مضمونة علی البائع بالثمن ومقتضى التعلیل

عدم الفرق بین ما اشتراها للسیامة او للتجارة فتأمل۔ (۳)

(۳) اور بائع نے ثمن پر قبضہ کیا ہے وہ مالک ہو گیا لہذا اس کی زکوٰۃ بائع پر ہے نہ کہ مشتری پر۔

وفی الخانیة: اشتری عبداً للتجارة یساوی ما فی درهم وفقد الثمن ولم یقبض
 العبد حتی حال الحول فعات العبد عند البائع کان علی بائع العبد
 زکوۃ المأتین فلانہ ملک الثمن ولا زکوۃ علی المشتري لان الثمن

زال عن ملكه إلى البائع: (۱)

(۴) کرایہ پردی گئی پیشگی رقم، اس رقم کا مالک، مالک مکان ہو گیا لہذا اس کے ذمہ ہی زکوٰۃ

واجب ہوگی۔ ”إذا عجل الاجرة لا يملك الاسترداد“ (۲)

اور علامہ شامی نے آگے تفصیل سے ذکر کیا ہے:

”وذكر الشيخ الامام ابو بكر محمد بن الفضل البخاري ان

الزكاة في الاجارة الطويلة التي تعارفها اهل بخاري ان الزكاة

في الاجرة المعجلة تجب على الاجر لانه ملكه قبل الفسخ وان

كان يلحقه دين بعد الحول بالفسخ -

ڈپوزٹ کی رقم پر زکوٰۃ

اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر ہوگی اس لیے کہ وہ بہ طور قرض کے دیے ہوتے ہیں۔

”الدين القوي كقرض قلت الظاهر ان منه مال المرصد المشهور

في ديارنا لانه اذا انفق المستاجر لدار الوقف على عمارتها الضرورية

بامر القاضي للضرورة الداعية اليه يكون بمنزلة استقرار من

المتولى من المستاجر“ (۳)

(۵) مدارس میں جمع رقم پر زکوٰۃ نہیں ہے:

”وسبب افتراضها ملك نصاب فلا زكاة في سواهم الوقف

والخيل المسبلة لعدم الملك“

(۶) مال مخلوط میں مال حرام کی مقدار نکالنے پر بہ قدر نصاب پتا ہے تو اس باقی مقدار میں زکوٰۃ ہے:

”ولو خلط السلطان المال المغصوب بعالمه ملكه فتجب للزكاة فيه

هذا اذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط وفي الفصل العاشر

من التتارخانیہ عن فتاویٰ الحجة من ملك اموالا غیر طيبة
او غصب اموالا و خلطها ملکها بالخلط و یصیر منامنا وان لم یکن له
سواها نصاب فلا زکوة فیه علیها لانه مدیون و مال المدیون لا ینعقد
سببا لوجوب الزکوة عندنا فاناد بقوله وان لم یکن له سواها نصاب
ان وجوب الزکوة مفیه لما اذا کان له نصاب سواها» (۱)

دین کی زکوٰۃ کس پر

دین کی زکوٰۃ دائن پر ہوگی، مدیون پر کسی حال میں بھی نہ ہوگی۔
وصول یابی اور عدم وصول یابی کے اعتبار سے دین کے اقسام۔
جس کا مدیون اقرار کرتا ہو۔ (۱)

(۲) جس کا مدیون انکار کرتا ہو، مگر دائن کے پاس شہادت موجود ہے۔

(۳) مدیون انکار کرتا ہے اور دائن کے پاس شہادت موجود نہیں ہے۔

ان تینوں صورتوں میں مدیون کے اندر دین کی ادائیگی کی استطاعت ہے یا استطاعت
نہیں ہے اور معسر ہے، ابتداءً علماء احناف صرف اس دین کو جس کا مدیون انکار کرتا ہے اور
کوئی شہادت بھی دائن کے پاس نہیں ہے اس کو مال منار کے حکم میں کہتے تھے، مگر حالات کی
تبدیلی سے اس کو بھی مال منار کے حکم میں کہنے لگے جس پر شہادت موجود ہو، اس لیے کہ عدالت
کے ذریعہ قرضہ وصول کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے اس کے بعد حالات میں اور زیادہ تبدیلی آئی کہ
آدمی اقرار بھی کرتا ہے اور دین کی ادائیگی پر قادر بھی ہے پھر بھی مال منول کرتا ہے اور ادا نہیں کرتا
ہے اور دائن کے لیے وصول کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے جس کی بنا پر بعض فقہاء احناف نے دین کی فسر
دو قسمیں قرار دیں۔

(۱) جس دین کی وصول یابی کی بالکل امید نہیں یا امید ضعیف ہے۔

(۲) جس دین کی وصول یابی کی امید قوی ہے

جس دین کی وصول یابی کی امید قوی ہے اگر وہ دین قوی ہے تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرے گا اور اگر دین متوسط ہے یا ضعیف ہے تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور جس کے ملنے کی امید بھی نہیں یا ضعیف امید تھی اگر وہ مل جائے تو وہ مال مستغاد کے حکم میں ہوگا۔

"قلت قد صفا اول الزکوٰۃ اختلاف التصحیح فیہ وماالرحمی

الی ہذا وقال بل فی زماننا یقر العدیون بالمدین وبملاکة ولا

یقدر الدائن علی تخلیصہ فهو بمنزلة العدم : (۱)

پراویڈٹ پر زکوٰۃ

ملازمت کی وجہ سے اجرت کا استحقاق ہے مگر جب تک قبضہ نہ کرے ملک تام حاصل نہیں ہے بلکہ عند الاحناف یہ دین متوسط ہے، لہذا دین متوسط میں اصح روایت کی بنا پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دینا واجب نہیں ہے۔

نامی کی حقیقت

نمو، بمعنی بڑھوتری، نمو حقیقی تو الد و تناسل یا تجارت کی شکل میں نہ تو تقدیری نمو اور اضافہ کرنے پر قدرت کا ہونا بایں طور کہ وہ مال خود اس کے قبضہ میں ہو یا اس کے نائب کے قبضہ میں ہو۔

وفی الشرع هو نوعان حقیقی و تقدیری فالحقیقی الزیادة بالتوالد

والتناسل والتجارات، والتقدیری تمکنہ من الزیادة بکون

المال فی بیدہ او بید نائبہ : (۲)

حقیقۃ نمو و اضافہ مراد نہیں ہے :

لان معنی بہ حقیقۃ النما لان ذلک غیر معتبرا لما معنی بہ کون

العمال معدًا للاستنماء للتجارة أو بالاسامة۔ (۱)

حوائج اصلیہ کی تعریف

جس کے بغیر زندگی بسر کرنا دشوار ہو :

قال ابن الملك هي ما يدفع الهلاك عن الانسان كالنفقة ودار

السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج اليها لدفع الحر والبرد

او تقديرًا كالدين فان المديون محتاج الى قضاءه لعافى سيده

من النصاب دفعًا عن نفسه الحبس۔ (۲)

انسان کی بہت سی ضرورتیں ہیں اور موجودہ دور میں بہت سی غیر ضروری چیزوں کو لوگوں نے اپنے طور پر ضروری کر لیا ہے مگر زکوٰۃ کے سلسلہ میں حوائج اصلیہ سے مراد وہی ضرورت ہے جس کے بغیر چارہ نہ ہو، حوائج اصلیہ میں حالات کے اعتبار سے اور اسی طرح زکوٰۃ ادا کرنے والے کی حیثیت کے اعتبار سے کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا۔

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے

ہر اس دین سے محفوظ ہونا جس کا مطالبہ آدمی کی طرف سے ہو وہ دین حقوق اللہ کے قبیل سے ہو جیسے زکوٰۃ، یا حقوق العباد کے قبیل سے ہو، پھر دین معمل ہو یا دین مؤجل ہو، چوں کہ دین کی ادائے گئی حوائج اصلیہ میں داخل ہے۔ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے حوائج اصلیہ سے فارغ ہونا ضروری ہے، اس لیے مادیوں ہوتے ہوئے غنا کا تحقق نہیں ہوگا۔

فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد سواء كان للذکر زکوٰۃ

وخراج اول للعبد ولو كفاية أو موجلًا ولو صدق زوجته المؤجل للفراق

ونفقة لزمته لقضاء اور قضاء۔

یہی قول امام مالکؒ اور احمدؒ کا بھی ہے، مگر امام شافعیؒ کے یہاں زکوٰۃ کے وجوب کے لیے دین سے محفوظ ہونا شرط نہیں ہے۔

طویل الاجل قرضوں کا حکم

موجودہ دور میں زراعتی یا کارخانہ قائم کرنے کے لیے بڑی بڑی رقمیں حکومت سے لی جاتی ہیں اور اس سے خوب نفع بھی کمایا جاتا ہے، امام ابوحنیفہؒ کے قول پر ہر طرح کے دیون کو وضع کرنے کے بعد اس کے پاس بہ قدر نصاب ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

مگر جب اس طرح کے قرضوں کا عام رواج ہو جائے اور ان دیون کو مانع زکوٰۃ قرار دیا جائے تو زکوٰۃ کی وصولیابی بہت زیادہ متاثر ہوگی، شرعیہ بات مشروعیت زکوٰۃ کی حکمت کے منافی ہے اس لیے تجارتی دین کو حوائجِ اصلیہ میں شمار کرنا مشکل ہے، اگر امام شافعیؒ کا قول لیا جائے تو اس سے مالک کا ضرر نقصان ہے، اس لیے اگر درمیانی شکل نکالی جائے، جیسے بعض فقہاء نے دین مہر میں معجل اور مؤجل کی تفریق کی ہے تو مناسب ہوگا، لیکن اس میں اجتماعی فیصلہ معتبر ہوگا، انفرادی رائے کا کوئی اعتبار ہوگا بلکہ ایسی صورت میں یا توائمہ ثلاثہ کے قول کو اختیار کیا جائے یا پھر امام شافعیؒ کے قول پر حالات کی بسا پر فتویٰ دیا جائے۔

کمپنی پر زکوٰۃ

اقتصادی تجارتی ترقی کے ساتھ شرکت کی ایک قسم وجود میں آئی ہے، جس میں خود کمپنی کو ایک شخص حکمی قرار دیا جاتا ہے اور کمپنی کے لیے ذمہ ثابت کیا جاتا ہے اور کمپنی کا یہ ذمہ شرکاء کے ذمہ سے الگ ہوتا ہے، فقہاء نے اگرچہ اس لفظ کو استعمال نہیں کیا ہے مگر بہت سے ایسے احکامات بیان کیے ہیں جو شخص حکمی کے نظریہ پر منطبق ہیں۔

مثلاً مسجد اور اسی طرح دیگر ادارے کے لیے وصیت کرنا راجح قول کے مطابق بلا تفصیل مسیح

ہے۔ شامی میں ہے:

يَنْبَغِي أَنْ يَفْتَى لِمَصْحَةِ الْوَصِيَّةِ لِلْأَزْهَرِ وَيُصَرَّفَ لَطَلِبَتِهِ كَمَا
يَقْضَى بِهِ الْعَرَفُ -

اوقاف کے لیے حقوق ثابت ہوتے ہیں اس طرح اوقاف پر دوسروں کے حقوق ثابت ہوتے ہیں اور متولی اس کی نمائندگی کرتا ہے اور وقف کی ضروریات کے لیے متولی سامان خریدتا ہے اور وقف سے اس کی قیمت ادا کی جاتی ہے اور ضرورت کے وقت وقف کا متولی قاصی کی اجازت سے وقف کے لیے قرض لیتا ہے تو خود وقف مقروض ہوتا ہے اس طرح خود حکومت کو شخص حکمی قرار دے کر اس پر احکامات متفرع کیے جاتے ہیں۔

چوں کہ اموال زکوٰۃ میں احناف کے یہاں خلطۃ الشیوع اور خلطۃ البحار کسی کا اعتبار نہیں ہے بلکہ ہر شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرے گا، دیگر ائمہ مولیشی کی زکوٰۃ میں خلطۃ الشیوع جس کو وہ حضرات خلطۃ الاعیان سے اور خلطۃ البحار جس کو وہ حضرات خلطۃ الاوصاف سے تعبیر کرتے ہیں، دونوں طرح کی خلطۃ کا کچھ شرائط کے ساتھ اعتبار کرتے ہوئے اس کو شخص حکمی قرار دیتے ہیں اور اس پر زکوٰۃ کو واجب کہتے ہیں۔ مولیشی کی زکوٰۃ کے علاوہ اموال تجارت وغیرہ میں خلطۃ الشیوع یا خلطۃ البحار کا اعتبار کرنے میں اختلاف ہے:

"وَأَنَّ اخْتَلَطُوا فِي غَيْرِ هَذَا اخْتِذْ مِنْ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ عَلَى الْفُرَادِ
إِذَا كَانَ مَا يَخْصُهُ تَجِبُ الزَّكَاةُ وَمَعْنَاهُ إِذَا اخْتَلَطُوا فِي غَيْرِ السَّائِئَةِ
كَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَعُرُوضِ التَّجَارَةِ وَالزَّرْعِ وَالشُّعَارِ لَمْ يَتَوَثَّرْ
خَلْطُهُمْ شَيْئًا وَكَانَ حُكْمُهُمْ حُكْمُ الْمُنْفَرِدِينَ وَهَذَا قَوْلُ أَكْثَرِ
أَهْلِ الْعِلْمِ....."

وَعَنْ أَحْمَدَ فِي رِوَايَةٍ أُخْرَى أَنَّ شُرَكَةَ الْأَعْيَانِ تَتَوَثَّرُ فِي غَيْرِ
الْمَاشِيَةِ إِذَا كَانَ بَيْنَهُمْ نَصَابٌ يَشْتَرِكُونَ فِيهِ فَعَلَيْهِمْ زَكَاةُ
..... أَمَّا خِلْطَةُ الْأَوْصَافِ فَلَا مَدْخَلَ لَهَا فِي غَيْرِ الْمَاشِيَةِ

وَهِيَ الشُّعَارُ وَالزَّرْعُ وَالنَّقْدَانُ بِحَالٍ (۱)

اور حضرت امام شافعیؒ کے یہاں صحیح قول کے مطابق مولیٰ کے علاوہ دیگر اموال میں خلطہ کا اعتبار ہے۔

قال اصحابنا تو شر الخلطة فی غیر الماشیة وهی الشمار والزروع و
النقدان وعروض التجارة اما خلطة الاوصاف ففيها قولان القديم
لا يثبت والجديد الصحيح يثبت اما خلطة الجوار ففيها طروق-

والاصح ثبوتهما جميعا فی الجميع (۱)

مگر خلطہ کے تحقق کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ سب شرکا مسلمان ہوں۔

ويشترط ان يكون الخليطان من اهل الزكوة فان كان احدهما

ذميا او مكاتباً لم يعتد بخلطته - (۲)

فقال اصحابنا نوعا الخلطة يشتركان فی اشتراط امور تختص

خلطة الجوار بشروط فمن المشترك كون المختلط نصاباً.....

ومنها كون المخاطبين ممن يجب عليه الزكوة فلو كان احدهما

كافراً او مكاتباً فلا اثر للخلطة - (۳)

اس بنا پر اگر کمپنی کے تمام شرکا مسلمان ہوں تو شوافع کے قاعدہ کے مطابق کمپنی پر زکوٰۃ واجب ہوگی اگرچہ بعض شرکا کا حصہ انفرادی طور پر مقدار نصاب نہ ہو اور جب کمپنی زکوٰۃ ادا کر دے تو اس کے شرکا کو الگ سے اس کی زکوٰۃ نہیں نکالنی ہوگی، اگر کمپنی کے تمام شرکا مسلمان ہوں تو سہولت کے پیش نظر امام شافعیؒ کے قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اگر تمام شرکا مسلمان نہیں ہیں بلکہ کچھ غیر مسلم ہیں تو سب ائمہ کے نزدیک ہر حصہ دار کو اپنے حصہ کی الگ الگ زکوٰۃ نکالنی ہوگی۔

ہیرے، جواہرات پر زکوٰۃ

ہیرے اور جواہرات کو زینت کے لیے اور کسی غیر تجارتی مقصد کے لیے خرید رکھا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لیے کہ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے مال نامی ہونا شرط ہے چاہے حقیقتہً نامی ہو یا تقدیراً، اور

یہ مال نامی نہیں ہیں اور حوائجِ اصلیہ میں بھی داخل نہیں ہیں، مگر زکوٰۃ کے وجوب کے لیے حوائجِ اصلیہ سے زائد کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا نامی ہونا بھی شرط ہے۔ حوائجِ اصلیہ سے زائد ہونے کا اثر زکوٰۃ لینے پر پڑے گا۔

وكذا الكتب وان لم تكن لاهلها اذا لم ينو للتجارة غير ان الاهل له

اخذ الزكاة وان ساوت نصاباً - (۱)

اموال تجارت پر زکوٰۃ — نرخ کا تعین

سامان تجارت میں نرخ کے تعین میں اپنی لاگت کا اعتبار نہیں بلکہ بازار بھاؤ کا اعتبار ہوگا، اس لیے اگر نرخ کم ہو گیا اور لاگت اعتبار کیا جائے تو مالک کا ضرر نقصان ہے اور اگر نرخ بڑھ گیا تو لاگت کا اعتبار کرنے میں لازم آتا ہے کہ صرف اس المال کی زکوٰۃ ادا کرے جب کہ اس المال اور نفع دونوں کی زکوٰۃ ادا کرنا ہے تو کس دن کے نرخ کا اعتبار ہوگا۔

امام صاحبؒ کے بیان کے مطابق حوالانِ حول کے وقت کا اور صاحبینؒ کے بیان کے مطابق جس دن زکوٰۃ ادا کرے گا اس دن کے نرخ کا اعتبار ہوگا۔

وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقال يوم الاداء ونس السواثم

يوم الاداء بالاجماع - (۲)

نرخ میں تھوک کا اعتبار ہوگا یا پھٹکر کا؟

انفع للفقراء کا اعتبار کیا جائے جیسا کہ نصاب کے سلسلے میں فقہار نے اعتبار کیا ہے یا جس طرح کی تجارت کرتا ہے، اگر تھوک فروش ہے تو تھوک کی قیمت کا اعتبار کرے اور اگر پھٹکر فروش ہے تو پھٹکر کا اعتبار کرے مگر نقد قیمت کا اعتبار ہوگا ادھر قیمت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

(۲) بوند زدن قوی کے قبیل سے ہے اس لیے سین ما ضیہ کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

شیر کے سلسلے میں لکھا جا چکا ہے کہ تجارتی کمپنیاں مختلف قسم کی ہوتی ہیں، بعض میں پورا حصہ مال

نامی ہوتا ہے بعض میں کچھ مال غیر نامی کی شکل میں ہوتا ہے اور کچھ نامی شکل میں جو نامی ہے اسی پر زکوٰۃ ہے، اور غیر نامی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے حصص بنفسہ نامی نہیں ہیں، ہاں اگر حصص کو خرید و فروخت کی غرض سے خریدتا ہے تو خود حصص مال تجارت ہوں گے، ورنہ مال تجارت کے قبیل سے نہیں ہوں گے۔

پورے حصص یا حصص کے کچھ حصہ پر زکوٰۃ

حنفیہ کے اصول کے مطابق اس کے حصہ میں جتنا حصہ کمپنی کے غیر نامی اثاثوں میں صرف ہوا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور جتنا حصہ نقد رقم یا مال تجارت کی شکل میں ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اگر اس نے حصص کو خرید و فروخت کی غرض سے خریدا ہے تو کل حصہ مال تجارت ہو گیا ایسی صورت میں کل حصہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

نصاب زکوٰۃ

زکوٰۃ کے وجوب کے لیے مال نامی اور حوائجِ املیہ سے فارغ ہونے کے ساتھ ساتھ مقدارِ نصاب کا مالک ہونا بھی ہے تاکہ زکوٰۃ لگانے پر مالک کو کسی طرح کا ضرر و نقصان نہ ہو جو قابلِ اعتبار ہو، سونے چاندی دونوں کو جب شریعت نے معیار قرار دیا ہے تو خواہ مخواہ کسی ایک کو قرار دینا بے دلیل ہوگا۔ تفاوت کی صورت میں اموال زکوٰۃ کی قیمت میں چاندی کے نرخ کا اعتبار کیا جائے یا سونے کا یہ مسئلہ روح شریعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہاء نے بہت پہلے طے کر دیا ہے۔

تقوم السلع اذا حال الحول باللاحظ من عين او ورق ولا يعتبر ما

اشتریت به یعنی اذا حال الحول على العروض وقيمتها بالفضة

دون النصاب وبالذهب يبلغ نصابا قومنا بالذهب لتجب الزكاة

فيها ولهذا قال ابو حنيفة (مشق ۲/۲۳)

ولو بلغ احدهما نصابا دون الآخر تعين ما يبلغ به ولو بلغ باحدهما

نصابا دون الآخر تعين ما يبلغ به ولو بلغ احدهما نصابا خمساً

بالآخر اقل قومه بالانفع للفقير۔ سراج مشق ۱/۲۶۔

مہتمم مدرسہ کی حیثیت

مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا بھی وکیل ہے اور مستحقین زکوٰۃ کا بھی جس کی وجہ سے زکوٰۃ دینے والوں نے سفراء کو زکوٰۃ دی اس کی زکوٰۃ ادا ہو گئی، جیسے حکومت اسلامی کے مصدق و ساعی کو زکوٰۃ دیتے ہی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے اس لیے کہ امیر المؤمنین اور اس کے واسطے سے عالمین مستحقین زکوٰۃ کے وکیل ہیں۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ نے حضرت مولانا تھانویؒ کو اسی طرح کا جواب لکھا تھا جس پر وہ بھی مطمئن ہو گئے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے بھی اس طرح لکھا ہے کہ مہتمم مدرسہ کا قیام و نائب جملہ طلبہ ہوتے ہیں جیسا کہ امیر نائب جملہ عالم کا ہوتا ہے، پس جو مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ طلبہ کا قبضہ ہے اسی کے قبضہ سے ملک معطل سے نکلا اور ملک طلبہ کی ہو گئی، اگرچہ وہ مجہول الکیت والذوات ہوں مگر نائب معین ہے۔

طلبہ پر فیس مقرر کرنا اور اس کو مذکوٰۃ سے ادا کرنا

طلبہ پر کمرہ کا کرایہ تعلیمی فیس، بجلی کی اجرت اور طعام کی قیمت مقرر کر کے ان کے ذمہ اس کو لازم کرنا درست ہے اور جب طلبہ مدیون ہو جائیں تو ان کے دین کو مذکوٰۃ سے ادا کرنا بائیں طور کہ ان کو مذکوٰۃ سے مقررہ روپیہ دیا جائے اور وہ مدرسہ میں داخل کریں، صحیح اور درست ہے اور بہت سے مدارس میں اس طرح کا نظم پایا جاتا ہے، البتہ مہتمم مدرسہ اور خود بدوں طلبہ کے وکیل بنائے ہوئے ادا کرے گا تو وہ زکوٰۃ ادا نہ ہوگی بلکہ طلبہ باقاعدہ مہتمم مدرسہ کو وکیل بنائیں کہ آپ ہماری طرف سے ہمارا مقررہ وظیفہ وصول کر کے ہمارے دین میں محسوب کر لیں تو صحیح ہوگا۔

نوٹ: ابتدا میں مہتمم مدرسہ کو مستحقین زکوٰۃ کا وکیل تسلیم کیا گیا ہے، مگر اس میں کسی طالب علم کا تعین نہیں ہے اس لیے اس وکالت کی بنا پر طلبہ پر مدرسہ کا کوئی متعین حق ثابت نہیں ہوتا ہے ہاں جب مدرسہ باقاعدہ طلبہ کا وظیفہ مقرر کرے اس وقت لڑکوں کو استحقاق حاصل ہوگا، اس لیے اس کو وصول کر کے ان کے دین میں محسوب کرنے کے لیے طلبہ باقاعدہ وکیل بنائیں اس لیے اس وکالت کی بنیاد پر طلبہ کا وظیفہ بہ مذکوٰۃ مقرر کرے تو اس وقت میں زکوٰۃ کا استحقاق ہوگا، اس لیے اس کو وصول کر کے ان کے دین میں محسوب کرنے کے لیے باقاعدہ وکیل بنانا ضروری ہوگا۔

سفر مدرسہ کو مذکورۃ سے تنخواہ دینا

جب مہتمم مدرسہ کو مثل امیر متحقین زکوٰۃ کا وکیل تسلیم کر لیا گیا تو محصلین و سفرہ عاملین میں داخل ہوں گے اور ان کو ان کی کارکردگی کے مطابق مذکورۃ سے بہ طور عمالہ دیا جاسکتا ہے، مگر ان کی وصول کردہ زکوٰۃ میں سے نصف سے زائد دینا جائز نہ ہوگا اور جب یہ بہ طور اجارہ نہیں ہے بہ طور عمالہ ہے تو کمیشن بھی صحیح ہوگا۔

فیعطی بقدر عملہ ما یکفیه واعوانہ بالوسط لکن لا یزاد علی

نصف ما یقبضہ۔ (۱)

حساب لکھنے والوں کو ان کی کارکردگی کے بہ قدر مذکورۃ سے دیا جاسکتا ہے اس لیے کہ وہ بھی عاملین کے حکم میں ہیں۔

فی سبیل اللہ سے مراد

لفت کے اعتبار سے فی سبیل اللہ کا ہر نیک کام پر ہوتا ہے مگر عرف شرع میں عام طور پر جہاد پر اطلاق ہوتا ہے۔ ابن اثیرؒ نے ذکر کیا ہے،

السبیل فی الاصل الطريق وسبیل اللہ عام علی کل عمل خالص سلك به طریق التقرب إلى اللہ عزوجل باداء الفرائض والنوافل وانواع التطوعات واذا اطلق فهو علی الغالب واقع علی الجہاد حتی مار لکثرة الاستعمال کانه مقصور علیہ۔

اور ائمہ اربعہ نے منصارف زکوٰۃ میں جہاد ہی مراد لیا ہے اور حدیث لا تحل الصدقة لغنی إلا لخمسة لغازی سبیل اللہ میں بھی غازی کے ساتھ مقید کر دیا گیا ہے۔

غازی میں عند الاحناف فقر کی شرط ہے مگر صاحب بدائع نے فرمایا ہے کہ مال دار مجاہد جب میقم ہے اس وقت اس کو سواری سامان سفر، آلات جنگ کی ضرورت نہیں ہے مگر جب جہاد کا ارادہ کرے گا

تو اس کو ان چیزوں کی ضرورت پڑے گی، اس کی ضرورت کو مد زکوٰۃ سے پورا کیا جائے گا۔

اما استثناء الغازی فمحمول علی حال حدوث الحاجة وسماه
غنیا علی اعتبار ما كان قبل حدوث الحاجة وهو ان يكون غنيا ثم
تحدث له الحاجة فان كان له دار يسكنها ومتاع يمتهنه وثياب
يلبسها وله مع ذلك فضل ما تى درهم حتى لا تحل له الصدقة ثم
يعزم علی الخروج فی سفر غزو فيحتاج إلى آلات سفره وسلاح يستعمله
فی غزوه ومركب يغزو علیه ما يستعين به فی حاجته التي
تحدث له فی سفره وهو فی مقامه غنی الخ . (۱)

دیگر ائمہ بھی یہی کہتے ہیں، اگر فرق ہے تو اس بات میں کہ اس کے عیال کا نفقہ بھی مد زکوٰۃ سے
ادا کیا جائے یا نہیں :

قال النووي فی الروضة هل يعطى جميع المؤنة ام ما زاد بسبب
السفر وجهان قال النووي فی بعض شروح المفتاح انه يعطى
الغازی نفقته ونفقة عیاله وسکت الجمهور عن نفقة العیال
لكن اخذها ليس ببعید -

انما الصدقات کا حصر

اس میں حصر حقیقی ہے، یہاں پر فی سبیل اللہ کے مفہوم میں تعمیم صحیح نہیں ہے اس لیے کہ جن ضرورتوں
کا سوال نامے میں ذکر کیا گیا ہے زمانہ رسالت سے ائمہ کے دور تک اس طرح کی ضرورتیں پائی جاتی تھیں
اس کے باوجود کہیں سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ان ضرورتوں میں زکوٰۃ کی رقم کو خرچ کیا جائے، اسلام نے
اس طرح کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ کے علاوہ دیگر صدقات کی ترغیب دی ہے ہم کو بھی اسی
پر زور دینا چاہیے ۔ ❦

زکوٰۃ کے شرعی احکام

ان: مفتی حبیب الرحمن خیر آبادی دارالعلوم دیوبند

زکوٰۃ کے احکام سے متعلق سولہ سوالات پر مشتمل سوال نامہ کے جوابات اختصار کے ساتھ بالترتیب ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔

(۱)

شریعت اسلام میں ملک تمام سے مراد وہ ملک ہے جس میں مالک کا قبضہ بھی ہو، لہذا اموال زکوٰۃ میں اگر ان دونوں میں سے ایک چیز بھی مفقود ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ وہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو اور مال اب تک مشتری کے قبضہ میں نہ آیا ہو تو چوں کہ قیمت کی ادائیگی کے بعد بائع اس قیمت کا مالک بن گیا اور اس پر قابض بھی ہو گیا، اس لیے بائع کے ذمہ اس قیمت پر (نصاب و حوالان حول کے بعد) زکوٰۃ واجب ہوگی اور مال چوں کہ مشتری کے قبضہ میں نہیں آیا، گو مشتری اس کا مالک ہے مگر ملک تمام نہ ہونے کی وجہ سے اس مال پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

”و سبہ ای سبب افتراضها ملك منصاب حولی تام صفة ملك

خرج مال المكاتب ای خرج والتقبيد به لأن المراد بالتام المملوك

وقبة وبيد خرج به ايضاً كما في البحر، المشتري

للتجارة قبل القبض والأبق المعد للتجارة: (شامی ۲/۲۶۶)

واطلق الملك فانصرف الى الكامل وهو المملوك رقبةً وبيداً
 فلا يجب على المشتري فيما اشتراه للتجارة قبل القبض ۛ (۱)
 وفي الدرشم فرغ عن سببه بقوله فلا زكوة على مكاتب لعدم
 الملك التام ولا في كسب ماذون ولا في مرهون بعد قبضه ولا
 فيما اشتراه للتجارة قبل قبضه ۛ (۲)

(۲)

کرایہ کی جو رقم پیشگی دی جاتی ہے اور فسخ یا مدت پوری ہونے کے بعد واپس کی جاتی ہے
 وہ رقم بہ طور وثیقہ کے رکھی جاتی ہے جس طرح پرشی مرہون بہ طور وثیقہ رکھی جاتی ہے اور چوں کہ اس رقم
 پر ملک تام کسی کی نہیں ہے، کرایہ پر لینے والا اس رقم کا مالک تو ہے مگر اس کا اس پر قبضہ نہیں ہے اور
 کرایہ پر دینے والا اس رقم کا مالک نہیں، البتہ قبضہ ضرور ہے اس لیے اس رقم پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

"قوله (ولا في مرهون) أي لا على المرتهن لعدم ملك الرقبة
 ولا على الرهن لعدم اليد وإذا استرده الرهن لا يزكي عن
 السنين الماضية وهو معنى قول الشارح بعد قبضه ويدل عليه
 قول البحر ومن موانع الوجوب الرهن ولو كان الرهن أزيد
 من الدين ۛ (۳)"

(۳)

مدارس اور اداروں میں جو رقم آتی ہے ارباب مدارس مثل عمال بیت المال کے معطین اور
 آخذین ہر دو کی طرف سے وکلاء ہیں، مالک نہیں ہیں، لہذا مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم
 میں ملکیت نہ پائے جانے کی وجہ سے ان رقم میں زکوٰۃ واجب نہیں نہ معطین کی طرف سے نہ آخذین کی
 طرف سے۔

"وسبب افتراضها ملك نصاب حولي تام ۛ (۴)"

خالص مال حرام میں زکوٰۃ واجب نہیں، کیوں کہ اس کا مالک معلوم ہونے کی صورت میں وہ مال الردیٰ صاحب المال کے اصول کے پیش نظر واجب الرد ہے، اور اگر مالک معلوم نہیں تو کل مال واجب التصدق ہے، اور مال حرام جب مال حلال کے ساتھ خلط ہو جاتا ہے تو وہ مستہلک ہو جاتا ہے اور استہلاک سے مستہلک کے ذمہ دین ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ دیکھا جائے گا اگر مال مخلوط میں سے بہ قدر مال حرام نکال کر نصاب تک پہنچتا ہے تو باقی مال پر یعنی نصاب تک پہنچنے والے اس مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر بہ قدر نصاب نہیں پہنچتا ہے تو پھر اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

”ولو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه فتجب الزکوۃ فيه ويورث عنه لأن الخلط استهلاك، إذا لم يكن تمييزه عند الجحيفة وقوله أرفق إذا قلما يخلو مال من غصب وهذا إذا كان له مال غير ما استهلك بالخلط منفصل عنه يوفى دينه ولا فلا زکوۃ كما لو كان الكل خبيثاً كما في النهر وفي فصل العاشر من التاتارخانية عن فتاوى الحية من ملك أموالاً غير طيبة أو غصب أموالاً وخلطها ملكها بالخلط ويصير ماصناً وإن لم يكن له سواها نصاب فلا زکوۃ عليه فيها وإن بلغت نصاباً لأنه مديون ومال المديون لا يتعقد سبباً للوجوب لوجوب الزکوۃ عندنا فأفاد بقوله وإن لم يكن له سواها نصاب الغ أن وجوب الزکوۃ مقيد بما إذا كان له نصاب سواها“ (۱)

(۵)

دین کی وصولیابی کی امید نہ ہو تو اس دین پر زکوٰۃ واجب نہیں اور اگر دین کی وصولیابی کی امید ہو تو پھر دین کے تین درجے ہوں گے۔ (۱) دین قوی (۲) دین متوسط (۳) دین ضعیف

دین قوی وہ یہ کہلاتا ہے جو مال تجارت یا سونے چاندی کے بدلہ میں کسی کے ذمہ واجب ہوا ہو۔ اور متوسط وہ دین ہے جو مال ہی کے بدلہ میں واجب ہوا ہو مگر وہ مال تجارت یا نقد سونا چاندی نہ ہو، بلکہ ان کے علاوہ کوئی اور سامان ہو۔ اور دین ضعیف وہ دین کہلاتا ہے جو کسی مال کے بدلہ میں مدیون کے ذمہ واجب نہ ہوا ہو، جیسے دین مہر، بدل، فسخ، میراث، وصیت وغیرہ۔

ان تینوں دیون کا حکم یہ ہے کہ دین قوی اگر بہ قدر نصاب ہے اور چالیس درہم پر دائن کا قبضہ ہو جائے تو اس میں ایام ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ اور دین ضعیف پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں بلکہ قبضہ ہونے کے بعد حسب ضابطہ زکوٰۃ واجب ہوگی۔ رہا دین متوسط کا حکم تو حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک دین متوسط میں اصح روایت کے مطابق ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں بلکہ وصول ہونے کے بعد جب اس پر سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، بشرطے کہ وہ بہ قدر نصاب ہو۔

اگر مدیون کے ذمہ ایسا دین ہے جس کا طالب بندہ ہے جیسے قرض، زکوٰۃ، مال خرچ، دین مہر وغیرہ تو مدیون کے اتنے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں، جتنا مال اس کے ذمہ ادا کرنا واجب ہے، البتہ اگر اس سے زائد مال بہ قدر نصاب موجود ہو تو اس پر حسب ضابطہ شرعیہ زکوٰۃ واجب ہوگی، مدیون قرض کی ادائے گی پر قدر کے باوجود اگر قرض ادا نہ کرے تو وہ مال مدیون کے ذمہ دین ہی میں مشغول سمجھا جائے گا اور اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، البتہ اگر اس مشغول فی ادارہ الدین مال کو تجارت میں لگائے اور اتنا نفع ہو کہ دین کی ادائیگی کے بعد بہ قدر نصاب مال، مدیون کے پاس بچتا ہو تو اس پر حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی۔

”واعلم أن الديون عند الامام ثلاثة: قوی و متوسط و ضعیف

فتجب زکوٰۃها إذا تمّ نصابها و حال الحول لكن لا فوراً بل عند

قبض أربعين درهما يلزم درهم و عند قبض مائتين منه لغيرها

أى من يدل لغير تجارة و هو المتوسط و عند قبض مائتين مع حولان

الحول بعده أعم بعد القبض من دين ضعیف - (۱)

فلو كان له نصاب حال عليه حولان ولم يتركه فيهما لا زکوٰۃ عليه في الحول الثاني (۲)

پراویڈنٹ فنڈ جو حکومت کے ذمہ واجب الادا ہے، ملازم اس رقم کا صرف استحقاق رکھتا ہے، اس رقم پر مالک و قابض نہیں ہوا ہے، اس رقم کو نہ تو دین قوی بنایا جاسکتا ہے، نہ دین متوسط بلکہ یہ دین ضعیف میں داخل ہے اور دین ضعیف کا حکم یہ ہے کہ اس میں ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں بلکہ قبضہ میں آنے کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، لہذا پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کا بھی حکم ہوگا۔

"ویشترط أن يتمكن من الاستثناء بكون المال في يده أو يد
ناثبه فإن لم يتمكن من الاستثناء فلا زكاة عليه وذلك
مثل مال الضمار وهو كل ما بقي أصله في ملكه ولكن زال عن
يده زوالاً يرجي عوده في الغالب ومن مال الضمار الدين
المجحود والمغلوب إذا لم يكن عليها بيعة" (۱)

وجملة الأحكام في الديون أنها على ثلاث مراتب في
قول أبي حنيفة دين قوي ودين ضعیف ودين متوسط كذا
قال عامة المشايخ أما القوي فهو الذي وجب بدلًا عن مال التجارة
كثمن عرض التجارة من ثياب التجارة وعبید التجارة ولا خلاف
في وجوب الزكاة فيه إلا أنه لا يخاطب بأزاء شيء من زكاة ماضی
ماله يقبض أربعين درهماً وأما الدين الضعیف فهو الذي وجب
بدلاً عن شيء سواء وجب له بغير صنعه كالميراث أو بصنعه
كما بوصية أو وجب بدلاً عما ليس بمال كالمهر وبدل الخلع
والصلح من قصاص وبدل الكتابة ولا زكاة فيه مالم يقبض كله
ويحول عليها الحال بعد القبض. وأما الدين الوسيط فما وجب
له بدلاً عن مال ليس للتجارة كثمن عبد الخدمة وثمن ثياب

البذلّة والمنّة وفيه روايتان عنه ذكر في الاصل أنه تجب فيه الزكوة قبل القبض لكن لا يخطب بالاداء ما لم يقبض ما ستر درهم فاذا قبض ما ستر درهم زكّى لما مضى وروى ابن سماعه عن ابي يوسف عن ابي حنيفة أنه لا زكوة فيه حتى يقبض المائتين ويحول عليه الحول من وقت القبض وهو أصح الروايتين^(۱) عنه فارغ عن دين له مطالب من جملة العباد سواء كان لله كزكوة وخراج ولو كغالة أو مؤجلاً ولو صداق زوجة المؤجل^(۲) لفراق الخ - (۲)

وفي الشامي قوله كزكوة فلو كان له نصاب حال عليه حولان ولم يزكه فيهما لا زكوة عليه في الحول الثاني: (۳)
(۴)

حقیقت نما اور اس کی قسمیں

نما کی حقیقت یہ ہے کہ مال ایسی حیثیت میں ہو کہ اس میں بڑھوتری اور زیادتی ہو سکے خواہ وہ حقیقی ہو، جیسے توالد و تناسل و تجارت۔ یا تقدیری ہو، جیسے مالک کو اس مال کے بڑھانے کی قدرت ہو خواہ وہ مالک کے قبضہ میں رہ کر ہو یا نائب کے قبضہ میں رہ کر ہو یا نمونہ خلقی ہو، جیسے سونا چاندی، اس میں چاہے تجارت کی نیت کرے یا نہ کرے اس پر زکوة واجب ہوگی، یا نمونہ فعلی ہو، یعنی سونا چاندی کے علاوہ دیگر سامان، اگر اس میں تجارت و اسامت اور عملاً ان چیزوں میں تجارت کی ہو تو اس پر زکوة واجب ہے، خواہ ان چیزوں میں تجارت کی نیت صراحتاً یا دلالتاً ہو۔

”ومنها كون النصاب نامياً حقيقة بالتوالد والتناسل والتجارة أو تقديراً بأن يتمكن من الاستنماء بكون المال في يده“

أَوْ فَيُذَوِّبُهُ وَيَنْقَسِمُ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا إِلَى قَسْمَيْنِ خُلِقِي
وَنَعْلَى فَالْخُلُقَى الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ لِأَنَّهُمَا لَا يَصْلُحَانِ لِلانْتِفَاعِ
بِأَعْيَانِهِمَا فَيُدْفَعُ الْحَوَائِجُ الْأَصْلِيَّةُ فَتَجِبُ الزَّكَاةُ فِيهِمَا نَوَى
التَّجَارَةِ أَوْ لَمْ يَنْوَأْ أَصْلًا أَوْ نَوَى الْمُنْفَقَةَ وَالْفَعْلَى مَا سِوَاهُمَا وَيَكُونُ
الِاسْتِنْمَاءُ فِيهِ بِنِيَّةِ التَّجَارَةِ وَالِاسْمَاءُ وَنِيَّةِ التَّجَارَةِ وَالِاسْمَاءُ
لَا تَعْتَبَرُ مَا لَمْ تَتَّصِلْ بِفِعْلِ التَّجَارَةِ أَوْ الِاسْمَاءُ بِقَرِينَةٍ أَنْ يَكُونَ
الْمَمْلُوكُ لِلتَّجَارَةِ سِوَاءَ كَانَ ذَلِكَ الْعَقْدُ شَرَاءً وَاجَارَةً وَسِوَاءَ كَانَ
ذَلِكَ الثَّمَنُ مِنَ النُّقُودِ وَالْعُرُوضِ وَأَمَّا الدَّلَالَةُ أَنْ يَشْتَرَى عَيْنًا
مِنَ الْأَعْيَانِ بِعُرُوضِ التَّجَارَةِ أَوْ يُوَاجِرَ السُّتَى لِلتَّجَارَةِ بِعُرُوضِ مِنَ الْعُرُوضِ
فَتَصِيرُ لِلتَّجَارَةِ وَإِنْ لَمْ يَسُوْ التَّجَارَةَ صَرِيحًا (۱)

(۸)

حاجتِ اصلیہ

حاجتِ اصلیہ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ انسان اپنی جان کو ہلاکت اور بے عزتی
سے محفوظ رکھ سکے، نان و نفقہ، رہائش کے لیے مکان، جنگ کے سامان، سردی، گرمی سے حفاظت کے لیے
کپڑے، یہ حاجتِ اصلِ حقیقی ہے، اس کے علاوہ دینِ حاجتِ تقدیری میں داخل ہے، کیوں کہ مدیون اپنی
جان دائن کے ہاتھ سے بچانے کے لیے اس کی ادائیگی کا محتاج ہوتا ہے، اسی طرح آلاتِ حرفت، متاعِ
بیت، سواری کا جانور، علماء کے لیے کتابیں یہ چیزیں بھی حاجتِ اصلیہ میں داخل ہیں، لہذا اگر صاحبِ
مال کے پاس اپنی حاجتِ اصلیہ کو پورا کرنے کے بعد اتنا مال بچتا ہو جو بہ قدر نصاب ہو تو سال گزرنے کے
بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

”وَفَارَغَ مِنْ حَاجَتِهِ الْأَصْلِيَّةِ لِأَنَّهُ الْمَشْغُولُ بِهَا كَالْمَعْدُومِ وَفَسْرُهُ ابْنُ

مَلِكٍ بِمَا يَدْفَعُ عَنْهُ الْهَلَاكَ تَحْقِيقًا كَشَيْءٍ أَوْ تَقْدِيرًا كَدَيْنِهِ (۲)۔

قوله وهو ما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقا كالنفقة والدور
للسكنى وآلات الحرب وثياب المحتاج اليها لدفع الحر والبرد
أو تقديرًا كالدين فان الديون محتاج إلى قضاءه بما في يده من
النصاب دفعًا عن نفسه الحبس الذي هو كالهلاك وكآلات العرفة
وأثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لأهلها فان الجاهل عندهم
كالهلاك فاذا كان له درهم مستحقة يصرفها إلى قلب الحوائج
صارت كالمعدومة: (۱)

جب حاجت اصلیہ میں یہ بات اصل قرار پائی کہ انسان جس سے بآسانی اپنی جان اور عزت و آبرو کی
حفاظت کر سکے تو ہر دور اور ہر ماحول میں اپنی جان و عزت کی حفاظت کے لیے جتنی مالیت کی حاجت ہو وہ جتنی
اصلیہ میں داخل ہوگی۔

(۹)

حکومت کی طرف سے جو قرض ملتا ہے جس کی ادائے گی کے لیے کئی سال کی لمبی مہلت ملتی ہے،
اور سالانہ ایک متعین مقدار قرض کی ادائے گی اس کے ذمہ رہتی ہے تو ان صورتوں میں اس کے اموال پر زکوٰۃ
واجب ہونے کے لیے مدیون کے ذمہ پورا قرض منہا کرنے کے بعد اگر بہ قدر نصاب مال پختا ہے تو اس میں زکوٰۃ
واجب ہوگی، سالانہ واجب الادا قسط وضع کرنے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ فقہی عبارات سے یہی سمجھ میں
آتا ہے۔

"وسببه أي وسبب افتراضها ملك نصاب حولي تام فارغ عن"

دين له مطالب من جهة العبادۃ (۲)

(۱۰)

اگر کمپنی کی مجموعی مالیت بہ قدر نصاب ہو جائے اور شرکاء کی تعداد کے اعتبار سے تقسیم کرنے
کے بعد کسی شریک کے حصہ میں بہ قدر نصاب مال نہ ہو تو اس رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ البتہ اگر تقسیم کے

کے بعد ہر شریک کے حصہ میں یا بعض شریک کے حصہ میں اتنا مال آتا ہو جو بہ قدر نصاب ہو تو ان شرکا کے ذمہ اپنے اپنے حصوں میں زکوٰۃ واجب ہوگی، غرض کہ زکوٰۃ کے وجوب میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ ہر شریک کے انفرادی حصے کا اعتبار ہوگا۔

”ولا تجب الزکوٰۃ عندنا فی نصاب مشترك من سائمة و مال

تجارة - (۱)

قوله (فی نصاب مشترك) المراد ان يكون بلوغه النصاب بسبب الاشتراك وضم احد المالین الى الآخر بحيث لا يبلغ مال كل منهما بانفراده نصاباً وقوله وان تعدد النصاب الغ اخرجت يبلغ قبل الضم مال كل واحد بانفراده نصاباً فانه يجب حينئذ علی كل منهما زکوٰۃ نصابه (۲)

(۱۱)

جو حضرات سونے چاندی کی صورت میں اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کے بجائے ہیرے جواہرات لاکھوں روپے کے خرید کر محفوظ کرتے ہیں اگر خریدتے وقت دل میں یہ نیت ہو کہ آئندہ کبھی اس کو بیچ کر روپے حاصل کر لیں گے تو وہ مال تجارت میں شمار ہو کر اس کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور واقعہ یہی ہے کہ سرمایہ بنانے کی نیت سے ہیرے جواہرات جو شخص خریدتا ہے لازمی نیت اس کی یہی ہوتی ہے کہ وہ آئندہ فروخت کرے گا، صرف ہیرے جواہرات جمع کرنے کی نیت سے نہیں رکھتا ہے، البتہ اگر کوئی شخص جمع کرنے کی نیت سے خریدے، آئندہ انہیں فروخت کرنے کی کہیں دور تک بھی نیت نہ ہو یا یہ نیت ہو کہ آئندہ اگر کوئی مصلحت یا نفع تمہوں تو فروخت کر دوں گا ورنہ اسے گھر میں جمع رکھیں گے، خواہ وہ کتنی بھی مالیت کے ہوں، اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ اور خواتین تزئین کے لیے جو ہیرے جواہرات استعمال کرتی ہیں اس میں حقیقتہً نمونہ نہ دلائل اس لیے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

”ولا زکوٰۃ فی الجواهر والالی إلا ان یتملکھا بنية التجارة کسائر

العروض (مراتی)، قوله ولا زكوة في الجواهر الخ قال في الدر الاصل
ان ما عدا الحبرين والسواثم انما يزكى بنية التجارة عند العقد
فلو نوى التجارة بعد العقد واشترى شيئاً للقيمة نادياً انه ان وجد
ربحاً باعه لا زكوة عليه (۱)

(۱۲)

جو سامان تجارت تا جبر کے قبضہ میں ہے سالانہ زکوٰۃ نکالتے وقت اس کی مالیت کا تعین اس
رخ سے ہوگا جو زکوٰۃ کی ادائے گی کے وقت بازار میں ہوگا، یعنی جس قدر نفع یا نقصان کے ساتھ بازار میں وہ
سامان بکتا ہو اسی نفع یا نقصان کے ساتھ نرخ کا تعین کیا جائے گا۔ بازار کا بمباؤ خرید کی قیمت سے
زیادہ ہو یا کم۔

”وعنده تعتبر قيمته يوم الوجوب قال يوم الأداء الخ ويقوم
في البلد الذي المال فيه“ (۲)

وفي المحيط يعتبر يوم الاداء بالاجماع وهو الاصح (۳)

جو لوگ ارامنی کی خرید و فروخت کو ایک تجارتی کاروبار کے طور پر کرتے ہیں چوں کہ خریدتے
وقت ان کی نیت تجارت ہوتی ہے اس لیے وہ ارامنی بھی اموال تجارت میں داخل ہوں گی اور ان کا
حکم بھی یہی ہوگا، یعنی ان اراضی پر بازاری قیمت کا اعتبار کرتے ہوئے ان کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔^(۴)

(۱۳)

اگر شیرز کی قیمت نصاب کے بہ قدر یعنی ۵۲ ۱/۲ اتولہ چاندی کی قیمت کے برابر پہنچ جائے،
یا شیرز کے علاوہ دیگر نقد روپے یا مال تجارت مل کر شیر ہو لڈر نصاب کا مالک بن جائے تو اس کے ذمہ
شیرز پر زکوٰۃ واجب ہے، جس طرح اس کے منافع پر زکوٰۃ واجب ہے، البتہ شیرز کی قیمت میں چوں کہ کمینوں
کی مشینری، مکان، فرنیچر وغیرہ کی لاگت بھی شامل ہوتی ہے (اور درحقیقت ان چیزوں میں زکوٰۃ واجب

(۱) طحطاوی علی مرقی الفلاح (ص ۳۹۱) (۲) درمختار

(۳) شامی ۳/۲، نعمانیہ (۴) حوالہ مذکورہ ایضاً۔

ہیں) اس لیے شیرز کی زکوٰۃ نکالتے وقت کمپنی سے دریافت کر لیا جائے، جس قدر رقم شیرز کی مشینری، مکان اور فرنیچر وغیرہ میں لگی ہوئی ہے، شیر ہولڈر اتنی قیمت شیرز کی کم کر کے زکوٰۃ نکالے، زکوٰۃ دیتے وقت شیرز کی جو قیمت ہوگی وہی نکالی جائے گی۔

”کالدراہم والدناسیر لعینہما للتجارة بأصل الخلقة فلتسرم

الزکوٰۃ کیف ما امسکہما“ (۱)

(۱۴)

فقہاء کرام نے چاندی کے نصاب کو اصل قرار دیا ہے، لہذا ۵۲ ½ تو لے چاندی کی قیمت کے برابر کسی کے پاس مال ہو تو اس کو عنی قرار دیا جائے گا، اس کو زکوٰۃ لینا جائز نہ ہوگا اور اس مال پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی، فقہاء کی تصریح کے پیش نظر اگر سونے چاندی کا نرخ برابر ہو تو کسی ایک کنخ کو اصلی قرار دیا جائے جائے گا، اگر دونوں میں سے کسی ایک کے نرخ سے مال نصاب تک پہنچ جاتا ہے تو اسی کا اعتبار ہوگا، غرض جس میں فقرا کا نفع ہو اس کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا۔

”فی عروض التجارة قیمته نصاب من ذهب أو ورق أى فضة مضروبة

فأفاد أن التقویم انما یكون بالمسلوک عملاً بالعرف مقوماً بأحدہما

ان استویا فلو أحدہما أروج تعین التقویم بہ ولو بلغ بأحدہما

نصاباً دون الآخر تعین ما یبلغ بہ ولو بلغ بأحدہما نصاباً وخمساً

بالآخر اقل قومہ بالأنفع للفقیر“ (۲)

(۱۵)

اگر مدرسہ والے ہر طالب علم کو ماہانہ جو خرچہ بیٹھتا ہے مثلاً ۲۵۰ روپے، وہ مذکورہ سے مستحق زکوٰۃ طلبہ کو دے دیں اور ان کو یہ سمجھا دیں کہ تم پر ماہانہ ۲۵۰ روپے خرچ بیٹھتا ہے، تم کو نقدی شکل میں دیا جاتا ہے تم اس رقم کے مالک ہو، تم اپنے اختیار سے مدرسہ کے مطبخ میں جا کر اپنے کھانے کا وظیفہ جمع کر دو یا کسی اور دفتر میں جمع کر دو، طلبہ اس رقم کے مالک بننے کے بعد مدرسہ میں جا کر وہ رقم جمع کر دیں تو یہ صورت

جائز رہے گی۔ زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ بھی ادا ہو جائے گی اور اس رقم کو تنخواہ و تعمیرات میں لگانا بھی درست ہوگا۔ لیکن یہ واضح رہے کہ محض ہیرا پھیری نہ ہو، بلکہ واقعی تملیک ہو جانی چاہیے۔

(۱۶)

مدارس کے جو چندہ کی رقوم مدرسہ میں جمع کرتے ہیں، ان رقوم میں سے فی صد کے حساب سے سفراء کو کمیشن دینا جائز نہیں کیوں کہ یہ اجرت مچھول ہے، امانت یا روزانہ، کوئی مقدار اجرت کی مقرر و متعین نہیں، سفراء کو عاملین علیہا میں داخل کرنا درست نہیں، کیوں کہ عاملین وہ لوگ کہلاتے ہیں جو اسلامی ملک میں اسلامی حکومت کی طرف سے صدقات وغیرہ کے وصول کرنے پر مامور ہوتے ہیں۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے شرط یہ ہے کہ بلا کسی عوض فقراء کو اس کا مالک بنا دیا جائے اور تنخواہ ایک عوض ہے، عاملین کے علاوہ کسی اور کو تنخواہوں کا بہ مدد زکوٰۃ ادا کرنا صحیح نہیں، اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

”ولا تصح (ای الاجارة) حتی تتكون المنافع معلومة والاجرة معلومة“^(۱)

وفی الدر المختار و شرطها کون الاجرة والمنفعة معلومتین وفی

رد المحتار اما الاول فکقولہ بکذا درہم اودنا نیر“^(۲)



زکوٰۃ کے چند اہم مسائل

ان: مولانا محمد طیب الرحمن صاحب امیر شریعت شمال مشرق ہند

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

دوسری ہجری میں فرضیت رمضان کے قبل زکوٰۃ فرض کیا گیا۔ قرآن پاک میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ۳۲ جگہ میں نماز کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ کا ذکر کیا ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم روحی فداہ نے بے شمار احادیث میں زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی ہیں جس سے زکوٰۃ کی غیر معمولی اہمیت ثابت ہو رہی ہے اس لیے زکوٰۃ کے مسائل کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کی شدید ضرورت ہے، خاص طور پر جن دقیق مسائل کے بارے میں سوال نامہ تیار کرتے ہوئے فقہ عصر قاضی شریعت حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب نے ارسال کیا ہے ان کی تحقیق کرنا نہایت ہی ضروری ہے کیوں کہ دور حاضر میں یہ مسائل کثیر الوقوع ہیں زما کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوال نامہ تیار کرنے کی وجہ سے منگلر زماں مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب یقیناً قابل مبارک باد ہیں۔

محور اول

زکوٰۃ تین قسم کے اموال میں واجب ہوتی ہے،

(۱) نقد (۲) سواحم (۳) اموال تجارت

"اعلم ان الزکوٰۃ لاتجب الا فی نصاب نام - ۱ھ (شرح الوقایہ ۲۱۸)

وفى عمدة الرعاية ، حامله ان الزكوة لا تجب فى مال وان بلغ مقدار النصاب وحال عليه الحول ايحاً الا اذا وجد ثلثة اشياء احدها الشعية اه وثانيها السوم اه وثالثها التجارة اه فلما عداها اذا كانت بنسبة التجارة تجب فيه الزكوة والا لا (۱)

وجوب زکوة کی وہ شرطیں جن کا تعلق اموال سے ہے ان میں پہلی شرط ملک تام ہے۔ ملک تام سے مراد مملوک بہ اعتبار ملک اور قبض ہے۔ لہذا فی الجوهرة النيرة :

" لان الملك التام ما اجتمع فيه العلك واليد : (۲)

وفى رد المحتار : لان المراد بالتام المملوك رقبة وبيداء (۳)

وفى بدائع الصانع : ومنها الملك المطلق وهو ان يكون مملوكاً له رقبة

وبيدأ وهذا قول اصحابنا الثلاثة الخ (۴)

(۱) کسی مال پر زکوة واجب ہونے کے لیے ملک تام یعنی ملک اور قبض شرط ہے ، بنا علیہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہو سکی ہے تو وہ قیمت جو پیشگی ادا کی جا چکی ہے اس پر زکوة واجب نہیں ہوگی ، کیوں کہ اس پر مشتری کا ملک بھی نہیں ہے اور قبض بھی نہیں ہے۔ البتہ وہ مال جو مشتری کے ملک میں آچکا ہے لیکن قبض میں نہیں آیا اس پر زکوة واجب ہوگی یا نہیں اس کے بارے میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک اس پر زکوة واجب نہ ہوگی بہ سبب ملک ناقص کے اور صحیح قول یہ ہے کہ زکوة واجب ہوگی البتہ وجوب ادا قبض کے بعد ہوگا دین قوی کی طرح۔ وصول کے بعد ایام ماضیہ ماضیہ کی بھی زکوة دینی ہوگی۔

لعافى فتاوى عالمگیری : — "واما المبيع قبل القبض فمقيل لا يكون

نصاباً والصحيح انه يكون نصاباً كذا فى محيط الرخسى.

(۱) عمدة الرعاية ۲۱۸/۱ (۲) الجوهرة النيرة ۱۱۲/۱ (۳) رد المحتار ۵۶

(۴) بدائع الصانع ۹/۲ (۵) فتاوى عالمگیری ۸۸/۱

فی البحر^(۱)؛ وقد منا ان المبیع قبل القبض لا تجب زکوٰۃ علی
المشتري و ذکر فی المحيط فی بیان اقسام الدین ان المبیع قبل القبض
قلیل لا ینکون نصابا لان الملك فیہ ناقص بافتقار الید والصحیح انه
یکون نصابا لانه عوض عن مال کان یدہ ثابتة علیہ وقد
امکنه احتواء الید علی العوض فتعتبر یدہ باقیة علی النصاب
باعتبار التمكن شرعا اه فعلى هذا قولهم لا تجب الزکوة معناه
قبل قبضه واما بعد قبضه فتجب زکوٰۃ فیعامضی کالدین القوی
وفی شرائع النقایة^(۲) (مالک ملکاتاما) ای رقبۃ وید افلا تجب

علی المشتري فی مال اشتراه قبل القبض للتجارة الخ

(۲) کرایہ دار مالک مکان کو کرایہ کی مد میں جو پیشگی رقم یا ڈپوزٹ دیتا ہے جس کو عقد اجارہ کے
فسخ ہو جانے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کرنا پڑتا ہے ایسی پیشگی رقم یا ڈپوزٹ
دینا ضرورت کی طرف نظر کرتے ہوئے بیع بالوفاء پر قیاس کر کے جائز قرار دیا گیا ہے اور بیع بالوفاء
میں مشتری بائع کو جو قیمت ادا کرتا ہے اس قیمت میں بائع پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا مشتری پر اس میں
ائمہ احناف کا اختلاف ہے۔ قول راجح یہ ہے کہ اس کی زکوٰۃ مشتری پر واجب ہوگی نہ کہ بائع پر اور
مسئلہ مسئول عنہا میں کرایہ دار بہ منزلہ مشتری ہے اور مالک مکان بہ منزلہ بائع، بناء علیہ کرایہ کی مد
میں دی گئی پیشگی رقم یا ڈپوزٹ کی زکوٰۃ بھی قول راجح کی بنا پر کرایہ دار پر واجب ہوگی نہ کہ مالک
مکان پر۔ لما فی رد المحتار (۳)

” نعم یفتی بہ فیما دعت الیہ الحاجة وجوب بہ فی المدة
المدیة العادة و تعارفه الاعیان بلا تکثیر كالخلو المتعارف
كالحوانیت وهوان یجعل الواقف او المتولی او العالک فی الحانوت
قدرا معینا یؤخذ من الساکن الذی ثبت له الخلو ولا اجارتها

لغيره ما لم يبدفع اليه المبلغ المرقوم فيفتى بجواز ذلك قياساً على
بيع الوفاء الذي تعارفه المتأخرون احتيالا عن الربا حتى قال
في مجموع النوازل اتفق مشايخنا في هذا الزمان على صحته
بيعا لا اضطرار الناس الى ذلك ومن القواعد الكلية اذا ضاق الامر
اتسع حكمه فيندرج تحتها امثال ذلك معادعت اليه الضرورة
وفى رد المحتار^(۱) قلت ينبغي لزومها على المشتري فقط على
القول الذي عليه العمل الآن من ان بيع الوفاء منزل منزلة
الرهن وعليه فيكون الثمن ديناً على البائع تأمل - الخ

(۳) مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم جس کا کوئی مالک معین نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب
نہیں ہوگی، کیوں کہ زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ملک تمام شرط ہے اور مدارس اور اداروں میں
جمع ہونے والی رقم اموال موقوفہ کی طرح ہے اس کا کوئی مالک معین نہیں ہے اور اموال موقوفہ پر
زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

لما في الفقه على المذاهب الاربعة^(۲) : "ولا زكاة في المال الموقوف"

(۴) مال حرام اگر مال حلال کے ساتھ مخلوط ہوا ہے بلکہ وہ خالص مال حرام ہے تو ایسی صورت
میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ اس پر اس کی ملکیت نہیں ہے بلکہ مال حرام کا مالک اگر معلوم
ہے تو سارا مال مالک کو واپس کرنا واجب ہے اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو فقراء اور مساکین پر
مدد کرنا واجب ہے۔ مال حرام اگر مال حلال کے ساتھ مخلوط ہو جائے تو مال مخلوط سے مال حرام
کی مقدار نکال کر اگر بقدر نصاب بچتا ہے تو باقی مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر بقدر نصاب
نہیں بچتا ہے تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ حرام خلط سے مستہلک ہو جاتا ہے اور مقدار مال
حرام مستہلک کے ذمہ دین ہو جاتا ہے۔ لما في رد المحتار^(۳) :

(تحت قوله كما لو كان الكل خبيثا معنى القنية لو كان الخبيث نصابا

لا يلزمه الزكوة لان الكل واجب التصديق عليه اه وفي الدر المختار^(۱)
وفي القهستاني ولا زكوة في المغصوب والمملوك شراء فاسدا الخ
والمراد ما لم يخلطه بغيره لعدم الملك اه وفي فتح القدير^(۲) ولذا
قالوا لو ان سلطانا غصب مالا وخلطه صار ملكا له حتى وجبت عليه
الزكوة وورث عنه الخ وفي منحت الخالق على البحر الرائق^(۳)
ومن ملك اموالا غير طيبة او غصب اموالا وخلطها ملكها بالخلط
ويصير ضامنا وان لم يكن له سواها نصاب فلا زكوة عليه فذلك
الاموال وان بلغت نصابا لانه مديون ومال المديون لا ينعتق سببا
لوجوب الزكوة عندنا وفي رد المحتار^(۴) وفي الفصل العاشر من
التتارخانية عن فتاوى الحجة من ملك اموالا غير طيبة او غصب
اموالا وخلطها ملكها بالخلط ويصير ضامنا وان لم يكن له سواها
نصاب فلا زكوة عليه فيها وان بلغت نصابا لانه مديون ومال
المديون لا ينعتق سببا لوجوب الزكوة عندنا اه۔

(۵) دین کی زکوٰۃ فی احوال ادا کرنا دائن یا مدیون دونوں میں سے کسی پر واجب نہیں ہوتی۔ دائن پر اس
لیے واجب نہیں ہوتی کہ اس کی ملک ہونے کے باوجود قبض نہیں ہے لہذا قبض کے قبل دائن کی ملک
تمام نہیں ہے اور مدیون پر اس لیے واجب نہیں ہوتی کہ مال اس کے قبض اور تصرف میں ہونے کے
باوجود بھی اس پر اس کی ملک نہیں ہے، اگر مدیون کی ادائے گئی کی قدرت کے باوجود مال مٹول کرے
اور اس کو تجارت میں لگا کر استفادہ کرتے رہے تو بھی مدیون پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیوں کہ اس پر
مدیون کی ملک نہیں ہے اور زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ملک تمام یعنی ملک اور قبض دونوں شرط ہے۔
وصولیابی کے اعتبار سے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دین کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) الدر المختار ۶/۲ (۲) فتح القدير ۴۸۴/۱ (۳) بحر الرائق ۲۱/۲

(۴) رد المحتار ۲۵۰

(۱) قوی (۲) متوسط (۳) ضعیف

- (۱) دین قوی وہ دین ہے جو قرض یا مال تجارت کے بدلے بہ ذمہ مدیون عائد ہوا ہو۔
 (۲) دین متوسط وہ دین ہے جو نقد یا مال تجارت کے علاوہ دوسری کسی قسم کے مال کے بدلے بہ ذمہ مدیون عائد ہوا ہو، جیسے لباس بذلہ خدمت کے عبادار ہنے کے گھر وغیرہ کی قیمت۔
 (۳) دین ضعیف وہ دین ہے جو کسی قسم کے مال کے بدلے میں بہ ذمہ مدیون عائد نہیں ہوا ہو، جیسے دین مہر، وصیت وغیرہ۔

دین قوی کی زکوٰۃ دائن پر اصل وقت سے ہر سال واجب ہوتی رہتی ہے لیکن وجوب ادا اسی وقت ہوتا ہے جب چالیس درہم یا اس کے مقدار روپیہ وصول ہو جائے اس کے پہلے ادا کرنا واجب نہیں ہوتا لیکن وصول کے بعد سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ دینا واجب ہوگا، دین ضعیف پر قبض ہونے کے بعد جب سال بھر گزر جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دینا واجب نہ ہوگا۔ دین ضعیف پر قبض ہونے کے بعد جب سال بھر گزر جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دینا واجب نہ ہوگا۔ دین متوسط کے بارے میں امام ابو حنیفہ کے دو قول ہیں، ایک قول کے مطابق دین متوسط کا حکم دین قوی کی طرح ہے مگر وجوب ادا چالیس درہم کی وصول یا بی پر نہیں بلکہ پورا الفسا یعنی دو سو درہم کے وصول ہونے پر ہوگا اور سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی، اور دوسرے قول کے مطابق دین متوسط دین ضعیف کے حکم میں ہے یعنی وصول یا بی کے بعد جب سال بھر گزر جائے تب زکوٰۃ واجب ہوگی، سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دینا واجب نہ ہوگا، دونوں قول کی جانب تصحیح بھی موجود ہے۔ البتہ صاحب بدائع الصنائع نے دین متوسط کو دین ضعیف کے حکم میں اعتبار کرتے ہوئے اسی کو اصح قرار دیا ہے:

”نقول قسم ابو حنیفۃ الدین ثلاثۃ اقسام قوی وهو بدل القرض

ومال التجارۃ - ومتوسط وهو بدل مالیس للتجارۃ کثمن المذلة

وعبدالخدمۃ ودارالسکى وضعیف وهو بدل مالیس بمال

کالمہر والوصیۃ وغیرہ ففی القوی تحب الزکوٰۃ اذا حال الحول

ویستراعی الاداء الخ ان یقبض اربعین درهما ففیہا درہم وکذا فیما

زاد فی حسابہ وفی المتوسط لا تحب مالہ یقبض نصابا وتعتبر

الماضي من الحول في صحيح الرواية وفي الضعيف لا تجب ما لم
 يقبض نصاباً ويحول الحول بعد القبض عليه (١)
 وفي الفقه على المذاهب الأربعة (٢) ويعتبر حولان الحول في الدين
 القوي من وقت ملك النصاب لامن وقت القبض فيجب اداء الزكاة
 بمجرد القبض بخلاف اما الدين المتوسط فانه لا تجب الزكاة
 الا اذا قبض منه نصاباً فان كان الدين خمس مائة درهم مثلاً و
 قبض مائتين وجب عليه ان يخرج خمسة درهم ولا يجب عليه
 فيما دون ذلك كما تقدم والدين المتوسط مثل الدين القوي في
 حولان الحول عليه فيعتبر حوله بحسب الاصل لامن وقت القبض
 في الاصح واما الدين الضعيف فانه يجب اداء الزكاة فيه بقبض
 نصاب منه بشرط ان يحول عليه الحول من وقت القبض
 وفي بدائع الصنائع (٣) واما الدين المتوسط فما وجب له
 بدلا من مال ليس للتجارة كثمن عبد الخدمة وثمن ثياب
 البذلة والمهنة وفيه روايتان عنه الى قوله وروى ابن سماعة
 عن ابي يوسف عن ابي حنيفة رحمهم الله تعالى انه لا زكاة فيه
 حتى يقبض المائتين ويحول عليه الحول من وقت القبض وهو
 اصح الروايتين عنه -
 وفي المبسوط (٤) وروى ابن سماعة عن ابي يوسف عن ابي
 حنيفة رحمهم الله تعالى ان الدين نوعان وجعل الوسط كالضعيف
 وهو اختيار الكرخي على ما ذكره في المختصر -

(١) فتح القدير ٢٩١/١ (٢) الفقه على المذاهب الأربعة ٦٣/١

(٣) بدائع الصنائع ١٢/٢ (٤) المبسوط ١٩٥/١

(۶) پراویڈنٹ فنڈ میں ملازم کی جو رقم جمع کی جاتی ہیں خواہ وہ ملازم کی تنخواہ سے وضع کی ہوئی رقم ہو یا سرکار یا کمپنی کی طرف سے اضافہ کی ہوئی رقم ہو یا رقم انٹرسٹ ہو وہ بہ ذمہ سرکار یا کمپنی قرمن ہے، لہذا اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں، اس کے بارے میں حکم لگانے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ دین کے اقسام میں سے کس قسم کا دین ہے۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ وہ ملازم کی خدمت کا معاوضہ ہے، اب دیکھنا چاہیے کہ خدمت کا معاوضہ یعنی اجرت مال ہے یا نہیں، پھر اگر مال ہو تو وہ مال تجارت کی منزل میں ہے یا مال غیر تجارت کی منزل میں امام ابو حنیفہ رحمہ سے اجرت کے بارے میں تین روایات مذکور ہیں، ایک روایت میں اجرت کو مہر کے مانند قرار دیا گیا، کیوں کہ وہ حقیقہً مال کا بدلہ نہیں ہے بلکہ وہ منفعت کا بدلہ ہے اور منفعت حقیقہً مال نہیں ہے۔ اس روایت کی بنا پر وہ دین ضعیف ہوگا، دوسری روایت میں منافع کو من وجہ مال اعتبار کرتے ہوئے اجرت کو ثمن ثیاب بذلکے مانند قرار دیا، اس روایت کی بنا پر وہ دین متوسط ہوگا، تیسری روایت میں بدل منفعت کو بدل عین کی منزل میں اعتبار کرتے ہوئے اجرت ہو عبد تجارت کو ثمن متاع تجارت کی منزل میں اعتبار کیا گیا اس روایت کی بنا پر اجرت عبد تجارت دین قوی کے قبیل سے ہوگا۔

پراویڈنٹ فنڈ کی رقم اجرت عبد تجارت نہیں ہے بلکہ وہ اجرت حر ہے لہذا یہ دین دین قوی نہیں ہو سکتا بلکہ وہ دین ضعیف ہوگا یا دین وسط ہوگا۔ دین متوسط ہونے کی تعدد پر منافع کو مال کے قبیل سے شمار کرنا پڑتا ہے لہذا اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ کتاب المیوع میں ائمہ احناف کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ منافع مال کے قبیل شمار کیا جائے تو ائمہ احناف کے قول میں باہم تعارض پیدا ہوتا ہے لہذا اس کو دین ضعیف قرار دینا ہی راجح معلوم ہوتا ہے، علاوہ بریں اصح روایت کی بنا پر دین متوسط بھی دین ضعیف کے حکم میں ہے جس کے متعلق ماقبل میں تفصیل سے ذکر کیا چکا ہے ورنہ دین ضعیف کا حکم یہ ہے کہ دین قبض ہونے کے بعد جب سال بھر گزر جائے اس وقت زکوٰۃ لازم ہوتی ہے، سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بنا علیہ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ قبض ہونے کے بعد جب سال بھر گزر جائے اس وقت زکوٰۃ لازم ہوگی۔ لما فی المجموعۃ: (۱۹۶/۱)

وفی الاجرة ثلاث روایات من ابی حنیفۃ فی روایۃ جعلها کالمہر لانہا

لیست ببدل عن المال حقیقۃ لانہا بدل عن المنفعة وفی روایۃ

تناسل اور تجارت کے ذریعہ جو زیادت حاصل ہوتی ہے اسے نما، حقیقی کہتے ہیں، اور نما، تقدیری مال کا مالک یا اس کے نائب کے ہاتھ میں ہونے کو کہتے ہیں جس سے تجارت وغیرہ کی قدرت حاصل ہوتی ہے۔

لما فی رد المحتار^(۱) النماء فی اللغة الزیادة الزکوة الم و فی الشرع
هو نوعان حقیقی و تقدیری فالحقیقی الزیادة بالتوالد و التناسل
والتجارة و التقدیری تمكنه من الزیادة بكون المال فی یدہ او ید
نائبہ۔

تیسری شرط حاجت اصلیه

حاجت اصلیه ایسی حاجت اور ضرورت کو کہتے ہیں جس سے انسان اپنی ہلاکت کو دفع کرتا ہے، تحقیقاً ہو، جیسے کپڑا وغیرہ یا تقدیراً ہو، جیسے قرض وغیرہ اور حاجت اصلیه کا تعین ہر دور اور ماحول میں اس کے اعتبار سے کیا جائے گا۔ لما فی الفقہ علی المذاهب الاربعہ^(۲)

”و یعتبر فی الراحلة ما یلیق بالشخص عادة و عرفاً و یختلف
ذلك باختلاف احوال الناس الخ

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے؟ — دین کی قسمیں اور ان کے احکام :
مانع وجوب زکوٰۃ ہونے اور نہ ہونے کے اعتبار سے دین کی تین قسمیں ہیں :
(۱) وہ دین جو خالص بندہ کے لیے ہے اور بندوں کی طرف سے اس کا طلب کرنے والا موجود
ہے، جیسے قرض، شمن، بیع وغیرہ۔

(۲) وہ دین جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے لیکن بندہ کی طرف سے اس کا طلب کرنے والا ہے، جیسے
زکوٰۃ، خراج وغیرہ۔ اس کے لیے بندہ کی طرف سے طلب کرنے والا امام یا نائب امام ہے

(۱) رد المحتار ۵/۲ (۲) الفقہ علی المذاهب الاربعہ ۶۲۳/۲

بسمہ نبول ثياب البذلة لان المنافع مال من وجه لكنه ليس
بمحل لوجوب الزکوة فيه والاصح ان اجرة دار التجارة او عبد
لتارة بمنزلة ثمن مشاع التجارة كلما قبض منها اربعين تلزمه
الزکوة اعتبارا ببدل المنفعة ببدل العين - (۱)

وفى البحر الرائق^(۲) ولو اجر عبده او داره بنصاب ان لم يكونا للتجارة
لا تجب مالهم يحل الحول بعد القبض فى قوله وان كان للتجارة كان
حكمه كالقوى لان اجرة مال التجارة كضمن مال التجارة فى صحيح
الرواية اه -

وفى منحة الخالق^(۳) وفى اجرة مال التجارة او عبد التجارة روايتان
فى رواية لازکوة فيها حتى يقبض ويحول عليها الحول لان المنفعة
ليست بمال حقيقة فصار كالمهر، وفى ظاهر الرواية تجب الزکوة
فيها ويجب الاداء اذا قبض منها ما تى درهم لانها بدل عن مال
ليس بمحل لوجوب السررة فيه لان المنافع مال حقيقة لكنها ليس
بمحل لوجوب الزکوة لانها لا تصلح لانها لا تبقى سنة اه قلت
وهذا صريح فى انه على الرواية الاولى من الدين الضعيف و
على ظاهر الرواية من المتوسط لامن القوى لان المنافع ليست
مال زکوة وان كانت مالا حقيقة تأمل ثم رأيت فى الولوا جمية
التصريح بان فيه ثلاث روايات :-

دوسری شرط نما

نما کے لغوی معنی زیادت ہے، اس کی دو صورتیں ہیں، نما، حقیقی اور نما، تقدیری۔ تو والد

اور وہ اس طرح ہے کہ شروع اسلام سے حضرت عثمان غنی کے وقت تک زکوٰۃ امام المسلمین وصول کرتے تھے ان کے بعد کے دور سے ارباب اموال، اموال باطنہ کی طرف سے دکلاء کے طور پر ہیں۔

(۳) وہ دین جو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور اس کا طلب کرنے والا بندہ کی طرف سے کوئی نہیں ہے اگرچہ قیامت میں ان کا مطالبہ ہوگا، جیسے ندور، کفارات، حج وغیرہ۔ پہلے دو قسم کے دین مانع وجوب زکوٰۃ ہیں اور تیسری قسم دین مانع وجوب زکوٰۃ نہیں۔

اکثر ائمہ احناف کے نزدیک دین خالص للعباد معجل ہو یا مؤجل دونوں صورتوں میں مانع وجوب زکوٰۃ ہے۔ بعض کے نزدیک دین خالص للعباد اگر مؤجل ہو جائے تو وہ مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے، مثال کے طور پر انھوں نے بتایا کہ عورت کا مہر مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے، کیوں کہ عادتاً اس کے لیے بندہ کی طرف سے مطالبہ نہیں ہے اور بعض نے یہ بھی بتایا کہ زوج کے ہاتھ میں جو نقد موجود ہے اسے اگر دین مہر ادا کرنا مقصود ہو تو وہ مانع وجوب زکوٰۃ ہوگا، ورنہ نہیں۔ صاحب رد المحتار نے صاحب معراج سے بیان کیا کہ امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق دین مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور قہستانی نے جواہر سے نقل کیا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ دین مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے۔ خلاصہ یہ نکلا کہ دین خالص للعباد کے بارے میں تین اقوال ہیں۔

(۱) معجل اور مؤجل دونوں مانع زکوٰۃ ہے۔

(۲) معجل مانع ہے مؤجل مانع نہیں ہے۔

(۳) اگر عزم ادا ہو تو مانع ہے ورنہ نہیں۔

اور قہستانی نے جواہر سے ثانی قول کی ترجیح و تصحیح نقل کیا ہے نیز وجوب زکوٰۃ میں جو صورتیں انفع للفقراء ہے اس کی رعایت کرنے کے لیے فقہا کرام نے تصریح کی ہے اس لیے قول ثانی کو ترجیح دینا ہی الزم ہے۔

سرکار اپنے شہریوں کو موجودہ دور میں طویل الاجل جو دین بہ صورت زراعتی قرض، صناعی قرض، تعمیر مکان کے لیے قرض وغیرہ قرض دیتی ہے اور قسط وار ان کو ادا کرنا پڑتا ہے، وہ بھی دین خالص للعباد ہے اور اس میں بھی مطالبہ صرف سالانہ واجب الاداء قسط کا ہے اور مدیون کے ہاتھ میں جو نقد ہے اس سے سالانہ واجب الاداء قسط کے علاوہ باقی رقم ادا کرنے کا عزم بھی نہیں ہوتا، بناء علیہ ایسے طویل الاجل قرضوں میں

اموال زکوٰۃ سے سالانہ واجب الادا قسط وضع کر کے باقی اموال مقدار نصاب ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ لمافی الفقہ علی المذاہب الاربعۃ^(۱)

الحنفية قالوا ينقسم الدين بالنسبة لذلک الى ثلثة اقسام الاول ان يكون ديناً خالصاً للعباد۔ الثاني ان يكون ديناً لله تعالى ولكن له مطالب من جهة العباد كدين الزکوٰۃ والمطالب هو الامام في الاموال الظاهرة وهي السوائم وما يخرج من الارض او نائب الامام في الاموال الباطنة وهي الاموال التجارية كالذهب والفضة ونائب الامام هم الملاك لان الامام كان يأخذها الى زمان عثمان رضي الله عنه ففوضها عثمان الى اربابها في الاموال الباطنة الثالث ان يكون ديناً خالصاً لله تعالى ليس له مطالب من جهة العباد كديون الله تعالى الخالصة من سائر وكفارات ومدقة فطر ونفقة حج فالدين الذي يمنع وجوب الزکوٰۃ هو دين القسمين الاولين الخ واما الثالث فانه لا يمنع وجوب الزکوٰۃ۔

وفي بدائع الصنائع^(۲) وعلى هذا يخرج مهر المرأة فانه يمنع وجوب الزکوٰۃ عندنا معجلاً كان او مؤجلاً لانها اذا طالبت به يؤخذ به وقال بعض مشائخنا ان المؤجل لا يمنع لانه غير مطالب به عادة فيمنع وقال بعضهم ان كان الزوج على عزم من قصائه يمنع وان لم يكن على عزم القضاء لا يمنع لانه لا بعد له ديناً وانما يؤخذ المرء بما عنده من الاحكام۔

وفي الدر المختار^(۳) فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد سواء كان لله كزکوٰۃ وخراج اولي العبد ولو كفالة او مؤجلاً ولو صداق زوجته

المؤجل للفراق -

وفى الدر المختار^(۱) : تحت قوله أو مؤجلاً عزاه فى المعراج إلى
شرح الطحاوى وقال وعن ابى حنيفة لا يمنع وقال الصدر الشهيد
لارواية فيه والكل من المنع وعدمه وجه زاد القهستاني عن
الجواهر والصحيح انه غير مانع -

وفى فتح القدير^(۲) : وهل يمنع الدين المؤجل كما يمنع
المعجل فى طريقة الشهيد لارواية فيه ان قلنا لا فله وجه
وان قلنا نعم فله وجه ولو كان عليه مهر لامرأته وهو
لا يريد ادائه لا يجعل مانعا من الزكاة ذكره فى التحفة عن
بعضهم ان كان مؤجلاً لا يمنع لانه غير مطالب به عادة انتهى
وهذا يفيد ان المراد المؤجل عرفاً لا شرطاً مصرحاً به والا لم يمنع
قوله لانها متى طلبت اخذته ولا بانه غير مطالب به عادة لان هذا
فى المعجل لا المؤجل شرطاً فلا معنى لتقييد عدم المطالبة فيه
بالعادة ۛ

کمپنیز پر زکوٰۃ

کوئی بھی کمپنی متعدد شرکاء سے سرمایہ حاصل کرتے ہوئے جو کاروبار کرتے ہیں اس کاروبار کو
چلانے کے لیے کمپنی عام طور پر سرمایہ کے ایک حصہ کو تجارت چلانے کے لیے ضروری اسباب مثلاً
تعمیر مکان، آلات حرفت، بیع ارامنی وغیرہ مختلف ایسی چیزوں کو خریدنے میں لگاتی ہیں جن کی عین کو باقی رکھتے
ہوئے نفع حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے اور سرمایہ کے ایک حصہ کو تجارت میں لگا کر نفع حاصل کرنا مقصود ہوتا
ہے۔ شرکاء اپنے اپنے حصہ کے مطابق تجارت کے اموال آمدنی آلات حرفت وغیرہ کے مالک ہوتے ہیں

ایسی صورت میں نصاب وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہ ہوگا کیوں کہ مجموعی مالیت پر کسی ایک کی ملکیت نہیں ہے بلکہ اس پر شرکا میں سے ہر کوئی شریک ہے اور ہر فرد کی ملکیت اپنے انفرادی حصہ پر ہے لہذا کمپنی اپنے سرمایہ کے کسی حصہ کو آلات حرفت، تعمیر مکان وغیرہ اسباب جن کی میں کو باقی رکھتے ہوئے نفع حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ ایسے اسباب خریدنے میں اگر صرف کریں تو سرمایہ کے اسی حصہ کو علیحدہ کرتے ہوئے باقی سرمایہ پر یا شرکا سے جن فرد کا جو حصہ رہے گا وہ اگر مقدار نصاب ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں، کیوں کہ حالت انفرادیہ جس شئی کا اعتبار کیا جاتا ہے حالت شرکت میں بھی اسی کا اعتبار کیا جاتا ہے۔^(۱) فی رد المحتار؛

وكذلك آلات المحترفين اى سواء كانت مما لا تستهلك عينه
فى الانتفاع كالقدوم والمبرد او تستهلك لكن هذا منه مالا
يبقى اشرعيه كصابون وحوش لغسال ومنه ما يبنى كعصف
وزعفران لمصباغ ودهن وعفص، للدباغ فلا زكوة فى الاولين
لان ما يأخذه من الاجرة بمقابلة العمل وفى الاخيرة الزكوة اذا حال
عليه الحول لان المأخوذ بمقابلة العين كما فى الفتح -

وفى البدائع^(۲)؛ ويعتبر فى حال الشركة ما يعتبر فى حال
الانفراد وهذا عندنا -

ولما فى الدر المختار^(۳)؛ ولا تجب الزكوة فى نصاب مشترك
من سائمة ومال تجارة وان صحت الخلطة فيه (الى ان قال) وان
تعد النصاب تجب اجماعاً ويتراجعان بالحصص وببيان فى
الحاوى فان بلغ نصيب احدهما نصاباً زكاه دون الاخر^(۴) - المراد ان
يكون بلوغه النصاب بسبب الاشتراك ومنهم احد المالين الى
الاخر بحيث لا يبلغ مال كل منهما با انفراده نصاباً -

(۱) رد المحتار ۱۱/۴ (۲) البدائع ۱۶/۴ (۳) الدر المختار ۲۶/۴ (۴) ايضاً ۲۶/۴

والیضا فی رد المحتار^(۱) (وان تعدد النصاب) ای بحیث یبلغ قبل الضم مال کل واحد بانفراده نصابا فانه یجب حیثیضا علی کل منهما زکوۃ نصابہ۔
وفی العالمگیریۃ^(۲) فان کان نصاب کل واحد منهما یمثل نصابا وجبت الزکوۃ والا فلا سواء کانت شرکتہما عتانا او مفاضة او شركة ملک بالارث وغیره من اسباب الملك۔

ہیرے اور جواہرات

ہیرے اور جواہرات اگر تجارت کی نیت سے کسی کی ملکیت میں ہو تو اس پر زکوۃ واجب ہوگی ورنہ زکوۃ واجب نہ ہوگی، لہذا کوئی اگر اپنے سرمائے کو محفوظ کرنے کی غرض سے ہیرے اور جواہرات خرید کر کے بدون نیت تجارت کے محفوظ رکھے تو اس پر زکوۃ واجب نہ ہوگی۔ لما مر فی سرائی الفلاح^(۳) ولا زکوۃ فی الجواہر واللائی الا ان یتملکھا بنية التجارة کما فی العروص۔

وفی الطحاوی^(۴) قال فی الدر الاصل ان ما عد الحبرین والسواثم انما یزکی بنية التجارة عند العقد فلو نوى التجارة بعد العقد او اشترى شیئا للقتية فاولیا انه ان وجد ربحا باعہ لازکوۃ علیہ۔

وفی الجوہرۃ^(۵) واما الیواقیت واللائی والجواہر فلا زکوۃ فیہا وان کانت حلیا الا ان تكون للتجارة۔

وفی الدر المختار^(۶) لازکوۃ فی اللآلی والجواہر وان سوت الفا اتفاقا

(۱) رد المحتار ۴/۲۶ (۲) العالمگیریۃ ۱/۱۸ (۳) سرائی الفلاح ۳۹۷

(۴) الطحاوی: ۳۹۷ (۵) الجوہرۃ ۱۱۲/۴ (۶) در مختار ۱۸/۴

الا ان تكون للتجارة والاصل ان هاعدا الحجرين والسواثم انما يبيزكى
بنية التجارة الى ان قال ولو نوى التجارة بعد العقد او اشترى
شيئا للتسوية فابا انه ان وجد ربحا باعه لا زكاة عليه -

اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت جو تاجر کے قبضہ میں ہے تاجر اگر اس مال کی زکوٰۃ نقد روپیہ سے ادا کرنا چاہے تو
اس کی قیمت متعین کرنے کے وقت اگر تاجر کی لاگت کے حساب سے یا تھوک کے بھاؤ سے متعین کیا جاوے
تو اس میں فقرا کی رعایت نہ ہوگی، حالیکہ عند الشرع وہ مطلوب ہے لہذا اس کی وہ قیمت معتبر ہوگی جو دھوب
کے دن عام طور رائج و معروف ہو اور اس میں پھٹک فروختگی کے بھاؤ کا اعتبار ہوگا، نیز اموال اگر سائٹ میں
سے ہو تو یوم الاداء کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ لما فی الجوهرة النيرة^(۱) :

ثم المعتبر في القيمة عند ابی حنیفة یوم الوجوب ولا یلتفت
بعد ذلك الى زیادة القيمة ونقصانها وعندهما یوم الاداء الى
الفقراء -

وفی جامع الرموز^(۲) : لكن للمالك ولاية نقل قيمته یوم
الاداء عندهما ویوم الوجوب عنده علی ما قال بعضهم وقال آخرون
فی السائمة العین ویجوز قيمته یوم الاداء وفی غیرها العین
او قيمته یوم الوجوب -

وفی الدر المختار^(۳) : وتعتبر القيمة یوم الوجوب وتالا یوم
الاداء وفی السواثم یوم الاداء اجماعاً وهو الاصح ویقوم فی البلد
الذی الحال فیہ -

وفی رد المحتار^(۴) : وهو تصحیح للقول الثانی الموافق لقولہما و

(۱) الجوهرة النيرة ۱۳/۱ (۲) جامع الرموز ۱۳۹/۱ (۳) رد المحتار ۳۶/۲ (۴) رد المحتار ۳۶/۲

عليه فاعتبار يوم الااء يكون عتقاً عليه عنده وعندهما -
 کوئی ارامنی کی خرید و فروخت کو اگر تجارتی کاروبار کے طور پر کرے تو بھی وہ ارامنی اموال زکوٰۃ میں
 شمار نہیں کی جائے گی، کیونکہ ارامنی پر عشر یا خراج واجب ہوتا ہے اس لیے اگر ارامنی پر زکوٰۃ بھی واجب
 ہو جائے تو ایک ہی سبب پر روحی لازم کرنا پڑتا ہے حالیکہ وہ عند الشرع جائز نہیں ہے۔
 لما فی قامنی خان^(۱) ولو اشترى ارض عشر او خراج للتجارة لا يجب
 فيها الزکوۃ۔

وفی الکفاية حاشية على الهداية^(۲) : واما اذا اشترى شيئاً لم
 يصلح فيه نية التجارة لا يصير للتجارة بان اشترى ارضاً خراجية
 أو عشرية بنية التجارة فانه لا يجب فيها زکوۃ التجارة لانه
 لا يصلح فيه نية التجارة لانه الوصحت يلزم فيها حقان بسبب واحد
 وهو الارض۔

وفی الدر المختار^(۳) والاصل ان ما عدا الحبرين والسواثم
 انما يترك بنية التجارة بشرط عدم المانع المودى الى الشئ۔ الخ۔
 وفی رد المحتار^(۴) (تنبيه) ما ذكره الشارح من عدم وجوب
 الزکوۃ فی الارض العشرية للتجارة وانما فيها العشر والخراج للمانع
 المذكور قال فی البدائع هو الرواية المشهورة عن اصحابنا (الى قوله)
 ووجه ظاهر الرواية ان سبب الوجوب فی كل واحد لانه يضاف
 اليها فيقال انه عشر الارض وخراجها وزكاتها والكل حق الله تعالى
 وهو حقوقه تعالى المتعلقة بالاموال النامية لا يجب فيها حقان منها
 بسبب مال واحد كزکوۃ السائمة مع التجارة فانهم۔

(۱) قامنی خان : ص ۸۸ (۲) الکفاية حاشية على الهداية : ۲۶/

(۳) الدر المختار ۱۷۲ (۴) رد المحتار ۱۷۲

شیرز اور بونڈز کی زکوٰۃ

کسی بھی کمپنی کے شیر خرید کرنے کے معنی اس کمپنی کی تجارت میں شریک ہونا ہے۔ اگر شیر ہولڈر کو معلوم ہو کہ شیر کی رقم کس صورت میں ہے تو ماقبل میں کمپنی پر زکوٰۃ کے زیر بحث وجوب زکوٰۃ کے بارے میں جو حکم بتایا گیا ہے شیر کے بارے میں بھی وہی حکم ہوگا۔ شیر کی رقم کے بارے میں اگر یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کس صورت میں ہے تو اصل رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور نفع معلوم ہو تو اصل اور نفع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

قرض دینے والا جو سرمایہ بونڈز پر لگانا ہے وہ بہ ذمہ حکومت یا کمپنی قرض ہے اور وہ دین قوی کے قبیل سے ہے، بنا، علیہ بونڈز کی زکوٰۃ دائن پر اصل وقت سے ہر سال واجب ہوتی رہے گی، لیکن سال بہ سال ادا کرنا واجب نہ ہوگا بلکہ وصولی کے بعد ادا کرنا ہوگا، اس لیے بونڈز کے کیش کرانے کے بعد سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی۔ ماقبل میں دین کی قسمیں اور دین کی زکوٰۃ کے حکم کے تحت دلائل ذکر کیا جا چکا ہے۔

محور ثانی نصاب زکوٰۃ

چاندی اور سونے کے نصاب میں سے کسی ایک کے نصاب کو اصل اور دوسرے کو فرع اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ ہر ایک اپنے اپنے نصاب کے اعتبار سے مستقل ہے، لہذا سونے اور چاندی دونوں اگر علی الانفراد بہ قدر نصاب ہوئے تو دونوں کو ایک ساتھ نہ ملایا جائے گا، بلکہ چاندی اور سونا ہر ایک کی زکوٰۃ علاحدہ علاحدہ ادا کریں۔ اگر چاندی اور سونا دونوں میں سے کوئی قدر نصاب نہ ہو یا دونوں میں سے ایک قدر نصاب ہو اور دوسرا قدر نصاب نہ ہو تو ضم لازم ہے یعنی ایک کے اصل کے ساتھ دوسرے کی قیمت کو ملایا جائے گا، سونا اور چاندی دونوں میں سے جس کی قیمت دوسرے کے ساتھ ملانے میں فقرائے کے لیے نفع ہے ضم کے وقت اس کی رعایت کرنا واجب ہے نیز دونوں میں سے اگر ایک کو دوسرے کی قیمت کے ساتھ ملانے سے مقدار نصاب یہ ہو اور اس کے عکس پر مقدار نصاب ہو تو جس کی قیمت کو دوسرے کے ساتھ ملانے سے نصاب پورا ہوتا ہے اس کی رعایت کرنا بھی واجب ہے۔

لعافى رد المحتار: وفى البدائع ايضاً ان ما ذكر من وجوب الضم اذا

لم يكن كل واحد منهما نصاباً بان كان اقل فلم كان كل منهما نصاباً

تماماً بدون زيادة لا يجب الضم بل ينبغى ان يؤدي من كل واحد
 زكواته فلو ضم حتى يؤدي كله من الذهب او الفضة فلا بأس
 به عندنا ولكن يجب ان يكون التقويم بما هو انفع للفقراء وارجا
 والا يؤدي من كل منهما ربع عشرة - (١)

وفى بدائع الصنائع^(٢) واذا كان تقدير النصاب من اموال
 التجارة بقيمتها من الذهب والفضة وان تبلغ قيمتها مقدار
 نصاب من الذهب والفضة فلا بد من التقويم حتى يعرف
 مقدار النصاب ثم بما اذا تقوم ذكر القدر وفى شرحه مختصر
 الكرخى انه يقوم بادنى القيمتين من الدراهم والدنانير حتى
 انها اذا بلغت بالتقويم بالدراهم نصابا ولم تبلغ بالدنانير قومت
 بما تبلغ به النصاب وكذا روى عن ابى حنيفة فى الامالى انه
 يقومها بانفع التقديرين للفقراء -

وفى بدائع الصنائع^(٣) فاما اذا كان الصنفان جميعا فان لم يكن
 كل واحد منهما نصابا بان كان له عشرة مثاقيل ومائة درهم فانه
 يضم احدهما الى الآخر فى حق تكميل النصاب عندنا -

وفى بدائع الصنائع^(٤) وهذا الذى ذكرنا كله من وجوب الضم
 اذا لم يكن كل واحد منهما نصابا بان كان اقل من النصاب فاما اذا كان
 كل واحد منهما نصابا تاما ولم يكن زائدا عليه لا يجب الضم بل
 ينبغى ان يؤدي من كل واحد منهما زكواته ولو ضم احدهما
 الى الآخر حتى يؤدي كله من الفضة او من الذهب فلا بأس به
 عندنا ولكن يجب ان يكون التقدير بما هو انفع للفقراء وارجا الم -

(١) رد المحتار ٣٥/٢ (٢) بدائع الصنائع ٢١/٢ (٣) ايضا ١٨/٢ (٤) بدائع الصنائع ٢/٢

(۳) مصارف زکوٰۃ

(۱) مدرسہ اگر طالب علم کے طعام، قیام، تعلیم اور دوسری سہولتوں کا انتظام کرے اور یہ نظام مقرر کرے کہ فی کس طالب علم پر ان سہولتوں کی فراہمی میں جو خرچ عائد ہوتا ہے طالب علم کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے پاس سے اس رقم کو ادا کرے، مدرسہ فی کس طالب علم پر خرچ کا جو حصہ آتا ہے اگر حساب کرتے ہوئے اس کو یہ طور ماہواری فیس مقرر کر لے تو ایسی صورت میں جو طالب علم مصرف زکوٰۃ ہے اس کی طرف سے مقررہ فیس ادا کرنے کے لیے مدرسہ اگر مذکوٰۃ سے اس رقم کا چیک اس طالب علم کے نام دے دے اور طالب علم وہ چیک وصول کرنے کے بعد مدرسہ میں جمع کر دے تو یہ صورت جائز ہوگی۔ طالب علم نہ دے کہ مدرسہ اگر یہ مقررہ فیس مذکوٰۃ سے ادا کرے تو یہ جائز نہ ہوگا کیوں کہ مہتمم مدرسہ کے پاس زکوٰۃ کی جو رقم ہے وہ عین ہے اور دین عین نہیں ہے اور عین کی زکوٰۃ غیر عین سے ادا نہیں ہوتی نیز عین کی تملیک ہر کسی کو کی جاسکتی ہے لیکن دین کی تملیک من علیہ الدین کے علاوہ دوسرے کسی کو نہیں کی جاسکتی۔

مہتمم مدرسہ یا ان کے نائبین کے پاس جو لوگ زکوٰۃ دیتے ہیں وہ معلوم اور معین ہیں اور وہ لوگ اس نیت سے ان کے ہاتھ میں زکوٰۃ دیتے ہیں کہ وہ زکوٰۃ کو مستحقین کے پاس پہنچا دیں گے، لہذا مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دینے والوں کا وکیل ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ مستحقین زکوٰۃ اگر کسی شخص کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے ان کی طرف سے وکیل مقرر کریں تو وہ ان کا وکیل ہو سکتا ہے لیکن مستحقین کے عدم تقرر کی حالت میں کوئی شخص ان کا وکیل نہیں ہو سکتا، مدرسہ کے مستحقین طلبہ عادیہ مہتمم مدرسہ کو اپنی طرف سے وکیل نہیں بناتے نیز طلبہ بھی ایک آتے ہیں تو دوسرے جاتے ہیں ایسی صورت میں مہتمم مدرسہ مستحقین طلبہ کی طرف سے وکیل نہیں ہو سکتا۔

فی بدائع الصنائع: "وان كان مال الزکوٰۃ دیناً فجملة الكلام فيه ان اداء العين عن العين جائز بان كان له ما مثله درهم عين فحال عليها الحول فادى خمسة منها لانه اداء الكامل عن الكامل فقد ادى

ما وجب عليه فيخرج عن الواجب وكذا اذا ادعى العين عن الدين بان كان له مائتا درهم دين فحال عليها الحول ووجبت منها الزكاة فادى خمسة عينا عن الدين لانه اداء الكامل عن الناقص لان العين مال بنفسه ومال بيته لاعتبار تعيينه في العاقبة وكذا العين قابل للتملك من جميع الناس والدين لا يقبل التملك لغير من عليه الدين واداء الدين عن العين لا يجوز بان كان له على فقير خمسة دراهم وله مائتا درهم عين حال عليها الحول فتصدق بالخمس على الفقير ناويا عن زكاة المائتين لانه اداء الناقص عن الكامل فلا يخرج عما عليه والحيلة في الجواز ان يتصدق عليه بخمس دراهم عين ينوي عن زكاة المائتين ثم يأخذها منه قضاء عن دينه فيجوز ويحل له ذلك -

وفي الطحاوي^(١) : واعلم ان اداء الدين عن المال الذي عنه لا يصح والحيلة ان يعطى المديون زكوته ثم يأخذها عن دينه شيخ وفي العالمكيرية^(٢) : ولو قضى دين الفقير بزكاة ماله ان كان بامر يجوز وسقط الدين -

وفي قاضي خان^(٣) : ولو دفع قوم زكاة اموالهم الى من يأخذ الزكاة لفقير فاجتمع عند الاخذ اكثر من مائتي درهم قالوا كل من اعطى زكوته قبل ان يبلغ مائتي يد الاخذ مأق درهم جازت زكوته ومن اعطى بعد ما اجتمع عند الاخذ مأق درهم لا يجوز الا ان يكون الفقير مديونا هذا كان الاخذ اخذ الاموال بامر الفقير فان اخذ بغير امره جازت الكل لان الاخذ اذا لم يكن بامر

(١) الطحاوي: ص ٢٢ (٢) العالمكيرية ٩٤/١ (٣) قاضي خان ١٢٥/١

الفقير كان الأخذ وكيلاً عن الدافعين فما اجتمع عند الأخذ يكون ما
الدافعين تجاوزت زكاة الكل الخ -

والضامى قاضى خان^(١) الوكيل كسيد المؤكل ودفعه كدفع المؤكل
فاذا نوى الزكاة كان عما نوى -

وفى فتح القدير^(٢) من فروعها قوم دفعوا الزكاة الى من
يجمعها لفقير فاجتمع عند الأخذ اكثر من مأتين فان جمعه له
بامره قالوا كل من دفع قبل ان يبلغ ما فى بيد الجالى مأتين جازت
زكوته ومن دفع بعده لا يجوز الا ان يكون الفقير مديوناً فيعتبر
هذا التفصيل فى مأتين تفضل بعد دينه فان كان بغير امره جاز
الكل مطلقاً لان فى الاول هو وكيل عن الفقير فما اجتمع عنده ملكه
وفى الثانى وكيل الدافعين فما اجتمع عنده ملكهم.

وفى العناية^(٣) وانما قيد بدين الميت لانه لو قضى دين
حتى بامره وقع عن الزكاة كانه تصدق على الغريم فيكون القابض
كالوكيل له فى قبض الصدقة -

وفى فتح القدير^(٤) ومحمد هذا ان يكون بغير اذن الحى
اما اذا كان باذنه وهو فقير فيجوز عن الزكاة على انه تمليك منه
والدائن يقبضه بحكم النيابة عنه ثم يصير قابضاً لنفسه
وفى بدائع الصانع^(٥) ولا يجوز قبض الاجنبى للفقير البالغ
العاقل الا بتوكيله لانه لولاية له عليه فلا بد من امره كما
فى قبض الهبة -

(١) قاضى خان ١٢/١ (٢) فتح القدير ٢٤/٢ (٣) العناية ٢/٢

(٤) فتح القدير ٢٠/٢ (٥) بدائع الصانع ٣٩/٢

(۲) قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے مصارف زکوٰۃ کے تحت والعالمین علیہا کو بھی ذکر کیا ہے حسب تصریح فقہاء ومفسرین والعالمین علیہا میں وہی لوگ مراد ہیں جن کو امام المسلمین زکوٰۃ وعشر و صول کرنے کے لیے مقرر کرتے ہیں، ائمہ احناف نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ عالمین کو ان کے عمل سے قدر کفایت نفقہ دیا جائے گا، لیکن ان کے عمل کے نصف سے زائد دینا جائز نہیں ہے اور یہ اجرت کے طور پر نہیں ہے بلکہ بطور عملہ ہے۔ مدرسہ کے لیے زکوٰۃ کی وصولی پر جو لوگ مقرر ہوتے ہیں ان کا تقرر چوں کہ امام کی طرف سے نہیں بلکہ مدرسہ کی طرف سے ہوتا ہے اس لیے وہ والعالمین علیہا کے تحت داخل نہیں ہوں گے لہذا ان کو ان کے عمل کے عوض میں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ بہ طریق اجرت ہے اور عامل کے عمل کی اجرت معلوم ہونا ضروری ہے کیوں کہ اجرت اگر مجہول ہو تو اجارہ فاسد ہو جاتا ہے اسی وجہ سے فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ عامل کی اجرت اگر اس کے عمل کے ایک جز کو مقرر کیا جائے تو اجارہ فاسد ہو جاتا ہے۔ بنا، علیہ مدارس کی طرف سے محصلین زکوٰۃ وغیرہ کو اگر متعین شرح فی صد کیشن دینے کی شرط پر مقرر کیا جائے تو یہ جائز نہ ہوگا۔ زکوٰۃ ادا ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ ایسے شخص کو مالک بنا دیا جائے جو مصرف زکوٰۃ ہو اور مالک بنانا بھی بلا کسی معاوضہ کے ہو، بنا، علیہ زکوٰۃ کے آمدنی اور خرچ کا حساب رکھنے کے لیے مدرسہ کی طرف سے جو عملہ مقرر ہوتا ہے ان کی ماہانہ تنخواہ مدر زکوٰۃ سے ادا کرنا جائز نہ ہوگا۔

لما فی بدائع الصنائع^(۱) : واما العاملون علیہا فہم الذین نصبہم
الامام لجباية الصدقات واختلف فیما یعطون قال اصحابنا
یعطیہم الامام کفایتہم منہا وقال الشافعی یعطیہم الثمن
ولنا انما یتحقہ العامل انما یتحقہ بطریق العمالة لا
بطریق الزکوٰۃ بدلیل انہ یعطی وان کان غنیا بالاجماع ولو کان
ذلك صدقة لما حلت للغنی ان قال لا علی سبیل الاجرة لان
الاجرة مجهولة وفيہ ایضا وجہالة احد البدلین یمنع حیوان
الاجارة۔

وفى تفسير روح المعاني^(١) تحت قوله تعالى والعاملين عليها
 وهم الذين يبعثهم الامام لجبايتها وفى الفقه على المذاهب الاربعة^(٢)
 والعامل هو الذى نصبه الامام لاختصاصات الصدقات والعشور -
 وفى احكام القرآن للجصاص^(٣) تحت قوله تعالى والعاملين
 عليها ويدل ايضا على ان اخذ الصدقات الى الامام -
 وفى البحر الرائق^(٤) هى تعليق المال من فقير مسلم غير
 هاشمى ولا مولا به شرط قطع المنفعة عن المملك من كل وجه لله
 تعالى -

وفى فتاوى عالمگیری^(٥) ومنها العامل وهو من نصبه الامام
 لاستيفاء الصدقات والعشور كذا فى الكافى -
 وفى الدر المختار^(٦) لو استأجر بطلا ليجمل طعامه ببعضه
 او شرا ليطحن بوه ببعض دقيقه فسدت فى الكل لانه استأجره
 بجزء من عمله والاصل فى ذلك نهيه صلى الله عليه وسلم عن
 فقير الطحان -

وفى الدر المختار^(٧) دفع الزكاة الى صبيان اقاربه برسم عييد
 او الى مبشر او مهد الباكورة جاز الا اذا نص على التعويض -
 وفى العناية على الهداية تحت قوله وهو الركن^(٨) لان
 الاصل فى دفع الزكاة تمليك فقير مسلم غير هاشمى ولا مولا
 جزء من المال مع قطع منفعة المدفوع عن نفسه مقرونا بالنية -

(١) روح المعاني ١٢١/١ (٢) الفقه على المذاهب الاربعة ٦٢١/١ (٣) احكام القرآن للجصاص ٢/٢

(٤) بحر الرائق ٢١٦/٢ (٥) فتاوى عالمگیری ٢٦/١ (٦) در مختار ٢٨/٥

(٧) در مختار ٩٦/٢ (٨) العناية على الهداية ٢٠/٢

مصرف زکوٰۃ فی سبیل اللہ

- (۱) مصارف زکوٰۃ کے بارے میں سورۃ توبہ کی جو آیت ہے اس میں کلمہ انما مذکور ہے جو حصر پر دلالت کرتا ہے اور یہاں پر حصر حصر حقیقی ہے جو مختار ہے جمہور مفسرین اور فقہاء کا۔
- (۲) آیت مصارف زکوٰۃ میں مذکور فی سبیل اللہ سے غازی مراد ہے کیوں کہ کتاب و سنت میں جب فی سبیل اللہ کا استعمال مطلق طور پر ہوتا ہے تو اس سے غزوہ اور جہاد مراد ہوتا ہے، جیسا کہ جمہور مفسرین اور فقہاء کرام نے ذکر کیا ہے۔
- (۳) صحابہ کرام، تابعین مفسرین اور فقہاء کرام نے جب فی سبیل اللہ میں دو ہی قول ذکر کیا ہے تو اس میں تیسرا معنی مراد لینا درست نہ ہوگا۔
- (۴) فقہاء احناف کا قول راجح یہی ہے کہ عالمین کے علاوہ باقی تمام مصارف میں فقر شرط ہے البتہ ایک اشکال یہاں رہتا ہے کہ ایسی صورت میں دوسرے مصارف کو ذکر کرنے کی بظاہر ضرورت ہی نہیں رہتی، للفقراء والمساکین کے تحت میں وہ داخل ہو جاتے ہیں۔
- ح: فی سبیل اللہ کے مصداق غزاة ہیں۔
- ب: فی سبیل اللہ کے مصداق جو لوگ ہیں ان کے مستحق زکوٰۃ ہونے کے لیے فقر شرط ہے۔
- ۵ زکوٰۃ کے مصارف کی تعلیل کر کے اشتراک علت کی بنا پر مذکورہ مصارف کے علاوہ دوسرے کو مصارف زکوٰۃ کے ساتھ ملحق کرنا درست نہ ہوگا۔
- (۶) دورِ حاضر میں دینی اور دعوتی کاموں کے لیے جس طرح بے پناہ سرمایہ کی ضرورت ہے ایسا ہی امت مسلمہ میں فقر و محتاجی دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے فقراء کی حمایت کے لیے بھی بے پناہ سرمایہ کی شدت سے ضرورت ہے اور قص قرآنی سے اموال زکوٰۃ میں ان کا حق ثابت ہو رہا ہے اس لیے فی سبیل اللہ کے دائرہ کو وسیع کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔
- ۷ احقر کے نزدیک زکوٰۃ کا مصرف فی سبیل اللہ میں فقہاء احناف کا قول راجح ہی مختار ہے۔

هذا ما سنجح لي والله تبارك وتعالى اعلم وعلمه اتم

زکوٰۃ کے مسائل

اسم ————— حضرت مولانا زبیر احمد قاسمی، صدر المدرسین، اشرف العلوم، کنہوان

الحمد لله وبه نستعين والصلوة والسلام على حبيب سيد المرسلين وآله

وصحبه اجمعين، اما بعد :

”اسلامک فک اکیڈمی انڈیا“ نے اپنے پانچویں سیمینار منعقدہ اعظم گڑھ میں زیر بحث لانے کے لیے جن مسائل کو موضوع قرار دیا ہے، ان میں ایک مسئلہ زکوٰۃ بھی ہے۔

بلاشبہ ان سے متعلق جتنے بھی سوالات ترتیب دیے گئے ہیں وہ اپنی جگہ اہم اور افادیت کے حامل ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ ان میں بعض ایسے بھی مسائل ہیں جو اپنی جگہ معروف و معلوم اور کتب فقہ میں مہرچ موجود ہیں، جس میں نہ اختلاف رائے کی کوئی گنجائش محسوس ہوتی ہے اور نہ دور حاضر میں وہ کسی نئے اجتہاد اور غور و فکر کے محتاج نظر آتے ہیں، اس طرح انہیں زیر بحث لانے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی، اس کے علاوہ ان میں ایسے بھی سوالات نظر آئے جن کے متعلق اختلاف رائے بہر حال لازمی ہے، کیونکہ اس کے سلسلے میں خود حضرات ائمہ کے مختلف اقوال و مواضع ہمارے کتب متداولہ میں منقول ملتے ہیں، مثلاً بیع قبل القبض کی زکوٰۃ مشتری پر واجب ہوگی یا نہیں۔

اس لیے ایسے مسائل میں تو اختلاف العلماء و رمۃ کے پیش نظر اسے مبتلی بہ کی ذاتی شرعی ذمہ داری پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ وقت ضرورت متدین علماء اور معتمد صاحب فتویٰ، فقہاء کی طرف رجوع ہو کر ان کے فتویٰ پر عمل کرتا رہے اپنے اس خیال و احساس اور مذکور بالا رائے کے اظہار کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ سے متعلق بعض خاص سوالات کے سلسلے میں اپنے محدود مطالعہ و تحقیق کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا کہ جس طرف اپنا رجحان ہوا اسے پیش کر دوں؛ ان سے بعد غرض اللہ العلیٰ اعلم۔

————— ایک تاجر بغرض تجارت بیع و شراء کرتا ہے، اور مشتری قیمت سپرد کر دیتا ہے لیکن بیع اس کے قبضہ میں نہیں آتی ہے تو بائع پر اس مقبوضہ ضمن کی زکوٰۃ بشرط نصاب و دخول بہر حال لازم ہو گئی؛

”لکونہ مالک بعلک تامای یدا ورقبہ“

لیکن مشتری پر اس بیع غیر مقبوضہ کی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں اس میں فقہاء کی عبارتیں خود مختلف ہیں۔

اپنا خیال یہ ہے کہ اس میں قبضہ کے قبل تو زکوٰۃ واجب الادا نہ ہوگی، مگر بعد القبض سنین ماضیہ کی زکوٰۃ بھی بشرط نصاب و دخول واجب الادا نہ ہوگی، کیونکہ یہ بہر حال مال تجارت کے بدل کے طور پر مشتری کا ایک دین بذمہ بائع رہتا ہے جو دین قوی کے حکم میں ہے اور دین قوی میں حسب تفصیل فقہ بعد القبض سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہوا کرتی ہے۔

۲ کرایہ دار جو رقم بطور اجرت معجلہ مالک مکان کے حوالہ کرتا ہے، اس کی زکوٰۃ تو مالک پر بشرط نصاب دخول لازم ہو جائے گی۔

”لَا تُدْرِكُ الْمِلْكُ الْاِجْرَةَ بِالتَّعْجِيلِ كَلَهَا“

”وَ اِذَا عَجِلَ الْاِجْرَةَ لَا يَمْلِكُ الْاِسْتِغْرَادُ“

جیسی فقہی عبارتوں کا یہی مقتضا ہے۔

البتہ وہ رقم جو بطور ڈپوزٹ اور زر ضمانت، کرایہ دار جمع کرتا ہے اس کی زکوٰۃ بشرط نصاب دخول خود کرایہ دار پر واجب ہوگی اور سنین ماضیہ کی بھی ہوگی، کیونکہ یہ رقم یا تو امانت ہے یا بعد الاذن تصرف کے سبب قرض ورنہ کامل معصوب، بہر حال جب اس کی واپسی کا ظن غالب ہوگا تو دین قوی کا حکم رہے گا ورنہ مال ضمانت کا حکم۔

اس رقم کو کامل ہون کہنا صحیح نہیں ہے کیوں کہ ایک حق ثابت اور دین موجود کو ممکن الاستفاد اور سہل الحصول بنانے کے لیے جس چیز کو صاحب حق اپنے پاس محبوس کرتا ہے وہ شے مرہون بنتی ہے، یہاں مالک مکان کا کوئی حق یا دین فی الحال کرایہ دار پر ثابت و موجود نہیں، وصولی کرایہ کا حق تو حسب شرائط مہینہ اور سال کے اختتام پر ثابت ہوگا، ڈپوزٹ کی رقم صرف اس احتمال و امکان کی بنیاد پر جمع کی اور کرائی جاتی ہے کہ حسب معاہدہ وقت معہودہ پر اگر کرایہ مکان وصول نہ ہو سکے گا، تو اس رقم سے محسوب ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ ایک حق موبہوم اور دین منظنون کے بدلے شے محبوبہ کو رهن نہیں کہا جاسکتا، اس لیے اسے یا تو امانت کے لیے یا قرض یا کامل معصوب اور اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر لازم ہونی چاہیے۔

یہاں اس کی وضاحت ہو جانی مناسب ہے کہ بلاشبہ وجوب زکوٰۃ کے لیے ملک تمام ضروری ہے اور ملک کی تمامیت رقبۃ ویدامہ دونوں طرح کی ملکیت پر موقوف ہے مگر ملک ید کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ میرے پاس اور میرے ہاتھ میں بالفعل موجود ہو، بلکہ جس چیز میں ہمیں شرعاً تصرف کا حق ہو ہم تصرف میں کسی کے اذن کے محتاج نہ ہوں، اور اس کا کبھی نہ کبھی مقبوضہ ہو جانا مظنون بظن غالب ہو، وہ حکماً مقبوضہ اور ید الملوکہ ہی کہلائے گی، ورنہ دین قوی وغیرہ میں سنین ماضیہ کی زکوٰۃ کو واجب الادا رکھنے کا کوئی جواز نہ ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ یہاں اس امر کا استحضار بھی ضروری ہے کہ شے مرہونہ بقدر دین ہی مضمون ہوتی ہے اور اسی کے بقدر وہ مشغول بالدين مشغول بالخاصہ ہونے کے سبب کا معدوم قرار پاتی ہے اس لیے اس کی زکوٰۃ راہن پر بعد الاسترداد بھی واجب نہیں ہو پاتی۔ لیکن کیا اس کا بھی فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔ کہ بشرط نصاب قدر دین سے زائد مالیت کی زکوٰۃ بھی بعد الاسترداد والانفکاک سنین ماضیہ کی واجب الادا نہیں ہوگی، اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اسی سے ملک ید کی حقیقت سمجھی جاسکتی ہے۔

۳۔۔۔ کسی مال کا ایسا ہونا کہ اس کا کوئی مالک معین نہ ہو نہ معلوم الذات ہو نہ معلوم النوع والجنس اس کی نظیر شریعت میں نہیں، "لا سیابة فی الاسلام" حدیث ہے، ہاں مع بشرط نیا اس کی نظیر ہو سکتی تھی، مگر وہ بھی مختلف فیہ ہے، اس لیے سوال یوں کیا جائے کہ جس مال کا کوئی معلوم الذات معین مالک نہ ہو بلکہ معلوم النوع والجنس اور مجہول الذات مالک ہو جیسے کہ مال موقوفہ اور مدارس اسلامیہ جیسے اداروں میں جمع شدہ مال، تو اس کی زکوٰۃ کا کیا حکم ہوگا۔

چوں کہ مدارس اسلامیہ میں زکوٰۃ وغیرہ کی جمع شدہ رقم پر مستحق زکوٰۃ طلبہ کی ملکیت ہوتی ہے ہفرار اور نظام مدرسہ کا قبضہ دراصل طلبہ مستحق کا قبضہ ہوتا ہے، سارے اکابر دیوبند اس کے قائل ہیں اور یہ معلوم النوع مگر مجہول الذات طلبہ اشخاص حقیقی نہیں، اشخاص حکمی ہیں، اس لیے اس کی زکوٰۃ کسی پر واجب نہ ہوگی۔

"لعدم تصور التعلیك من الاشخاص الحکمیة"

۴۔۔۔ مال مرام یا تو واجب التصدق ہوتا ہے یا اصل مالک پر واجب الزد، مال حلال کے ساتھ اس کا غلط گوبوہ استہلاک موجب ملک ہے، مگر اس مقدار کا وہ استہلاک ضامن ہونے کے سبب مدیون بھی بن جاتا ہے، اس لیے بقدر حرام مشغول بالدين والخاصہ ہونے کے سبب کا معدوم ہی ہوگا، اس لیے اس قدر حرام کے استثناء کے بعد صرف مابقی پر بشرط نصاب دخول زکوٰۃ واجب ہوگی،

”وهو ظاهر جداً استفاد من عبارة الفقهاء، مثلاً ولو غلط السلطان المال المخصوص بمال ملكه فتجب الزكاة فيه ويورث عنه (الى قوله) وهذا اذا كان له مال غير ما استهلكه بالغلط منفصل عنه يوق دينه والا فلا زكاة كما لو كان الكل خبيثاً“

اور اس صورت میں ثبوت ملکیت کا ثمرہ صرف وراثت و توریث میں ظاہر ہوگا، اور بس۔
 ۵۔۔۔ دین کی زکوٰۃ دائن پر ہوگی، اس تفصیل و شرائط کے ساتھ جو فقہ کی تمام ہی کتب متداولہ میں صراحتاً موجود ہیں، دین قوی، دین وسط اور دین ضعیف کی ماہیت و حقیقت کا بیان پھر ان کے درمیان سنین ماضیہ اور سنین آتیہ کے اعتبار سے جو جو ادا میں فرق کا مسئلہ، اسی طرح کس دین کے کس مقدار پر قبضہ کے بعد کسب سے وجوب ادا کا حکم ہوگا، اور اس سلسلے میں خود امام اعظم اور صاحبین کے درمیان میں اختلاف اور تعدد اقوال کی ساری بحثیں اور تفصیلات فقہی کتابوں موجود ہیں، اس کے نقل و اعادہ کی کیا ضرورت۔
 مدیون پر اس قدر دین کے زکوٰۃ واجب ہونے کی بات ”لکوند مشغولاً بالعاجۃ کالمعدنہ“ ہونے کے باوجود خلاف عقل و نقل ہے، البتہ اس دین سے اگر مدیون نے بذریعہ تجارت نفع حاصل کیا ہوگا تو بشرط نصاب و قبول مال استفاد کی طرح اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

۶۔۔۔ سرکاری غیر سرکاری ملازمین کو ریٹائر ہونے کے بعد جو پراویڈنٹ فنڈ کی رقم ملا کرتی ہے۔ وہ بہر حال ایک دین ضعیف کے حکم میں ہے اس کا حکم شرعی معلوم و معروف ہے کہ بعد انقبض بشرط نصاب و قبول وغیرہ زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

۷۔۔۔ دین اور قرض کے درمیان جو جو ہر فرق ہے اسے مستحضر رکھا جائے تو کبھی یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا کہ حکومت یا کمپنی سے بغرض تجارت حاصل کردہ طویل المیعاد قرض و وجوب زکوٰۃ سے مانع ہوگا یا نہیں، اور نہ اس کے جواب میں دین مؤجل کے مانع ہونے نہ ہونے کے درمیان اختلاف ائمہ اور تعدد اقوال کی طرف ذہن بھٹکے گا، کیوں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ قرض ایک تبرع ہے، جس میں لزوم نہیں، اس لیے اس کی تاخیر بھی صحیح و لازم نہیں، ”التأجيل في القرض باطل“ جیسے اصول اور ”کل دین مال اذا اقبله صاحبه صار مؤجلاً القرض فان

میرا خیال یہ ہے کہ جو اس ارادہ سے خریدے اسے حکماً بغرض تجارت خریدار قرار دے کر
 وجوب زکوٰۃ کا حکم لگنا چاہیے، اور ہمارے سمجھ کے مطابق سد ذرائع جیسے فقہی اصول کا یہی مقتضی ہے
 ورنہ پھر اس حرص و ہوس کے افراط، بددینی اور خوف خداوندی سے عاری ماحول میں اسقاط زکوٰۃ کا
 ایسا حیلہ سرمایہ داروں کے ہاتھ آجائے گا، کہ بس الامان والحفیظ اور فقر اور مساکین تو تک تک دیدم
 دم نہ کشیدم کا منظر پیش کریں گے اس لیے نہ صرف دیانتاً بلکہ قضا میں بھی وجوب زکوٰۃ کا فتویٰ اور حکم
 ہونا چاہیے، سد ذرائع کے علاوہ دوسرے اہل کلی مثلاً "الامر اذا ضاق اتسع واذا اتسع ضاق" کا
 بھی یہی اشارہ ہو رہا ہے۔ واللہ اعلم۔

۹۔ تجارتی اموال کے قدر و مالیت کے تحقیق میں کس نرخ کا اعتبار ہوگا؟ اس میں حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ سے تو مولانا مولیٰ دہلوی نے جو جواب ادا کر کے دن کی قیمت و نرخ کا معتبر ہونا منقول ہے مگر صابین فرماتے ہیں کہ اگر اسی دن ادا نہیں کیا تو پھر ادائے کی کے دن کی قیمت و نرخ کا اعتبار ہوگا، اور ہمارے خیال میں صابین ہی کا قول ایسر و ارتق ہونے کے سبب لائق ترجیح ہے۔ اب وہ تاجر جس معیار کا ہے

یعنی حقوق فروش ہے یا فردہ فروش وہ اپنے معیار و مقابل کے اعتبار سے ہی نرخ و قیمت کا حساب لگائے گا۔

۱۰۔ جو لوگ "اراضیات" کی تجارت کرتے ہیں، اگر وہ زمین عشری یا خراجی نہیں ہیں تو اس کی مالیت پر بشرط نصاب و حول وغیرہ زکوٰۃ واجب ہونے میں کوئی اختلاف ہے نہ کوئی خفا۔

البتہ اگر وہ زمین عشری یا خراجی ہوگی تو اس میں بظاہر اشکال ہوگا کہ عشر و خراج کے ساتھ وجوب زکوٰۃ کا حکم لگانے سے تضاعف حق اللہ لازم آئے گا، اور فقہی عبارت مثلاً "حقوق اللہ تعالیٰ المتعلقہ بالاموال" لایجب فیہا حقان^۱ وغیرہ کے خلاف ہوگا، مگر اس سلسلہ میں ہمارا خیال یہ ہے کہ حضرت امام محمد علیہ الرحمۃ کی تحقیق و توجیہ کو رائج قرار دیتے ہوئے ان تجارتی اراضیات میں عشر و خراج کے ساتھ وجوب زکوٰۃ کا حکم بھی لگنا چاہیے، یہ فرماتے ہیں کہ عشر و خراج کا محل دراصل پیداوار حقیقی یا حکمی ہوگا اور وجوب زکوٰۃ کا محل نفس زمین اور اس کی قیمت ہوگی، فلا یلزم کون حق اللہ مضاعفا فی محل واحد^۲۔

محرث ثالث

محرث ثانی میں صرف یہی ایک سوال تھا کہ اموال تجارت کے نصاب متعین کرنے میں سونے چاندی میں سے کس کے نصاب کو اہل تسلیم کیا جائے؟ اور چوں کہ اس کا جواب انفع للفقراء کی روشنی میں واضح تر تھا اس لیے اس سے تعرض کیے بغیر محرث ثالث کے سوالات پر غور کیا۔

۱۔ اس میں پہلا مسئلہ یہ غور طلب نظر آیا کہ مدارس اسلامیہ کے مہتمم اور ان کے ماتحت سفراء و محصلین مد زکوٰۃ کی رقوم پر کس حیثیت سے قابض ہوتے ہیں، چوں کہ جواہر الفقہ جلد چہارم صفحہ ۲۸۷ میں موجود مباحث و نقول سے یہ بات منقح ہو جاتی ہے کہ رجوع و اعتراف اور افادہ اور استفادہ کے بعد حضرات اکابر مثلاً حضرت گنگوہی، حضرت تھانوی، حضرت مولانا غلیل احمد سہارنپوری، بلکہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہم اللہ سب ہی لوگ بالاتفاق تسلیم کر چکے ہیں کہ مہتمم مدرسہ معطی و مستحق زکوٰۃ دونوں کے وکیل ہوتے ہیں اس لیے جیسے خود فقراء و مستحقین زکوٰۃ کے قابض ہونے کی شکل میں صرف قبضہ فقراء سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے،

ملک معطل سے وہ رقم نکل جاتی ہے اور معطلی بری الذمہ ہو جاتا ہے، اسی طرح ہہتمم اور اس کے مامور و ماتخذ سفر اس کے قبضہ میں آتے ہی معطلی کی زکوٰۃ ادا شدہ بن جائے گی، کیوں کہ ”یدالوکیل کیدالموکل“ مسلمہ قاعدہ شرعیہ ہے، یہاں اس تفریع حکم کے ساتھ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ چوں کہ یہ ہہتمم و سفرار معطلی زکوٰۃ کے وکیل کی حیثیت بھی رکھتے ہیں اس لیے جس طرح خود معطلی کو اپنی زکوٰۃ بلا تملیک فقر کسی دوسرے منصارف غیر مثلاً تعمیر مساجد، بنار مدارس اور تکفین میت وغیرہ میں خرچ کرنے کی اجازت نہیں، اسی طرح ہہتمم حضرات بھی بلا تملیک اگر منصارف غیر میں خرچ کرنے کے مجاز نہیں ہوں گے۔۔۔۔۔ اس طرح یہ مسئلہ ہمارے خیال میں مفروضہ عنہا بن چکا ہے، ان حضرات اکابر کی اجتماعی رائے سے اب اختلاف کرنے کے بجائے اتفاق کر لینا ہی الشار اللہ غیر قرار پائے گا۔

۲۔۔۔۔۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ سفرار و محصلین کو منصوص مصرف زکوٰۃ ”العالمین علیہا“ میں داخل مان کر وہ زکوٰۃ سے انہیں تنخواہ دی جاسکتی ہے یا نہیں ؟

اپنا خیال اور رجحان اس طرف ہے کہ اس سلسلہ میں حضرت مفتی کفایت اللہ علیہ الرحمہ کے فتویٰ جواز کو تسلیم کر لینا چاہیے۔

یہ صحیح ہے کہ عالمین کا تقرر و انتخاب امیر و سلطان کی طرف سے ہوتا ہے جو مدارس کے سفرار کے حق میں بظاہر مفقود ہے مگر ملک ہندوستان میں جب خود امیر و قاضی کا تقرر و انتخاب ارباب حل و عقد کی طرف سے کیا جاسکتا ہے اور اس پر دور حاضر کے سارے معروف علماء کا تقریباً اجماع ہو چکا ہے تو مدارس کے ہہتمم حضرات جو اپنے اپنے دائرہ میں ارباب حل و عقد کے ہی منتخب و مقرر کردہ ہوتے ہیں ان کی حیثیت امیر کی کیوں نہیں ہو سکتی۔

حضرت مولانا غلیل احمد سہارنپوری علیہ الرحمہ کی وہ تحریر جو حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے رفع امر کا کے طور پر ہمارے سامنے ہے وہ اس کی واضح دلیل کہی جاسکتی ہے۔

مولانا علیہ الرحمہ لکھتے ہیں، ”بندہ کے خیال میں سلطان میں دو وصف ہیں ایک حکومت (سیاست اور انتظام ملکی) جس کا ثمرہ تنفیذ محدود و قصاص ہے دوسرا نظم حقوق عامہ، امراول میں کوئی اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتا، لیکن امرثانی میں اہل حل و عقد بوقت ضرورت قائم مقام ہو سکتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ اہل حل و عقد

کی رائے و مشورہ کے ساتھ نصب سلطان وابستہ ہے جو باب انتظام سے ہے، لہذا مالی انتظام مدارس جو برضار ملاک و طلبہ ابقار دین کے لیے کیا گیا ہے بالاولیٰ معتبر ہوگا۔ بلکہ فتویٰ خلیفہؒ میں ان کے الفاظ میں یہ صراحت ہے کہ اہل مدرسہ بیت المال کے عمال کے مثل ہیں، اسی طرح مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمۃ کے الفاظ یہ ہیں، ”چندہ وصول کرنے والے عاملین صدقہ کے حکم میں داخل ہو کر فقرا کے وکیل ہیں، معطین چندہ کی وکالت صرف اس درجہ میں ہے کہ انہوں نے ان حضرات کو وکیل فقرا تسلیم کر کے اپنا چندہ ان کے حوالہ کر دیا۔“

بہر حال ان اکابر کی ان تحریروں سے بھی مفتی کفایت اللہ علیہ الرحمۃ کے فتویٰ کی تائید ہی ہوتی ہے اور جب ان حضرات کی تحریر سے سفر کار کا مثل عمال ہونا اور عاملین صدقہ کے حکم میں داخل ہونا واضح ہو رہا ہے تو ”اذا ثبت الشيء ثبت بلوازمہ“ کے تحت ان کو مد زکوٰۃ سے عوض عمل بھی دینا جائز ہونا چاہیے، لیکن زمانہ حرص و ہوس کا ہے، صبر و قناعت اور جذبہ ایثار سے عام قلوب غالی ہو چکے ہیں اس لیے قدر کفان کی تعیین وغیرہ میں باہمی نزاع و اختلاف کا قوی اندیشہ ہے، اس لیے برضار طریقین بطور تنخواہ اس کی پہلے ہی تعیین کی جاسکتی ہے، یہ محض تغیر اسم ہے تغیر معنی نہیں، درحقیقت یہ کفان اور عمال ہی رہے گا۔

باقی رہائش کی اجازت دینا کہ کسی طرح صحیح طریقہ کار نہیں کہا جاسکتا، اس سلسلے میں عام طور پر اس کے عدم جواز کی جو دلیلیں بیان کی جاتی ہیں، گو ہمیں ان دلائل اور طرز استدلال سے کوئی انس اور مکمل اتفاق نہیں، مگر اس طریقہ کار کا کبھی مفضی الی الضمار ہو جانا لازم بلکہ معلوم و مشاہد ہے، اس کمیشن کی اجازت پر ہمیں کبھی شرح صدر نہیں ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۲۔ اب رہا تیسرا مسئلہ ”فی سبیل اللہ“ کے مفہوم و مصداق کی تعیین کا، تو اس سلسلے میں حدیثاً و قدیماً بہت ساری بحثیں ہو چکی ہیں، اور ہر طرح کے رطب و یابس دلائل کا ایک انبار باخبر حضرات کے سامنے اُپکا ہے، لیکن حق یہی ہے کہ نظریہ تعمیم کے حاملین کی جتنی بھی پیش کردہ دلیلیں ہیں، برنگ اجتہاد و استنباط میں اس پر نقد و تبصرہ، توہم و تاویل سے قطع نظر کسی دلیل میں وہ قوت اور وزن نہیں جو نظریہ تخصیص کے دلائل میں ہیں۔

اور اگر صحیح فیصلہ کی بنیاد قوت دلائل پر ہوا کرتی ہے، اور یقیناً ہوا کرتی ہے تو یہ بات طے شدہ

سمجھنی چاہیے کہ قرآن پاک میں مصارف زکوٰۃ میں تین آئے ہوئے لفظ فی سبیل اللہ کا مصداق صرف اور صرف جہاد عسکری ہے اور بس۔

یہ صحیح ہے کہ قرآنی آیتوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایتوں میں فی سبیل اللہ کا استعمال لغوی معنی میں بھی ہوا ہے اور یہ لفظ لغوی طور پر سارے ہی قرابات و طاعات کو عام اور شامل ہے لیکن یہ بھی ایک زبردست سچائی اور حقیقت ہے کہ مصارف زکوٰۃ میں جو فی سبیل اللہ آیا ہے وہ بطور منقول شرعی بلکہ منقول عرفی کی حیثیت سے جہاد عسکری کے ساتھ مختص ہے اور ظاہر ہے کہ سارے استدلال پر بھاری ہے شہادت اس کی۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ عہد رسالت اور عہد صحابہ میں اس لفظ کے مطلق استعمال کی صورت میں تبادر ذہنی صرف جہاد عسکری کی طرف ہوتا تھا، اور یہ مفہوم و مصداق عوام و خواص میں اتنا معروف تھا کہ از قبیل عوام ایک صحابیہ اور ایک صحابی بن کا کوئی علمی مقام معروف نہیں اور جن کی کوئی فقہانہ امتیازی شان نہیں وہ بھی فی سبیل اللہ کا یہی مفہوم سمجھتے اور سمجھاتے تھے۔

آخر ابو داؤد کی روایت میں حضرت ام معقل کا جو واقعہ منقول ہے کہ انہوں نے اپنے شوہر حضرت ابو معقل سے سفر حج کے لیے اونٹ مانگا تو انہوں نے یہی عذر پیش کیا کہ وہ اونٹ تو میں نے فی سبیل اللہ وقف کر دیا ہے اور صحابیہ اس عذر کو معقول سمجھتی ہوئی کوئی بحث و اعتراض نہیں کریں اور نتیجتاً وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کی سعادت سے محروم ہو جاتی ہیں، اس سے کیا یہ حجت قائم نہیں ہو جاتی کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان فی سبیل اللہ کا مفہوم و مصداق جہاد عسکری ہی تھا، اور غالباً اسی عرف و تبادر اور منقول شرعی و عرفی ہونے کی بنیاد پر تابعین تبع تابعین اور سارے ائمہ مجتہدین کا اس مفہوم پر اجماع ہو چکا ہے، اقوال شاذہ اور تفردات قابل اعتنا رکب اور کس مسئلے میں ہوتے ہیں کہ یہاں ان کی طرف ادنیٰ التفات کا جواز نکالا جائے، سلف و خلف کے اس اجماع کی صورت میں موجود ایک قطعی اور بدیہی دلیل کے مقابلہ میں دور ماضی یا ماضی قریب و بعید کے اصاغر و اکابر کی محض اجتہادی و استنباطی اور صرف ظنی و نظری دلیلوں کا کیا وزن ہو سکتا ہے۔ "فیما عجب این تذهیون"

یہ صحیح ہے کہ ام معقل رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی موجود ہے۔ "فہلّا خرجت علیکم فان الحج فی سبیل اللہ" جس سے فی سبیل اللہ کے مصداق میں

ایک گونہ عموم کا ثبوت ہوتا ہے، یہاں اس حدیث پر سنداً متناہت سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ بھی سمجھتا ہوں کہ یہ دراصل ایک لفظ کے معنی لغوی اور سطح ظاہر سے استفادہ کی صورت ہے اور بس۔

آپ جیسے باخبر حضرات سے کون زیادہ واقف ہوگا کہ یہ بھی ایک معروف طرز استدلال ہے کہ بسا اوقات مختلف مصالِح کی بنیاد پر آیت و روایت کی ظاہری سطح پر نظر رکھتے ہوئے اسے مواقع استدلال میں پیش کر دیا جاتا ہے، مگر درحقیقت آیت و روایت کا حقیقی انطباق مقصود نہیں ہوتا، اور اس کے نظائر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور فقہائے عظام سمجھوں کہ استدلال میں ملتے ہیں، مثلاً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رئیس المنافقین کے لیے دعا را استغفار کرتے ہیں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآنی آیت "استغفرلہم اولاً تستغفرلہم ان تستغفرلہم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لہم" پیش کرتے ہوئے اڑے آتے ہیں تو آپ جواب میں جو یہ فرماتے ہیں کہ تمہکو استغفار سے منع تو نہیں کیا گیا ہے بلکہ بخاری کے الفاظ میں آپ جو فرماتے ہیں کہ اگر میں جانتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے سے انکی مغفرت ہو سکتی ہے تو میں ستر مرتبہ سے زائد استغفار کرتا" یہ کون استدلال ہے؟ وہی الفاظ کے سطح ظاہر سے استفادہ کی شکل ہے حقیقی انطباق نہیں۔

اور مثلاً حضرت ابن عباسؓ کے پاس ایک مسلمان آتا ہے جو قتل مسلم کا ارادہ رکھتے ہوئے قتل مسلم کے متعلق دریافت کرتا ہے تو آپؓ "من یقتل مؤمناً متعمداً فجزاءہ جہنم خالداً فیہا" کی آیت تلاوت کرتے ہیں، یہاں بھی مصلحتاً اور سد الباب الفتۃ وہی الفاظ کے سطح ظاہر سے استفادہ ہے، اسی طرح جب حضرت احنف بن قیس جنگ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے شریک ہونے کے لیے گھر سے نکلتے ہیں تو ان کی ملاقات حضرت ابوبکرہ سے ہوتی ہے اور احنف بن قیس کے ارادہ پر مطلع ہو کر انہیں اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے جو حضرت ابوبکرہ یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

"اذا التقى المسلمان بسيفيهما فالقاتل والمقتول في النار الخ"

یہ بھی اس قبیل سے ہے ورنہ حضرت علی اور حضرت عائشہ وغیرہما اگر حضرات صحابہ پر جو ارباب حق کا بعض اجتہادی خطا کے سبب قتال تھا، روایت کا انطباق ممکن نہیں، یہاں حضرت ابوبکرہ ثقیل فتہ کی وقتی مصالحت کے سبب الفاظ کی ظاہری سطح سے فائدہ اٹھائے ہوئے یہ روایت پیش کرتے ہیں اور بس۔ اور مثلاً فقہاء کرام جو لکھتے ہیں کہ اگر بحالت موم غیبت کرنے کے ارادے سے کوئی مسئلہ

دریافت کرے تو جواب میں یہ حدیث سنا دیا جائے "من اغتاب فافطر" یہ استدلال بھی ظاہر ہے کہ روایت کا صحیح انطواء نہیں صرف مصلحتاً موقع استدلال میں پیش کر کے ظاہری سطح سے استفادہ ہے، الغرض اس طرح کے بہت سے نظائر ہیں، اس لیے اگرچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امم معقلہ سے فان الحج فی سبیل اللہ فرمایا تھا، تاہم مصرف زکوٰۃ کے فی سبیل اللہ کے مفہوم و مصداق کے تحت بالغزوہ ہونے کی اجماعی رائے پر کوئی آج نہیں آسکتی۔

اور کئی بات یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کے تحت بالجهاد العسكري ہونے کی سبب مضبوط اور جامع تر دلیل بس یہی اس کا عرفی و اجماعی ہونا ہی ہے دیگر سارے دلائل کے متعلق فیہ ما فیہ کہا جاسکتا ہے مثلاً کلمہ انما اگر حقیقی کے لیے ہی ہو اور کوئی فی سبیل اللہ کو ہر قاضی، مفتی، عالم مشغول بخدمت الدین پر عام و شامل مان لے تو اس سے مصارف زکوٰۃ کے اصناف ثمانیہ کا حقیقی کب ٹوٹے گا۔ اصناف تو اب بھی وہی آٹھ رہیں گے، ایک صنف کے صرف افراد بڑھیں گے، ولا مانع من ذلك، اسی طرح دوسرے دلائل کا بھی تجزیہ ممکن ہے، اس لیے اس سے زیادہ مزید کچھ کہنا لا حاصل یا تحصیل حاصل ہے۔

اجماع سلف صالحین کے خلاف آج فی سبیل اللہ کے مفہوم میں تعمیر کی کوشش، احادیث اللہ، من یتبع غیر سبیلہ ینزلہ ما قوٹی ونصلیہ جہنم وساءت مصیرا کی وعید کا مستحق بنا سکتی ہے۔ اللہم احفظنا من شرور انفسنا۔

اللہم ارننا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔ فقط

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت

ان: مفتی عزیز الرحمن مدنی دادالافتاء، تبجنور۔ (بیوی)

حامدًا ومصلیًا، اما بعد!

اسلام میں زکوٰۃ کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی نماز کی، قرآن پاک میں ان دونوں فریضوں کو ایک ہی ساتھ بیان فرمایا ہے۔ نماز اگرچہ ابتدا، اسلام یعنی لیلة المعراج ۱۲ھ میں فرض ہوئی تھی، لیکن اس سے قبل بھی نماز پڑھی جاتی تھی، چنانچہ سورہ مزمل ۳۷ھ نبوی میں نماز اور زکوٰۃ کا تذکرہ ایک ہی ساتھ ملتا ہے۔

”اقیموا الصلوة و آتوا الزکوۃ و اقرضوا اللہ قرضاً حسناً“

نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو قرض حسن دو۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تحریر فرمایا ہے:

”ایسے ہی زمانہ جاہلیت میں زکوٰۃ بھی تھی، اسی زکوٰۃ میں مہمان نوازی، مسافر نوازی،

عیال پروری، مساکین پر صدقہ اور خیرات، صلہ رحمی، حوادث میں امداد، سب زکوٰۃ میں

داخل تھے“ (۱)

مفسر عماد الدین ابن کثیر نے تحریر فرمایا ہے:

” فرضیت زکوٰۃ مکہ میں ہو چکی تھی لیکن نصاب زکوٰۃ اور مقدار خرچ یہ مدینہ منورہ میں ہوا۔ (۱)
اس تمہید سے غرض فہم اس قدر ہے کہ اسلام میں زکوٰۃ کی وہی اہمیت ہے جو نماز کی ہے، دونوں فرض ہیں، رکن ہیں اور اسلام کی بنیادیں ہیں۔ نماز کی طرح زکوٰۃ کے اصول و قوانین بھی ہیں، یہ بات دیگر ہے کہ نمازیں ان قوانین کو سنن، واجبات، فرائض کے ناموں سے یاد کیا ہے جب کہ زکوٰۃ میں نصاب زکوٰۃ، مقدار خرچ، مصرف اور اہلیت کے ناموں سے یاد کیا ہے، اس مقالہ میں بعض ان مسائل کا ذکر ہے جو موجودہ حالات اور ضروریات کے تحت اہم ہیں۔

نصاب زکوٰۃ

اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے مال داری (صاحب نصاب ہونا) کی حد مقرر کی ہے مقررہ حد سے کم فقیر مستحق اخذ زکوٰۃ و صدقات ہے اور مقررہ حد یا اس سے اوپر کو مال داری یا غنی جس کو صاحب نصاب کہا جاتا ہے اس کے لیے اخذ زکوٰۃ و صدقات حرام ہے، اسلام نے یہ حد بندی چاندی اور سونے کے ذریعہ کی ہے جو آج تک برقرار ہے، جواہرات اور موتی، ہیرے وغیرہ قیمتی سے قیمتی دھاتوں کی قیمت کا تعین ان ہی دو چیزوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے اس وجہ سے ان تہلم قیمتی اشیاء کو عروض تجارت میں شمار کیا ہے، بشرطیکہ وہ اسی غرض سے فراہم کیے گئے ہیں لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

”لا زکوٰۃ فی اللآلی و الجواہر وان ساوت النقا اتفاقاً الا ان یکون للتجارة“

وفی رد المحتار ونسب نسخة اولیاً (۳)

یہ جواہرات کسی شخصیت کے تمول اور قد آوری کو ظاہر کرنے کے لیے ایسے ہی ہیں جیسے ٹی. وی، فرج وغیرہ، اس لیے زکوٰۃ میں مال داری کی حد بندی ان اشیاء سے نہیں بلکہ چاندی سونے سے ہوتی ہے سونے میں بیس مثقال اور چاندی میں دو سو درہم ہے لیکن موجودہ زمانہ میں نوٹوں کی ایجاد نے نوٹوں کو معیار قرار نہیں دیا بلکہ معیار وہی ہے یعنی چاندی سونا، اس وقت یہ فرق غیر متوازن ہو گیا ہے، جس زمانہ میں احکام زکوٰۃ اور نصاب زکوٰۃ مقرر ہوا تھا اس وقت تو بیس مثقال برابر دو سو درہم تھے، لیکن اب نہیں ہیں

اس لیے اب کسی کے پاس اگر دس مثقال سونا ہے اس کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ دوسو درہم چاندی کا حکم مالک نہیں ہے، بے شک وہ مالک ہے بلکہ کچھ زائد کا مالک ہے اور صاحب نصاب ہے۔

(الف) اس وجہ سے کہ جس کے پاس دس مثقال یا ایک تولہ سونا ہے وہ کچھ نہ ہی دو چار کے نوٹ تو ضرور اپنے پاس رکھتا ہوگا۔

(ب) بالفرض اگر دو چار روپیہ بھی پاس نہ ہوں تب بھی وہ صاحب نصاب ہے کیوں کہ سونا نہ ہی چاندی کا نصاب تو قیمتاً پورا ہو ہی جاتا ہے۔

”من ذهب و ورق مقوماً باحدهما (۱)۔ ونفی رد المحتار: قوله تعین تقویم بہ اعی اذا کان یبلغ بہ نصاباً کما فی النہر ویقوم فی البلد الذی المال فیہ الی قوله یتعین ما یشیخ نصاباً دون ما لا یشیخ نصاباً فان بلغ بکل منہما او احدهما اروج تعین التقویم بالاروج (۲)“

ملکیت اور قبضہ

زکوٰۃ کے بیان میں دوسرا اہم سلسلہ ملکیت کا ہے اسی پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ ملکیت سے مراد کیا ہے؟ اس پر حضرات فقہاء کی بہت جامع و مانع تعریفات ہیں:

(الف) ”الزکوٰۃ فی الشرع عبارة عن اخراج الحر المسلم البالغ العاقل اذا ملک

نصاباً ملکاً تاماً طائفة من المال الی الصرف (۳)

لیکن ملک تام سے مراد کیا ہے؟

(ب) ”الملك قیل هو القدرۃ علی التصرف (۴)

اس سے معلوم ہوا کہ ملک تام وہ ہے کہ مالک بھی ہو اور تصرف کی قدرت بھی رکھتا ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ قبضہ بھی ہو، اور قبضہ ہی وہ حقیقت ہے جو تصرف کا حق دیتا ہے، چنانچہ ہر قبل قبضہ کے بارے میں بیان فرمایا ہے۔

(۱) درمختار (۲) رد المحتار ۲/۴ (۳) البناہ ۱۱۵/۱ مطبعہ نزلکشر

(۴) البناہ ایضاً

"أما الصداق قبل القبض فإن بالعقد أصل الملك وتتمامه بما هو

المقصود ولا يحصل الا بالقصص (1)

یعنی مہر کی ملکیت تو عورت کے لیے نکاح ہوتے ہی متعین ہو گئی لیکن چوں کہ قبضہ نہیں ہوا اس لیے اس کے تصرف کی قدرت بھی معدوم ہے بدین و مہر عورت پر زکوٰۃ واجب نہیں اور مرد پر زکوٰۃ واجب ہونے کو عورت کی ملکیت مانع نہیں۔

(۳) "وعن أبي حنيفة ر لا يمنع إلى قوله والصحيح أنه غير مانع"

(ج) ایک اور مثال ملک کامل کی ملاحظہ ہو۔

”ويخرج ايضا المشتري للتجارة اذا لم يقبض حتى حل عليه الحول

لازكية فيه اذا لم يستغد ملك التصرف كمال الملك بكونه

مطلقا للتصرف : (٣)

“الملك التام الذى يكمل جميع آثار الملك : (٣)

”المشمري للتجارة قبل القبض: (٥)

موجودہ زمانہ میں وہ اشیاء (خواہ بڑی ہوں یا چھوٹی) جن کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہے اگرچہ خریدار مالک ہو چکا ہے لیکن ملک ناقص ہونے کی وجہ سے ادائے زکوٰۃ میں باوجود زکوٰۃ میں محسوب نہ ہوگی۔ یہیں سے ایک دوسرا مسئلہ بھی مستفاد ہوتا ہے (یعنی پرائیڈنٹ فنڈ جس کی تفصیل سوال ۶ میں مذکور ہے) پر زکوٰۃ کا معاملہ اس مسئلہ میں یہ تفصیل ہے کہ اس فنڈ کی رقم اگر پیشگی طور پر کل رقم کا جزو لیا جاتا ہے وہ قرضہ ہوتا ہے جس کو صاحب فنڈ یعنی مالک ادا کرتا ہے، اس فنڈ کی رقم کا وہ حصہ جو تنخواہ میں سے وضع کر لیا ہے کہ وہ سرکاری کمپنی کے ذمہ قرضہ ہوتا ہے اور جو اضافہ ہوتا ہے وہ امداد ہے جس کا مالک ملازم ملنے پر ہی ہوگا، یعنی بقدر تنخواہ حصہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور بقدر اضافہ جو ایک قسم کا قانونی وعدہ ہے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ وہ ملک تام نہیں ہے۔

(١) البناية ١١٥٢/١ - الرشاه م٢ (٢) رد المحتار ٥/٢ (٣) فتح القدير ١/٢٩٩

(٣) البنايه (٥) ردالمحتار ٥/٢

مال مخلوط پر زکوٰۃ

یہیں سے ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ بینکوں اور ڈاک خانوں اور ایسے ہی پراویڈنٹ فنڈ پر جو سود لگایا جاتا ہے اور یہ سب مال مل جاتا اور مخلوط ہو جاتا ہے اس کے بارے میں بھی یہ حکم ہے کہ جب اصل رقم کا امانہ کر دیا گیا تو کھاتہ دار کل رقم کا مالک ہو جاتا ہے لہذا کل رقم پر اس کو زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی۔

"ودخل ماملک بسبب خبیث کمفسوب خلطہ الخ" (۱)

وفی رد المحتار، واما المملوک ثراء فاسد افہومشکل لانہ قبل

قبضہ غیر مملوک وبعده مملوک ملکاً تاماً (۲)

اس لیے کھاتہ میں سود کی رقم کا جو امانہ ہوا اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ کیوں کہ ملک تام ہے اگرچہ اس کا سبب حرام ہے۔

مدارس اور اوقاف کے مال

ملک تام نہ ہونے کی وجہ سے مدارس اور اوقاف کے اموال پر ایسے ہی بیت المال کے اموال پر اور ایسے ہی مسلم خندوں کے اموال پر زکوٰۃ لازم نہ ہوگی۔

"فللا زکوٰۃ فی سواشم الوقف والخیل المسبلۃ تقدم الملك ولا فی

ما احرز العدو و بدراهم لانهم ملکوه بالاحصاء عندنا خلافاً للشافعی" (۳)

مصارف زکوٰۃ

منجملہ مصارف زکوٰۃ میں عالمین زکوٰۃ بھی زکوٰۃ کا مصرف قرار دیے گئے ہیں اور ان کو قرآن پاک نے مصرف قرار دیا ہے۔ زمانہ رسالت میں اور اس کے بعد بھی زکوٰۃ کی وصولیابی کا انتظام اور ایسے ہی اس کے خرچ کا انتظام اسلامی گورنمنٹ کے ہاتھ میں رہا ہے، گورنمنٹ اپنے ہی افسران کے ذریعہ اس کو وصول

کراتی اور اپنے ہی افسران کے ذریعہ اس کو تقسیم کراتی تھی، اسی وجہ سے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ارشاد فرمایا تھا،
 "ولو منعوني معالا" اگر مجھے ایک رسی دینے سے بھی انکار کیا تو ان سے جہاد کیا
 جائے گا۔

یہ بھی مسلمانوں کی بد قسمتی ہے کہ زکوٰۃ کا اجتماعی نظم انفرادیت پر آگیا، جس کی وجہ سے وہ اپنی اقتصادیات
 کے مسائل حل نہ کر سکے۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ فقہی اصطلاح میں تراویح مسلمانوں کے
 تحت ہر قریب اور ہر ہستی میں امیر یا قاضی کا تقرر جائز ہے اور طلاق و نکاح، رویت ہلال وغیرہ کے بارے میں اس
 کے فیصلے ناقد ہیں تو کیوں نہیں خلیفہ زکوٰۃ کے اجتماعی نظم کے قیام کی طرف توجہ دی جاتی؟ غالباً اس میں یہ
 اشکال ہو سکتا ہے کہ یہ مدارس اور مکاتب کس طرح چلیں گے؟ میرا خیال یہ ہے کہ اس اشکال میں قومی اور
 اسلامی مفاد کے بجائے انفرادی منفعت زیادہ حائل ہے۔

عالمین زکوٰۃ یا محصلین زکوٰۃ کو اسلامی گورنمنٹ بقدر کفایت تنخواہ دیتی ہے اور یہ بقدر کفایت
 بقدر نصف سے زیادہ نہ ہوگا۔ عامل مالدار ہوں یا فقیر بہر صورت ان کو زکوٰۃ میں سے دیا جائے گا اور یہ جائز ہے
 بشرطے کہ وہ خاندان رسالت میں سے نہ ہوں۔ صاحب مظہری نے لکھا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے عالمین زکوٰۃ کو بھی اصناف فقرا میں شمار کیا ہے خواہ وہ مالدار ہوں یا فقیر
 کیوں کہ وہ اموال زکوٰۃ وصول کرنے میں فقرا کے وکیل ہیں اور ان کے معاملات میں
 مشغول ہیں، اس لیے حکماً وہ بھی فقیر ہیں" (۱)

"لان الفقر شرط فی جمیع الاصناف الا العامل والمکاتب وابن السبیل" (۲)
 مصرف زکوٰۃ کی تمام قسموں میں فقیر ہونا شرط ہے مگر عامل، مکاتب اور مسافر کے لیے شرط نہیں ہے۔

علامہ شامیؒ نے ایک صفحہ کے بعد یہاں تک تحریر کر دیا ہے:

"لا يجوز دفع الزکوٰۃ الى من يملك ثياباً الا الى طالب علم والغازي
 ومنقطع الحج لقوله عليه السلام يجوز دفع الزکوٰۃ لطالب علم
 وان كان له نفقة اربعين سنة" (۳)

فی سبیل اللہ کے مفہوم کو متاخرین علماء نے اس قدر وسعت دی کہ بقول امام رازی وہ کھن موتی تعمیر مساجد وغیرہ جمع اصناف خیر کو فی سبیل اللہ سمجھنے لگے، لیکن حضرات حنفیہ کے نزدیک چوں کہ ادائے زکوٰۃ میں تملیک ضروری ہے اور یہ اشیاء اس مفہوم سے خالی ہیں اس لیے زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہیں۔

(الف): صاحب مظہری نے عاملین زکوٰۃ میں ایک علت یہ بھی بیان کی ہے کہ وہ چوں کہ فقراء کے وکیل ہیں اور ان کے معاملات میں مشغول رہتے ہیں اس لیے بقدر نصف تک ان کو زکوٰۃ کا مال دیا جاسکتا ہے۔

(ب): یہیں سے یہ بھی ایک مسئلہ مستفاد ہوتا ہے کہ معلمین علماء اور اہل افتاء صاحب الدرس اور مہتمم

مدارس صاحبان بھی طلبائے علم کے لیے مشغول ہوتے ہیں، اس لیے ان کو بھی زکوٰۃ کا مال دیا جاسکتا

ہے اور وہ بھی زکوٰۃ کا مصرف ہیں، جیسا کہ رد المحتار کی مندرجہ بالا عبارت سے مترشح ہوتا ہے،

اس لیے میری رائے میں نواب صدیق حسن خاں صاحب کا استدلال وقیع معلوم ہوتا ہے کہ:

آیت مصارف زکوٰۃ میں مذکورہ لفظ فی سبیل اللہ کے معنی اللہ کا راستہ ہے اور جہاد اگرچہ

اللہ کے راستوں میں اہم ترین راستہ ہے، لیکن باب زکوٰۃ میں فی سبیل اللہ کے حصہ کو مجاہدین کے ساتھ خاص

کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں بلکہ اس کا مصرف کرنا ہر اس عمل پر جو اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہوں جائز ہوگا۔

اس کے بعد نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”منجملۃ فی سبیل اللہ الصرف فی العلماء الذین یقومون

بمصالح المسلمین الدینیۃ فان لهم فی مال اللہ تعالیٰ نصیباً

سواء كانوا اغنیاء او فقراء بل الصرف فی هذه الجهة من اہم

الامور لان العلماء ورثة الانبیاء وحملة الدین وبہم تحفظ بیضة

الاسلام وشریعة سیدنا الامام“ (۱)

حضرات علماء کرام کی اس عطا کردہ سہولت کو اگر عمومیت دی جائے تو تمام لیڈران عظام اور ہر

ایک شخص ملت اسلامیہ کا خادم نظر آئے گا اور وہی مصرف زکوٰۃ قرار پائے گا۔ میرے نزدیک اتنی ڈھیل اور

وسعت کسی طرح جائز نہیں ہے کیوں کہ نصوص کو خدا اور رسول کی عطا کردہ حدود سے زیادہ پر قیاس کرنا جائز

نہیں ہے، لہذا زیادہ سے زیادہ:

طلباء علم دین، محصلین زکوٰۃ، خدام اور اساتذہ طلبائے دین زکوٰۃ کا مصرف قرار پاسکتے ہیں، لیکن وہ بھی بعض شرائط کے ساتھ، وہ شرائط ہیں امام کی جانب سے ان کا تقرر۔ موجودہ زمانہ میں اگرچہ یہ معنی حاصل نہیں ہیں، لیکن تراضی مسلمین کی قید نے جو مقتدر علماء اور مستند اور باعتبار مسلم اداروں کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے۔ سوال نامہ کے اعتبار سے ایک اشکال اور باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ محصلین زکوٰۃ کو اگر تنخواہ دیں تو اتنا عمل نہیں تو کیا سکے رائج الوقت کی طرح کمیشن پر مقرر کیا جاسکتا ہے اس میں محصل کا بھی فائدہ ہے اور ادارہ کا بھی فائدہ ہے۔

اس باب میں دو طرح پر جواب ہے ایک وجہ یہ کہ محصل کو بقدر نصف عمل کے زکوٰۃ کا مال دیا جاسکتا ہے اور کسی چیز کا نصف یا ثلث اسی وقت مقرر ہوگا جب وہ عمل و جود میں آئے گا، اس کے باوجود نصف زکوٰۃ تک محصل کو دینا جائز ہے اس میں دلیل ہے کہ کمیشن جائز ہے لیکن اگر اس کو اجارہ فائدہ قرار دیا جائے تو میں عرض کروں گا کہ عموم بلوئی کی وجہ سے علماء بخاری و بلخ نے اس قسم کے اجارہ کو جائز قرار دیا ہے۔

”قال فی التمسین و مشائخ بلخ والنسفی یجیزون حمل الطعام ببعض

المحمول ونسج الثوب ببعض النسج لتعامل اهل بلدہم بذلك“ (۱)

بتوفیق اللہ تعالیٰ میں عرض کرتا ہوں ہمارے دیار میں گیارہوں کی فصل کی کٹائی پر یہ تعامل رہا ہے کہ بیس گڈیوں پر ایک گڈی مزدور کو دی جاتی ہے اس کے مقابلہ میں مزدور نقد لینا پسند نہیں کرتا اور یہ تعامل سکے رائج الوقت کی طرح رہا ہے اور اب بھی ہے اور اہل مدارس نے محصلین کی بدعنوانیوں کی وجہ سے کافی عرصہ سے کمیشن مقرر کرنا شروع کر دیا ہے اور اب وہ تعامل عام بن گیا ہے، اس لیے مشائخ بلخ کی رائے کی تصویب زیادہ مناسب اور مفید ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

سوالات کے جوابات

ان : مفتی عبدالرحمن صاحب دہلی

زکوٰۃ کس قسم کے اموال میں واجب ہے؟

چار قسم کے اموال پر زکوٰۃ فرض ہے۔

- (۱) سونے چاندی پر (۲) تجارتی مال پر، خواہ وہ کسی قسم کا ہو۔ (۳) سائیکہ جانوروں پر۔ (۴) کھیتی اور درختوں کی پیداوار پر جس کو عشر کھاجاتا ہے۔
- س (۲) ملک تمام سے یہی مراد ہے کہ مال ملک کی ملک میں ہو، ید ابھی اور رقبہ بھی۔
- (۱) لہذا وہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہے مگر مال ابھی تک قبضہ میں نہیں آیا، اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی وصول ہونے سے پہلے واجب نہ ہوگی۔

”فلا تجب علی المشتري فیما اشتراه للتجارة قبل القبض“ (۱)

جو قیمت ادا کی جا چکی ہے اس کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہوگی۔ لانہ ملک ہایذا در قبضہ۔

- (۲) کرایہ کی مد میں جو رقم پیشگی دی گئی ہے وہ اجارہ پر دینے والے کی ملک ہو گئی ید ابھی اور رقبہ بھی،

اس لیے وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا، بشرطہ کہ اجارہ کی مدت پوری ہو جائے اس سے قبل اجارہ فسخ

نہ ہو۔

”وفى المحيط معزياً الى الجامع رجل له الف درهم لامال له غيره
استاجر بها دارا عشر سنين لكل سنة مائة فذبح الالف ولم
يسكنها حتى مضت السنون والدار فنى بيد الأجير زكا الأجير
فى السنة الاولى عن تسع مائة وفى الثانية عن ثمان مائة الا
زكاة السن الاولى ثم يسقط لكل سنة زكاة مائة اخرى وما
وجب عليه بالسنين الماضية لانه ملك الالف بالتعجيل كلها^(۱)

ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہو جانے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر اس لیے واجب نہیں کہ اس پر اس کا قبضہ نہیں اور اس لیے بھی واجب نہیں کہ مکان حوائج اعلیٰ میں سے ہے اور یہ رقم حوائج اعلیٰ میں محبوس تھی کہ اس کے بغیر مکان کا میسر آنا ناممکن اور آجر پر اس لیے اس کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی کہ وہ اس رقم کا مالک نہیں۔

س، (۳) وہ مال جو کسی شخص کی ملک نہیں ہے جیسے مدارس اور اداروں کے اموال، ان اموال میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

فلا زکوٰۃ فى سوائى الوقف والتخيل المسبلة لعدم الملك^(۲)

(۳) مال حرام جو اپنے پاس ہے اگر وہ اپنے مال کے ساتھ مخلوط نہیں ہے تو اس کی زکوٰۃ واجب

نہ ہوگی، اگر اس کے مالک معلوم ہیں تو واجب الرد نہیں تو واجب التصدق ہے۔

اور اگر مال حرام اپنے مال کے ساتھ اس طرح مخلوط ہو گیا ہے کہ امتیاز مشکل ہے تو یہ استہلاک ہے

جو امام صاحب کے نزدیک موجب ملک ہے، لیکن اس مال حرام کا ضمان اس صورت میں واجب ہوگا جو اس

کے ذمہ دین ہوگا اور زکوٰۃ اس میں واجب ہوگی بشرطہ کہ اس کے علاوہ اتنا مال موجود ہو کہ اس مال حرام کا ضمان

ادا کیا جاسکے اور اگر اس کے علاوہ مال نہیں ہے تو پھر زکوٰۃ اس کی واجب نہ ہوگی بلکہ مال حرام کو منہا کرنے

کے بعد جو بچے اگر وہ نصاب کو پہنچتا ہے تو اس پر زکوٰۃ ہوگی ورنہ نہیں۔

”ولو خلط السلطان المال المنسوب بعماله ملكه فتجب الزكاة

فيه ويورث عنه لان الخلط استهلاك اذا لم يمكن تمييزه
عند الحنفية وقوله ارفق اذ قل ما يخلو مال عن غصب
وهذا اذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط منفصل عنه
يؤني دينه والا فلا زكاة كما لو كان الكل خبيثا كما في النهر (۱)

(۵) ایسا دین کہ اس کا ثبوت دائن کے پاس موجود ہے یا مدیون اس دین کا منکر نہیں ہے اور اس کے وصول ہونے کی امید ہے اور دین قوی ہے یا متوسط ہے تو ایسی حالت میں دین کی زکوٰۃ دائن کے ذمہ لازم ہے مگر بعد قبضہ کے۔ دین قوی میں تو چالیس درہم پر قبضہ کے بعد اور دین متوسط میں دوسو درہم پر قبضہ کے بعد۔ اور اگر دین ضعیف ہے تو اس کی زکوٰۃ دینا لازم نہیں، جب وہ قبضہ میں آجائے گا اور اس پر سال گزر جائے گا تو مثل اور مالوں کے اس کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی۔

لیکن اگر مدیون مال مثول کر رہا ہے اس سے قرض کے وصول ہونے کی امید نہیں ہے وہ اقرار کے باوجود دیتا نہیں ہے اور دائن اس سے لینے پر قادر نہیں ہے تو ایسی صورت میں اس دین کی بامضیٰ کی زکوٰۃ دائن پر وصولیابی کے بعد بھی واجب نہ ہوگی۔

”وقد منا اول الزكاة اختلاف التصحيح فيه ومال الرحمتي الى هذا

وقال بل في زماننا يقر المديون بالدين وبملاءته ولا يقدر الدائن

على تخليصه منه فهو بمنزلة العدم (۲)

(۶) پراویڈنٹ فنڈ کی رقم (یعنی وہ رقم جو ملازم کی تنخواہ سے قبضہ میں آنے سے پہلے ہی وضع کر لی جاتی ہے اور اس پر بطور انعام حکومت اپنی طرف سے مع سود کے بڑھا کر دیتی ہے اس) رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، جب یہ رقم وصول ہوگی اور اس پر سال گزر جائے گا (یا پہلے سے صاحب نصاب ہے تو جب اس کے نصاب کا سال ہوگا) تب زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس لیے کہ تنخواہ سے وضع شدہ رقم جو قبضہ میں نہیں آئی ہے وہ خدمتِ حُر (آزاد) کا بدلہ ہے اور خدمتِ حرام نہیں ہے اس لیے اس کا بدلہ دین ضعیف ہے اور دین ضعیف کا حکم یہی ہے کہ اس پر ایام بامضیٰ کی زکوٰۃ

واجب نہیں ہوتی۔

شرط ثانی نہا ہے

مخالفت میں زیادتی کو کہتے ہیں جس کی شرعاً دو قسمیں۔ حقیقی و تقدیری۔ حقیقی نہادہ زیادتی ہے جو توالر و تناسل کے ذریعہ یا تجارت کے ذریعہ ہو، اور تقدیری نہا یہ ہے کہ مال کے اپنے یا اپنے نائب کے قبضہ میں رہنے کی وجہ سے زیادتی پر قدرت ہو۔ کذا فی رد المحتار۔

تیسری شرط مال کا حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجت اصلیہ وہ ضرورت ہے جو جان یا آبرو سے متعلق ہو، یعنی اس کے پورا نہ ہونے سے جان کے یا آبرو کے جانے کا خوف ہو، تو جو چیزیں انسان سے ہلاکت کو رفع کریں حقیقتاً جیسے نفقہ اور رہنے کا مکان اور آلات حرب اور سردی و گرمی کے کپڑے یا تقدیراً جیسے دین کہ مدیون اس کی ادائے لے گی کی طرف محتاج ہے اپنے نفس سے جس (قید) کو دفع کرنے کے لیے جو بہ منزلہ ہلاکت کے ہے اور جیسے پیشہ کے آلات اور گھر کا سامان اور سواری اور کتابیں اہل علم کے لیے۔ لان الجہل عندہم کالہ ہلاک۔ تو جو مال اپنی اصلی ضرورت سے زائد ہو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی اور جو مال ان اصلی ضرورتوں کے لیے ہو وہ مثل معدوم کے ہے اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔

"وفارغ عن حاجته الأصلية لان المشغول بها كالمعدوم" (۱)

رہی نفس حوائج تو ان میں بدرجہ اولیٰ زکوٰۃ واجب نہیں، اس لیے کہ وہ حوائج اصلیہ میں سے ہیں اور نمو بھی نہیں ہے۔

"لكن كلام الهداية مشعر بان المراد به نفس الحوائج فانه

قال وليس في دور السكنى وثياب البدن واثاث المنازل ودواب

الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة لانها مشغولة

چوتھی شرط، دین سے محفوظ ہونا

مال زکوٰۃ کا ایسے قرض سے محفوظ ہونا جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہو، خواہ وہ اللہ جل شانہ کا قرض ہو جیسے زکوٰۃ، عشر، خراج وغیرہ کہ حق اللہ تو ہیں مگر ان کا مطالبہ امام وقت کی طرف سے ہوتا ہے یا وہ قرض بندوں کا ہو، جو مال اس قسم کے قرض میں مستغرق ہو یا اس قدر قرض ہو کہ اس کے ادا کرنے کے بعد نصاب پورا نہ رہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

دیون کی اقسام

امام صاحب کے نزدیک دیون کی تین قسمیں: قوی - متوسط - ضعیف۔
 دین قوی وہ ہے جو مال تجارت یا سونے چاندی کے عوض کسی کے ذمہ عائد ہوا ہو۔ اور متوسط وہ دین ہے جو مال ہی کے بدلے میں عائد ہوا ہو، مگر وہ مال تجارت یا نقد سونا چاندی نہ ہو بلکہ گھر کا سامان وغیرہ ہو اور دین ضعیف وہ دین ہے جو کسی مال کے بدلے میں بذمہ دیون عائد نہ ہوا ہو، جیسے دین مہر وغیرہ۔
 دین قوی پر قبضہ ہونے سے پہلے بھی زکوٰۃ ہر سال واجب ہوتی رہتی ہے مگر ادا کرنا اس وقت ضروری ہوتا ہے جب چالیس درہم یا اس کی مقدار روپیہ وصول ہو جائے اس سے پہلے ادا کرنا واجب نہیں ہوتا۔ لیکن جب ادا کی جائے گی تو تمام سنین ماضیہ کا حساب کر کے ادا کی جائے گی، اور دین ضعیف پر قبضہ ہونے کے بعد بھی جب تک سال بھر نہ گزر جائے اس وقت تک زکوٰۃ واجب ہی نہیں ہوتی اور دین متوسط میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ سے دو روایتیں ہیں، ایک یہ کہ اس پر دین قوی کی طرح زکوٰۃ تو ایام ماضیہ کی بھی واجب ہوگی مگر ادا کرنا محض چالیس درہم کی وصولیابی پر لازم نہیں ہوگا، بلکہ پورا نصاب یعنی دو سو درہم یا اس کی مقدار مال جب وصول ہو اس وقت ادا کرنا لازم ہوگا، مگر ایام ماضیہ کی جی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ دین متوسط بھی دین ضعیف کے حکم میں ہے اس پر بھی زکوٰۃ ایام ماضیہ واجب نہیں ہوگی، بلکہ وصول ہونے کے بعد جب سال بھر اس پر گزر جائے تب زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور صاحب بدائع نے اسی آخری روایت کو اصح قرار دیا ہے۔

اس تفصیل کے بعد جوابات درج ذیل ہیں۔
 (۱) ایسا کثیر دین جو طویل الاجل ہے اور اس کی ادائے گی کی مدت قسط وار بیان کر دی گئی ہے
 'جل جلالہ دین مؤجل کو اگرچہ بعض نے مانع زکوٰۃ قرار دیا ہے مگر صحیح یہی ہے کہ وہ مانع زکوٰۃ
 نہیں ہے۔ علامہ ابن عابدین نے ردالمحتار میں قہستانی کے حوالے سے جواہر سے اسی قول کی
 تصحیح نقل کی ہے کہ دین مؤجل مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔

" زاد استافی عن الجواهر والصحيح انه غير مانع " (۱)
 اس روایت پر جس قسط کی ادائے گی ہو رہی ہے وہ مانع بنے گی باقی قرض کا چوں کہ مطالبہ
 نہیں اس لیے مانع نہیں بنے گا۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

ایسی کمپنی جس میں متعدد شرکا ہوتے ہیں اور اپنے اپنے حصہ کے مطابق اثاثے اور آمدنی کے مالک
 ہوتے ہیں ان پر زکوٰۃ کے وجوب کے لیے کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ ہر فرد کے انفرادی حصہ
 کا اعتبار ہوگا۔ جس فرد کا انفرادی حصہ نصاب کو پہنچے گا، اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

ہیرے جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے اور جواہرات میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی قیمتی کیوں نہ ہوں اور خواہ
 ان کے زیورات ہی کیوں نہ ہوں۔ ہاں اگر ہیرے اور جواہرات تجارت کے لیے ہیں تو اس صورت
 میں وہ مال تجارت ہوں گے اور ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

" لا زكاة في السلائي والجواهر وان ساوت الوفا الا ان تكون للتجارة " (۲)

واما اليواقيت والسلائي والجواهر فلا زكاة فيها وان كانت حليا الا ان

تكون للتجارة. كذا في الجوهرة النيرة " (۳)

اموال تجارت پر زکوٰۃ

جوامال تاجر کے قبضہ میں ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے اور اس میں یوم وجوب کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ یوم خرید کی قیمت کا اعتبار نہ ہوگا۔ زمین و جائداد جو تجارت کے لیے ہے ان کا یہی حکم ہے۔ یہ امام صاحب رحمہ کا قول ہے اور صاحبین رحمہ کے نزدیک یوم ادا کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ تاجر عام طور پر بھوک سے ہی خرید کرتا ہے تو اسی کے اعتبار سے اسٹاک کی قیمت لگائے گا، اور جو اشیا پھٹکر سے خرید کی ہیں ان میں پھٹکر کی قیمت لگائے گا اور زکوٰۃ ادا کرے گا۔

"وتعتبر القيمة يوم الواجب وقالا يوم الاداء وفي السوانم

يوم الاداء اجماعاً" (در المختار ۲/۳۷۲)

شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

کمپنی کے شیرز ہولڈر نے جو روپیہ کمپنی کو دیا ہے وہ پوری رقم تجارت میں لگی ہوئی ہے اس میں سے اس کے حصہ کی وہ رقم جو مشنری کی خرید میں صرف ہوگئی ہے یا دیگر آلات حرقہ (پیشہ) میں صرف ہوئی ہے اس تمام رقم کو منہا کر کے بقیہ رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (بشرط نصاب و حولان حول)۔ اگر مشنری میں صرف شدہ رقم کا علم نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتا تو احتیاط اس میں ہے کہ پوری رقم کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے جو رقم نفع کی آتی ہے اور وہ صرف ہونے سے بچ رہتی ہے اس پر (اگر وہ بقدر نصاب ہے اور سال گزر گیا ہے) زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بونڈس جو بڑا قرضہ حکومت کو دیا گیا ہے اس کا حکم یہی ہے کہ وصولیابی کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اور یہ دین بھی دین قوی ہے۔ چالیس درہم یا ان کے بقدر روپیہ وصول ہونے پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہوگی۔ فقط واللہ اعلم۔

سوالات کے جوابات

انہ — (حضرت مولانا عبدالجلیل قاسمی، مدرس مدرسہ جامعہ اسلامیہ قرآنیہ سر، چمپارن)

الحمد للہ والصلوة والسلام علی حبیبہ وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

اما بعد !

زکوٰۃ، سونا، چاندی، سامان تجارت اور سائمر ہانوروں میں واجب ہوتی ہے، ملک تام سے مراد یہ ہے کہ ملکیت بھی ہو اور اس سے انتفاع بھی ممکن ہو، علامہ کاسانی نے اس کو ملک مطلق سے تعبیر کیا ہے:

”وہو ان یکون مملوکا لہ رقبتہ ویداً“

سوال — مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہو سکی ہے اس میں زکوٰۃ تو واجب ہوگی لیکن قبضہ میں آنے سے پہلے ادائیگی واجب نہیں ہوگی، قبضہ میں آنے کے بعد گزشتہ ایام کی زکوٰۃ بھی ادا کرے گا، علامہ شامی نے ملک تام کی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

”وخرج بہ ایضاً کافی البحر: المشتري للتجارة قبل القبض“

پھر آگے درمختار کی عبارت:

”ولا فیما اشتراہ للتجارة قبل قبضہ“ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اما بعد فی زکیہ عما مضی“

سوال _____ کرایہ دار نے جو پیشگی رقم مالک مکان کو دیا ہے وہ دو قسم کی ہو سکتی ہے اول یہ کہ وہ پیشگی کرایہ ہو، دوسرے یہ کہ وہ زر ضمانت ہو جو عقد اجارہ کے قسغ ہونے یا مدت پوری ہو جانے پر کرایہ دار کو واپس کیا جائے گا، پہلی صورت میں اس کا مالک، مالک مکان ہوگا، اور اس کو ملک تام حاصل ہے، اس لیے اس قسم کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی، گرچہ صاحب بدائع نے ایک قول کرایہ دار پر بھی وجوب کا نقل کیا ہے، مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے :

”ذکر الشیخ الامام ابو بکر محمد بن الفضل البخاری فی الاجارة الطریلة
التي تعارفها اهل بخاری ان الزکات فی الاجرة المعجلة علی الأجر لانه
ملكه قبل الفسخ وان كان يلحقه دين بعد العول بالفسخ وقال بعض ثغنا
انه يجب علی المستاجر ايضا لانه یحد مالا موضوعا عند الأجر“

دوسری صورت میں چوں کہ اس کا مالک کرایہ دار ہے اس لیے اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر واجب ہوگی، قبضہ پانے کے بعد گزشتہ ایام کی زکوٰۃ بھی ادا کرے گا، جس طرح دوسرے تمام دیون میں ہوگا۔ علامہ کا سامی نے بیع الوفاء کے ثمن پر بکت کرتے ہوئے بائع اور مشتری دونوں پر وجوب زکوٰۃ کو نقص کیا ہے، علامہ شامی نے اس پر بکت کرتے ہوئے اپنا رجحان صرف مشتری پر وجوب کی طرف ظاہر کیا ہے

”قلت ينبغي لزومها علی المشتري فقط علی القول الذی علیہ العمل الآن“

من ان یبع الوفاء منزل منزلة الرهن فيكون الثمن دینا علی البائع“

پہلی صورت کی تائید اس بحث سے بھی ہوتی ہے جو علامہ شامی نے کیا ہے کہ اگر کسی عورت کا ککاح ایک ہزار درہم پر ہوا اور عورت نے اس پر قبضہ پالیا، اور اس پر سال گزر گیا تو اس صورت میں عورت پر زکوٰۃ واجب ہوگئی۔ اب اگر شوہر نے قبل الدفول طلاق دیدیا تو عورت نصف مہر شوہر کو واپس کرے گی، لیکن اس نصف کی زکوٰۃ اس سے ساقط نہیں ہوگی۔

سوال _____ جس مال کا کوئی مالک معین نہ ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہیے :

”وهذا لان فی الزکات تعلیكا والتعلیك فی غیر الملك لا یتصور“

سوال ۴۔ جو مال کہ کسی کے قبضہ میں بطور حرام آتا ہے، وہ کل واجب التصدق ہے، تمام کا صدقہ کرنا واجب ہوگا نہ کہ ایک جزء (زکوٰۃ) کا، یعنی اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی؛

”فی القنیۃ لو کان الخبیث نصاباً لایلزمہ الزکوٰۃ لان کل واجب التصدق علیہ فلا یفید ایجاب التصدق ببعضہ“

اگر یہ حرام مال اس کے حلال مال میں اس طرح مخلوط ہو گئے کہ تمیز ممکن نہیں ہے تو حرام مال کے بقدر وضع کرنے کے بعد اگر باقی ماندہ مال نصاب کے برابر ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں؛

”من ملک اموالاً غیر طیبۃ او غصب اموالاً و خلطها ملکها بالخلط و یبیر

ضامناً وان لم یکن لہ سواہا نصاب فلا زکوٰۃ علیہ فیہا وان بلغت نصاباً

لانہ مدیون و مال المدیون لا ینعقد سبباً لوجوب الزکوٰۃ عندنا فافاد

بقولہ وان لم یکن لہ سواہا نصاباً الخ ان وجوب الزکوٰۃ مقید بعا اذا کان

لہ نصاب سواہا“

سوال ۵۔ دین کی زکوٰۃ بہر حال دائن پر ہوگی نہ کہ مدیون پر، مدیون کے مال مٹوں کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں کی جاسکتی، نہ دائن وجوب سے بری قرار دیا جاسکتا ہے، فقہاء نے دین کی جو تقسیم کی ہے، اس میں سے دین قوی اور متوسط کا اگر وصول پانا آج کل کے حالات کے اعتبار سے ممکن ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ جب وصول پائے گا گزشتہ ایام کی زکوٰۃ بھی ادا کرے گا۔ اور اگر دین ضعیف ہو تو اس میں قبضہ سے پہلے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جب قبضہ پائے گا اس وقت اگر اس کے پاس نصاب ہوگا تو اس میں ضم کر کے زکوٰۃ ادا کرے گا اور اگر اس کے علاوہ نصاب نہیں ہوگا، تو جب نصاب کے برابر وصول پائے گا، اور اس پر سال گزر جائے گا، تو زکوٰۃ ادا کرے گا، اگر آج کل کے حالات کے اعتبار سے دین کا وصول پالینا ممکن نہ ہو، تو قبضہ سے پہلے کسی قسم کے دین میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

سوال ۶۔ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کا مالک ملازم ہوتا تو ہے، لیکن وہ رقم اس کے لیے ممکن الانتفاع نہیں ہے اور اگر وہ چاہے تو اس رقم کو استعمال میں نہیں لاسکتا، البتہ اس رقم کی بنیاد پر اس کو قرض تو

مل سکتا ہے جو پھر اس کی تنخواہ سے وضع ہو جائے گا، اگر وہی رقم اس کو ملتی، جس طرح تنخواہ کا باقی حصہ ملتا ہے، تو پھر اس کے وضع کا سوال ہی نہیں ہوتا، اس لیے اس پر قبضہ پانے سے پہلے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، جس وقت قبضہ پائے گا اگر اس کے پاس اس کے علاوہ نصاب ہوگا، تو اس میں ضم ہو جائے، ورنہ جب نصاب کے برابر پائے گا، اور اس پر سال گزر جائے گا تو زکوٰۃ واجب ہوگی، اس رقم کے سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بدائع کی لمبی عبارت نقل کرنے کے بعد پوری تفصیلی بحث کی ہے، اور لکھا ہے کہ وہ دین ضعیف میں داخل ہے، قبضہ پانے کے بعد ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس تحقیق سے اتفاق کیا ہے۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی عدم وجوب زکوٰۃ کے قائل ہیں۔

دوسری شرط نمّا

”نمّا“ کا معنی زیادتی اور بڑھوتری ہے، یہ جانوروں میں تو والد و تناسل کے ذریعہ ہوتا ہے اور دوسری اموال میں تجارت کے ذریعہ، اسامہ دودھ، گھی اور نسل کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے، اور تجارت نفع کا سبب ہے تو سبب کو مسبب کی جگہ دی گئی ہے، جیسا کہ سفر، نکاح اور نوم کو مشقت و طہی اور حدیث کے قائم مقام کر کے ان پر انکامات جاری کیے گئے ہیں، البتہ سونا، چاندی میں مطلقاً زکوٰۃ واجب ہوگی، اس میں تجارت کی نیت شرط نہیں ہے اگر زیور کی شکل میں ہو تو بھی زکوٰۃ واجب ہوگی،

”هوان يكون معدا للاستثمار وذلك بالاعداد للاسامة في المواشي والتجارة

في اموال التجارة إلا ان الاعداد للتجارة في الاثمان المطلقة من الذهب والفضة

ثابت باصل الخلقة لانها لا تصلح للانتفاع باعيانها في دفع الحوائج الاصلية

فلا حاجة إلى الاعداد من العبد للتجارة بالنية إذ النية للتعيين وهي متعيّنة للتجارة

باصل الخلقة فلا حاجة إلى التعيين بالنية فتجب الزكاة فيها نوى التجارة أو

لغيرها أصلاً ونوى النفقة“

نصاب کے لیے نہ حقیقی جو اسامہ یا تجارت کے ذریعہ ضروری نہیں ہے، بلکہ نہ تقدیری بھی نصاب کی تکمیل کے لیے کافی ہے، علامہ شامی نے نما کی بحث میں لکھا ہے :

”هو نوعان حقیقی و تقدیری فالحقیقی الزیادة بالتوالد والتناسل والتجارات
والتقدیری تمکنه من الزیادة بكون المال فی یدہ او ید نائبہ“

(نام ولو تقدیراً، النما اما تحقیقی بكون بالتوالد والتناسل والتجارات او تقدیری
یکون بالتمکن من الاستنماء بان یکون فی یدہ او ید نائبہ“

تیسری شرط حاجتِ اصلیہ

انسان کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے جتنی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ سب خواجگہ
اصلیہ میں داخل ہیں، مثلاً رہنے کا مکان، پہننے کے کپڑے سواری کے جانور وغیرہا، آج کل سواری کے
لیے جیپ کار اور موٹر سائیکل بھی حوائجِ اصلیہ میں داخل ہیں، ملک العلماء کی پوری بحث کا حاصل ہے
کہ نقدین کے علاوہ جو سامان بھی تجارت کے لیے بنے ہیں وہ حوائجِ اصلیہ میں داخل ہیں اور ان میں زکوٰۃ
واجب نہیں ہوگی، میرے خیال میں ہر دور اور ماحول میں اس کے اعتبار سے حوائجِ اصلیہ کا اعتبار کیا
جائے گا۔

چوتھی شرط

دین سے محفوظ ہونا، ہر وہ دین جس کا مطالبہ آدمی کر سکتا ہو، وہ مانع و موجب زکوٰۃ ہے
چاہے یہ دین بندوں کا ہو یا اللہ تعالیٰ کا، چاہے یہ دین حال ہو یا مؤجل ہو :

”ومنها ان لا یكون علیہ دین مطالب بہ من جهة العباد عندنا
فان کان فائز یمنع الزکاة بقدرہ حالاً کان او مؤجلاً“

بیوی کا مہر وجوب زکوٰۃ سے مانع ہوگا یا نہیں اس سلسلہ میں صاحب بدائع ۲/۲۸۱ اور صاحب مجمع الانہر ۱/۲۱۲ نے فقہاء احناف کے مختلف اقوال نقل کیا ہے، لیکن آج کے دور میں علامہ شامی کی نقل پر عمل ہونا چاہیے کہ بیوی کا مہر کسی حال میں بھی وجوب زکوٰۃ سے مانع نہیں ہوگا :

”ومن اى حنیفة لا یمنع زاد القہستانی عن الجواہر والصحیح انہ
غیر مانع“

آج کے دور کے طویل المیعاد قرضے بھی وجوب زکوٰۃ سے مانع ہوں گے۔

کمپنی پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ کے سلسلہ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ ہر شخص کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا، اس لیے کہ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے نصاب کا مالک ہونا ضروری ہے جو نصاب کا مالک ہوگا، اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور جو مالک نہیں ہوگا اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی،

”ولو كانت الفضة مشتركة بين اثنين فان كان يبلغ نصيب كل واحد
منهما مقدار النصاب تجب الزکوۃ والا فلا ويعتبر في حال الشركة
ما يعتبر في حال الانفراد“

لهذا الذي ذكرنا اذا كانت السواثم لواحد فاما اذا كانت مشتركة
بين اثنين فقد اختلف فيه قال اصحابنا انه يعتبر في حال الشركة ما يعتبر
في حال الانفراد وهو كال النصاب في حق كل واحد منهما فان كان نصيب
كل واحد منهما يبلغ نصابا تجب الزکوۃ والا فلا“

پھر امام شافعی کا اختلاف اور دلائل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

”كل جواب عرفتہ في السواثم المشتركة فهو الجواب في الذهب والفضة واموال
التجارة“

ہیرے جواہرات

ہیرے اور جواہرات کو اگر سرمایہ محفوظ کرنے کے لیے خریدا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا ارادہ ہے کہ جب ضرورت ہوگی تو بیچ کر ضرورت پوری کی جائے گی، یعنی خریداری و فروخت کی نیت کے ساتھ ہے تو یہ مال تجارت ہے اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر استعمال کے لیے خریدا ہے تو سونے، چاندی کے علاوہ زیورات حوائجِ اصلیہ میں داخل ہیں یا نہیں مختلف فیہ ہے، مجھ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کو حوائجِ اصلیہ میں داخل ہونا چاہیے :

”سئل الحسن بن علی عن رجل لبسها جواهر ولا الى تلبسها في الامسيات وتزين بها للزوج وليست للتجارة هل عليها صدقة الفطر قال نعم اذا بلغت نصاباً وسئل عنها عمر العافظ فقال لا يجب عليها شيء وحاصله ثبوت الخلاف في ان العلل غير النقاد من الحوائج الاملية، والله تعالى اعلم“

صاحب درمختار نے وضاحت کی ہے کہ ہیرے اور جواہرات میں، اگر تجارت کے لیے نہ ہوں، تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی :

”لان زکوٰۃ في اللاتي والجواهر وان سارت الفاء اتفاقاً الا ان تكون للتجارة“

اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت جو تاجر کے قبضہ میں ہے ادائیگی زکوٰۃ کے دن ان کی مالیت کا تعین اس دن کی قیمت سے کیا جائے گا، میرے خیال میں ہتھوک بھاؤ کا اعتبار کیا جائے گا۔ جو لوگ اراضی کی خرید و فروخت ایک تجارتی کاروبار کے طور پر کرتے ہیں اگر وہ زمین شہر میں ہے، عشری یا خراجی نہیں ہے تو وہ مال تجارت ہے اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، اور قیمت کا تعین زکوٰۃ کی ادائیگی کے دن کی قیمت سے کیا جائے گا، اگر وہ زمین کاشت کی ہے، عشری یا خراجی

ہے تو علامہ کا سانی نے اس میں فقہاء کا اختلاف نقل کیا ہے، مشہور روایت کے مطابق اس زمین میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ عشر یا خراج واجب ہوگا، تاکہ حق اللہ مضاعف نہ ہو جائے، مثال میں سائلمہ مع التجارة کو پیش کیا ہے، یعنی اگر کسی کے پاس تجارت کے لیے جانور ہوں اور وہ سائلمہ بھی ہوں، تو ان میں سائلمہ ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ تجارت کا مال ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی،

”لو اسيبت للبيع والتجارة ففيها زكوة مال التجارة لا زكوة السائلمة“

اسی طرح اگر کسی کے پاس عشری یا خراجی زمین ہو تو اس میں عشر یا خراج واجب ہوگا، زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، ورنہ حق اللہ مضاعف ہو جائے گا، امام محمد علیہ الرحمۃ سے مروی ہے کہ ایسی زمین میں زکوٰۃ اور عشر یا زکوٰۃ اور خراج واجب ہوگا، وجہ یہ ہے کہ عشر پیداوار میں ہوگا اور زکوٰۃ قیمت میں ہوگی، اس لیے ایک مال میں دو حق جمع نہیں ہوں گے، میرے نزدیک امام محمد رحمۃ اللہ کا قول راجح ہے، جانور میں سائلمہ اور مال تجارت کی زکوٰۃ واجب کرنے میں دو حقوں کے جمع ہونے کا امکان ہے، مثلاً کسی کے پاس اکتالیس بکریاں سائلمہ تجارت کے لیے ہوں، اگر وہ سائلمہ کی زکوٰۃ دے گا اور مال تجارت کی زکوٰۃ دے گا، تو بھی ایک بکری دے گا اس طرح حق مضاعف ہو جائے گا، کیوں کہ سائلمہ کی زکوٰۃ بھی پوری پونجی ہوتی ہے اور مال تجارت کی زکوٰۃ بھی پوری پونجی میں ہوتی ہے لیکن زمین میں زکوٰۃ کا مسئلہ اس سے بالکل مختلف ہے، عشر صرف منافع یعنی پیداوار میں ہے اور زکوٰۃ صرف قیمت یعنی اصل پونجی میں ہے، مثلاً اگر کسی کے پاس ایک زمین ہے جس کی قیمت ایک لاکھ روپے ہیں اور اس کی پیداوار دس کونٹنل گندم ہے تو عشر صرف گندم میں ہوگا، اس کی قیمت میں نہیں، اور زکوٰۃ صرف اس کی قیمت میں ہوگی، گندم میں نہیں، تو یہاں دو حق ایک مال میں جمع نہیں ہوں گے، اس لیے اگر تجارت کے لیے عشری یا خراجی زمین ہے تو اس کی قیمت میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور ادائیگی کے وقت کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا،

”قال اصحابنا فيمن اشترى ارض عشر للتجارة او اشترى ارض خراج للتجارة“

فيها العشر والخراج ولا تجب زكوة التجارة مع احدهما هو الرواية المشهورة

منهم وروى عن محمد انه يحب العشر والزكوة او العشر

هذه الرواية ان زكاة التجارة تجب في الارض والعشر يجب في الزرع وانها
مالا مختلفان فلم يجتمع الحقائق في مال واحد وجه ظاهر الرواية ان
سبب الوجوب في الكل واحد وهو الارض الا ترى انه يضاف الكل اليهما
يقال عشر الارض وخروج الارض وزكاة الارض وكل واحد من ذلك حق
الله تعالى وحقوق الله تعالى المتعلقة بالاموال النامية لا يجب فيها
حقان منها بسبب مال واحد كزكاة السائمة مع التجارة ^{له}
علامہ شافعی نے بھی اسی عبارت کو نقل کیا ہے۔

نصاب زکوٰۃ

سونے اور چاندی کے نصاب میں وجوب اور ادائیگی دونوں میں ان کے وزن کا اعتبار
کیا جائے گا، یعنی اگر صرف سونا ہے تو جب تک $\frac{1}{5}$ تولہ نہیں ہوگا زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، مثلاً اگر صرف
سات تولہ ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، چاہے اس کی قیمت سات سو تولہ چاندی کے برابر کیوں نہ
ہو جائے۔ ایسے ہی اگر صرف چاندی ہے تو $\frac{1}{5}$ تولہ ہوگی تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں؛

"فان كان له فضة مصرية فلا زكاة فيها حتى تبلغ مائتي درهم ووزنها
ووزن سبعة - فاما اذا كان ذهب مصرية فلا شيء فيه حتى يبلغ عشرين مثقالاً
والمعتبر وزنهما اداءً وجوباً لا قيمتهما۔"

اگر تجارت کا مال ہے تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر چاندی سے خریدا ہے تو چاندی
سے دام لگایا جائے گا، اور اگر سونا سے خریدا ہے تو سونا سے دام لگایا جائے گا۔ ورنہ جو بکے شہر میں
زیادہ رائج ہوگا، اس سے دام لگایا جائے گا، امام محمد رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ بہر دو صورت شہر میں غالب
رائج سکے سے دام لگایا جائے گا، لیکن آج کے دور میں جب کہ چاندی اور سونے کا سکہ معدوم ہے

کے مقابلہ میں ہوگا، اور اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

بونڈس کی رقم دین قوی ہے، اس لیے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ قبضہ سے پہلے ادائیگی ضروری نہیں ہوگی، کمیشن کرانے کے بعد گزشتہ برسوں کی زکوٰۃ بھی ادا کی جائے گی۔

مصارف زکوٰۃ

۱۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک شرط ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ رقم طالب علم کے حوالہ کر دی جائے پھر وہ کھانے کی قیمت، مکان کا کرایہ اور دوسرے اخراجات ادا کرے گا، جس طرح مستطیع طلباء ادا کرتے ہیں، ان خود مکان کے کرایہ اور اساتذہ کی تنخواہ میں خرچ کر دینا صحیح نہیں ہوگا، مدرسہ کا مہتمم زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے نہ کہ طلباء کا۔

۲۔ مدرسہ کے محصلین کو زکوٰۃ کی رقم سے تنخواہ دی جاسکتی ہے یا نہیں یہ الگ مسئلہ ہے اور مدارس میں کمیشن پر وصول کرانا جائز ہے یا نہیں یہ دوسری بحث ہے۔

جو لوگ اسلامی حکومت کی طرف سے صدقات، زکوٰۃ، عشر وغیرہ، لوگوں سے وصول کر کے بیت المال میں جمع کرنے کی خدمت پر مامور ہوتے ہیں وہی عامل ہیں، اور ان کو زکوٰۃ کی مد سے معاوضہ دیا جاسکتا ہے، اسلامی مدارس اور انجمنوں کے سفراء ان میں داخل نہیں ہیں، اور ان کو زکوٰۃ سے تنخواہ دینا جائز نہیں ہے۔

کمیشن پر وصولی کو فقہاء نے اجرت کے مہول ہونے کی وجہ حرام کہا ہے، جواز کے لیے یہ وجہ دکھانا کہ تنخواہ پر وصولی کم ہوتی ہے اور کمیشن پر زیادہ یہ عذر لنگ ہے، وصولی میں کمی ذمہ داران مدرسہ کی آپسی عیقل سے کی وجہ سے ہوتی ہے، یہ خرابی کمیشن کا طریقہ اختیار کیے بغیر بھی دور کی جاسکتی ہے، مثلاً تنخواہ مقرر کیے جانے کے ساتھ وصولی کی ایک حد بھی مقرر کی جائے اور اس میں معمولی کمی زیادتی کو نظر انداز کر دیا جائے، غیر معمولی کمی کی صورت میں تنخواہ کم کر دی جائے یا ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے، کمیشن میں بھی

خرا بیاں ہیں، اگر کوئی شخص یکمشت ایک بڑی رقم مثلاً دس ہزار روپے کسی محصل کو حوالہ کر دے تو ذمہ دارانِ مدرسہ اس میں کمیشن دینا نہیں چاہتے ہیں، اور آپس میں بدگمانیاں بڑھتی ہیں۔

مصارف زکوٰۃ فی سبیل اللہ

زکوٰۃ کا مقصد غریبوں کی کفالت ہے، بالداروں سے ان کے مال کا ایک حصہ لیا جائے اور غریبوں پر خرچ کیا جائے؛

”ان اموالہم حق معلوم للسائل والمحروم“

یہی وجہ ہے کہ زکوٰۃ جہاں کے بالداروں سے لی جائے وہیں کے فقراء پر خرچ بھی ہونی چاہیے، الایہ کہ دوسری جگہ بھیجنے کے وجوہات قوی ہوں، زکوٰۃ کا مقصد مسلمانوں کی عمومی مصالح کی رعایت ہرگز نہیں ہے، آیت میں فقیر و مسکین کے ساتھ بعض دوسرے مصارف کا ذکر ہے تو اس لیے کہ وہ بظاہر فقیر و مسکین نہیں ہوتے، مثلاً مسافر جس کے گھر پر دولت کی ریل پیل ہے، لیکن حالت سفر میں وہ کسی وجہ سے محتاج ہو گیا، تو اس کو زکوٰۃ دی جائے گی، حالانکہ وہ حقیقت میں فقیر نہیں ہے اس لیے اگر صرف فقیر و مسکین کا لفظ استعمال کیا جاتا، تو ایسے مسافر کو زکوٰۃ کی رقم دینے میں تاہل ہو سکتا تھا، ورنہ اگر فقر کی قید نہ ہو تو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک ادنی لاکھوں کی دولت کے ساتھ سو کیلو میٹر اپنے وطن سے دور ہے اس کو زکوٰۃ کی رقم اس لیے دی جائے کہ وہ مسافر ہے اور مصرف زکوٰۃ ہے۔

اس لیے اگر احناف نے عاقلین کے علاوہ تمام مصارف میں فقر کی بنیادی شرط لگائی ہے تو یہ استہانی معقول ہونے کے ساتھ ضروری بھی ہے۔

فی سبیل اللہ کی تعین میں ہمیں دیکھنا ہو گا کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے اس سے کیا سمجھا، ہم لوگ اس سے باہر نہیں جاسکتے، اگر قرآن کی تفسیر لغت کی مدد سے ہونے لگے، اور صحابہ و ائمہ کرام کی تشریحات کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر قرآن کو تحریف سے بچانا مشکل ہو جائے گا، جو لوگ لغت کا سہارا لیکر فی سبیل اللہ میں ہر قسم کے کاریگر کو شامل کرنا چاہتے ہیں، حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب مرحوم نے ان کو غلط کہا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حضرت مفتی صاحب مرحوم کی بحث جو فی سبیل اللہ کے متعلق ہے نقل کر دی جائے؛

”سانواں مصرف فی سبیل اللہ ہے، یہاں پھر حرف فی کا اعادہ کیا گیا ہے، تفسیر کشاف میں ہے کہ اس اعادہ سے اس طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ مصرف پہلے سب مصارف سے افضل اور بہتر ہے، وجہ یہ ہے کہ اس میں دو فائدے ہیں ایک غریب مجلس کی امداد دوسرے ایک دینی خدمت میں اعانت، کیوں کہ فی سبیل اللہ سے مراد وہ غازی اور مجاہد ہے، جس کے پاس اسلحہ اور جنگ کا ضروری سامان خریدنے کے لیے مال نہ ہو یا وہ شخص جس کے ذمہ حج فرض ہو چکا ہو، مگر اس کے پاس اب مال نہ رہا ہو، جس سے وہ حج فرض ادا کرے، یہ دونوں کام غلصہ دینی خدمت اور عبادت میں، اس لیے مال زکوٰۃ کو ان پر خرچ کرنے میں ایک مجلس کی امداد بھی ہے اور ایک عبادت کی ادائیگی میں تعاون بھی اسی طرح حضرات فقہاء نے طالب علموں کو بھی اس میں شامل کیا ہے کہ وہ بھی ایک عبادت کی ادائیگی کے لیے لیتے ہیں، اور صاحب بدائع نے فرمایا کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیک کام یا عبادت کرنا چاہتا ہے اور اس کی ادائیگی میں مال کی ضرورت ہے تو وہ بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے، بشرطیکہ ان کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے اس کام کو پورا کر سکے، جیسے دین کی تعلیم و تبلیغ اور اس کے لیے نشر و اشاعت کہ اگر کوئی مستحق زکوٰۃ یہ کام کرنا چاہے تو اس کی امداد مال زکوٰۃ سے کر دی جائے مگر مالدار صاحب نصاب کو نہیں دیا جاسکتا“

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان تمام صورتوں میں جو فی سبیل اللہ کی تفسیر میں مذکور ہیں، فقر و حاجت مندی کی شرط ملحوظ ہے، غنی صاحب نصاب کا اس میں بھی حصہ نہیں، بجز اس کے کہ اس کا موجودہ مال اس ضرورت کو پورا نہ کر سکتا ہو، جو جہاد یا حج کے لیے دستیاب ہے، تو اگرچہ بقدر نصاب مال موجود ہونے کی وجہ سے اس کو غنی کہہ سکتے ہیں، جب کہ ایک حدیث میں اس کو غنی کہا گیا ہے مگر وہ بھی اس عبارت سے فقیر و حاجت مند ہی ہو گیا کہ جس قدر مال جہاد یا حج کے لیے درکار ہے وہ اس کے پاس موجود نہیں۔

فتح القدیر میں شیخ ابن ہمام نے فرمایا کہ آیت صدقات میں عتق مصرف ذکر کیے گئے ہیں، ہر ایک کے الفاظ خود اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ فقر و حاجت مندی کی بنیاد پر مستحق ہیں، لفظ فقیر، مسکین میں تو یہ ظاہر ہی ہے، رقاب، غارمین، فی سبیل اللہ، ابن السبیل کے الفاظ بھی اس طرف مشیر ہیں کہ ان کی حاجت روائی کی بنیاد پر ان کو دیا جاتا ہے، البتہ عالمین کو بطور معاوضہ خدمت دیا جاتا ہے، اس لیے اس میں غنوی

دقیقہ برابر ہیں، جیسے غارین کے مصرف میں بیان کیا جا چکا ہے کہ جس شخص کے ذمہ دس ہزار روپیہ قرض ہے اور پانچ ہزار روپیہ اس کے پاس موجود ہے تو اس کو بقدر پانچ ہزار کے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، کیوں کہ جو مال اس کے پاس موجود ہے وہ قرض کی وجہ سے نہ ہونے کے حکم میں ہے۔

تنبیہ

فی سبیل اللہ کے لفظی معنی بہت عام ہیں، جو جو کام اللہ کی رضا جوئی کے لیے کیے جائیں وہ سب اس عام مفہوم کے اعتبار سے فی سبیل اللہ میں داخل ہیں، جو لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر و بیان اور ائمہ تفسیر کے ارشادات سے قطع نظر محض لفظی ترجمہ کے ذریعہ قرآن سمجھنا چاہتے ہیں، یہاں ان کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ لفظ فی سبیل اللہ دیکھ کر زکوٰۃ کے مصارف میں ان تمام کاموں کو داخل کر دیا جو کسی حیثیت نیکی یا عبادت میں، مساجد، مدارس، شفا خانوں، مسافر خانوں وغیرہ کی تعمیر کنوئیں اور پل اور سڑکیں بنانا ان رہائی اداروں کے ملازمین کی تنخواہیں اور تمام دفتری ضروریات، ان سب کو انہوں نے فی سبیل اللہ میں داخل کر کے مصرف زکوٰۃ قرار دیدیا، جو سراسر غلط ہے اور اجماع امت کے خلاف ہے، صحابہ کرام جنہوں نے قرآن کو براہ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا اور سمجھا ہے، ان کی اور ائمہ تابعین کی جتنی تفسیریں اس لفظ کے متعلق منقول ہیں، ان میں اس لفظ کو حجاج اور مجاہدین کے لیے مخصوص قرار دیا گیا ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے اپنے ایک اونٹ کو فی سبیل اللہ وقف کر دیا تھا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمایا اس اونٹ کو حجاج کے سفر میں استعمال کرو۔

امام ابن جریر، ابن کثیر قرآن کی تفسیر روایات حدیث ہی سے کرنے کے پابند ہیں، ان سب نے لفظ فی سبیل اللہ کو ایسے مجاہدین اور حجاج کیلئے مخصوص کیا ہے، جن کے پاس جہاد یا حج کا سامان نہ ہو اور جن حضرات فقہاء نے طالب علموں یا دوسرے نیک کام کرنے والوں کو اس میں شامل کیا ہے تو اس شرط کے ساتھ کیا ہے کہ وہ فقیر و محتاج ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ فقیر و محتاج تو خود ہی مصارف زکوٰۃ میں سب سے پہلا مصرف ہیں، ان کو فی سبیل اللہ کے مفہوم میں شامل نہ کیا جاتا جب بھی وہ مستحق زکوٰۃ تھے، لیکن ائمہ اربعہ

اور فقہاء امت میں سے کسی نے نہیں کہا کہ رفاہ عام کے اداروں اور مساجد اور مدارس کی تعمیر اور ان کی جملہ ضروریات مصارفِ زکوٰۃ میں داخل ہیں، بلکہ اس کے خلاف اس کی تصریحات فرمائی ہیں کہ مالِ زکوٰۃ ان چیزوں میں صرف کرنا جائز نہیں، فقہاء احناف میں سے شمس اللامہ سرخسی نے مبسوط اور شرح میر اور فقہاء شافعیہ میں سے ابو عبید نے کتاب الاسوال میں اور فقہاء مالکیہ میں سے دررینر نے شرح مختصر غلیل میں اور فقہاء حنابلہ میں سے موفق نے مغنی میں اس کو پوری تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

ائمہ تفسیر اور فقہاء امت کی مذکورہ تصریحات کے علاوہ اگر ایک بات پر غور کر لیا جائے، تو اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے بالکل کافی ہے وہ یہ کہ اگر زکوٰۃ کے مسئلہ میں اتنا عموم ہوتا کہ تمام طاعات اور عبادات اور ہر قسم کی نیکی پر خرچ کرنا اس میں داخل ہو تو پھر قرآن میں ان آٹھ مصروفوں کا بیان (معاذ اللہ) بالکل فضول ہو جاتا ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد جو پہلے اسی سلسلہ میں بیان ہو چکا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مصارفِ صدقات متعین کرنے کا کام نبی کو بھی سپرد نہیں کیا، بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصرف متعین فرمادیتے۔

تو اگر فی سبیل اللہ کے مفہوم میں تمام طاعات اور نیکیاں داخل ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں زکوٰۃ کا مال خرچ کر سکتا ہے تو معاذ اللہ یہ ارشاد نبویؐ بالکل غلط ٹھہرتا ہے معلوم ہوا کہ فی سبیل اللہ کے لغوی ترجمہ سے جو نادائق کو عموم سمجھ میں آتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے بلکہ وہ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور صحابہ و تابعین کی تصریحات سے ثابت ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب)



سوالنامہ کا جواب

اننا ————— مولانا عبد الرحمن قاسمی، چھاپی گجرات

حامداً و مصلیاً و مسلماً۔

- ۱ ————— مال تجارت کی وہ قیمت جو پیشگی ادا کی جا چکی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے اسی طرح وہ مال جو خریدار کے ملک میں آچکا، لیکن قبضہ میں نہیں آیا اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ (۱)
- ۲ ————— کرائے کے مد میں پیشگی دی ہوئی رقم کی زکوٰۃ مؤجر مالک مکان پر واجب ہے اور ڈپوزٹ کی رقم مال مرہون ہے اور مال مرہون کی زکوٰۃ نہ راہن پر ہے اور نہ مرہن پر ہے، لہذا ڈپوزٹ رقم کی زکوٰۃ نہ کرایہ دار پر ہوگی اور نہ مالک مکان پر، لیکن ڈپوزٹ کی رقم کرایہ دار کو واپس ملنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔
- ۳ ————— مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔
- ۴ ————— رشوت کا مال بینک کا سود وغیرہ حرام مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔
- اور اگر اموال حرام حلال مال میں مخلوط ہو گئے ہوں تو اس مخلوط سے مال حرام کی مقدار نکال کر باقی اگر بقدر نصاب بچتا ہے تو زکوٰۃ واجب ہے ورنہ نہیں۔
- ۵ ————— دین اگر قوی (جو قرض اور مال تجارت کا بدل) ہو تو اس کی زکوٰۃ دائن پر چالیس درہم کی مالیت

حاجتِ اصلیہ کا تعین ہر دور اور ہر ماحول کے لحاظ سے ہوگا۔

کون سا دین مانعِ زکوٰۃ ہے

دین مانعِ زکوٰۃ سے وہ دین مراد ہے جس کا طلب کرنے والا کوئی بندوں کی طرف سے ہو خواہ وہ دین بندوں کا ہو جیسا کہ قرض اور بھول لی ہوئی چیز کی قیمت اور تلف کی ہوئی چیزوں کا منان یا زخمی کرنے کا تاوان ہو اور قرض چاہے نقد کی قسم سے ہو یا کیلی وزنی ہو یا کپڑے ہوں یا جانور ہوں یا خلع کے عومن ہیں واجب ہو یا عہداً قتل کرنے کے عومن میں صلح ہو کر واجب ہو یا ہو اور وہ فی الحال دینا ہو یا کسی قدر مدت کے بعد دینا ہو، اور وہ قرض خواہ اصلہ ہو یا کفالت ہو، اور خواہ وہ قرض اللہ کا قرض ہو، جیسا کہ زکوٰۃ اور خسراج کا دین۔ بخلاف نذر اور کفالت اور حج کے دین کے، اس لیے کہ ان قرضوں کا طلب کرنے والا کوئی بندہ نہیں اور اسی طرح صدقۃ الفطر اور حج تمتع کرنے والے کی ہدی اور قربانی کا دین مانعِ زکوٰۃ نہیں ہے۔

دین طویل الاجل جیسے زراعتی قرض، تعمیر مکان کے لیے قرض مانعِ زکوٰۃ ہے لہذا اموالِ زکوٰۃ سے پورے قرض کو منہا کیا جائے گا۔ (۱)

ہیرے جواہرات

ہیرے جواہرات سرمایہ محفوظ کرنے کے لیے خریدے ہوں یا تزئین و آرائش کے لیے ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ (۲)

اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت کی مالیت کا تعین ادائے گی زکوٰۃ کے دن قوتِ خرید کے اعتبار سے کیا جائے گا، پھر جو تا جر تھوک مال کی تجارت کرتا ہے اس کے لیے تھوک بھاؤ کا اعتبار کرنا ہوگا، اور جو تا جر پھٹکر مال فروخت کرتا ہے اس کے لیے پھٹکر فروختگی کا اعتبار کرنا ہوگا۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ ہر فرد کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا۔
 اراضی تجارت اگر خسراجی ہیں تو ان میں خراج واجب ہے زکوٰۃ نہیں، اور اگر عشری ہیں تو ان میں عشر واجب ہے زکوٰۃ نہیں، لیکن امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک عشر کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ بھی واجب ہے (لہذا امام محمد رحمہ اللہ کے قول کو اختیار کرنا مناسب ہے کیوں کہ اس میں فقرا کا فائدہ ہے)۔ (۱)
 اراضی تجارت اگر نہ عشری ہوں اور نہ خسراجی ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے اور ان پر زکوٰۃ کا وجوب ادا کیے کے دن کی متوقع قیمت فروخت کا اعتبار ہوگا۔

شیرزا اور بونڈس کی زکوٰۃ

- (۱) شیرز کی خرید و غرض تجارت ہو تو تجارتی سرمایہ ہونے کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔
- (۲) شیرز کی مالیت کا تعین بوقت ادائے زکوٰۃ مارکیٹ کے نرخ سے کیا جائے گا۔
- شیرز کی خرید و غرض ذریعہ آمدنی ہو تو آلات و اثاثہ کے علاوہ جو اصل و منافع ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔
- (۳) عرصہ دہندہ نے جو سرمایہ بونڈس پر لگایا ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ بونڈ کیش کرانے کے وقت گزرے ہوئے تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ (۲)

نصاب موجب زکوٰۃ

صرف سونا ہو یا بقدر نصاب سونا ہو تو اس میں سونے کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔
 صرف چاندی ہو یا بقدر نصاب چاندی ہو تو اس میں چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔

(۱) تاتاریخانیہ ۲۲۳/۲ - بحر ۲۰۹/۲

(۲) درمختار علی ہامش رد المحتار ۲۶۶/۲

سونا، چاندی دونوں نصاب سے کم ہوں تو دیکھا جائے گا، دونوں کی قیمت مل کر کسی ایک نصاب کے بقدر ہو جاتی ہے تو زکوٰۃ واجب ہے ورنہ نہیں۔

اموال تجارت کی قیمت اگر دونوں (سونا، چاندی کے) نصاب کو پہنچ جاتی ہے تو اختیار ہے جس نصاب کا چاہے اعتبار کرے اور اگر دونوں نصابوں میں سے صرف ایک نصاب کو پہنچتی ہے تو اسی نصاب کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔ (۱)

نصاب حرمت زکوٰۃ

مالدار کو جو نصاب کا مالک ہو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے خواہ وہ نصاب کسی بھی قسم کے مال کا ہو بشرطے کہ اس کی حاجت اصلہ سے زائد ہو، پھر اس بارے میں اختلاف ہے کہ حرمت زکوٰۃ کے لیے نصابی اموال (سونا، چاندی، سائتم) میں ان کے نصاب کی مقدار کا اعتبار ہے یا قیمت کے حساب سے نقدی کے نصاب کا اعتبار ہے۔ بعض نے نصابی اموال میں ان کے نصاب کا اعتبار کیا ہے اور بعض نے قیمت کا اعتبار کیا ہے۔ نصابی اموال کے علاوہ میں بالاتفاق قیمت کا اعتبار ہوگا۔ اور موجودہ دور میں چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔

مصارف زکوٰۃ

مستحق زکوٰۃ طلبہ کو چیک کی بجائے رقم زکوٰۃ دی جائے اور وہ وصول کرنے کے بعد مدرسہ میں جمع کر دیں، یہ صورت جائز ہے۔

مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے۔

سفراء و محصلین کو کمیشن پر ملے کرنا صحیح نہیں ہے اور نہ وہ العالمین علیہا میں داخل ہیں اور عملہ کو ماہانہ تنخواہ مد زکوٰۃ سے ادا کرنا جائز نہیں ہے۔

فَسَبِيلَ اللَّهِ

(۱) سورہ توبہ کی آیت ”انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبہم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل فریضۃ من اللہ واللہ علیم حکیم“ میں انما سے جو حصر بیان کیا گیا ہے وہ حصر حقیقی ہے۔

(۲) جی ہاں، ہم جمہور مفسرین اور فقہاء کی اس بات سے پورے طور پر متفق ہیں کہ فی سبیل اللہ کا استعمال جب کتاب و سنت میں مطلق طور پر ہو تو اس سے مراد غزوہ و جہاد ہی ہوتا ہے۔ (۱)

(۳) آیات احکام میں سے کسی آیت کی تشریح میں قردن اولیٰ میں صرف دو قول پائے جاتے ہوں تو ہمارے لیے لازم و ضروری ہے کہ ان دو اقوال میں سے ایک قول کو اختیار کریں۔ ان دو اقوال کو چھوڑ کر آیت کی تفسیر و تشریح میں کوئی تیسرا یا چوتھا قول اختیار کرنا صحیح نہیں ہے۔

(۴) الف :- فی سبیل اللہ کا مصداق غازی ہے اور فی سبیل اللہ کے دائرہ میں صرف الفزۃ الفقراء اور العجاج الفقراء ہیں۔

ب :- فی سبیل اللہ کا مصداق غازی کے مستحق زکوٰۃ ہونے کے لیے فقر کی شرط ہے۔

(۵) مصارف زکوٰۃ قیاس شرعی کا محل نہیں ہیں اور فی سبیل اللہ کا مصداق جہاد عسکری پر قیاس کرتے ہوئے جہاد قلبی، جہاد فکری، جہاد ثقافتی پر زکوٰۃ کی رقم صرف کرنا جائز نہیں ہے، نیز اصولاً بھی اس کی گنجائش نہیں ہے کہ مصارف زکوٰۃ پر قیاس کرتے ہوئے کچھ اور قسموں کو مصارف زکوٰۃ میں شامل کر لیا جائے۔

(۶) فی سبیل اللہ کا دائرہ وسیع کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور تعمیم و توسیع کے قول کو اختیار کرنا صحیح نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب وعلما اتم واکمل۔

جوابات ضمیمہ سوالات

حامداً و مصلیاً و مسلماً ۔

شیرز پر زکوٰۃ کے وجوب کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ شیرز کی خرید اگر بہ نیت تجارت ہو اور ابھی تک نیت تجارت میں تبدیلی نہ آئی ہو (چاہے زیادہ مدت پاس رکھا جائے یا کم مدت) تو شیرز کی موجودہ مارکیٹ قیمت اور اس سے ہوئی آمدنی دونوں پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے۔

• ۲۔ شیرز کی خرید اگر بہ نیت تجارت ہو پھر نیت تجارت میں تبدیلی آگئی یعنی شیرز کو ذریعہ آمدنی بنا دیا تو شیرز کی جو رقم آلات و اثاثہ میں لگ گئی اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور شیرز کی جو رقم آلات و اثاثہ کے علاوہ ہے اس رقم اور شیرز سے ہوئی آمدنی دونوں پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے شیرز چاہے کم مدت پاس رہے یا زیادہ مدت ۔

• ۳۔ شیرز کی خرید اگر بہ نیت تجارت نہ ہو بلکہ بہ نیت ذریعہ آمدنی ہو تو شیرز کی اصل میں سے جو رقم آلات و اثاثہ میں لگ گئی ہے اس پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور شیرز کی اصل میں سے جو رقم آلات و اثاثہ کے علاوہ ہے اس رقم اور آمدنی دونوں پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے ۔

وجوب زکوٰۃ صافی آمدنی پر یا غیر صافی آمدنی پر؟

• ۴۔ اخراجات اگر از قبیل دیون شرعی ہیں تو آمدنی سے منہا کر دیے جائیں گے، جیسے ملازمین کی تنخواہیں وغیرہ، اور اگر از قبیل دیون شرعی نہیں ہیں جیسے سیل ٹیکس، انکم ٹیکس وغیرہ تو ان کو آمدنی سے

منہا نہیں کیا جائے گا۔

- —: اخراجات اگر یوم وجوب ادا کر دیے گئے ہیں تو بقیہ آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہے۔
- —: اخراجات اگر یوم وجوب ادا سے پہلے ادا نہیں کیے گئے ہیں تو اس کی دو صورتیں ہوں گی۔
- (۱) اخراجات اگر از قبیل دیون شرعی ہیں، جیسے ملازمین کی تنخواہیں وغیرہ تو آمدنی سے اخراجات منہا کر دیے جائیں گے۔
- (۲) اخراجات اگر از قبیل دیون شرعی نہیں، جیسے انکم ٹیکس وغیرہ تو آمدنی سے اخراجات منہا نہیں کیے جائیں گے۔

- —: شیرز کو مسلسل خریدا اور بیچا جاتا ہو، نفع بھی ہوتا ہو اور نقصان بھی تو یوم وجوب ادا شیرز کی جو پوزیشن ہو اس پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے۔
- ۲ —: کاروباری ادارہ میں کاروبار سے ہوئے نفع اور موجودہ اسٹاک میں جن اشیاء کی خرید و بیع تجارت ہوئی ہو، ان تمام پر شرعاً واجب ہے۔
- —: جانوروں کی خرید اگر بہ نیت تجارت (خرید و فروخت) ہو تو ان جانوروں اور ان سے حاصل شدہ (منافع) دودھ، انڈوں پر زکوٰۃ واجب ہے۔
- —: جانوروں کی خرید اگر بہ نیت تجارت نہ ہو تو ان جانوروں اور ان سے حاصل شدہ دودھ، انڈوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، البتہ دودھ، انڈے فروخت کر دیے جائیں تو ان کے اثمان پر زکوٰۃ واجب ہے۔

- ۳ —: تمسکات سے کیا سرکاری تمسکات مراد ہیں؟ یا اس کے علاوہ مراد ہے؟ پہلے اس کی وضاحت کی جائے، نیز اخراجات کی مکمل وضاحت کی جائے۔ اس کے بعد جواب لکھا جاسکتا ہے۔

انسٹریٹ کے متعلق

مذکورہ حالات میں حکومت کی سیکورٹیز بانڈز میں اور کمپنیوں کی فکسٹ ڈپازٹس میں سرمایہ کاری جائز قرار نہیں دی جاسکتی۔ فقط والتداعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب۔

سوالنامہ کا جواب

از: مولانا اشرف علی

جواب (۱):

اقسام اموال اور وجوبِ زکوٰۃ:

زکوٰۃ ان اموال میں واجب ہوتی ہے جو کچھ دنوں تک باقی رہنے والے ہیں اور ان میں خلقتاً یا عملاً نشوونما ہے۔ اس طرح اموال چار ہیں۔

(۱) سونا چاندی اور نقد (۲) حیوانات، سوائم (۳) زمین کی پیداوار

(۴) تجارت کا سامان جو بہ نیت تجارت خرید جائے۔

وجوبِ زکوٰۃ کی شرطیں

وجوبِ زکوٰۃ کی شرائط میں سے پہلی شرط ملک تام ہے۔ ملک تام سے مراد یہ ہے کہ مال پر صاحب مال کا قبضہ ہو اور وہ اس میں تصرف کرنے پر قادر ہو، جسے ملک ید اور ملک تصرف سے تعبیر کیا جاتا ہے اس ذیل میں قائم کردہ سوالات کے جوابات بالترتیب ملاحظہ ہوں۔

(۱) تجارت کی غرض سے خریدے ہوئے مال میں قبضہ سے پہلے مشتری پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی،

اس مال کی پیشگی ادا کردہ قیمت میں مشتری پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (بحر الرائق ۲/۲۱۸) میں ہے:

”فلأوجب على المشتري فيما اشتراه للتجارة قبل القبض :

اور شامی^(۱) میں بھی ایسا ہی مذکور ہے۔ اور شامی^(۲) ہی میں ہے :

قلت ينبغي لزومها على المشتري فقط على القول الذي

عليه العمل الآن من ان يبيع الوفاء منزل منزلة الرهن.

جواب ۲: کرائے کے مد میں پیشگی دی گئی رقم یا ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہو جانے کے بعد واپس کی جاتی ہے اس کی زکوٰۃ مالک پر ہوگی۔

" اما زكوة الحبة المعجلة عن سشين نسي الاجابة الطويلة.....

فَتَجِبَ عَلَى الْأَجْرِلَانِ أَنَّهُ مِلْكُهَا بِالْقَبْضِ: (٣)

لیکن بہتر یہ ہے کہ دونوں زکوٰۃ ادا کر دیں۔

" وفي الخلاصة الاحتياط ان يترك كل منهما " (۴)

جواب (۳): وہ اموال جن کا مالک معین شخص نہیں ہوتا اور وہ رفاہ عام میں صرف ہوتے ہیں ان میں زکوٰۃ واجب

نہیں۔۔۔۔۔ "فلا زکوٰۃ فی سواثم الوقف والحیل المسبلة لعدم الملك"۔ (۵)

جواب (۴) : حرام ذریعے سے حاصل شدہ مال کل واجب التصدق ہے اس میں زکوٰۃ کا وجوب نہیں مالمبتہ

اگر کسی کی ملک میں حرام اور حلال مال اس طرح مخلوط ہوں کہ ان میں تمیز مشکل ہو تو زکوٰۃ مجموعہ مال میں واجب ہوگی، یعنی نصاب میں حرام مال بھی شامل کیا جائے گا۔ شامیؒ کہیں ہے:

"لا زكوة في المغصوب والمملوك شراء فاسدًا والمراد بالمغصوب

عالم يخلطه بغيره لعدم الملكة

جواب (۵) دین کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہوگی۔ مہیون دین کی رقم ادا کرنے میں مالمٹول کر رہا ہو یا تجارت

میں لگا کر استفادہ کر رہا ہوں دونوں صورتوں میں دائن پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

جس قرض کے وصول ہونے کی امید ضعیف ہو یا بالکل نہ ہو اس پر زکوٰۃ وصولی سے پہلے

(٣) فتح القديس ١٣١/٢ (٢) ١٣١/٢

(۲) شامی ۶/۴

(۱) مناسی ہر

(۶) شامی ۵/۴

(۵) شامی ۲/۴

واجب نہیں ہوگی، اور جس قدر وصولی ہوگی حولانِ حول کے بعد صرف اسی مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر قرض ایسے شخص کے ذمہ ہے جو انکار کر رہا ہے، ایسی صورت میں اگر گواہ مل گئے تو ان کی گواہی کی وجہ سے زکوٰۃ تو واجب ہو جائے گی، مگر زکوٰۃ کی ادائے گی کا وجوب وصولی کے بعد ہوگا اور صرف مستقبل کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ فتح القدیر میں ہے:

”ومن له على آخر دين فجد له سنين ثم قامت له البينة

لم يترك ماله“ (۱)

جواب (۶)؛ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم جو بہ قدر نصاب ہو اس میں وصولی کے بعد حولانِ حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

وجوب زکوٰۃ کی دوسری شرط نما ہے

نما کی حقیقت یہ ہے کہ مالی اضافے کے لیے تیار کیا گیا ہو۔ بدائع الصنائع میں ہے:

”وذلك من المال النامي على التفسير الذي ذكرناه أن يكون المال

معدًا للاستنماء وذلك بالاعداد للأسامة وفي المواشي والتجارة

في أموال التجارة“ (۲)

نما کی دو صورتیں ہیں۔ (۱) حقیقی (۲) تقدیری

نما حقیقی؛ توالد و تناسل اور تجارت سے ہوتا ہے۔

نما تقدیری؛ جس میں مال میں اضافہ کرنے کی صلاحیت پر قدرت حاصل ہو۔

نما حقیقی کی دو قسمیں ہیں:

(۱) خلقی؛ جیسے سونا اور چاندی۔

(۲) فعلی؛ سونا اور چاندی کے علاوہ، وہ سامان جس میں تجارت یا اسامت کی جہت سے

اضافہ ہوتا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے،

ممنها كون النصاب ناميًا حقيقة بالتوالد والتناسل والتحبة

أو تقدیرًا ان يتمكن من الاستنعاء" (۱)

تیسری شرط حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجتِ اصلیہ کی تعریف اور اس کا دائرہ۔

ہر وہ مال جس سے انسان کی حفاظت ہو سکتی ہو تحقیقاً یا تقدیراً، وہ حاجتِ اصلیہ ہے، جیسے نفقہ، رہنے کے لیے مکان، آلاتِ حرب، گرمی و سردی سے بچنے کے لیے کپڑے اور اس کے لوازمات، آلاتِ حرفت، گھر کے سامان، سواری کے حیوانات، اہل علم کے کتابیں، قرض۔ بحر الرائق میں ہے:

"ما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقاً" (۲)

حالات اور ماحول کے بدلنے سے ضروریاتِ انسانیہ میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، اس لیے حاجتِ اصلیہ کا تعین دور اور ماحول کے حساب سے ہوگا۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

مانعِ زکوٰۃ دین: ہر وہ دین جس کا مطالبہ من جہۃ العباد ہو، زکوٰۃ سے مانع ہے، جیسے قرض، بیع کی قیمت اور جراحت و ہلاکت کا تاوان اور دینِ زکوٰۃ وغیرہ۔
دین کی تین قسمیں ہیں:

(۱) دینِ قوی (۲) دینِ متوسط (۳) دینِ ضعیف

- (۱) دینِ قوی: جو واجب ہو مالِ تجارت کے بدلے مثلاً سامانِ تجارت کی قیمت۔
- (۲) دینِ متوسط: جو واجب ہو بدل ایسے مال کا جو تجارت کے لیے نہیں ہے، جیسے خدمت کے لیے غلام کی قیمت۔
- (۳) دینِ ضعیف: جو واجب ہو کسی شے کا بدل بن کر چاہے اس کی مداخلت کے بغیر ہو، جیسے میراث وغیرہ، یا مداخلت سے ہو، جیسے وصیت یا بدل ایسی چیز کا جو مال نہیں، جیسے مہر۔

احکام:

(۱) دین قوی میں حولانِ حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور ادائے گئی متاخر ہوتی ہے یہاں تک کہ ایک خمس نصاب پر قبضہ ہو جائے اور اس مقبوض کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کیا جائے، اسی حساب سے بقیہ میں بھی ادا کیا جائے گا۔ طویل الاجل دین میں جس میں قرض کی ادائے گئی قسط دار ہوتی ہے اس کی ادائے گئی میں ہر سال اموال زکوٰۃ سے پورا قرض منہا کیا جائے گا، صرف واجب الادا قسط منہا نہیں کی جائے گی۔

(۲) دین متوسط میں مال پر قبضے کے بعد جب حولانِ حول ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔
 (۳) دین ضعیف میں جب پورا مال قبضے میں آجائے اور اس کے بعد حولانِ حول ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ (۱)

کن اموال میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؟

جو اموال کہ نامی ہوں، فارغ عن الدین و الحاجة الاصلیہ ہوں اور ملک میں بڈا و تصرفاً حاصل ہوں ان میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

کمپنی کی مجموعی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی بلکہ کمپنی کے شرکا میں سے جو لوگ کہ صاحبِ نصاب ہوں انہیں پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

کمپنیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔

ایک تو وہ ہے جو اپنے شرکا سے رقم وصول کرنے کے بعد ایسا سامان مہیا کرتی ہے جو خود فروخت ہوتے ہیں۔ اور دوسری وہ کمپنیاں ہیں جو رقم سے ایسے سامان خریدتی ہیں کہ ان سامانوں کو اجارے پر چلاتی ہیں۔ اول الذکر کمپنی میں لگی ہوئی رقم کو نصاب میں شامل کرنا ہوگا اور مؤخر الذکر کمپنی میں جو آمدنی ہوگی وہ

نصاب میں جوڑی جائے گی، اصل رقم حاجتِ اصلیہ میں داخل ہوگی۔

ہیرے اور جواہرات

ہیرے اور جواہرات اگر تجارت کی غرض سے نہ خریدے جائیں تو ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اسی طرح عورتوں کی تزئین اور آرائش کے سامان۔ عالم گیری میں ہے،

”وكذا طعام اهله وما يتجمل به بين الاواني اذا لم يكن من الذهب والفضة وكذا الجواهر واللؤلؤ والياقوت والبلخش والزمرد ونحوها اذا لم يكن للتجارة“ (۱)

اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت کی زکوٰۃ کی ادائے گی، ادائے گی کے وقت کی قیمت فروخت کے اعتبار سے ہوگی اور حقوق تجارت کرنے والا حقوق قیمت فروخت کے اعتبار سے اور پھٹکر تجارت کرنے والا پھٹکر کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرے گا۔

جو لوگ زمین کی خرید و فروخت تجارت کرتے ہیں ان کو زمین کی مالیت بھی نصاب میں شامل کرنی ہوگی اور مالیت کا اندازہ زکوٰۃ کے وجوب کے وقت کی قیمت سے ہوگا۔

شیراز اور بونڈز کی زکوٰۃ

کمپنی کے حصص میں تجارتی سرمایہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب ہوگی اور زکوٰۃ کی ادائے گی کے وقت جو نرخ مارکیٹ کا ہوگا اسی حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

اور بونڈز میں جمع کی ہوئی رقم پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب وہ وصول ہو جائے اور گزشتہ تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

نصابِ زکوٰۃ

سونا اور چاندی میں ہر ایک کی مستقل مالیت ہونے کی وجہ سے دونوں کا الگ الگ مستقل نصاب ہے۔ موجودہ دور میں فقہاء کی تشریح ماہو انفع للفقراء کے ضابطے سے دیگر اشیاء میں نصابِ زکوٰۃ کا تعین چاندی کے حساب سے کیا جائے گا۔

مصارفِ زکوٰۃ

(۱) مدارس کے ذمہ داران، طلبہ کو ان کے قیام و طعام اور تعلیم پر ہونے والے اخراجات مثلاً ۲۵٪ فی طالب علم مقرر کر کے مد زکوٰۃ سے دے دیں اور پھر خرچ کے مد میں جمع کرائیں تو یہ زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ اسی طرح اتنی رقم کا چیک طلبہ کو دے دیں اور طلبہ اس چیک کو مدرسہ میں جمع کر دیں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دینے والے کا وکیل ہوتا ہے۔

(۲) زکوٰۃ کی وصولی پر مقرر لوگوں کو زکوٰۃ کی رقم سے کمیشن کی صورت میں معاوضہ دینا ناجائز ہے، اس لیے اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔

زکوٰۃ کی آمد و خرچ کا حساب کرنے والے علمہ کی تنخواہ کی ادائیگی زکوٰۃ کی رقم سے نہیں کی جاسکتی۔

مصرفِ زکوٰۃ فی سبیل اللہ

(۱) مصرفِ زکوٰۃ میں وارد آیت "انما الصدقات للفقراء والمساكين والزیة میں کلمۃ انما کے حصر حقیقی ہونے پر جمہور مفسرین اور فقہاء کا فیصلہ درست ہے، آیت کا موقع نزول اسی بات کی تائید کرتا ہے۔

(۲) لفظ فی سبیل اللہ کے اطلاق سے جمہور مفسرین کا فیصلہ کہ اس سے مراد غزوہ اور جہاد ہے، یہی صحیح ہے۔

(۳) فی سبیل اللہ کی تشریح میں دو قول غزوہ اور حج کے علاوہ کار خیر میں مصروف ان لوگوں کو بھی کیا جاسکتا ہے جو اپنے عمل پر اپنے کو اجرت کا مستحق نہیں سمجھتے اور دینے والا بھی حق اجرت سمجھ کر نہ دیتا ہو۔

(۴) الف، مذکورہ بالا۔ انا کو سامنے رکھتے ہوئے زکوٰۃ کے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ میں غازی،

اور حاج کے علاوہ اس کے عام معافی ہر کار خیر میں مصروف وہ بھی لوگ آسکتے ہیں جو ملا استحقاق اجرت عمل سمجھتے ہوئے خدمت دین میں مصروف ہیں داخل ہوں گے، اور چوں کہ زکوٰۃ میں تملیک بلا عوض شرط ہے اس لیے رفاہی امور فی سبیل اللہ میں داخل نہیں ہوں گے۔

(ب) فی سبیل اللہ کے مصداق میں شامل ہونے والے لوگ بشرط فقر مستحق زکوٰۃ ہوں گے۔

(۵) مصارف زکوٰۃ قیاس شرعی کا محل ہیں لیکن قیاس کرتے ہوئے مقیس علیہ کی علت تامہ سے مقیس کی تطبیق بالکلیہ ہونی چاہیے، اس لیے جہاد قلمی، جہاد فکری اور جہاد ثقافتی پر زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جائے گی۔

(۶) دورِ حاضر میں ترقیات پر جدید وسائل کے پیش نظر دینی کاموں کی ضروریات اور مصارف میں امانہ اگرچہ بہت ہو چکا ہے اس کے باوجود فی سبیل اللہ کے مفہوم میں اتنی وسعت دی جائے گی کہ زکوٰۃ کی اصل روح باقی رہے اور زکوٰۃ کی رقم غیر مصرف میں خرچ نہ ہونے پائے۔

(۷) جمہور نے فی سبیل اللہ کی تشریح جو غازی اور حاج سے کی ہے اس سے فی سبیل اللہ کا دائرہ اس حد تک متعین ہو جاتا ہے کہ جو لوگ دین کی حفاظت اور اشاعت میں مصروف ہوں اور ان کی یہ مصروفیت للہیت پر مبنی ہو اور اس عمل پر اپنے کو کسی اجرت کا امیدوار نہ سمجھتے ہوں فی سبیل اللہ کے دائرہ میں آسکتے ہیں۔

جوابات ضمیمہ سوالات بابت زکوٰۃ

(۱) شیرز کی زکوٰۃ ادا کرتے وقت اس کی بازاری قیمت حاصل شدہ آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہوگی، زکوٰۃ ادا کرنے کی یہی صورت شیرز کی مسلسل خرید و فروخت کے طریقے میں ہوگی۔

(۲) کاروباری ادارہ اگر سامان ہی خرید و فروخت کرتا ہے تو بہ قدر نصاب ہونے کی صورت میں حوالان حول کے بعد موجودہ مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مثلاً حیوانات کی تجارت کرنے والے حیوانات ہی کو خریدتے بیچتے ہیں تو اگر سال کے شروع میں حیوان کی قیمت بہ قدر نصاب ہو تو حوالان حول کے وقت موجودہ حیوانات کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر کمپنی اصل سامان

کو فروخت کرنے کی بجائے اس سے پیدا ہونے والے سامانوں کو فروخت کرتی ہے تو زکوٰۃ آمدنی پر واجب ہوگی، مثلاً گائے بھینس وغیرہ کے دودھ کی تجارت کی جائے تو گائے بھینس کی قیمت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ دودھ کی قیمت جو نصاب کے بقدر ہو جائے اور اس پر حوالان حول بھی ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔
(۳) شخصی اخراجات کا کوئی معیار مقرر نہیں کیا جاسکتا۔

(۴) سود کی حرمت میں تخفیف لانے کی غرض سے اس کی تشریح تبصر میں جو بھی رد و بدل کیا جائے وہ سود کی حرمت میں تخفیف پیدا نہیں کر سکتے البتہ الفاظ کی اس ہیرا پھیری سے لوگوں کو مفرد دھوکے میں ڈالا جاسکتا ہے۔ اس لیے سود کے لیے بہتر سے بہتر جو بھی الفاظ استعمال کیے جائیں ان سے سود کا جواز ثابت نہیں ہوگا۔ ہندوستان میں ہر چار طرف حکومتی سطح پر ہونے والے کاروبار میں سود کے جزو لازم ہونے کی وجہ سے سود کے کاروبار کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ اس لیے کہ مسلمان بہ حیثیت مجموعی مجبور نہیں ہے، بلکہ حکومت سے اس کے لیے الگ قانون بنانے کی مانگ کر سکتا ہے۔ جیسا کہ اپنے مذہبی شخص کو باقی رکھنے کے لیے مسلم پرسنل لا منظور کرا کے اپنا وجود قائم کیے ہوئے ہے۔ البتہ وہ لوگ جن کے پاس ذریعہ معاش کی کوئی صورت نہ ہو تو وہ لوگ بہ درجہ مجبوری سوال میں مذکورہ کمپنیوں میں شرکت کر سکتے ہیں۔

اسلام کا نظامِ زکوٰۃ

مفتی نسیم احمد قاسمی ————— رفیق اسلامک فقہ اکیڈمی

موجودہ معاشی مسائل و مشکلات کا حل

زکوٰۃ اسلام کا تیسرا اہم ترین مالی فریضہ ہے جس کی فرضیت کتاب و سنت اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ اسلام کا نظامِ زکوٰۃ اجتماعی عدل اور تضامن و یک نفل کا بہترین آئینہ دار ہے۔ اس کے اندر معاشرہ کے تمام معاشی اور اقتصادی مسائل و مشکلات کا حل موجود ہے۔ اسلام کے نظامِ زکوٰۃ کے نفاذ اور قیام کے ذریعہ ایک ایسے پاکیزہ اور صاف ستھرے معاشرہ کی تشکیل کی جاسکتی ہے جس میں امیر اور غریب، حاکم اور محکوم، صنعت کار اور مزدور ہر طبقہ کے لوگ ایک دوسرے سے سیر و شکر ہو کر اعتمادِ باہمی کے ساتھ زندگی گزاریں۔ نہ امیر غریب سے نالاں ہو اور نہ غریب امیر سے شاکی۔ اسلام کے نظامِ زکوٰۃ کے ذریعہ دولت و ثروت کی منصفانہ تقسیم ہوتی ہے اور دولت و ثروت سے ایک خاص طبقہ کی اجارہ داری کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس میں نہ تو فقراء و مساکین کا استحصال ہوتا ہے اور نہ ہی امراء اور اہل ثروت پر ظلم۔ آج دنیا کا جو معاشی ڈھانچہ اپنا توازن کھو بیٹھا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس نظام میں ہر طبقہ کے حقوق کی یکساں طور پر رعایت نہیں کی گئی ہے۔ آج کے موجودہ نازک حالات میں اس کی سخت ضرورت ہے کہ اسلام کا ”اجتماعی نظامِ زکوٰۃ“ قائم کیا جائے۔ زکوٰۃ مالداروں سے اجتماعی طریقے پر وصول کی جائے، اور اس کے صحیح مصارف پر خرچ کی جائے۔ اس کے لئے ایک مضبوط اور منظم نظام قائم کیا جائے تاکہ زکوٰۃ کی رقم کا استعمال صحیح طریقے سے ہو سکے۔ اسلامک فقہ اکیڈمی جو اسلامک بینکنگ پر قابلِ قدر کام کر چکی ہے اسے اس طرف بھی پیش قدمی کرنی چاہئے۔ اور اسلام کے اجتماعی نظامِ زکوٰۃ کے قیام کی راہ میں جو دشواریاں اور مشکلات حائل ہیں ان کے حل کے لئے علماءِ زماہرین فقہ و فتاویٰ اور قانون

دانوں کی مدد لے کر اس کا ایک ٹکڑا خا کہ امت کے سامنے پیش کرے تاکہ امت کو اس کی خوبیوں سے بہرہ ور ہونے کا ذریعہ موقع مل سکے۔ اسلام کے اجتماعی نظامِ زکوٰۃ میں وہ تمام خوبیاں اور محاسن موجود ہیں جنہیں لوگ انشورنس اور اس طرح کے دیگر نظاموں میں تلاش کرتے ہیں۔

زکوٰۃ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

زکوٰۃ ”زکا“ کا مصدر ہے جو بڑھوتری اور زیادتی کے معنی میں آتا ہے۔ زکوٰۃ کا لفظ طہارت اور پاکیزگی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”قد افلح من زکاه“ کا میاب ہو گیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو پاکیزہ بنایا۔ اور شرعاً زکوٰۃ ایک ایسا حق ہے جو مالِ مخصوص میں واجب ہوتا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک زکوٰۃ کی اصطلاحی تعریف یہ ہے :

”مالِ مخصوص کے ایک حصہ کا شخص مخصوص کو مالک بنادینا جسے اللہ نے اس کا حقدار بنایا ہے

اور یہ تملیک محض رضائے الہی کی خاطر ہو“۔

کنز میں زکوٰۃ کی یہ تعریف کی گئی ہے :

”ہی تملیک المال من فقیر مسلم غیر ہاشمی ولا مولاہ بشرط

قطع المنفعة عن المملک من کل وجه للہ تعالیٰ“۔

یعنی زکوٰۃ ایسے مسلمان فقیر کو مال کا مالک بنادینے کا نام ہے جو نہ تو ہاشمی ہو اور نہ ہی اس کا غلام ہو۔ بشرطیکہ اس مال کی منفعت پوری طرح سے مالک سے ختم ہو جائے اور یہ تملیک محض اللہ کی رضا کی خاطر ہو۔

اموالِ زکوٰۃ

اموالِ زکوٰۃ جن میں شریعت نے زکوٰۃ واجب قرار دیا ہے وہ پانچ ہیں۔

(۱) نقدین — یعنی سونا اور چاندی (۲) سائے جانور — اونٹ، گائے، بھینس، بکری وغیرہ

(۳) سامانِ تجارت — (۴) معدن و رکاز — (۵) زرعی پیداوار اور پھل

زکوٰۃ کے وجوب کی شرطیں

زکوٰۃ کے وجوب کی شرطیں دو طرح کی ہیں، بعض شرطیں وہ ہیں جو معطیٰ یعنی زکوٰۃ دہندہ سے متعلق ہیں، اور بعض وہ ہیں جو نفس مال سے متعلق ہیں۔

زکوٰۃ دہندہ سے متعلق شرطیں

۱۔ اسلام۔ زکوٰۃ کے وجوب کی ایک شرط مسلمان ہونا ہے، کافر اور مشرک پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے اس لئے کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے اور کافر کی طرف سے عبادت کی ادائیگی درست نہیں ہوتی۔ بدائع میں ہے:

”زکوٰۃ کے وجوب کی ایک شرط مسلمان ہونا ہے۔ کافر پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اس لئے کہ

زکوٰۃ عبادت ہے اور کفار عبادات کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔“ ۱

فقہ شافعی کی رو سے بھی وجوب زکوٰۃ کے لئے اسلام ضروری ہے۔ غیر مسلم پر زکوٰۃ واجب نہیں

ہوتی ہے المجموع شرح المہذب للنفوس میں ہے:

”ولا تجب الزکاة الا على حر مسلم۔“ ۲

یعنی زکوٰۃ کا وجوب صرف آزاد مسلمان پر ہوگا۔

الفروع لابن مفلح العنبلی میں ہے:

”هي فرض على كل مسلم حر۔“ ۳

۲۔ حریت۔ زکوٰۃ کے وجوب کی دوسری شرط آزاد ہونا ہے۔ غلام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے کہ غلام کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ سب اس کے آقا کی ملکیت ہوتی ہے۔ خود غلام کسی چیز کے مالک بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔ اس لئے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ مکاتب

۱۔ بدائع ج ۲ ص ۱۱۲، فتح القدیر ج ۲ ص ۱۱۲، البحر الرائق ج ۲ ص ۱۱۲

۲۔ الفروع ج ۲ ص ۳۱۵

۳۔ المجموع ج ۵ ص ۲۲۹

اور مدبر اگرچہ مالک بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر چوں کہ اس کو بھی ملک تام حاصل نہیں ہوتا ہے اس لئے اس پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ علامہ کا سانی نے لکھا ہے :

”زکوٰۃ کے وجوب کی شرطوں میں سے ایک شرط حریت (آزاد ہونا) ہے اس لئے ملکیت شرائط وجوب میں سے ہے۔ (جیسا کہ ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے) اور غلام کسی چیز کے مالک بننے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا ہے لہذا غلام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اگرچہ وہ ماؤن فی التجارہ ہو، اس لئے کہ اس صورت میں اگر اس کے ذمہ قرض نہیں ہوگا تو اس کی ساری کمائی مولیٰ کی ملک ہوگی اور اس کی زکوٰۃ مولیٰ پر واجب ہوگی۔ اور اگر اس کے ذمہ آنا قرض ہو جو اس کی کمائی پر محیط ہو تو اس صورت میں اس کی کمائی کا مالک مولیٰ نہیں ہوگا۔ اور اس کی زکوٰۃ نہ تو غلام پر واجب ہوگی اور نہ اس کے آقا پر۔“

المجموع میں ہے :

”زکوٰۃ صرف آزاد مسلمان پر واجب ہوگی اس لئے کہ غلام اور مکاتب کے مال کا مالک مولیٰ ہوتا ہے وہ دونوں کسی چیز کے خود مالک نہیں بنتے۔“

الفروع میں ہے :

”زکوٰۃ ہر آزاد مسلمان پر فرض ہے۔“

۳۔ بلوغ ————— وجوب زکوٰۃ کے لئے بلوغ صغیر کے نزدیک شرط ہے۔ اس لئے نابالغ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ بدائع میں ہے :

”وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط ہمارے نزدیک بلوغ ہے پس نابالغ کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک بلوغ وجوب زکوٰۃ کی شرط نہیں ہے۔ ان کے نزدیک نابالغ پر بھی زکوٰۃ کا وجوب ہوتا ہے جسے اس کا ولی اس کی طرف سے ادا کرے گا۔ صحابہ میں سے حضرت عائشہؓ اور ابن عمرؓ کا یہ قول ہے۔“

۱۔ بدائع ج ۲ ص ۲۰۰، البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۰، الفتاویٰ التاتاریخانیہ ج ۲ ص ۲۰۰

۲۔ المجموع ج ۵ ص ۲۰۰، کتاب الفروع ج ۲ ص ۲۰۰، البدائع ج ۲ ص ۲۰۰

الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے :

”بلوغ اور عقل صنفیہ کے نزدیک شرائط وجوب میں سے ہے۔ پس ان کے نزدیک نابالغ اور مجنون (پاگل) کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیوں کہ یہ دونوں ادائیگی عبادت کے مخاطب ہی نہیں ہوتے ہیں۔“^۱

المجموع میں فقہ شافعی کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے :

”زکوٰۃ نابالغ اور پاگل کے مال میں بھی واجب ہوگی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا : نابالغوں کے اموال میں زیادتی پیدا کرنے کی کوشش کر دے، ایسا نہ ہو کہ اسے زکوٰۃ ختم کر دے اور اس لئے کہ زکوٰۃ کا مقصد حصول ثواب اور فقراء کے ساتھ ہمدردی و مواسات ہے۔ اور نابالغ اور مجنون اہل ثواب اور اہل مواساتہ میں سے ہے۔“^۲

الفروع میں ہے :

”زکوٰۃ نابالغ اور پاگل پر بھی فرض ہے۔“^۳ نابالغ پر وجوب زکوٰۃ کا حکم ذکر کرتے ہوئے ابو عبید نے لکھا ہے : زکوٰۃ ہمارے نزدیک نابالغ کے مال میں بھی واجب ہے جسے اس کا دلی اس کی طرف سے ادا کرے گا جیسا کہ دلی حالات صغر میں اس کے لئے خرید و فروخت کرتا ہے پس اگر دلی نے اس کے مال میں سے زکوٰۃ نہیں نکالی۔ اور وہ بالغ ہو گیا تو دلی کو چاہئے کہ اسے بتا دے تاکہ وہ گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ نکال دے اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو پھر گناہ دلی پر ہوگا۔ فقہ طاہوس سے ایسا ہی منقول ہے۔“^۴

۳۔ عقل۔ صنفیہ کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کی چوتھی شرط عقل ہے۔ مجنون پر ان کے نزدیک زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ جنون کی دو قسمیں ہیں جنون اصلی اور جنون طاری۔ جنون اصلی یہ ہے کہ نابالغ کی حالت میں بھی وہ مجنون تھا اور جنون کی ہی حالت میں وہ بالغ ہوا۔ ایسے جنون کے بارے میں ہمارے ائمہ احناف کا اتفاق ہے کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے بالغ ہوگا۔ اور اگر چند سالوں کے بعد جنون سے افادہ ہو جائے تو گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ افادہ کے بعد سے جب پورا ایک سال ہو جائے گا تو

۱۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۲ ص ۲۲۹ (۲) المجموع ج ۵ ص ۲۲۹ ۳۔ الفروع ج ۲ ص ۲۱۸

اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی جب کہ بالغ ہونے کی صورت میں بلوغ کے بعد سے سال کا اعتبار ہوتا ہے اور ایک سال پورا ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ جنون طاری اگر پورے ایک سال تک محیط ہو تو وہ جنون اصلی کے حکم میں ہے۔ اور وجوب زکوٰۃ کے لئے مانع ہوگا اور اگر پورے سال کو محیط نہ ہو بعض اوقات افاقہ ہو جاتا ہو تو اس سلسلہ میں امام محمد کا ایک قول یہ ہے کہ اگر سال میں ایک لمحہ کے لئے بھی جنون سے اتفاق ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اگر سال کے زیادہ تر حصہ میں جنون سے اتفاق ہو تو زکوٰۃ کا وجوب ہوگا ورنہ نہیں ہے۔

بدائع میں ہے :

”ہمارے نزدیک زکوٰۃ کے وجوب کی شرطوں میں سے ایک شرط عاقل ہونا ہے، پس مجنون کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ جنون کی دو قسمیں ہیں، اصلی اور طاری۔ اصلی یہ ہے کہ جنون ہی کی حالت میں بالغ ہوا ہو۔ اس کے بارے میں ہمارے علماء کے درمیان اختلاف نہیں ہے کہ وہ وجوب زکوٰۃ کے لئے مانع ہے لہذا اتفاق کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ اتفاق کے بعد پورے سال کا آغاز ہوگا۔ اور سال پورا ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ جنون طاری اگر پورے سال کو محیط ہو تو وہ جنون اصلی کے حکم میں ہوگا اور اگر درمیان سال اتفاق ہو جائے تو اس مسئلہ میں نوادر میں امام محمد سے منقول ہے کہ اگر سال میں ایک لمحہ کے لئے بھی جنون سے اتفاق ہو جائے چاہے وہ اتفاق سال کے کسی بھی حصہ میں ہو، اس پورے سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ ابن سماعہ نے امام ابو یوسف سے بھی ایک روایت اس کے مطابق نقل کی ہے۔ ہشام نے امام ابو یوسف سے دوسری روایت یہ نقل کی ہے کہ اگر سال کے اکثر حصہ میں جنون سے اتفاق رہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں اور وہ شخص جس پر بھی جنون طاری ہوتا ہو۔ پھر اتفاق ہو جاتا ہو تو ایسا شخص ”مجنون“ کے حکم میں نہیں ہوگا۔ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔“

جمہور ائمہ کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کے لئے عاقل ہونا شرط نہیں ہے۔ پاگل کے مال میں بھی ان

حضرات کے نزدیک زکوٰۃ واجب ہوگی۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے :

”وقال الجمهور لا يشترطان ذلك وتعجب الزکوۃ فی مال الصبی والمجنون“

المجموع شرح المہذب میں ہے :

”وتعجب فی مال الصبی والمجنون“

۵۔ فراغت عن الدین : حنفیہ کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط فراغت عن الدین ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ دہندہ کے ذمہ ایسا دین نہ ہو جس کا بندوں کی طرف سے کوئی مطالبہ کرنے والا ہو۔ اگر کسی کے ذمہ ایسا دین ہے تو بقدر دین وہ وجوب زکوٰۃ کے لئے مانع ہوگا۔ چاہے دین معجل ہو یا مؤجل۔ البتہ اگر دین کی مقدار مالیت منہا کرنے کے بعد بھی بقدر نصاب مال رہ جائے تو اس صورت میں زکوٰۃ کا وجوب ہوگا۔ وہ دیون جن کا مطالبہ بندوں کی جانب سے نہ ہوتا ہو وہ مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہوں گے جیسے دیون کفارات و ندور۔ امام شافعی کے نزدیک دین سرے سے مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔

۶۔ العلم بالفریضہ : علامہ کا سانی نے وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط یہ بھی لگائی ہے کہ نفسِ فریضۃ زکوٰۃ کا کسی بھی طرح سے علم حاصل ہو جائے۔ لہذا وہ شخص جو دارالحرب میں مسلمان ہوا اور دارالاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی اور اسے دارالحرب میں کسی بھی ذریعہ سے زکوٰۃ کی فرضیت کا علم نہیں ہو سکا تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ کا سانی نے اسے ائمہ ثلاثہ امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کا مسلک قرار دیا ہے۔ امام زفر کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کے لئے فرضیت کا علم ضروری نہیں ہے لہذا وہ شخص جو دارالحرب میں مشرف باسلام ہوا اور دارالاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی، سالوں دارالحرب میں مقیم رہا، اس کے پاس سائمہ جانور یا دوسری مالیت ہو اور اسے فرائض اسلام کا علم ہی نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ اور جب وہ دارالحرب سے دارالاسلام ہجرت کر کے آئے گا تو اس سے گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا اور امام زفر کے نزدیک اس پر گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۱۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۲ ص ۷۲۹

۲۔ المجموع ج ۵ ص ۲۲۹

۳۔ بدائع ج ۲ ص ۷

۴۔ بدائع ج ۲ ص ۷

وجوب زکوٰۃ کی دہ شرطیں جن کا تعلق محل زکوٰۃ یعنی اموال سے ہے

پہلی شرط — ملک تام

شریعت اسلامی نے وجوب زکوٰۃ کے لئے "ملک تام" کو بنیادی شرط قرار دیا ہے، اور صرف انہیں اموال میں زکوٰۃ واجب کی گئی جن پر انسان کو "ملک تام" حاصل ہو۔ وہ اموال جن پر انسان کو ملک تام حاصل نہیں ہوتی ہے ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ ملک تام کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اس چیز پر مالکانہ حقوق بھی حاصل ہوں اور وہ چیز اس کے قبضہ و تصرف میں بھی ہو۔ اگر اس پر ملکیت حاصل نہ ہو صرف قبضہ ہو تو اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ جیسے مال مکاتب، کہ اس پر اگرچہ مکاتب کو قبضہ حاصل ہوتا ہے۔ مگر وہ درحقیقت اس کے مولیٰ کی ملکیت ہے۔ اس لئے مکاتب پر اس کے مال کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ اور اگر ملکیت حاصل ہو مگر قبضہ نہ ہو، تو بھی اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی جیسے مہر کی رقم قبضہ سے پہلے کہ عورت اس کی مالک تو ہوتی ہے مگر اس پر قبضہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہوتی، اسی طرح مال شمار پر بھی ملکیت حاصل ہوتی ہے مگر قبضہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی زکوٰۃ قبضہ سے پہلے واجب نہیں ہوتی۔

ملک تام کا وجوب زکوٰۃ کے لئے شرط ہونا قرآن کریم کی آیت: "خذ من اموالہم صدقۃ" و از اموالہم حق۔ اور حدیث رسول: ان الله فرض علیہم فی اموالہم سے ثابت ہے۔

ملک تام کے شرط ہونے کی حکمت

ملک تام کے وجوب زکوٰۃ کی شرط ہونے کی حکمت ذکر کرتے ہوئے یوسف القرضاوی نے لکھا ہے:

"اس شرط کا اعتبار اس لئے کیا گیا ہے کہ ملکیت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ کیونکہ یہ نہ صرف حریت بلکہ انسانیت کا ثمرہ ہے۔ حیوان کو کسی چیز پر مالکانہ اختیارات اور حقوق حاصل نہیں ہوتے۔ یہ انسان ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ مالکانہ حقوق رکھتا ہے۔ ملکیت مملکت کے فطری جذبہ کی تسکین کا سامان کرنے کے علاوہ انسان میں سیادت و قوت کا احساس بھی

پیدا کرتی ہے۔ اور ملکیت تمام انسان کو یہ اختیار عطا کرتی ہے کہ وہ اپنے مملوکہ مال سے فائدہ حاصل کرے اور اس کے اضافہ اور نشوونما کا سامان کرے نیز بذات خود یا اپنے نائب کے ذریعہ اس کو نفع بخش کاموں میں لگائے۔ ایسی عظیم نعمت کے حصول پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے اس لئے اگر اسلام نے اس کے مالک سے زکوٰۃ کی ادائیگی اور مال کا حق ادا کرنے کا مطالبہ کیا ہے تو یہ باعث تعجب نہیں ہے۔“ ۱

ملک تمام سے کیا مراد ہے

ملک تمام ایک فقہی اصطلاح ہے۔ فقہاء کرام ملک تمام اور ملک مطلق کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ ملک تمام سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز پر انسان کو مالکانہ حقوق بھی موصول ہوں اور اس شئی پر اس کا قبضہ بھی ہو۔ اس کی تعبیر فقہائے کرام ”هو المملوك رقبۃ وبيداء“ سے کرتے ہیں یعنی وہ شئی رقبہ (ذات) اور ید (قبضہ) دونوں لحاظ سے مملوک ہو، ائمہ ثلاثہ حضرت امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد بن الحسن شیبانی کے نزدیک ملک تمام سے ملکیت اور قبضہ مراد ہے۔ اور جب کسی چیز پر انسان کو ملکیت اور قبضہ دونوں حاصل ہوگا، تب اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ امام زفر بن الہذیل کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کے لئے قبضہ ضروری نہیں ہے۔ حضرت امام شافعی بھی وجوب زکوٰۃ کے لئے قبضہ کو ضروری قرار نہیں دیتے ہیں۔ ان دونوں حضرات کے نزدیک مال ضامین بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی علامہ کاسانی نے اموال سے متعلق شرائط کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

”وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط ملک مطلق ہے۔ ملک مطلق سے مراد یہ ہے کہ اس شئی پر انسان کو ملکیت بھی حاصل ہو اور قبضہ بھی یعنی باعتبار رقبہ و ید و مملوک ہو، یہ ہمارے ائمہ ثلاثہ امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد کا قول ہے۔ امام زفر کے نزدیک قبضہ شرط نہیں ہے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے۔ پس ہمارے نزدیک مال ضامین زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور ان دونوں حضرات کے نزدیک واجب ہوگی۔“ ۲

البحر الرائق میں ہے :

”هو المملوك رقبة ويبدأ أئمنى ملك مطلق سے مراد رقبة اور يد کے لحاظ سے مملوک ہونا ہے۔“

شامی میں ہے :

هو المملوك يبدأ ورقبة^۱ وہ رقبة اور يد کے لحاظ سے مملوک ہونا ہے۔

الفقه على المذاهب الاربعہ میں ہے :

”حنیفہ کے نزدیک ملک تمام سے مراد یہ ہے کہ مال قبضہ کے لحاظ سے مملوک ہو، پس اگر کسی چیز پر ملکیت حاصل ہو مگر اس پر قبضہ نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ جیسے قبضہ سے پہلے عورت کا ہر ایسی چیز جس پر قبضہ ہو مگر ملکیت حاصل نہ ہو، اس کی زکوٰۃ بھی واجب نہیں ہوگی مالکیہ کے نزدیک ملک تمام سے مراد یہ ہے کہ مالک کو اپنی مملوکہ اشیاء میں تصرف کا اختیار حاصل ہو۔ پس غلام کی تمام اقسام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ کیونکہ غلام کو کسی بھی صورت میں مال پر ملک تمام حاصل نہیں ہوتی ہے۔ شافعیہ کے نزدیک ملک تمام کی قید سے غلام اور مکاتب کو نکالنا مقصود ہے کہ غلام کو سرے سے ملکیت ہی حاصل نہیں ہوتی ہے اور مکاتب کو ناقص ملکیت حاصل ہوتی ہے اس لئے ان دونوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی^۲ علامہ کاسانی کی صراحت کے مطابق شافعیہ کے نزدیک ملک تمام کی تعریف میں قبضہ شامل نہیں ہے کہ حنابلہ کے نزدیک ملک تمام سے مراد یہ ہے کہ مالک کو اس مال پر قبضہ حاصل ہو، اس کے ساتھ کسی دوسرے کا حق متعلق نہ ہو اور اس میں اسے حسب منشاء تصرفات کا اختیار حاصل ہو، اور اس کے فوائد اسی کی طرف لوٹتے ہوں۔ لہذا مال مکاتب پر ان کے نزدیک بھی وجوب زکوٰۃ نہیں ہوگا۔“^۳

ملک تمام کے ذیل میں پیدا ہونے والے سوالات حسب ذیل ہیں :

۱۔ البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۲ ۲۔ شامی ج ۲ ص ۱۵۹

۳۔ الفقه على المذاهب الاربعہ ج ۱ ص ۵۹۲ ۴۔ بدائع ج ۱ ص ۱

۵۔ الفقه على المذاهب الاربعہ ج ۱ ص ۵۹۳

سوالات کے جوابات

۱۔ مال تجارت پر قبضہ سے پہلے زکوٰۃ

وہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو لیکن مال کی حصولیابی نہیں ہو سکی اور وہ مال خریدار کے قبضہ میں نہیں آیا، تو سوال یہ ہے کہ اس مال کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی؟ مشتری پر جس نے اس کی پیشگی قیمت داکر دی مگر مال اس کے قبضہ میں نہیں آیا، یا اس کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہوگی جس نے اس کی قیمت تو وصول کر لی مگر سامان ابھی بھی اسی کے پاس ہے۔

بائع پر اس کی زکوٰۃ اس وجہ سے واجب نہیں ہونی چاہئے کہ وہ اسے فروخت کر چکا ہے اور اس کی قیمت پر بھی قبضہ کر چکا ہے۔ اس لئے وہ مال اس کی ملکیت سے نکل چکا، پس ملکیت نہیں پائی گئی اور وہ زکوٰۃ کے لئے ملکیت بذیادہ شرط ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ خریدار پر اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اور اگر چند سالوں کے بعد وہ سامان اس کے قبضہ میں آیا تو گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی یا نہیں؟

اس سلسلہ میں فقہائے دو قول ملتے ہیں!

۱۔ پہلا قول یہ ہے کہ سامان تجارت قبضہ سے پہلے نصاب شرعی نہیں بنے گا، اور اس کی زکوٰۃ خریدار پر واجب نہیں ہوگی۔ اکثر مشائخ عراق کا یہی قول ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے بھی وہ نصاب شرعی ہو جائے گا، اور اس کی زکوٰۃ خریدار پر واجب ہوگی، بعض مشائخ کا اسی طرف رجحان ہے، فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

”واما المشتري قبل القبض فقد قال مشايخ العراق انه لا يكون

نصاباً قبل القبض عند هم جميعاً قال غيرهم من المشايخ هو

علم الخلاف الذي ذكرنا في الثمن وقال غيرهم من المشايخ.....

هو نصاب قبل القبض بلا خلاف“ ۱۷

”یعنی خریدی ہوئی چیز جس پر قبضہ نہ ہوا ہو مشائخ عراق کہتے ہیں کہ قبضہ سے پہلے تمام ہی فقہاء کے نزدیک وہ نصاب شرعی نہیں ہوگی۔ دیگر مشائخ کہتے ہیں کہ اس میں بھی وہی اختلاف ہے جو ثمن میں ہے۔ بعض مشائخ کہتے ہیں کہ مبیع قبضہ سے پہلے بھی بالاتفاق نصاب ہے۔ علامہ حنفی صاحب درمختار نے عدم وجوب کے قول کو اختیار کیا ہے چنانچہ ”ملک“ پر حث کے ذیل میں لکھا ہے :

”ولا ینہما اشتراء للتجارة قبل قبضہ“ اور مبیع قبل القبض میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

شامی نے اس عبارت کے تحت لکھا ہے کہ قبضہ سے پہلے تو اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی لیکن قبضہ کے بعد گزشتہ تمام سالوں کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی :

”فی زکیہ ما مضی“ اور قبضہ کے بعد تمام ہی سالوں کی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔

قاضی خاں نے سامان تجارت پر قبضہ سے پہلے زکوٰۃ کے عدم وجوب کے قول کو راجح قرار دیا ہے۔ اور قبضہ کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی ہے۔ ان کے نزدیک قبضہ کے بعد جب اس سامان پر حوالان حول ہو جائے گا تب اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ فتاویٰ قاضی خان میں ہے :

”ایک شخص کے پاس ساٹھ بکری تھیں اس سے دوسرے شخص نے بکری خریدی مگر اس پر قبضہ نہیں کیا یہاں تک کہ اس پر ایک سال گزر گیا پھر اس پر قبضہ کیا۔ تو مشتری پر گزشتہ سال کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ اور قبضہ کے بعد جب سال پورا ہوگا تو اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس لئے کہ وہ بکری اپنے بائع کے پاس ثمن کے عوض مضمون تھی“۔

علامہ ابن نجیم نے بھی قبضہ سے پہلے مشتری پر زکوٰۃ کے عدم وجوب کے قول کو ترجیح دی ہے چنانچہ ”ملک تمام“ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے :

”فلا یجب علی المشتري فیما اشتراه للتجارة قبل القبض“ کہ

قبضہ کی حقیقت

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پر غور کر لیا جائے کہ شرعاً قبضہ اور تسلیم کی حقیقت کیا ہے اور قبضہ کا اصل مقصد کیا ہے۔ تاکہ اس بات کا فیصلہ آسان ہو جائے کہ وہ سامان تجارت جس کی پیشگی قیمت ادا کی جا چکی اور وہ ابھی مشتری کے پاس نہیں آیا تو اس پر مشتری کا قبضہ سمجھا جائے گا یا نہیں؟ فقہ طاہر بن عبدالرشید نے خلاصۃ الفتاویٰ کے کتاب البیوع میں ایک باب ہی اس عنوان سے قائم کیا ہے: "فیما یکون قبضاً و فیما لا یکون" یعنی کسے قبضہ قرار دیا جائے گا اور کسے نہیں اس باب کے ذیل میں انھوں نے قبضہ کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"تجرید میں بیع پر قبضہ کے باب میں لکھا ہے کہ بیع پر قبضہ اور اس کی سپردگی یہ ہے کہ بائع بیع اور مشتری کے درمیان اس طرح سے تخلیہ کر دے کہ بغیر کسی رکاوٹ کے مشتری کے لئے اس پر قبضہ کرنا ممکن ہو اور اسی طرح ثمن کی سپردگی سمجھی جائے گی، اجناس میں ہے کہ سپردگی کے لئے تین چیزیں معتبر ہیں (۱) بائع مشتری سے کہے کہ میں نے بیع اور تمہارے درمیان تخلیہ کر دیا ہے (۲) بیع مشتری کے پاس اس طرح ہو کہ اگر اس میں وہ کوئی تصرف کرنا چاہے تو بلا کسی رکاوٹ کے کر سکے (۳) بیع حق غیر کے ساتھ مشغول نہ ہو، امام ابوحنیفہ سے منقول ہے کہ قبضہ یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں نے تمہارے اور بیع کے درمیان تخلیہ کر دیا، پس اس پر قبضہ کر لو..... اگر کسی نے گہوں خرید اور وہ گہوں کسی مکان میں ہے بائع نے اس گھر کی تالی مشتری کو دیتے ہوئے کہا کہ میں نے تمہارے اور اس کے درمیان تخلیہ کر دیا ہے، تو اسے قبضہ سمجھا جائے گا۔"

محقق ابن انہام نے قبضہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"قبضہ اور بیع کی سپردگی کا مفہوم یہ ہے کہ مشتری اور بیع کے درمیان اس طرح تخلیہ کر دیا جائے کہ مشتری کے لئے بغیر کسی رکاوٹ کے اس پر قبضہ کرنا ممکن ہو۔ اور یہی مفہوم ثمن کی سپردگی کا ہے"

..... اور وبری سے منقول ہے کہ اگر کسی مکان میں خریدے گئے سامان تجارت کے ساتھ بائع کے سامان کے علاوہ کسی دوسرے کا سامان ہو تو وہ قبضہ کے حق میں مانع ہوگا۔ پس اگر اسے سامان پر قبضہ کی اجازت دے دی جائے تو قبضہ صحیح ہو جائے گا۔ اور سامان بائع کے پاس حکم و رعیت ہوگا..... کپڑے میں قبضہ کی صورت یہ ہے کہ مشتری اسے اپنے ہاتھ میں لے لے یا اگر کپڑا زمین پر رکھا ہو اور بائع مشتری سے یہ کہے کہ میں نے تمہارے اور کپڑے کے درمیان تخلیہ کر دیا ہے۔ پس اس پر قبضہ کر لو اور مشتری نے اس کے جواب میں کہا کہ میں نے قبضہ کر لیا تو شرعاً اسے قبضہ قرار دیا جائے گا۔ اور اگر کسی مکان میں رکھے ہوئے گندم کو خریدا گیا اور بائع نے مشتری کو اس مکان کی تالی دیتے ہوئے کہا کہ میں نے تمہارے اور مبيع کے درمیان تخلیہ کر دیا ہے تو شرعاً یہ قبضہ قرار پائے گا۔

بحر الرائق میں ہے :

”اگر بائع نے مشتری سے مبيع کے مکمل ہونے کے بعد کہا کہ ”لو“ تو یہ قبضہ نہیں ہوگا اور اگر مبيع کی طرف اشارہ کر کے کہا: ”اسے لو“ پس اگر مشتری کے لئے مبيع پر قبضہ کرنا ممکن ہو تو یہ تخلیہ اور قبضہ ہوگا۔“

آگے چند سطروں کے بعد لکھا ہے :

”مبيع پر قبضہ اور اس کی سپردگی کا مفہوم یہ ہے کہ مبيع اور مشتری کے درمیان اس طرح سے تخلیہ کر دیا جائے کہ اگر مشتری اس پر قبضہ کرنا چاہے تو کوئی رکاوٹ اور مانع پیش نہ آئے۔“

علامہ حنفی نے قبضہ کی حقیقت یہ بیان کی ہے :

”پھر قبضہ اور مبيع کی سپردگی ایسے تخلیہ سے عمل میں آئے گی جس میں مشتری کے لئے مبيع پر قبضہ کرنا بغیر کسی رکاوٹ کے ممکن ہو۔“

علامہ شامی نے صراحت کی ہے کہ تخلیہ بھی مکمل قبضہ ہے بشرطیکہ تخلیہ کے بعد مبيع پر بغیر کسی دشواری

کے قبضہ ممکن ہو۔ فتح القدیر میں ہے :

”اور ملک تمام کی قید سے مبیع قبل القبض نکل جاتی ہے۔ اگر اس پر بائع ہی کے پاس
حوالان حول ہو جائے، اور اس دوران مشتری کو اس پر ملک تصرف حاصل نہ ہو تو اس
کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ واضح رہے کہ کمال ملک کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہر طرح
کے تصرف کا اختیار حاصل ہو“۔

ان عبارات فقہیہ کا حاصل یہ ہے کہ فقہائے ”تخلیہ“ کو بھی حکماً ”قبضہ“ تسلیم کیا ہے اور سامان تجارت پر قبضہ اور
اس کی سپردگی کے لئے یہ بات کافی قرار دی گئی ہے کہ سامان تجارت اور خریدار کے درمیان اس طرح تخلیہ
کر دیا جائے کہ اگر خریدار سامان پر قبضہ کرنا چاہے تو اسے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ لہذا ان تفصیلات کی روشنی
میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے :

”وہ سامان تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی اور ابھی سامان تجارت بائع ہی کے پاس
ہے۔ اس سامان کا مشتری شرعاً اور عرفاً مالک بن چکا ہے۔ اور اسے سامان پر حکماً قبضہ بھی
حاصل ہے۔ قبضہ کی دلیل یہ ہے کہ اس طرح کے خریدے ہوئے مال میں خریدار کو ہر طرح
کے تصرفات کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اور اسے اس پر مالکانہ حقوق بھی حاصل ہوتے ہیں
اس میں وہ جو چاہے تصرف کر سکتا ہے۔ بائع کی طرف سے کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ہوتی
ہے۔ کیوں کہ ثمن کی وصولیابی کے وقت ہی بائع سامان اور خریدار کے درمیان تخلیہ کر دیتا
ہے۔ لہذا اس مال تجارت کی زکوٰۃ خریدار پر واجب ہوگی۔ اور اگر وہ سامان تجارت چند
سالوں کے بعد خریدار کے پاس آئے تو اسے گزشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی“
چنانچہ علامہ ابن نجیم نے لکھا ہے :

”وقد منان المبيع قبل القبض لا تجب زكوة على المشتري وذكر
في المحيط في بيان اقسام الدين : ان المبيع قبل القبض قيل لا يكون
نصاباً لان المالك فيه ناقص بافتقار اليد والصحيح انه يكون نصاباً
لانّه عوض عن مال كانت يده ثابتة عليه وقد امكنه احتواء اليد

على العرض فتعتبر بيدة باقية على النصاب باعتبار التمكن شرعاً فعلى
هذا قولهم لا تجب الزكاة معناه قبل قبضه وما بعد قبضه فتجب زكاة فيما مضى

كالدين القوي ۴

پیشگی ادا کی ہوئی قیمت کی زکوٰۃ

پیشگی ادا کی ہوئی قیمت کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہوگی یا مشتری پر۔ اس سلسلہ میں حکم یہ ہے کہ پیشگی ادا کی ہوئی قیمت چوں کہ مشتری کی ملکیت سے نکل چکی ہے۔ اور اس پر مشتری کو نہ تو ملکیت حاصل ہے اور نہ قبضہ اس لئے اس کی زکوٰۃ مشتری پر واجب نہیں ہوگی۔ البتہ بائع کو اس قیمت پر ملک تام حاصل ہے اس کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی۔ بحر الرائق میں ہے :

”رجل اشترى عبداً للتجارة يساوي مائتي درهم ونقد الثمن ولم يقبض

العبد حتى حال الحول فمات العبد عند البائع كان على بائع العبد زكاة

المائتين ما على البائع فلا تملك الثمن وحال الحول عليه

عند البائع الى قوله ولا زكاة على المشتري لو ان الثمن زال عن ملكه

الى البائع فلم يملك المائتين حوله كاملاً فلا تجب عليه الزكاة“ ۵

”ایک شخص نے بریت تجارت ایک غلام خریدا جس کی قیمت دو سو درہم کے مساوی ہے، اس نے

ثمن کی ادائیگی کر دی اور غلام پر قبضہ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اس پر ایک سال گزر گیا۔ اور اس

دوران غلام مر گیا تو بائع پر دو سو درہم کی زکوٰۃ واجب ہوگی، کیونکہ غلام کی قیمت پر اسے

ملکیت حاصل ہو چکی تھی۔ اور اس پر حولان حول بھی ہو گیا۔ مشتری پر اس کی زکوٰۃ واجب نہیں

ہوگی کیوں کہ ثمن اس کی ملکیت سے نکل کر بائع کی ملک میں داخل ہو گیا۔ پس پورے ایک

سال تک ثمن پر مشتری کی ملکیت نہیں رہی۔ اس لئے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔“

کرایہ کی پیشگی رقم اور ڈپوزٹ پر زکوٰۃ : کرائے کی مد میں دی جانے والی پیشگی رقم ”اجرت معبدہ“

ہے جس کا مالک، مالک مکان ہے۔ اس رقم پر اسے ملک تام حاصل ہے اس لئے اس کی زکوٰۃ مالک مکان پر واجب ہوگی۔ بدائع میں ہے :

”ذکر الشیخ الامام ابو بکر محمد بن الفضل البخاری فی الاجارة الطویلة السی
تعارفها اهل بخاری ان الزکاة فی الاجرة المعجله تجب علی الاجر لانه ملکه
قبل الفسخ“ ۱

امام ابو بکر محمد بن الفضل البخاری نے اجارہ طویلہ جس کا اہل بخاری کے مابین عام رواج ہے
کے بارے میں لکھا ہے کہ اجرت معجلہ میں آجر یعنی مالک پر زکوٰۃ واجب ہوگی کیونکہ اجارہ کے
فسخ ہونے سے پہلے تک وہ اس کا مالک ہے۔

فتاویٰ قاضی خان میں ہے :

”اجارہ مرسومہ جس کا بخاری میں رواج ہے۔ اگر اس میں پیشگی رقم ادا کر دی گئی اور مال چہرہ
سالوں تک آجر یعنی مالک مکان کے پاس ہی رہا، تو شیخ ابو بکر محمد بن الفضل سے منقول ہے کہ
اگر اجرت دراہم و دنانیر کے قبیل سے ہو تو اس کی زکوٰۃ آجر پر واجب ہوگی۔ اس لئے کہ قبضہ کے
ذریعہ وہ پیشگی رقم کا مالک ہو چکا ہے۔ اور اجارہ کے فسخ ہونے کی صورت میں اس پر عین مقبوض
کی واپسی ضروری نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کے علاوہ دوسرے دراہم و دنانیر کی واپسی کافی ہوگی
تو گویا کہ یہ اس دین کے مثل ہوا جو حوالان حوال کے بعد لازم ہوا ہو ۲

امام نووی شافعی نے لکھا ہے :

”اگر آجر کے پاس ہی کرایہ پر لگایا ہوا مکان ہو اور کرایہ دار نے ابھی اس مکان سے فائدہ نہ
اٹھایا ہو اور کرایہ کی رقم پر سال مکمل ہو گیا ہو تو اس کی زکوٰۃ آجر پر واجب ہوگی۔ اس لئے کہ آجر
کو اس پر ملکیت تامہ حاصل ہے“ ۳

محقق ابن الہمام کا بیان ہے :

”طویل اجارہ جس کا معاملہ بعض لوگ کرتے ہیں اور ہر ماہ کے شروع میں تین دن کے لئے خیاب شرط

لگاتے ہیں۔ اگر اس میں چند سالوں کا کرایہ پیشگی ادا کر دیا جائے تو اس کی زکوٰۃ (بر مالک مکان) پر واجب ہوگی۔ کیونکہ قبضہ کے ذریعہ آجر اس کا مالک ہو چکا ہے اور اجارہ کے نسخہ ہونے کی صورت میں اس پر بعینہ اسی رقم کی واپسی ضروری نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کی مقدار کا ٹوٹانا کافی ہوگا۔ پس سمجھا جائے گا کہ یہ وہ دین ہے جو حوالہ نول کے بعد اس کے ذمہ آیا ہے۔
صاحب خلاصۃ الفتاویٰ نے بھی اجرت مبادلہ کی زکوٰۃ آجر پر واجب قرار دی ہے۔ مگر لکھا ہے کہ احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ دونوں یعنی آجر اور مستاجر اس کی زکوٰۃ ادا کریں۔

مگر یہاں پر محل غور و فکر پیشگی ادا کی جانے والی کرایے کی رقم نہیں ہے۔ بلکہ وہ رقم ہے جسے کرایہ دار ضمانت اور ڈپوزٹ کے طور پر ادا کرتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں اور قصبہات میں مکان / دکان کرایہ پر لیتے وقت کرایہ کی متعینہ رقم کے علاوہ ایک بڑی رقم ڈپوزٹ / ضمانت / گچھوی کے نام پر کرایہ دار کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ رقم کرایہ دار کو درمیان میں لینے کا اختیار حاصل نہیں ہوتا ہے، بلکہ جب وہ مکان / دکان خالی کریگا یا اجارہ کا معاملہ ختم کیا جائے گا تو اسے یہ رقم واپس ملے گی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ضمانت یا ڈپوزٹ کے طور پر دی جانے والی رقم کا شرعی حکم کیا ہوگا۔ اور اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر واجب ہوگی یا مالک مکان پر جس کے قبضہ میں وہ رقم ہے۔ یہ بات تو متحقق ہے کہ مالک مکان کو اس رقم پر ملکیت حاصل نہیں ہے۔ صرف اس پر اس کا قبضہ ہے۔ اور وجوب زکوٰۃ کے لئے ”ملک تمام“ ہونا ضروری ہے۔ لہذا اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہونی چاہئے۔ اب رہا یہ سوال کہ کرایہ دار جو اس رقم کا اصل مالک ہے اس پر اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس رقم کی اصل حیثیت پر غور کر لیا جائے کہ شرعاً اس رقم کی حیثیت کیا ہے۔ اس رقم کے بارے میں چند احتمالات ہو سکتے ہیں۔

۱۔ اسے قرض قرار دیا جائے۔ مگر قرض ہونے کے احتمال کو عرف و تعامل رد کرتے ہیں۔ کیونکہ قرض کی صورت میں شرعاً قرض دہندہ کو اس کو اختیار رہتا ہے کہ جب وہ چاہے قرض میں دی ہوئی رقم کا مطالبہ کرے۔ مگر ڈپوزٹ کی رقم کو اجارہ کے ختم ہونے یا نسخ ہونے سے پہلے واپس لینے کا اختیار نہیں ہوتا ہے۔

اس لئے ہم اسے قرض قرار نہیں دے سکتے۔

۲۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس رقم کو "امانت اور ودیعت" قرار دیا جائے۔ مگر یہ احتمال بھی اس وجہ سے درست نہیں ہے کہ "امانت اور ودیعت" کی صورت میں اگر سامان مودع کے پاس ہلاک ہو جائے تو اس پر تاوان واجب نہیں ہوتا ہے۔ اور ڈپوزٹ کی رقم ہر حال میں واجب الرد ہوتی ہے۔ اس لئے اسے امانت بھی قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔

۳۔ ایک احتمال یہ ہے کہ اسے "عاریت" قرار دیا جائے مگر یہ احتمال بھی اس بنا پر درست نہیں ہے کہ عاریت کی صورت میں بھی مالک کو اپنی چیز واپس لینے کا ہر وقت اختیار رہتا ہے۔ نیز عاریت مکمل میں ودیعت کے ہوتی ہے۔ اور ڈپوزٹ کی رقم کو نہ تو ہر وقت واپس لینے کا اختیار رہتا ہے اور نہ ہی ہلاک ہونے کی صورت میں مالک مکان بری الذمہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ احتمال بھی درست نہیں ہے۔

۴۔ ایک احتمال یہ ہے کہ اس رقم کو "رہن" قرار دیا جائے۔ یہ احتمال درست معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ رہن رکھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دائن کی رقم مدیون کے پاس محفوظ رہے، ڈوبنے نہ پائے۔ اگر خدا نخواستہ مدیونین کی رقم لے کر فرار ہو جائے، یا اس سے انکاری ہو جائے تو دائن رہن سے اپنا دین وصول کر سکے۔ ڈپوزٹ اور ضمانت کی رقم کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اگر کرایہ دار درمیان میں کرایہ ادا کئے بغیر مکان خالی کر کے فرار ہو جائے یا مکان میں اپنی طرف سے تغیر و تبدیلی کر دے تو مالک ڈپوزٹ کی رقم سے اپنی واجب الادا رقم وصول کرے۔ اور نقصان کی صورت میں نقصان کی تلافی کر سکے۔ نیز جس طرح رہن میں جب تک "دین" ادا نہیں کیا جاتا ہے اس وقت تک مال رہن کی واپسی نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح ڈپوزٹ کی صورت میں بھی جب تک مکان / مکان خالی نہ کر دی جائے یا مدت اجارہ ختم نہ ہو جائے۔ اس رقم کی واپسی نہیں ہوتی۔ اس لئے میرے نزدیک اس رقم کی حیثیت مال رہن کی ہے۔ اور رہن کے بارے میں حکم شرعی یہ ہے کہ اس کی زکوٰۃ نہ تو رہن پر واجب ہوگی اور نہ ہی مرہن پر۔ رہن پر زکوٰۃ واجب ہونے کی علت یہ ہے کہ اگرچہ اسے مال رہن پر ملکیت حاصل ہے مگر اس پر اس کا قبضہ نہیں ہے۔ اور وجوب زکوٰۃ کے لئے "ملک تام" ملک قبضہ اور ضروری ہے جو یہاں پر مفقود ہے۔ اس لئے رہن پر اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ رہن پر اس کی زکوٰۃ واجب ہونے کی دوسری علت یہ ہے کہ یہ رقم اس کی ضروریات میں مشغول ہے۔ رہائشی مکانات تو ظاہر ہے کہ اس کی بنیادی ضرورت ہے اور وجوب زکوٰۃ کے لئے مال کی ضروریات اصلہ سے فارغ ہونا ضروری ہے۔ اور مرہن پر عدم وجوب کی علت یہ ہے کہ مرہن کو مال رہن پر ملکیت حاصل نہیں ہوتی ہے۔ اگرچہ اسے قبضہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے حق میں بھی "ملک تام" کا تحقق نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر بھی

زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ علامہ حنفی نے لکھا ہے :

”ولا فی مرہون بعد قبضہ“ اور مال رہن پر قبضہ کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

علامہ شامی نے درمختار کے قول ”ولا فی مرہون بعد قبضہ“ کے تحت لکھا ہے :

”مال مرہون کی زکوٰۃ مرہن پر اس لئے واجب نہیں ہوگی کہ اسے صرف قبضہ حاصل ہوتا ہے بلکہ رقبہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اور رہن پر اس کی زکوٰۃ اس لئے واجب نہیں ہوگی کہ مال مرہون پر اسے قبضہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اور جب مال مرہون واپس کیا جائے گا تو رہن پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔“

اس لئے اس سلسلہ میں راقم اطروف کی رائے یہ ہے کہ :

”وہ رقم جو بطور پیشگی (ADVANCE) مالک مکان / دوکان کو دی جاتی ہے۔ اس کی حیثیت مال رہن کی ہے۔ لہذا اس کی زکوٰۃ نہ تو کرایہ دار پر واجب ہوگی اور نہ مالک مکان پر۔ کیوں کہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی اس رقم پر ملک تام حاصل نہیں ہوتا ہے۔“

مدارس اور اداروں کی رقوم پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ کے لئے شرعاً مال پر ملک تام حاصل ہونا ضروری ہے۔ لہذا وہ سارے اموال جن کا کوئی متعین فرد مالک نہ ہو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ مدارس اور اداروں میں جو رقوم جمع ہوتی ہیں ان کا مالک بھی کوئی متعین فرد نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے ان رقوم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ علامہ شامی نے درمختار کے قول ”ملک نصاب“ کے تحت لکھا ہے :

”فلا زکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلة لعدم المملکۃ“

پس وقف کے سائے جانور اور گھوڑے میں ملکیت کے فقدان کی وجہ سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

علامہ کاسانی نے لکھا ہے :

”فمنها الملك فلا تجب الزكاة في سوائهم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك وهذا لان في الزكاة نفليكا والتمليك في غير الملك لا يتصور“^۱ وجوب زکوة کی ایک شرط ملک تام ہے۔ لہذا وقف کے مویشی اور گھوڑوں میں عدم ملک کی وجہ سے زکوة واجب نہیں ہوگی۔ اور اس لئے کہ زکوة میں تملیک ہوتی ہے اور ملک غیر میں تملیک کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

الفقه على المذاهب الاربعہ میں ہے :

”ولا زکوة في المال الموقوف لعدم الملك فيه“^۲

الفقه الاسلامی وادلتہ میں ہے :

”فلا زکوة في سوائهم الوقف والخيل الموقوفة“^۳

حضرت امام شافعی کا بھی یہی مشہور قول ہے کہ وقف اور مدارس کے اموال میں زکوة واجب نہیں ہوگی۔ المجموع میں ہے :

”اس باغ کے پھل اور زمین کے غلہ پر جو بہت عامہ پر وقف ہو، جیسے مدارس، مساجد،

فقراء، مجاہدین وغیرہ۔ زکوة واجب نہیں ہوگی، امام شافعی کا یہی مشہور قول ہے اور شوافع

کے نزدیک اسی قول پر عمل ہوتا ہے“^۴

فقہ حنبلی کے مطابق بھی مدارس اور اداروں کے اموال پر زکوة واجب نہیں ہوگی۔ الفروع میں ہے :

”ولا زکوة في وقف على غیر معین اذ على المساجد والمدارس والربط ونحوها“^۵

مال حرام پر زکوة کا حکم

کسی شخص کے پاس مال حرام کے جمع ہونے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں :-

۱۔ بدائع ج ۲ ص ۹ ۲۔ الفقه على المذاهب الاربعہ ج ۱ ص ۵۹۲

۳۔ الفقه الاسلامی وادلتہ ج ۲ ص ۴۴ ۴۔ المجموع شرح المہذب ج ۵ ص ۵۷۵

۵۔ کتاب الفروع لابن مفلح ج ۲ ص ۲۲۶

(الف) : اس شخص کے پاس سارا مال حرام ہی ہو جو اس نے ناجائز اور حرام ذرائع سے حاصل کر کے جمع کر رکھا ہو۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا حلال و طیب مال نہ ہو۔ اس صورت میں اس شخص کو مال حرام پر ملکیت حاصل نہیں ہے۔ بلکہ سارا ہی مال ناپاک اور ضعیف ہونے کی بناء پر واجب التصدق ہے۔ یا اگر جن لوگوں سے ناجائز طور پر مال حاصل کیا گیا تھا وہ معلوم و متعین ہیں تو ان تک اس مال کی واپسی لازم اور ضروری ہے۔ اس صورت میں چوں کہ سارا ہی مال واجب التصدق یا واجب الرد ہے، اس لئے اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ کیونکہ مال ضعیف پر ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے اور وجوب زکوٰۃ کے لئے ملکیت اور قبضہ ضروری ہے۔ شامی میں ہے :

”لو كان الغنيث نصاباً لا يلزمه الزكاة لان الكل واجب التصدق منه“

یفتید ایجاب التصدق بعضہ ”لہ

اگر کسی شخص کے پاس مال ضعیف بقدر نصاب ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ پوری رقم واجب التصدق ہے۔ پس صرف زکوٰۃ کی مقدار صدقہ کو واجب کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

کتاب البیوع میں شامی نے مال حرام کا حکم ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

الحاصل انہ ان علم ارباب الاموال وجب ردہ علیہم والا فان علم عین

العرام لا یحل لہ ویصدق بہ بنية صاحبه ”لہ

حاصل یہ ہے کہ اگر ارباب اموال معلوم ہوں تو ان تک مال کا لوٹانا واجب ہوگا۔ ورنہ اگر عین حرام کا علم ہو تو وہ رقم اس کے لئے حلال نہیں ہوگی اور صاحب مال کی نیت سے اس کا تصدق ضروری ہوگا۔

بحر الرائق میں ہے :

”ملکہ ملکاً خبیثاً فسیبیلہ التصدق بہ“ لہ

علامہ یوسف القرضاوی نے مال حرام پر زکوٰۃ کے عدم وجوب کی علت ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

”وجوب زکوٰۃ کے لئے ملکیت کی جو شرط لگائی گئی ہے۔ اس سے وہ مال خارج ہو جاتا ہے جسے ناپاک اور حرام ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو۔ جیسے غصب، چوری، رشوت، سود اور فریب دہی کے ذریعہ حاصل کئے گئے اموال..... صحیح بات یہ ہے کہ لوگ اس قسم کے اموال کے مالک نہیں ہوتے ہیں اگرچہ انہوں نے اپنے جائز مال کے ساتھ اسے اس طرح ملا لیا ہو کہ دونوں کو علیحدہ کرنا مشکل ہو۔ علماء کہتے ہیں کہ اگر مال غنیمت بقدر نصاب ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیونکہ ایسے شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس مال کی ذمہ داری سے اپنے کو سبکدوش کر دے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر اس کا مقدار معلوم ہو تو اس کو اس کا حق پہنچائے یا اس کے ورثہ کے حوالہ کرے۔ بصورت دیگر فقراء پر صدقہ کر دے۔ اور دریں صورت پورا مال صدقہ کرنا ضروری ہے۔ لہذا صرف اس کے ایک حصہ (یعنی زکوٰۃ کی حد تک) صدقہ کرنا حکم دینا مفید نہیں ہوگا۔“

(ب) : دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے پاس مال حرام کے علاوہ کچھ حلال و طیب مال بھی ہو۔ اس کی بھی دو صورتیں ہوں گی :

۱۔ مال حلال اور مال حرام علیحدہ علیحدہ ہو، دونوں ایک دوسرے سے ممتاز و مینر ہوں تو اس صورت میں بھی مال حرام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ کیونکہ مال حرام واجب التصدق ہو گا یا اصحاب اموال معلوم ہوں تو ان تک واپسی ضروری ہوگی۔

۲۔ مال حرام اور مال طیب کو اس طرح خلط ملط کر دیا گیا ہو کہ دونوں کو علیحدہ کرنا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں اس مال میں زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اس میں حضرت امام ابو حنیفہ اور صاحبین امام ابو یوسف، امام محمد کا اختلاف ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ درہم و دنانیر (موجودہ دور میں کرنسی نوٹ بھی درہم و دنانیر کے حکم میں ہیں) کا اس طرح خلط ملط کر دینا کہ ان کے درمیان تمیز ممکن نہ ہو، استہلاک ہے۔ لہذا اس استہلاک کی وجہ سے وہ شخص پورے مال کا مالک بن جائے گا البتہ مال حرام کی مقدار کا وہ ضامن قرار پائے گا اور اس پورے مخلوط مال میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور وراثت بھی جاری ہوگی۔

صاحب ولوالجیہ نے امام صاحب کے قول کو ارفق بالناس قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ بہت کم ایسے

لوگ ہیں جن کے پاس صرف مال حلال و طیب ہوتا ہے۔ ورنہ عام طور پر لوگوں کے مال میں غصب وغیرہ کی آمیزش ہوتی ہے۔ علامہ ابن نجیم مصری نے اس پر یہ اشکال کیا ہے کہ :

”اگرچہ امام صاحب کے قول کے مطابق ”خلط“ اور ”استہلاک“ کے ذریعہ وہ مال حرام کا مالک بن جائے گا۔ مگر وہ اس مقدار مال کا ضامن ہوگا تو گویا وہ مال مشغول بالدين ہوا۔ اور وجوب زکوٰۃ کے لئے مال کا دین سے فارغ ہونا ضروری ہے۔ لہذا امام صاحب کے قول کے مطابق بھی اس مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے۔ اسی لئے مبتنی میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اصحاب اموال اسے بری کر دیں۔ تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس لئے کہ ابرار سے قبل وہ قسم مشغول بالدين ہوگی۔ یہ قید بہت مناسب ہے۔ اس کا یاد رکھنا ضروری ہے۔“ ۱۷

فتاویٰ تاتارخانیہ کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ خلط کی صورت میں بھی امام صاحب کے قول کے مطابق صرف اس صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی جب کہ اس کے پاس مال مخلوط کے علاوہ دوسرا طیب حلال مال بقدر نصاب موجود ہو۔ اگر دوسرا نصاب نہ ہو تو چاہے مال مخلوط جس مقدار میں بھی ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی چنانچہ فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے :

”ومن ملك اموالاً غیر طیبۃ ارغصب امراً و خلطها ملکها بالخلط
و یصیر ضامناً وان لم یکن سواھا نصاب فلا زکوٰۃ علیہ فی تلك الاموال
وان بلغت نصاباً لانه مدیون و مال المدیون لا ینعقد سبباً لوجوب
الزکاۃ عندنا، ۱۸

اور در مختار میں ہے :

”وهذا اذا كان له مال غیر ما استهلكه بالخلط منفصل عنه یوفی دینہ
والا فلا زکوٰۃ علیہ“

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ امام صاحب کے قول کے مطابق بھی صرف اس صورت میں مال مخلوط پر وجوب زکوٰۃ ہوگا جب کہ مال حرام کا مالک اسے بری الذمہ کر دے۔ یا یہ شخص اس کے اصل

مالک سے کچھ مال کے بدلے مصالحت کرے تو اس صورت میں چوں کہ اس مال کا خلیفہ زائل ہو جائیگا اس لئے اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

”لکن علمت انه لا تجب زکاتہ الا اذا استبرأ من صاحبہ او صالح منه“

فی نزول خبیثہ : ۱۷

صاحبین فرماتے ہیں کہ مال حرام کو مال حلال کے ساتھ مخلوط کر دینے کی وجہ سے وجوب ضمان نہیں ہوتا ہے۔ اور چوں کہ ضمان ہی کی فرع ملکیت ہے، اس لئے اس مال پر اسے ملکیت بھی حاصل نہیں ہوگی۔ لہذا اس مال پر نہ تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ ہی اس میں وراثت جاری ہوگی۔ کیونکہ وہ مال مشترک ہے، لہذا جتنا اس میں میت کا حصہ تھا صرف اسی میں وراثت جاری ہوگی۔

علامہ ابن نجیم مصری نے مال حرام پر وجوب زکوٰۃ کا حکم ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

”ولذا قالوا ان سلطاناً غصب مالا و خلطه صار ملكاً له حتى وجبت

عليه الزكاة وورث عنه على قول أبي حنيفة لا يخلط درهمه بدرهم غيره

عند الاستحراق اما على قوليهما فلا يضمن فلا يثبت الملك لانه

فرع الضمان فلا يورث عنه لانه مال مشترك فانما يورث حصه الميت

منه وفي الولو الجبة وقوله ارفق بالناس اذ قلما يخلو مال من غصب

هكذا ذكر واوهو مشكل لانه وان كان ملكه عند أبي حنيفة بالخلط فهو

مشغول بالدين والشرط الفراغ فينبغي ان لا تجب الزكاة فيه على قوله

ايضا ولذا اشترط المبتغى بالصعجه ان يبرئ اصحاب الاموال لانه

قبل الابراء مشغول بالدين وهو قيد حسن يجب حفظه“ ۱۷

اور اسی بنیاد پر فقہائے کہا ہے کہ اگر بادشاہ نے مال غصب کر لیا اور اسے اپنے مال کے

ساتھ مخلوط کر لیا تو وہ مال اس کی ملک ہو جائے گا۔ اور حضرت امام ابو حنیفہ کے قول کے

مطابق اس مال پر زکوٰۃ بھی واجب ہوگی۔ اور وراثت بھی جاری ہوگی۔ اس لئے کہ ان

کے نزدیک اپنے درہم کو دوسرے کے درہم کے ساتھ مخلوط کر دینا استہلاک ہے۔ لیکن صاحبین کے قول کی بنیاد پر وہ ضامن نہیں ہوگا۔ اور اس پر اسے ملکیت حاصل نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ ملکیت ضمان کی فرع ہے، لہذا اس مال میں وراثت بھی جاری نہیں ہوگی۔ کیونکہ وہ مال مشترک ہے۔ صرف میت کے حصہ میں وراثت جاری ہوگی۔ ولو الجبرہ میں امام صاحب کے قول کو "ارفق بالناس" قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ بہت کم مال غصب وغیرہ سے پاک ہوتا ہے۔ فقہائے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ لیکن امام صاحب کے قول کے مطابق زکوٰۃ کا وجوب شکل ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ غلط کے ذریعہ ملکیت حاصل ہو جائیگی لیکن وہ مال مشغول بالدين ہے۔ اور وجوب زکوٰۃ کے لئے مال کا دین سے فارغ ہونا ضروری ہے۔ پس مناسب یہ ہے کہ امام صاحب کے قول کے مطابق بھی وجوب زکوٰۃ نہیں ہونا چاہئے اسی بنیاد پر مبتنی میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اصحاب اموال اسے بری کر دیں اس لئے کہ ابراہ سے قبل وہ رقم مشغول بالدين ہوگی۔ یہ قید بہتر ہے۔ اس کا یاد رکھنا ضروری ہے۔

علامہ ابن الہمام نے اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے :

”اور اسی بنیاد پر فقہائے کہا کہ اگر سلطان نے کسی کا مال غصب کر لیا اور اسے اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر لیا تو اس پر اسے ملکیت حاصل ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ اس پر زکوٰۃ بھی واجب ہوگی اور وراثت بھی جاری ہوگی۔ اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہ مسئلہ امام ابو حنیفہ کے قول کے مطابق ہے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک دوسرے کے درہم کو اپنے درہم کے ساتھ مخلوط کر دینا استہلاک ہے۔ لیکن صاحبین کے قول کے مطابق یہ استہلاک نہیں ہے۔ اس لئے وہ اس مال کا ضامن نہیں ہوگا اور اس پر اسے ملکیت حاصل نہیں ہوگی۔ کیونکہ ملکیت ضمان کی فرع ہے۔ اور نہ ہی اس پر اسے مال میں وراثت جاری ہوگی۔ اس لئے کہ وہ مال مشترک ہے۔ پس صرف میت ہی کے حصہ میں وراثت جاری ہوگی۔“ لے

علامہ حنفی نے مالِ مخلوط پر زکوٰۃ کا حکم ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

”اگر سلطان نے مالِ مغضوب کو اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر دیا تو وہ اس کا مالک ہو جائے گا۔ اور اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور وراثت جاری ہوگی۔ اس لئے کہ دوسرے کے مال کو اپنے مال کے ساتھ اس طرح مخلوط کر دینا کہ ان کے درمیان تمیز ممکن نہ ہو امام ابو حنیفہ کے نزدیک استہلاک ہے۔ امام صاحب کا قول ”ارفق بالناس“ ہے اس لئے کہ بہت کم ہی مال ایسا ہوتا ہے جو غصب وغیرہ سے محفوظ ہوتا ہے۔ اور زکوٰۃ کا وجوب اس صورت میں ہوگا جب کہ اس کے پاس مالِ مخلوط کے علاوہ اتنا مال ہو جس سے وہ دین ادا کر سکے۔ ورنہ زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی شائی میں ہے : صاحبین کے قول کے مطابق وجوب ضمان نہیں ہوگا۔ لہذا ملکیت بھی ثابت نہیں ہوگی اس لئے کہ وہ ضمان کی فرع ہے۔ اور نہ اس مال میں وراثت جاری ہوگی۔ کیونکہ وہ مال مشترک ہے۔ صرف میت کے حصہ میں وراثت جاری ہوگی۔“

ان تفصیلات کی روشنی میں مالِ حرام جو مخلوط ہو اس کے بارے میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ :

”اس مال پر حضرت امام ابو حنیفہ کے قول کی بنیاد پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ کیوں کہ مالِ حرام کو مالِ حلال کے ساتھ مخلوط کر دینے کی وجہ سے بوجہ استہلاک اگرچہ اسے اس مال پر ملکیت حاصل ہو جائے گی۔ مگر چونکہ وہ اس مقدار کا ضامن ہوگا۔ اور اس پر واجب ہوگا کہ مالِ حرام کی جتنی مقدار اس نے اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر دیا ہے۔ اسے صاحب مال تک لوٹا دے۔ یا اگر صاحب مال کا علم نہ ہو تو اس کی طرف سے صدقہ کر دے۔“

اس طرح سے وہ رقم مشغول بالدين ہوتی۔ حالانکہ وجوب زکوٰۃ کے لئے مال کا دین سے فارغ ہونا ضروری ہے۔ البتہ اس مال پر وجوب زکوٰۃ کی یہ صورتیں ہیں :

(الف) اس شخص کے پاس مالِ مخلوط کے علاوہ اتنا مال ہے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنے ذمہ واجب دین کو ادا کر دے تو بھی اس کے پاس بقدر نصاب مال رہ جائے تو اس صورت میں اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ درمختار میں ہے :

”وهذا اذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط منفصل عنه يوفى دينه

والا فلا زكوة“ ۱۷

(ب) جن لوگوں سے اس نے حرام طریقے سے حاصل کیا تھا وہ لوگ اپنی اپنی رقم سے اسے بری الذمہ کر دیں، یا وہ شخص صاحب اموال سے کچھ مال دے کر مصالحت کر لے تو اس صورت میں چوں کہ مال حرام کا نثبت دور ہو جائے گا اور وہ شخص پورے طور پر اس مال کا مالک بن جائے گا۔ اس لئے اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ شامی میں ہے :

”الا اذا استبرأ من صاحبه او صالح عنه فيزول خبثه“ ۱۸

۵۔ دیون کی زکوٰۃ

ملک تمام کی شرط کے ذیل میں دیون کی زکوٰۃ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ دین کی زکوٰۃ شرعاً کس پر واجب ہوگی، دائن پر جس کی ملک تو ہے لیکن قبضہ نہیں۔ یا مدیون پر جس کے قبضہ میں وہ رقم ہے، لیکن اس کی ملک میں نہیں یا دین کی زکوٰۃ کسی پر بھی واجب نہیں ہوگی۔

دیون کی زکوٰۃ کے بارے میں امام ابو عبید (م ۲۲۳ھ) نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف کتاب الاموال میں ائمہ سلف کے پانچ اقوال ذکر کئے ہیں :-

۱۔ اگر دین کسی مالدار شخص کے ذمہ ہو تو اپنے دیگر اموال کے ساتھ دین کی بھی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

۲۔ اگر دین کی وصولیابی کی امید نہ ہو، پھر وہ وصول ہو جائے تو قبضہ کے بعد تمام گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔

۳۔ قبضہ کے بعد صرف ایک سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی چاہے اس مال پر قتنا بھی سال گزرا ہو۔

۴۔ دین کی زکوٰۃ صرف قرض لینے والے پر واجب ہوگی، قرض دینے والے پر نہیں۔

۵۔ دین کی زکوٰۃ نہ تو دائن پر واجب ہوگی اور نہ مدیون پر۔ چاہے مدیون ثقہ اور مالدار ہو۔

المکہ مجتہدین میں سے امام مالک نے تیسرے قول کو اختیار کیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک صرف ایک سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ سفیان ثوری اور فقہاء عراق کی رائے ہے کہ اگر دین کے وصول ہونے کی امید ہو تو اس صورت میں گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی۔ اور اگر دین کے وصولیابی کی امید نہ ہو تو اہل عراق کے نزدیک گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔
تابعین میں سے حضرت عکرمہ اور عطاء بن ابی رباح اس بات کے قائل ہیں کہ دین کی زکوٰۃ کسی پر بھی واجب نہیں ہوگی۔ ابن حزم نے حضرت عائشہ کا قول نقل کیا ہے کہ: لیس فی الدین زکاۃ۔ دین میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ ظاہر یہ کاہی مسلک ہے۔

علامہ یوسف القرضاوی نے لکھا ہے کہ مہر فقہاء کے نزدیک دیون کی دو قسم ہے: ۱۔ ایک قرض وہ ہے جس کی وصولیابی متوقع ہو یعنی قرض ایسے شخص پر ہو جو اسے ادا کرنے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور دین کا اقرار بھی کرتا ہو۔ ایسے دین کی زکوٰۃ اپنے موجودہ مال کی زکوٰۃ کے ساتھ ہر سال ادا کی جائے گی۔ ابو عبید نے صحابہ میں سے حضرت عمرؓ، عثمانؓ، جابرؓ، ابن عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

”تابعین میں سے حسن بصری، ابراہیم، جابر بن زید، مجاہد اور میمون بن مہران کا یہی فتویٰ ہے۔“
۲۔ دوسرا قرض وہ ہے جس کی وصولیابی کی توقع نہ ہو یعنی دین ایسے کسی شخص پر ہو جو تنگدست ہو۔ اور اس کے خوشحال ہونے کی امید نہ ہو یا دین ایسے شخص پر ہو جو اس کا انکار کر رہا ہو اور اس کے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہ ہو اس صورت کا حکم مختلف فیہ ہے۔ اس کے بارے میں فقہائے کے دو اقوال ہیں: ۱۔ پہلا قول یہ ہے کہ قبضہ کے بعد تمام گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی۔ حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ کا یہی مذہب ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قبضہ کے بعد صرف ایک سال کی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔ حسن، عمر بن عبدالعزیز کا یہی مسلک ہے۔ امام مالک کے نزدیک دیون کی تمام اقسام کا یہی حکم ہے۔
۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس مال پر نہ تو ایک سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ گذشتہ سالوں کی

گواہی کے لئے گواہوں کو عدالت کے سامنے پیش کرنا اور قاضی سے انصاف کی توقع رکھنا مشکل ہے۔
لیکن اس سلسلہ میں حنفیہ کا اتفاق ہے کہ وہ دین جس سے دیون احکامی ہو اور اس کے
خلاف کوئی ثبوت فراہم نہ ہو تو اس دین پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ آئندہ اگر خلاف توقع وہ دین وصول
بھی ہو جائے تو گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

دیون کی اقسام اور ان کا حکم

امام ابو حنیفہ کے نزدیک دین کی تین قسم ہے :-

۱۔ دین قوی : — وہ دین جو مال تجارت کے بدلے میں واجب ہو، جیسے سامان
تجارت کی قیمت، تجارت کے غلام اور مال تجارت کے غلہ کی قیمت، قرض بھی اسی حکم میں ہے۔ اسے "دین قوی"
سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دین قوی کے بارے میں امام ابو حنیفہ اور صاحبین کے مابین زکوٰۃ کے وجوب کی بابت
کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ امام ابو حنیفہ یہ فرماتے ہیں کہ جب دین کا ایک خمس چالیس درہم وصول ہو جائے گا
تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی۔ اور چالیس میں سے ایک درہم ادا کرنا پڑے گا۔ صاحبین کہتے ہیں کہ جبنا جتنا
دین وصول ہوتا جائے گا اس کی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔

۲۔ دین متوسط : — وہ دین جو کسی مالی عوض کے طور پر دین ہو مگر وہ سامان
تجارت کی قیمت نہ ہو بلکہ ایسے مال کے بدلے میں واجب ہو جس میں شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ جیسے
استعمالی کپڑوں اور رہائشی مکان کی قیمت، خدمت کے غلام کی قیمت۔ ایسے دین کو "دین متوسط" کہا جاتا ہے
دین متوسط کے بارے میں امام ابو حنیفہ سے دو روایت ہے۔ ایک روایت کے مطابق "دین متوسط"
ان کے نزدیک "دین قوی" کے حکم میں ہے۔ اور دوسری روایت کے مطابق "دین ضعیف" کے حکم میں
کتاب الاصل میں امام صاحب کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ قبضہ سے پہلے بھی اس پر زکوٰۃ کا نفس وجوب
ہو جائے گا۔ البتہ ادائیگی زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب کہ بقدر نصاب اس پر قبضہ ہو جائے۔ لکھ

بن نخم نے لکھا ہے :

”صحيح رد ايت کے مطابق امام صاحب کے نزدیک ”دين وسط“ پر اس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی جب کہ بقدر نصاب دين پر قبضہ ہو جائے۔ البتہ قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دينی پڑے گی۔ اور قول ضعیف کے مطابق گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ نہیں دينی پڑے گی۔“

ابن سمانہ نے امام ابو یوسف کے واسطے سے امام ابو حنیفہ سے نقل کیا ہے کہ دين کی صرف دو قسم ہے اور انھوں نے دين وسط ”کو“ دين ضعیف قرار دیا ہے۔ کرنی نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ صحیح قول کے مطابق دين قوی اور دين متوسط میں صرف اتنا فرق ہے کہ دين قوی کے ایک خمس کی وصولیابی پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوتی ہے۔ جب کہ دين متوسط کی صورت میں بقدر نصاب مال پر قبضہ ضروری ہوتا ہے۔ صاحبین کے نزدیک سارے ديون برابر ہیں۔ قبضہ سے پہلے ان کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ البتہ جتنی مقدار پر قبضہ ہوتا جائے گا اس کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی۔“

۳۔ دين ضعیف — وہ دين جو کسی مالی عوض کے بدلے میں واجب نہیں ہوتا ہے۔ جیسے مہر کی رقم، خلع، اور صلح عن القصاص کی رقم۔ اس دين کا حکم یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ وصولیابی کے بعد جب اس رقم پر مکمل ایک سال گزر جائے گا تو اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ بدائع میں ہے :

”ولا زکوٰۃ فيه مالم يقبض ويعول عليه الحول بعد القبض“

خلاصہ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک ديون کی مذکورہ تمام قسموں پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ لیکن ادائیگی قبضہ کے بعد ہوگی۔ دين قوی میں خمس نصاب یعنی کم سے کم چالیس درہم کی وصولیابی کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی اور دين متوسط اور دين ضعیف میں نصاب کی مالیت کے بقدر قبضہ میں آنے کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم ہوگا۔ البتہ دين متوسط میں گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دينی پڑے گی جب کہ دين ضعیف میں حولان حول کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی۔ مالک کے نزدیک ديون کی تین قسمیں ہیں :-

۱۔ دین کی ایک قسم وہ ہے جس پر قبضہ کے بعد مکمل ایک سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوتی ہے وراثت، ہبہ، وقف، صدقہ، عورت کا مہر اور خلع کا عوض، اسی قبیل کے دین سے تعلق رکھتا ہے۔ ان تمام دیون میں قبضہ سے پہلے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ قبضہ کے بعد سے جب ایک سال اس پر گزر جائے گا تو اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۲۔ دوسرے وہ دین ہیں جس میں صرف ایک سال کی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ جیسے دین قرض اور دین تجارت۔ جسے صنفیہ کے نزدیک "دین قوی" سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس طرح کے دین میں مالکیہ کے نزدیک حسب ذیل چار شرطوں کے ساتھ وجوب زکوٰۃ ہوگا۔
۱۔ قرض کی اصل سونا، چاندی ہو۔ یا جمع کئے گئے سامان تجارت کی قیمت ہو مثلاً تجارتی پکڑوں کی قیمت۔

۲۔ اس دین کے ایک حصہ پر دائن کا قبضہ ہو چکا ہو۔ اگر دین کا کچھ بھی حصہ اس کے قبضہ میں نہیں آیا تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

۳۔ قبضہ کی ہوئی ہنسی نقد سونے، چاندی کے قبیل سے ہو۔ اگر اس نے سامان تجارت مثلاً پکڑے یا گیلہوں پر قبضہ کیا تو اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

۴۔ جتنے مال دین پر اس کا قبضہ ہوا ہے وہ کم سے کم بقدر نصاب ہو۔ یا اگر نصاب سے کم ہو مگر اس کے پاس دوسری مالیت ہو جس کے ملانے سے نصاب پورا ہو جاتا ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۳۔ تیسرے دین مدیر ہے: دین مدیر سے اس تاجر کا دین مراد ہے جو موجودہ قیمت کے ساتھ خرید و فروخت کرتا ہے۔ پس اگر دین کی اصل سامان تجارت ہو تو وہ ہر سال دین کی زکوٰۃ ادا کریگا۔ شوائف کے نزدیک اگر دین درہم و دینار یا سامان تجارت کی قیمت کے قبیل سے ہو تو جب دائن اپنے دین پر قبضہ کر لے گا یا اپنے دین کے حاصل کرنے پر اسے قدرت حاصل ہو جائے گی تو گزشتہ تمام سالوں کی اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ اگر دین موسیقی اور مطبوعہ کے قبیل سے ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب

نہیں ہوگی۔ یہ

دین کے بارے میں حنا بلہ کی رائے یہ ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی چاہے دین معجل ہو یا مؤجل اور چاہے مقروض دین کا اقرار کرنے والا ہو یا اس سے انکاری ہو۔ اور چاہے وہ تنگ دست ہو یا خوشحال یا مال منقول کرنے والا۔ البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی قبضہ کے بعد واجب ہوگی۔ اور گزشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی۔

۶۔ پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ

”ملک تمام ہی کے ذیل میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں سرکاری کمپنیوں مختلف پرائیویٹ کمپنیز اور ادارے میں جو لوگ ملازمت کرتے ہیں۔ ان کی ماہانہ تنخواہ میں سے ایک متعین حصہ وضع کر کے ان کے محفوظ کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے اور کچھ فیصد سرکاری کمپنی اپنی طرف سے اس میں اضافہ کرتی ہے۔ اور ریٹائرمنٹ کے وقت وہ پوری رقم مع بونس کے ملازم کو دے دی جاتی ہے۔ دوران ملازمت بھی بعض خاص قواعد کی پابندی کرتے ہوئے ملازم کو اپنے اس محفوظ فنڈ سے کچھ حصہ نکالنے کا اختیار ہوتا ہے۔ یہ رقم عام اصطلاح میں پراویڈنٹ فنڈ (P.F) کہلاتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر ہوگی تو کب؟ اور اگر زکوٰۃ وصولیابی کے بعد واجب ہوگی تو گزشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی؟ یا قبضہ کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ پراویڈنٹ فنڈ (P.F) پر زکوٰۃ کا حکم لگانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رقم کی حیثیت کی تعیین کر لی جائے کہ دین کی کس قسم میں اس کا شمار ہے۔ پھر اس پر حکم لگانا آسان ہوگا۔ حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک دین کی تین قسم ہے:

دین قوی: — وہ ہے جو سامان تجارت یا سونے چاندی کے بدلے کسی کے ذمہ واجب ہو۔ (اس کی تفصیل دیون کی بحث کے ذیل میں گزری چکی ہے۔

دین متوسط: — جو مالی معاوضہ کے طور پر ذمہ میں واجب ہو مگر وہ ایسے سامان کی قیمت ہو جس پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ جیسے استعمالی کپڑے اور رہائشی مکان کی قیمت۔

دین ضعیف : — جو مالی معاوضہ کے بغیر واجب ہو۔ جیسے عورت کا دین مہر، خلع اور صلح کی رقم۔
ظاہر ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کو ”دین قوی“ قرار نہیں دیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ کسی سامان تجارت کا معاوضہ نہیں ہے۔ بلکہ لازم کی خدمت کا معاوضہ ہے۔ اور خدمت مال تجارت ہے یا نہیں؟ اس میں صنفیہ کے نزدیک تفصیل ہے کہ:

”غلام اور مکان اگر تجارت کے لئے نہ ہو تو اس کی خدمت واجرت کو مال تجارت قرار نہیں دیا گیا ہے۔ البتہ جو غلام اور مکان تجارت کے لئے ہو اس کی خدمت واجرت کو مال تجارت قرار دیا گیا ہے۔ توجب غلام کی خدمت کو علی الاطلاق مال تجارت قرار نہیں دیا گیا ہے بلکہ صرف تجارت کے غلام کی خدمت کو مال تجارت قرار دیا گیا تو آزاد شخص کی خدمت کو بدرجہ اولیٰ مال تجارت قرار نہیں دیا جاسکتا ہے“

اب صرف دو احتمال باقی رہ جاتا ہے :-

۱۔ اگر خدمت کو مال تجارت قرار دیا جائے تو وہ دین متوسط میں داخل ہوگا۔

۲۔ اور اگر اسے مال ہی قرار نہ دیا جائے تو وہ دین ضعیف میں داخل ہوگا۔

خدمت واجرت کے بارے امام ابو حنیفہ سے دو قول منقول ہے :-

۱۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ دین متوسط کے حکم میں ہے اور قبضہ سے پہلے بھی اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ مسبوط جامع اور مالی میں امام صاحب سے یہی قول منقول ہے۔ علامہ شمس الدین سرخسی نے اس قول کو ”اصح“ قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ منفعت عقد کے ذریعہ مالیت کا حکم لے لیتی ہے۔ اس قول کے مطابق اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہونے کے بارے میں امام صاحب سے دو قول منقول ہے۔

۱۔ ایک قول یہ ہے کہ جب تک دو سو درہم (بقدر نصاب) پر قبضہ نہ ہو جائے زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں ہوگی۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ چالیس درہم پر قبضہ کرنے کے بعد اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ خدمت واجرت ”دین ضعیف“ کے حکم میں ہے اور وہ مہر کی طرح ہے۔

امام ابو یوسف نے اسے امام صاحب سے نقل کیا ہے۔ اس قول کے مطابق اس کی وصولیابی کے بعد جب حوالان حول ہو جائیگا تو اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔^۱

اجرت و خدمت کے بارے میں تیسری روایت یہ ہے کہ اجرت و خدمت علی الاطلاق نہ تو مال ہے اور نہ غیر مال۔ بلکہ اگر عبد تجارت کی خدمت یا مکان تجارت کی اجرت ہے تو وہ مال ہے، ورنہ مال نہیں ہے۔ صاحب مسبوط نے اس روایت کو "اصح" قرار دیا ہے۔^۲

مگر یہ سب مباحث اور روایات کا اختلاف غلام کی خدمت کے بارے میں ہے جو من وجہ مال ہے۔ آزاد کی خدمت کے مال ہونے کی صراحت کسی فقہیہ نے نہیں کی ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں پراویڈنٹ کی رقم "دین قوی" میں داخل نہیں ہو سکتی اور اسے "دین متوسط" میں بھی داخل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک آزاد شخص کی خدمت کو مال قرار دینے کی تصریح نہ مل جائے۔ اور اگر بالفرض اسے "دین متوسط" میں داخل بھی کر دیا جائے تو صحیح قول کے مطابق اس کا حکم بھی "دین ضعیف" کی طرح یہی ہے کہ اس پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ لہذا پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ البتہ جب وہ رقم قبضہ میں آجائے گی تو سال مکمل ہونے کے بعد اس کی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔ گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہوگی۔ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے (ص ۶۰۶) پر زکوٰۃ کا عدم وجوب ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

"اس روایت سے معلوم ہوا کہ اس جمع شدہ روپے میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ البتہ وصول کے

بعد سے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس تفصیل سے کہ اگر اس کے پاس پہلے سے کوئی نصاب

نہیں تب تو بعد حوالان حول کے اور اگر کوئی نصاب ہو تو اس نصاب کی زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ

مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان نے لکھا ہے :

"روایات فقہیہ کو دیکھنے اور غور کرنے سے احقر کو یہ بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس فنڈ کی رقم پر

ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں۔" لکھ

۲۔ دوسری شرط نما

نما کی تعریف اور اس کی حقیقت

وجوب زکوٰۃ کی دوسری شرط مال کا نامی ہونا ہے۔ نماز بالمدغنت میں زیادتی اور بڑھوتری کے معنی میں آتا ہے۔ جدید اصطلاح میں نمایا نمونہ کے معنی ہیں وہ مال جو صاحب مال کو فائدہ پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور اصطلاح شریعت میں نما کی دو قسمیں ہیں :-

نما حقیقی اور نما تقدیری۔ حقیقی کا اطلاق مویشیوں کی نسل بڑھنے اور کاروبار میں اضافہ ہونے پر ہوتا ہے۔ اور تقدیری کا اطلاق ایسے مال پر ہوتا ہے جس کو بڑھایا جانا ممکن ہو، یعنی اضافہ پذیری کی صلاحیت رکھنے والا مال، صاحب مال یا اس کے نائب کے قبضہ میں ہو۔ ۱۔

لہذا وہ مال جس میں صاحب مال اپنے ذریعہ یا اپنے نائب کے ذریعہ اضافہ اور بڑھانے پر قدرت نہ رکھتا ہو، اس کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہوگی۔ اگرچہ اس مال پر اسے ملکیت حاصل ہو۔ جیسے مال ضائع اور اسی وصف نما کے فوت ہونے کی وجہ سے مال مفقود، عبد آبق، دریا میں گرے ہوئے مال، بھسکریں دفن کئے ہوئے مال پر زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی گئی ہے۔ ۲۔

حیوانات میں نمو اور افزائش نسل کے ذریعہ ہوتی ہے اور حیوانات کے علاوہ دیگر اموال میں تجارت کے ذریعہ، سونے اور چاندی میں غلطی طور پر نمایا جاتا ہے۔ اس لئے ہر حال میں اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ شریعت نے وجوب زکوٰۃ کے لئے حقیقت نما کو ضروری قرار نہیں دیا ہے۔ کیونکہ نما ایک امر خفی ہے۔ اور اس میں لوگوں کے طریقے اور ان کی عادتیں باہم مختلف ہوتی ہیں۔ اس لئے شریعت نے حیوانات کے اندر "اسامہ" کو حصول نسل کے قائم مقام قرار دیا ہے۔ اور حیوانات، اور سونے چاندی کے علاوہ دیگر اموال میں تجارت کی نیت سے اسے اپنے پاس مکمل ایک سال روک کر رکھنے کو حصول نما کے قائم مقام قرار دیا ہے۔ ۳۔

۱۔ البحر الرائق ج ۲ صفحہ ۲۷۷، شامی ج ۲ صفحہ ۱۰، بدائع ج ۲ صفحہ ۱۲۹ فقہ الزکاۃ ج ۱ صفحہ ۱۲۹

۲۔ بدائع ج ۲ صفحہ ۱۰، الفتاویٰ النظار خانیہ ج ۲ صفحہ ۱۲۹

نمو کے شرط ہونے کی حکمت

محقق ابن الہمام نے ”نمو“ کے شرط لگانے کی حکمت و مصلحت ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :
 ”اگرچہ زکوٰۃ کا مقصد ابتلاء ہے تاہم اس سے مقصود فقرائے کے ساتھ مواساة اور ہمدردی ہے اس
 طور سے کہ وہ خود فقیر نہ بن جاتے۔ اس کی صورت یہ تجویز کی گئی کہ وہ اپنے کثیر مال میں سے تھوڑا سا
 مال ان پر خرچ کرے۔ لہذا اگر اموال غیر نامیہ میں زکوٰۃ واجب کی جاتی تو چند سال گزر جانے کے
 بعد اس کے برعکس صورت پیدا ہو سکتی ہے“۔

وہ اموال جن کی نشو و نما رک گئی ہو ان پر زکوٰۃ

نمو کے ذیل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اموال جن کی نشو و نما اور افزائش رک گئی ہو۔ ان
 زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر اس پر زکوٰۃ واجب کی جاتی ہے تو رفتہ رفتہ وہ مال ہی ختم ہو جائیگا۔ اس کا جواب
 یہ ہے کہ مال کے نمو میں رکاوٹ کی دو صورتیں ہیں :

۱۔ ایک وہ رکاوٹ ہے جو نفس مال کی طرف سے ہو۔

۲۔ دوسری وہ ہے جو صاحب مال کی طرف سے ہو۔

جو رکاوٹ مال کی طرف سے ہو مثلاً مال غصب کر لیا گیا ہو اور مال مفسوب کے خلاف کوئی ثبوت
 فراہم نہ ہو یا ایسا قرض جس کے واپس ملنے کی کوئی امید نہ ہو یا مال دریا میں گر گیا ہو یا مال صحرائیں دفن کیا گیا
 ہو۔ دفن کی جگہ بھول گیا ہو تو ان صورتوں میں اصحاب اموال شرعاً معذور قرار پائیں گے اور قبضہ سے پہلے
 ان اموال کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

رہی وہ رکاوٹ جو خود صاحب مال کی طرف سے ہو تو عدم افزائش کے معاملے میں شریعت نے
 اس عذر کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔ اور رکاوٹ کے اسباب کی تفصیلات میں گئے بغیر اس پر زکوٰۃ
 واجب قرار دی گئی ہے۔ کیوں کہ ایک مسلمان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے مال کو نفع بخش

بنانے کی کوشش کرے اور ہر جائز ذریعہ سے اس میں اضافہ کی کوشش کرے۔

۳۔ تیسری شرط۔ حاجت اصلیت سے فارغ ہونا

حاجت اصلیت کی تعریف اور اس کا دائرہ

وجوب زکوٰۃ کی تیسری شرط مال کا "حاجت اصلیت" سے فارغ ہونا ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس بقدر نصاب مال ہے اور اسے اس مال پر ملک تمام بھی حاصل ہے اور وہ مال نامی بھی ہے مگر وہ مال اس کی حاجت اصلیت میں مشغول ہے، تو شرعاً اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ مال کے حاجت اصلیت سے فارغ ہونے کو وجوب زکوٰۃ کی شرط اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ اس کے بغیر غنا (مالداری) اور نعمت کا تحقق ہی نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ جو شخص ضروریات اصلیت کا محتاج ہوتا ہے اسے عرفاً مالدار ہی نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اور نہ وہ شخص برضا و رغبت زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے۔ علامہ کا سانی نے اس کے شرط ہونے کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"مال کا حاجت اصلیت سے فارغ ہونا اس لئے ضروری ہے کہ غنا درحقیقت اسی صورت میں پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ جو شخص ضروریات اصلیت کا محتاج ہو گا وہ غنی نہیں کہا جاسکتا۔ اور نہ اس صورت میں تنعم کا مفہوم پایا جاتا ہے جس کے شکر کے طور پر زکوٰۃ واجب کی گئی ہے۔ اور نہ ہی اس صورت میں برضا و رغبت زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے۔ حالاں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش دلی اور برضا و رغبت اپنے اموال کی زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیا ہے"۔

فقہاء کی اصطلاح میں حقیقتہً حاجت اصلیت میں وہ چیزیں داخل ہیں جن کا انسان اپنی بقا، تحفظ کے لئے محتاج ہو، مثلاً اشیاء خورد و نوش، ہر موسم کے لحاظ سے لباس، رہائشی مکان، فرنیچر، اہل علم کے لئے علمی و فنی کتابیں، اہل حرفت کے لئے آلات حرفت، اور وہ ساری چیزیں حاجت اصلیت کے دائرہ میں آتی ہیں جنہیں عرفاً ضروریات زندگی سمجھا جاتا ہے۔ علامہ ابن نجیم اور ابن عابدین شامی نے ابن الملک کے حوالہ سے حاجت اصلیت کی یہ تعریف کی ہے:

”بعايد فاع الهلاك عن الانسان تحقيقاً كالنفقة ودور السكنى وآلات الحرب
والثياب المحتاج لدفع الحر والبرد أو تقديراً كالدين فان المعدون محتاج
الى قضائهم بما في يده من النصاب دفعاً عن نفسه الحبس الذي هو كالهلاك
وآلات العرفة واثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لاهلها فان
الجهل عندهم كالهلاك“ ۱

”حاجت اصلیه وہ چیزیں جو انسان سے ہلاکت کو دور کر دیں۔ تحقیقاً جیسے نفقہ، رہائشی مکانات،
آلات حرب، گرمی اور سردی سے تحفظ دینے والے کپڑے۔ یا تقدیراً جیسے قرض کیوں کہ قرضدار
ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اپنے کو قید سے بچانے کے لئے جو ہلاکت کے مترادف ہے نصاب کے
مال میں سے قرض ادا کرے۔ اسی طرح آلات حرفت، گھریلو سامان، سواری کے جانور اور اہل
علم کے لئے علمی و فنی کتابیں اس لئے کہ ان کے نزدیک جہالت بھی ہلاکت ہی کے مثل ہے۔“

حاجت اصلیه کا مفہوم، زمان و مکان کے تغیر سے بدلتا رہے گا

حاجت اصلیه کا تعلق دراصل انسان کی شخصی اور انفرادی ضروریات سے ہے جس میں
زمان و مکان، عرف و تعامل اور ماحول کے لحاظ سے تبدیلی عین فطرت ہے۔ حالات و زمانے اور مکان
و ماحول کے تغیر سے انسان کی بنیادی حاجتیں بھی بدلتی رہتی ہیں اس لئے حاجت اصلیه اور اس کے
حدود کی تعیین کرنا مشکل ہے۔ اسے مبتلی بہ کے حالات پر چھوڑ دینا چاہئے۔

حاجت اصلیه کی تعریف سے بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا دائرہ بہت ہی مختصر، محدود
اور تنگ ہے۔ اور اس کے اندر صرف وہی چیزیں داخل ہیں، جو انسان کو ہلاکت سے یقینی طور پر بچاتی
ہیں۔ مگر حاجت اصلیه کے ذیل میں جن چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان پر نظر ڈالنے سے محسوس ہوتا ہے کہ
حاجت اصلیه کا دائرہ کافی حد تک وسیع اور تمام ہی ضروریات زندگی کو شامل ہے۔ فقہاء کرام نے
جس طرح ہلاکت جسمانی کا لحاظ کر کے اس سے تحفظ دینے والی اشیاء کو اس کے دائرہ میں شمار کیا ہے۔

اسی طرح انھوں نے ہلاکت معنوی اور روحانی کا بھی اعتبار کیا ہے۔ اور اس سے بچانے والی چیزوں کو حاجتِ اصلیہ کا عنوان دیا ہے چنانچہ اہل علم کے لئے اس کے موضوع سے متعلق علمی و فنی کتابوں کو حاجتِ اصلیہ کا درجہ دیتے ہوئے اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ جہالت ان کے لئے ہلاکت و تباہی کے درجہ میں ہے۔ "فان الجمع عندہم کالحدیث" ۱

علامہ کاسانی نے حاجتِ اصلیہ کی تعریف و توضح کرتے ہوئے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اس میں ہر وہ چیز داخل ہے جس کی انسان کو اپنی بقا و تحفظ کے لئے ضرورت پڑتی ہے :

"لأنه من ضرورات حاجة البقاء وقيام البدن" ۲

غور کیا جائے فقہان نے حاجتِ اصلیہ کے ذیل میں رہائشی مکانات، سردی اور گرمی سے تحفظ دینے والے لباس پیشہ و رانہ آلات، اور آلاتِ حرب و غیرہ کو شمار کیا ہے۔ جن کا تعلق شخصی ضروریات و حاجات سے ہے جن میں زمان و مکان اور حالات کے تغیر سے تبدیلی عین ممکن ہے۔ اس لئے حاجتِ اصلیہ کے بارے میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ حاجتِ اصلیہ اور اس کے حدود کی تعیین نہیں کی جاسکتی ہے۔ بلکہ حالات و زمانہ اور عرف و ماحول کی تبدیلی سے اس میں تبدیلی ہوتی رہے گی۔ لباس و پوشاک کا معیار زمانہ اور مسلک و تمدن کے لحاظ سے بدلے گا، سواری میں فرق آئے گا، کھانے پینے کی اشیاء میں تبدیلی ہوگی، رہائشی مکانات اور گھر ملو سامان میں فرق ہوگا اور یہ چیزیں حاجتِ اصلیہ کے زمرہ میں آئیں گی۔ البتہ اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا کہ حضراتِ فقہاء کرام نے حاجت اور تحسین و زینت کے درمیان جو فرق کیا ہے اسے ملحوظ رکھا جائے۔ اور جو چیزیں تحسین و زینت کے دائرہ میں آتی ہیں انہیں حاجت کے دائرہ میں نہیں رکھا جائے۔

واضح رہے کہ حاجتِ اصلیہ سے مراد مکلف بالزکوٰۃ کی، اس کے اہل و عیال اور ان افراد کی حاجتِ اصلیہ ہے جن کا نفقہ شرعاً اس پر واجب ہوتا ہے جیسے بیوی بچے۔

"والمعتبر هنا الحاجات الأصلية للمكلف بالزكاة ومن يعوله من

الزوجة والأولاد" ۳

۴۔ چوتھی شرط — دین سے محفوظ ہونا

وجوب زکوٰۃ کی چوتھی شرط مال کا دین سے محفوظ ہونا ہے۔ اگر کسی کے پاس بقدر نصاب مال ہو مگر وہ مقروض ہو اور قرض کی ادائیگی کے بعد صاحب نصاب نہ رہتا ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ مثلاً ایک شخص کے پاس پچاس ہزار کی مالیت ہے مگر وہ چالیس ہزار کا مقروض ہے تو اس شخص پر صرف دس ہزار جو فارغ عن الدین ہے۔ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے

دین کی بحث کے ذیل میں یہ چند سوالات پیدا ہوتے ہیں :-

۱۔ کن اموال میں دیون مانع زکوٰۃ ہیں۔

۲۔ کس قسم کے دیون مانع زکوٰۃ ہیں۔

۳۔ دیون کی اقسام

۴۔ طویل الابل ترقیاتی قرضے وجوب زکوٰۃ میں مانع ہیں یا نہیں ؟

اب ہم ان پر ترتیب وار گفتگو کرتے ہیں۔

۱۔ کن اموال میں دیون مانع زکوٰۃ ہیں

مہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ دین اموال باطنہ (سونا، چاندی اور سامان تجارت) میں مانع زکوٰۃ ہے یعنی دین کی مقدار مال منہا کرنے کے بعد بقیہ مال میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ عطاء، سلیمان بن یسار، حسن، نخعی، لیث، مالک، سفیان ثوری، اوزاعی، احمد، اسحاق، ابو ثور، امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کی یہی رائے ہے۔ امام مالک کے اساذر بیئۃ الراۃ احمد بن سلمان اور امام شافعی کا قول جدید اس کے خلاف ہے۔ اموال ظاہرہ، حیوانات اور کھیتوں کے بارے میں بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اس میں دین مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔ امام مالک، اوزاعی، شافعی اور امام احمد کی ایک روایت اسی کے مطابق ہے۔ لے

ابو حنیفہ کی رائے یہ ہے کہ سوائے کھیتی اور بھیل کے تمام ہی اموال میں دین مانع زکوٰۃ ہے۔

۲-۳- کس قسم کے دیون مانع زکوٰۃ ہیں

دیون کی قسمیں: حنفیہ کے نزدیک دیون کی تین قسمیں۔

۱۔ وہ دیون جن کا تعلق خالص بندوں سے ہو۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں:

(الف) بندوں کی طرف سے اس کا کوئی مطالبہ کرنے والا ہو۔ جیسے قرض اور سامان تجارت کی قیمت..... اجرت وغیرہ۔

(ب) بندوں کی طرف سے اس کا کوئی مطالبہ کرنے والا نہ ہو۔ جیسے وہ مال حرام جس کے مالک کا پتہ نہ ہو۔

۲۔ وہ دیون جن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہو، ان کی بھی دو صورتیں ہیں:

(الف) بندوں کی طرف سے اس کا کوئی مطالبہ کرنے والا ہو۔ جیسے زکوٰۃ، عشر اور خراج۔ گو یہ چیزیں حق اللہ کے قبیل سے ہیں، مگر بندوں کی طرف سے اس کا مطالبہ ہوتا ہے۔ اموال ظاہرہ، مولیٰ شئی اور زرعی پیداوار میں امام وقت کی طرف سے اس کا مطالبہ ہوتا ہے اور اموال باطنہ، سونا چاندی اور سامان تجارت میں بھی امام یا اس کے نائب کی طرف سے مطالبہ ہوتا ہے۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ بندوں کی طرف سے اس کا کوئی مطالبہ کرنے والا نہ ہو، جیسے دیون، نذور و کفارات، ان دیون میں سے دین عبد جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی موجود ہو وہ وجوب زکوٰۃ کے باب میں مانع ہے اور صرف اس صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی جب کہ دین کی مقدار مالیت نکالنے کے بعد باقی ماندہ مالیت بقدر نصاب ہو جائے۔

دین عبد کی وہ قسم جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے نہ ہوتا ہو، جیسے مال حرام، صحیح قول کے مطابق وہ بھی وجوب زکوٰۃ میں مانع ہوگا۔

وہ دین جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے۔ اس میں صرف وہ دین وجوب زکوٰۃ اور وجوب

صدقۃ الفطر میں مانع ہوگا جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہوتا ہو۔ مگر یہ دین بھی عشر خراج کے وجوب میں مانع نہیں ہوگا۔ بحر میں ہے :

”لان الدين لا يمنع وجوب العشر والخراج ويمنع صدقة الفطر“ ۱

باقی وہ سارے دیون جن کا مطالبہ بندوں کی طرف سے نہیں ہوتا ہے جیسے دیون نذور کفارات تو وہ مانع نہیں ہوں گے۔ علامہ کاسانی نے لکھا ہے :

”وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط مال کا دین سے فارغ ہونا ہے۔ اور دین سے مراد وہ دین ہے جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہوتا ہو۔ اگر کسی کے ذمہ ایسا دین ہو تو وہ بقدر دین مانع زکوٰۃ ہوگا۔ چاہے وہ دین معجل ہو یا مؤجل۔ امام شافعی کے نزدیک دین چاہے جس قسم کا ہو وجوب زکوٰۃ میں مانع نہیں ہوگا۔ کاسانی نے دین کے مانع ہونے کی دلیل کے طور پر حضرت عثمان کا یہ قول پیش کیا ہے کہ انھوں نے رمضان المبارک میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا :

”لوگوں! تمہارے زکوٰۃ دینے کا مہینہ سائیکلنگ ہو گیا ہے۔ پس جس شخص کے پاس مال ہو اور مقرض ہو تو وہ مقدار دین کو مہیا کرنے کے بعد اپنے باقی مال کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔“

بحر الرائق میں ہے :

”مراد وہ دین ہے جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہوتا ہو۔ لہذا نذور و کفارہ کا دین وجوب زکوٰۃ میں مانع نہیں ہوگا۔“ ۲

عورت کا مہر مانع وجوب زکوٰۃ ہے یا نہیں

یہ سوال کہ عورت کا دین مہر وجوب زکوٰۃ میں مانع ہوگا یا نہیں؟ یعنی جس طرح دوسرے دیون مانع وجوب ہیں مہر کی رقم بھی مانع ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہائے کبار تین اقوال ملتے ہیں :

۱۔ ایک قول یہ ہے کہ مطلقاً عورت کا مہر وجوب زکوٰۃ میں مانع ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مہر معجل مانع ہے، مؤجل مانع نہیں ہے۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اگر مہر کی ادائیگی کا فوری ارادہ ہو تو مانع ہے اور اگر ادائیگی کا ارادہ نہ ہو تو مانع نہیں ہے۔ علامہ کا سانی نے قہستانی کے حوالے سے دوسرے قول کو راجح قرار دیا ہے۔

”زاد القہستانی من الجواهر والصحيح انه غير مانع“ ۱

بحر الرائق میں ہے :

”ولو صدق نية الموعود الى الطلاق أو الموت وقيل المهر الموعود لا يمنع

لانه غير مطالب به عادة بخلاف المعجل وقيل ان كان الزوج على عزم الاداء يمنع

والأفلا لانه لا يعد ديناً“ ۲

مولانا اشرف علی تھانوی نے تیسرے قول کو راجح قرار دیا ہے۔ ۳

پس حاصل یہ ہے کہ اگر بیوی کا مہر فوری طور پر ادا کرنے کا ارادہ ہو تو اس صورت میں عورت کا مہر جو زکوٰۃ میں مانع ہوگا اس کی ادائیگی کے بعد اگر مال بقدر نصاب رہ جائے تو اس پر وجوب زکوٰۃ ہوگا۔ اور اگر فوری طور پر ادا کرنے کا ارادہ نہ ہو تو پھر مہر مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہوگا اور اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

طویل الاجل ترقیاتی قرضے وجوب زکوٰۃ میں مانع ہیں یا نہیں؟

دیون کی بحث کے ذیل میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں زراعتی قرضہ تعمیر مکان کے لئے قرض اور اس قسم کے مختلف ترقیاتی قرضے سرکار اپنے شہریوں کو دیتی ہے جن کی ادائیگی کے لئے ۵ سال سے لے کر ۲۰ سال کی طویل مدت مقرر کی جاتی ہے۔ اس مدت کے دوران قسطوار قرض کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ اس قرض کی مقدار بھی عموماً بہت بڑی ہوتی ہے۔ مثلاً زید نے اپنے کسی تجارتی کاروبار کے لئے ۵ کروڑ روپے قرض لئے جسے پچاس قسطوں میں ادا کرنا ہے یعنی سالانہ دس لاکھ روپے ادا کرنا ہے۔ یا کسی شخص نے ٹریکٹر کی خریداری کے لئے ایک لاکھ روپے قرض لیا جسے دس سال میں دس ہزار سالانہ کے لحاظ سے ادا کرنا ہے۔ ان صورتوں میں وجوب زکوٰۃ کے لئے اموال زکوٰۃ میں پورے قرض کو منہا کیا جائے گا یا سالانہ واجب الادا قسط وضع کر کے باقی اموال پر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے گی؟

اس سلسلہ میں اگرچہ عام طور پر علماء یہی تحریر فرماتے ہیں کہ دین مؤجل ہو یا مؤجل۔ دونوں ہی وجوب زکوٰۃ میں مانع ہوگا۔ علامہ کاسانی نے لکھا ہے:

”فانه يمتنع وجوب الزكاة بقدره حالاً كان او مؤجلاً“

تاہم بعض مشائخ کی رائے یہ ہے کہ دین مؤجل وجوب زکوٰۃ میں مانع نہیں ہوگا۔ خود کاسانی نے بعض مشائخ سے یہ نقل کیا ہے:

”وقال بعض مشائخنا ان المؤجل لا يمتنع لانه غير مطالب به عادة“ ۱

شامی نے شرح الطحاوی کے حوالہ سے امام ابو حنیفہ سے نقل کیا ہے کہ امام صاحب ایسے دین کو مانع زکوٰۃ قرار نہیں دیتے تھے۔ شامی ہی نے تہستانی کے حوالہ سے یہ بات نقل کی ہے کہ صحیح یہ ہے کہ ایسا دین وجوب زکوٰۃ میں مانع نہیں ہے۔ ۲

فتاویٰ تاتارخانیہ میں مجدالائمہ السرخی کے حوالہ سے ان کے بعض مشائخ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ ان حضرات۔ نزدیک دین مؤجل وجوب زکوٰۃ میں مانع نہیں ہے۔

”ذكر مجد الائمة السرخي عن مشائخه انه لا يمتنع“ ۳

ان تفصیلات کی روشنی میں راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ اس قسم کے طویل لابل ترقیبی قرضوں میں صرف سالانہ واجب الادا قسط وضع کر کے باقی اموال پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

کمپنیوں کی مجموعی مالیت پر زکوٰۃ کا حکم

زکوٰۃ کے ذیل میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کسی بھی کمپنی میں متعقد شرکاء اور حصہ دار ہوتے ہیں جو اپنے اپنے حصہ کے بقدر مالیت کے مالک ہوتے ہیں بعض صورتیں ایسی ممکن ہیں کہ کمپنی کا مجموعی اثاثہ اور مالیت نصاب زکوٰۃ سے زائد ہو مگر شرکاء کے حصص کو علیحدہ کرنے کی صورت میں کوئی بھی صاحب نصاب نہ ہوتا ہو یا بعض صاحب نصاب ہو تو اس صورت میں زکوٰۃ کا وجوب کمپنی کی مجموعی مالیت کے لحاظ سے ہوگا یا ہر فرد کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا۔ اس سلسلہ میں حکم شرعی یہ ہے کہ کمپنیز کی مجموعی مالیت اور اس کے

اثاثے میں وجوب زکوٰۃ نہیں ہوگا بلکہ کمپنی کے شرکار کی انفرادی حالت کا اعتبار ہوگا۔ اور جس شریک کا حصہ بقدر نصاب ہوگا یا اس کے پاس دوسری مالیت ہوگی جس کے ملانے سے وہ صاحب نصاب ہو جاتا ہو تو صرف اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی مثلاً کمپنی کی مجموعی مالیت ایک کروڑ ہے جو بلاشبہ نصاب شرعی سے کافی زائد مالیت ہے۔ کمپنی کے شرکار کی تعداد ایک لاکھ ہے تو وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت ایک کروڑ کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ ہر شرکاء کی انفرادی حیثیت کو دیکھا جائے گا اور جس شریک کا حصہ بقدر نصاب ہوگا یا اس کے پاس دوسری مالیت پہلے سے موجود ہو جس کو ملانے سے وہ صاحب نصاب ہو جاتا ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور جس کے پاس بقدر نصاب مال نہیں ہوگا اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

حضرت امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اگر سائتمہ جانور دو یا دو سے زائد افراد کے مابین مشترک ہو یا سامان تجارت تو وجوب زکوٰۃ میں شرکار کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ ہر شرکاء کی انفرادی حالت معتبر ہوگی امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر ان کے درمیان معاملہ شرکت درست اور صحیح ہوگا تو پھر زکوٰۃ کا وجوب "مجموعی مالیت" پر ہوگا۔ فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے :

"قال اصحابنا واذا كان النصاب بين خلیطین لا تجب فيه الزكاة
وقال الشافعی تجب عند وجود شرائط الخلط ولو كانت السوائم بين
اثنتين فبلغ نصيب واحد نصاباً دون الآخر تجب عليه دون صاحبه
ولو لم يبلغ نصيب كل واحد نصاباً لا يجب شيء وفي شرح الطحاوی فان
كان نصيب كل واحد منهما على الافراد يبلغ نصاباً كاملاً تجب الزكاة
والأفلا" ۱۰

درمختار میں ہے :

"ولا تجب الزكاة عندنا في نصاب مشترك من سائمة ومال تجارۃ
وان صنعت الخلطة فيه" ۱۱

ہمیرے اور جواہرات کی زکوٰۃ : جن اموال میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وہ شرعاً منصوص ہیں۔ اموال زکوٰۃ

قیاسی نہیں ہیں۔ لہذا قیاس و ظن کے ذریعہ کسی ایسی چیز پر زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی جاسکتی جس پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ معدنیات میں سے صرف سونے اور چاندی پر زکوٰۃ واجب کی گئی ہے۔ باقی معدنیات چاہے جتنی بھی قیمتی اور مالیت رکھنے والی ہوں ان پر زکوٰۃ واجب نہیں کی گئی ہے۔ لہذا ہیرے، جواہرات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی چاہے جتنی بھی مالیت کے ہیرے، جواہرات اپنے پاس محفوظ کئے جائیں یا زیورات کی شکل میں محفوظ کئے جائیں ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ البتہ اگر کوئی شخص ہیرے اور جواہرات کی تجارت شروع کر دے تو پھر ان کا حکم سامان تجارت کا ہوگا اور سامان تجارت کی حیثیت سے ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ درمختار میں ہے :

”لا زکوٰۃ فی اللؤلؤ والجواہر وان سادت الفآ اتفاقاً الا ان تكون للتجارة

والاصل ان ما عدا العجریین والسوائیم انما یزکی بنية التجارة بشرط

عدم المانع“ ۱

فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے :

”ولیس فیما یشتري للتجمل والزینة من خادم ومقاع ولؤلؤ

وجوہر وفلوس للمنفعة شی غزانة الفقہ، ولیس فی البیاقیت وفی

المضمرات وان کان حلیاً الا ان تكون للتجارة“ ۲

اموال تجارت میں کس نرخ کا اعتبار ہوگا

مال تجارت کی زکوٰۃ میں قوت خرید کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ سامان تجارت کی موجودہ قیمت و مالیت معتبر ہوگی اور اسی لحاظ سے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ اس سلسلہ میں علماء احناف کے درمیان اختلاف ہے کہ کس دن کی قیمت معتبر ہوگی۔ حضرت امام ابو حنیفہ کی رائے یہ ہے کہ جس دن اس مال پر سال گزرا اور اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوئی اس دن اس سامان کی جو قیمت و مالیت رہی ہوگی اسی کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک جس دن زکوٰۃ ادا کی جائیگی

اس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ علامہ کاسانی نے لکھا ہے :

”ولو اراد ان يودي القيمة جاز عندنا خلافاً للشافعي لكن عند أبي حنيفة
في الزيادة والنقصان جميعاً ان يودي قيمتها يوم الحول وعندهما
في الفصلين جميعاً يودي قيمتها يوم الاداء“ ۱۸

فتاویٰ ہندیہ میں ہے :

”وان ادى من قيمته يعتبر يوم الوجوب وهو تمام الحول عند الامام
وقا لا يوم الاداء المصنفها“ ۱۹

فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے :

”وان ادى من القيمة ادى قيمتها يوم حولان الحول الذى هو

يوم الوجوب عند أبي حنيفة وعندهما يودي قيمتها يوم الاداء“ ۲۰

زکوٰۃ کے سلسلہ میں اصل یہ ہے کہ جس مال میں زکوٰۃ واجب ہوئی ہے اسی مال سے زکوٰۃ بھی ادا
کی جائے مگر فقہاء کرام نے شریعت کی دی ہوئی رخصتوں کے پیش نظر یہ کہا ہے کہ اصل سامان کے بجائے
اگر اس کی قیمت ادا کر دی جائے تو بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ اس لئے کہ قیمت اصل کا بدلہ ہوتی ہے۔ اس
اعتبار سے صاحبین کا مسلک زیادہ راجح اور قابل عمل معلوم ہوتا ہے کہ جس دن زکوٰۃ ادا کی جا رہی ہے،
اس دن کی قیمت کا اعتبار کیا جائے۔ کیوں کہ وہی قیمت اصل کا بدلہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔
اب رہا یہ سوال کہ تھوک کے بھاد کا اعتبار ہوگا یا پھنکر فروختگی کا۔ تو ظاہر ہے کہ اگر تھوک کے حساب
سے مال فروخت کیا جاتا ہے تو تھوک کے بھاد کا لحاظ ہوگا۔ اور اگر پھنکر فروخت کیا جاتا ہے تو پھنکر فروختگی کا
اعتبار ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص دونوں طرح سے فروخت کرتا ہو تو پھر انفع للفقراء کے اصول کے پیش نظر پھنکر
فروختگی کے لحاظ سے ادا کرے۔ ہدایہ میں ہے :

”يقوم بها بما هو انفع للمساكين احتياطاً لعق الفقراء“ ۲۱

۱۸ بدائع ج ۲ ص ۲۳۷ ۱۹ فتاویٰ ہندیہ ج ۱ ص ۱۸۱

۲۰ تاتارخانیہ ج ۲ ص ۱۲۴ ۲۱ ہدایہ علی هامش الفتح ج ۲ ص ۱۶۷

اگر اراضی کی خرید و فروخت تجارتی کاروبار کے نقطہ نظر سے کی جائے تو وہ سامان تجارت ہونے کی وجہ سے اموال تجارت میں شامل ہیں اور سال پورا ہونے پر نقد رقم کے علاوہ جو اراضی ان کی ملکیت میں ہیں ان کی موجودہ معروف قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔ وجوب زکوٰۃ میں اراضی کی موجودہ قیمت کا اعتبار ہوگا۔ آئندہ متوقع قیمت فروخت کا اعتبار نہیں ہوگا۔

شیراز اور بونڈس کی زکوٰۃ

شیراز چوں کہ ایک تجارتی اثاثہ اور سرمایہ ہیں۔ لہذا شرعاً ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ شیراز کی زکوٰۃ میں تفصیل یہ ہے :

”جو کمپنی تجارت کرتی ہے اور خود سامان تیار کر کے فروخت کرتی ہے جیسے ریشم اور کپڑے کے کارخانے۔ تو اس صورت میں کمپنی کی مالیت کی حیثیت سامان تجارت کی ہوگی اور اس المال اور اس کے منافع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ آلات حرفت اور مشنری اشیاء کی مالیت اس سے مستثنیٰ ہوگی۔ اور جو کمپنی تجارت نہیں کرتی ہے صرف کرایہ وصول کرتی ہے کرایہ پر مکانات، دکانات دیتی ہے، تو ایسی کمپنی کے صرف منافع پر وجوب زکوٰۃ ہوگا۔“

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے :

”شیراز پر زکوٰۃ ہے شیراز جو کمپنی تجارت کرتی ہے جیسا کہ ریشم اور کپڑے کے کارخانے، لوہا اور سامان بنا کر تجارت کرنے والے کارخانے اور بجلی کمپنی وغیرہ تو اصل رقم اور اس کے نفع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اور جو کمپنی تجارت نہیں کرتی ہے محض کرایہ وصول کرتی ہے تو زکوٰۃ نفع پر واجب ہے۔ اصل رقم پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔“

یوسف القرضاوی نے شیراز کی زکوٰۃ کے بارے میں لکھا ہے :

”صنعتی اور اس جیسی کمپنیاں جن کا سرمایہ مشینوں اور عمارتوں وغیرہ میں لگا رہتا ہے جیسے پریس، فیکٹریاں، کرایہ پر چلنے والی موٹریں۔ تو ان کی زکوٰۃ ان کے حصص سے نہیں بلکہ ان کی خالص مدنی اور

منافع سے لی جائے گی۔ ایسی تجارتی کمپنیاں جن کا بیشتر سرمایہ منقولات میں لگا رہتا ہے اور جن کی تجارت کی جاتی ہے اور جو اسلماً باقی نہیں رہیں تو ان کی زکوٰۃ ان کے حصص سے بازار کی قیمت کے مطابق وصول کی جائے گی۔ اس قیمت میں منافع کو شامل کر کے اور غیر منقولہ سامان کی قیمت کو حصص میں سے وضع کر کے اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کرنا پڑے گا۔^۱

واضح رہے کہ شیراز کی مالیت کا تعین ان کی بنیادی قیمت و مالیت کو سامنے رکھ کر نہیں کیا جائے گا بلکہ بہ وقت ادا زکوٰۃ مارکیٹ میں اس کا جو نرخ اور مالیت ہوگی اس کا اعتبار کر کے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بونڈز کی زکوٰۃ

بونڈز (BONDS) درحقیقت بینک کمپنی یا حکومت کے قرض دار ہونے کا وثیقہ اور تمسک ہے جن کا حامل متعین رقم مع منافع پانے کا حقدار ہوتا ہے۔ گویا بونڈ کا مالک دین مؤجل کا مالک ہوتا ہے۔ لہذا یہ "دین قوی" کے قبیل سے ہے۔ اس لئے کمیشن کرانے کے بعد تمام گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

محور ثانی — نصاب زکوٰۃ

سونے اور چاندی کے نصاب میں سے کسے معیار قرار دیا جائے

یہ حقیقت ہے کہ شریعت اسلامی نے سونے اور چاندی کو مستقل نصاب کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے اور دونوں ہی اپنی جگہ پر اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر اس وقت سونے اور چاندی کے نرخ میں غیر معمولی تفاوت اور فرق پیدا ہو جانے کی وجہ سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اموال تجارت میں نصاب وجوب زکوٰۃ کی کم سے کم مقدار چاندی کے نصاب سے مقرر کی جاتے یا سونے کے نصاب سے؟ اسی طرح نصاب حرمت زکوٰۃ (غنائی یعنی کسی شخص کو غنی قرار دے کر اس کے لئے زکوٰۃ لینا ممنوع قرار دیا جائے) کا معیار کسے قرار دیا جائے؟

اس سلسلہ میں علماء کے خیالات و رجحانات مختلف ہیں کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے دونوں میں سے کسے اصل اور معیار قرار دیا جائے۔ علامہ یوسف القرضاوی کا رجحان اس طرف ہے کہ سونے کو معیار قرار دینا زیادہ بہتر ہے۔ مگر خود قرضاوی نے علماء معاصرین کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی اکثریت چاندی کو معیار قرار دیتی ہے۔ لکھتے ہیں :

”البتہ اس وقت ہیں اس پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم نقدین سونے چاندی میں سے کس کے ذریعہ نصاب شرعی کی تحدید و تعیین کریں گے یعنی غنا کی وہ آخری حد کیا ہوگی جس پر وجوب زکوٰۃ کا حکم ہوگا۔ اس گفتگو کی ضرورت اس بنا پر پڑی کہ شارع نے سونے، چاندی کو علیحدہ علیحدہ نصاب مقرر کیا تھا۔ ایک کا نصاب دوسرے کے مخالف تھا تو کیا ہم چاندی کو وجوب زکوٰۃ کا معیار قرار دیں گے۔ بہت سے علماء معاصرین کا اسی طرف میلان ہے اور اس میلان کی دو وجہ ہے :

۱۔ چاندی کا نصاب متفق علیہ ہے۔ اس کا ثبوت احادیث صحیحہ مشہورہ سے ہے۔

۲۔ چاندی کو معیار قرار دینے اور اس کے ذریعہ تقدیر کی صورت میں فقرہ کا زیادہ فائدہ ہے کیوں کہ چاندی کو معیار قرار دینے کی صورت میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

راقم الحروف کا بھی اسی طرف رجحان ہے کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے نصاب چاندی کو معیار قرار دیا جائے۔ لہذا اس دور میں اگر کسی کے پاس سامان تجارت یا کوئی دوسری مالیت نصاب چاندی کے بقدر ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور وہ غنی قرار پائے گا۔ اس کے لئے زکوٰۃ لینا حرام ہوگا۔ زکوٰۃ کے باب میں ہمیشہ فقر اور مساکین کی منفعت کے پہلو کو پیش نظر رکھنا چاہیے کیوں کہ زکوٰۃ کی مشرعت ہی فقر کو نفع پہنچانے کے لئے ہوتی ہے۔

محور ثالث — مصارف زکوٰۃ

اہل مدارس کے لئے ایک آسان راہ

اس میں شمر غاکوئی قباحت نہیں ہے کہ ایک طالب علم جو مستحق زکوٰۃ ہے ادارہ اس کے قیام

و طعام تعلیم اور دوسری ضروریات کے انتظام پر آنے والے اخراجات ماہانہ مثلاً ڈھائی سو روپے کا چیک، اس کے حوالے کرے۔ چیک پر طالب علم کا قبضہ اصل رقم پر قبضہ تصور کیا جائے گا اور اس طرح سے وہ اس رقم کا مالک ہو جانے کے بعد جب وہ چیک مدرسہ کو واپس کرے گا تو مدرسہ والے کو اس رقم کو مدرسین کی تنخواہ اور تعمیرات میں خرچ کرنے کی گنجائش ہوگی۔ مدارس اسلامیہ کے ذمہ داران کے لئے یہ آسان اور قابل عمل طریقہ ہے۔ اس پر عمل کرنے سے بہت ساری برائیوں سے حفاظت ہوگی۔

مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندہ کا وکیل و طلبہ کا نائب ہے

مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندہ کا وکیل ہے۔ کیوں کہ معطلی نے اسی کو زکوٰۃ صرف کرنے کا حکم دیا ہے اور اسے وکیل بنایا ہے۔ اس لئے قبضہ مہتمم من کل الوجوہ قبضہ مستحق زکوٰۃ نہیں ہوگا اور تملیک طلبہ اور تملیک مستحق زکوٰۃ ضروری ہوگی۔ اور محض مہتمم مدرسہ کو زکوٰۃ دے دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ نیز مہتمم مدرسہ طلبہ کا بھی نائب ہے۔ واضح رہے کہ طلبہ کے نائب ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جہاں چاہے زکوٰۃ کی رقم صرف کرے بلکہ وہ جس کا نائب ہے اور جس کی نیابت کے طور پر اس نے زکوٰۃ و صدقات واجبہ کی رقوم وصول کی ہے اسی پر صرف کرنا متعین ہے۔ اگر وہ غیر مصرف میں اسے صرف کر دیتا ہے تو زکوٰۃ دہندہ کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نے اس سلسلہ میں لکھا ہے :

”مہتمم مدرسہ کا تیم و نائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے، جیسا امیر نائب جملہ عالم کا ہوتا ہے۔ پس جو شئی کسی نے مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے۔ اس کے قبضہ سے ملک معطلی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہو گیا اگرچہ وہ غیور الکمیہ والذوات ہوں مگر نائب معین ہے اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطلی کا بھی ہو سکتا ہے۔“

کمیشن پر زکوٰۃ : مدارس اسلامیہ کے سفراء و مصلین عاملین زکوٰۃ کے حکم میں نہیں ہیں جن کا مستحق زکوٰۃ ہونا نص قرآنی سے ثابت ہے۔ کیوں کہ عامل زکوٰۃ جو مصرف زکوٰۃ ہے وہ شخص ہے جسے امیر المسلمین نے لوگوں کی زکوٰۃ اور دیگر صدقات واجبہ کی تحصیل کے لئے مامور کیا ہو۔ عنایہ شرح ہدایہ میں ہے :

”العامل هو الذي يبعثه الامام لجباية الصدقات“ ۱؎

الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں ہے کہ ”عامل زکوٰۃ صرف اس صورت میں زکوٰۃ لینے کا
حقدار ہوگا جب کہ امام وقت نے زکوٰۃ کی وصولی پر اسے مامور کیا ہو وانما یأخذ العامل منها اذا فرقتها
الامام“ ۲؎

امام المسلمین کو تمام مسلمانوں پر ولایت عامہ حاصل ہوتی ہے اور اس بنیاد پر اسے زکوٰۃ کی وصولی
اور تقسیم کا شرعاً حق ملتا ہے اور زکوٰۃ کی وصولی کے لئے اس کا متعین کیا ہوا عملہ مستحق زکوٰۃ قرار پاتا ہے۔ مگر مدارس کے
اہتم کو ولایت عامہ حاصل نہیں ہوتی ہے اس لئے اس کے تحصیلین و سفراء کو عاملین زکوٰۃ کی حیثیت حاصل
نہیں ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ عامل صدقات کو زکوٰۃ کی رقم بطور معاوضہ واجرت نہیں ملتی ہے بلکہ وہ اپنے
اوقات کو امور مسلمین کے لئے فارغ کر دیتا ہے اور ہمہ وقت اس میں مشغول رہتا ہے اس لئے جزاء اعتباراً اس
کے طور پر بقدر کفایت (جو اس کے اور اس کے اہل و عیال کے گزارے کے لئے کافی ہو) اسے مال زکوٰۃ میں
سے دیا جاتا ہے۔ عنایہ میں ہے :

”فیعطیہ ما یسعه ای یکفیہ..... لأنہ فرغ نفسه لهذا العمل وکل

من فرغ نفسه لعمل من امور المسلمین یتحق علی ذلک رزقاً كالقضاة

والمقاتلة ولبس ذلک علی وجه الاجارة لأنها لا تكون الا علی عمل معلوم

او مدة معلومة واجرة معلومة“ ۳؎

الاختیار لتعلیل المختار میں ہے :

”ولیس ذلک بالاجارة لأنہ عمل غیر معلوم“ ۴؎

مدارس کے سفراء کو زکوٰۃ کی رقم بطور اجرت و معاوضہ دی جاتی ہے اور زکوٰۃ کی رقم کو اجرت
و معاوضہ کے طور پر دینا جائز نہیں ہے۔

۱؎ عنایہ علی هامش الفتح ج ۲ ص ۲۸۵ ۲؎ الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۲۲۵

۳؎ عنایہ ج ۲ ص ۲۸۵ ۴؎ الاختیار لتعلیل المختار ج ۱ ص ۱۱۸

کمیشن پر چندہ کرائے میں کئی طرح کی خرابیاں ہیں۔

۱۔ اس میں اجرت بھول ہوتی ہے۔ عمل و مدت کی بھی تعیین نہیں ہوتی حالانکہ عقد احبارہ کی صحت کے لئے اجرت کی تعیین، عمل اور مدت کا معلوم ہونا ضروری ہے۔

۲۔ زکوٰۃ کی رقم کا زیادہ تر حصہ خود تحصیلین و سفر پر خرچ ہو جاتا ہے جو مشروعیت زکوٰۃ کے خلاف ہے۔ زکوٰۃ کی مشروعیت فقراء و مساکین کو نفع پہنچانے کے لئے ہوتی ہے اور اس صورت میں ان تک زکوٰۃ کی رقم کا بہت کم حصہ پہنچ پاتا ہے۔

۳۔ مدارس کے ذمہ داران کے لئے زکوٰۃ کی رقم کو اس کے مصرف میں صرف کرنا ضروری ہے اور جب تک وہ رقم اپنے مصرف میں صرف نہیں ہوگی زکوٰۃ دہندگان بری الذمہ نہیں ہوں گے۔ اس لئے ان وجوہات کی بنا پر کمیشن پر چندہ کرنا شرعاً ممنوع اور ناجائز ہے۔ البتہ اگر کمیشن کی رستم زکوٰۃ و صدقات واجبہ کے علاوہ غیر واجب التملیک رقم سے ادا کی جائے تو اس صورت میں صرف ایک خرابی لازم آئے گی اور وہ ہے اجرت کا بھول ہونا جسے بعض مجبوریوں کے تحت گوارہ کر لیا جاسکتا ہے۔

ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔



مسائل زکوٰۃ

از: مولانا مفتی محمد حنیف عالم ندوی قاسمی — مفتی امارت شرعیہ بہار دارالریہ پلواری شریف، پٹنہ

الحمد لله رب العلمین وبہ نستعین والصلوة والسلام علی سید المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

اما بعد

زکوٰۃ — اسلام کے بنیادی ارکان میں سے تیسرا اہم ترین رکن ہے جس کی فرضیت نص قطعی سے ثابت ہے اور اس کا منکر کافر ہے قرآن و احادیث نبویہ میں اس کی ادائیگی کی بہت تاکید اور عدم ادائیگی پر بہت سخت وعیدیں بھی آئی ہیں اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنی کتاب مقدس قرآن عظیم میں اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ادائیگی زکوٰۃ کا متعدد جگہوں میں حکم دیا ہے زکوٰۃ کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ماہل کی شریعتوں میں بھی نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ دینے کا حکم اور اس کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

زکوٰۃ کی ادائیگی میں کمزوروں، پریشان حال لوگوں، یتیموں، بیواؤں اور عاجز و لاچار لوگوں کی اعانت و مدد ہے جو اسلام کا اہم ترین معاشرتی اور سماجی دشواریوں کے حل کا اصول و ضابطہ اور بے مثال نظام حیات ہے اور اللہ رب العزت کی خوشنودی و رضائے حصول کا سبب اور حکم خداوندی کی بجا آوری ہے۔ زکوٰۃ دینے سے گناہ دھلتے ہیں ایمانی اور دھانی قوت حاصل ہوتی ہے اخلاق و عادات میں جلا پیدا ہوتی ہے اور انسانی قلب و جگر عرفان الہی کی مقدس روشنی سے منور و روشن ہوتا ہے۔ لالچ، حرص، بغض و عداوت، جیسے اخلاق و ذیلیہ سے انسان کو دور رکھتی ہے۔ اخوت و بھائی چارگی، ایثار و قربانی اور جو دو سخا سے کریمانہ وصف اور خصائل حمیدہ پیدا ہوتے ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے ال و دولت سے نواز کر جو فارغ البالی عطا کی ہے اس کا تقاضا و درحق ہے کہ انسان اپنے رب کا شکر ادا کرے۔ اللہ کی عنایت کردہ مال و دولت سے غریب و مساکین کا حق ادا کرے جس کی مثلی صورت ادائیگی زکوٰۃ اور فرضیت کی شکل میں یہ ذمہ صاحب مال پر ڈال دی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اللہ رب العزت نے اس حقیقت کو بھی واضح فرما دیا ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے

اور صدقہ دینے سے مال میں کوئی کمی نہیں ہوتی ہے بلکہ اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے اور اس قدر اضافہ ہوتا ہے کہ انسانی فکر و درک اس کی گہرائیوں اور نزاکتوں کا تصور نہیں کر سکتی ہے اور وہ سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔

اس لئے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ مسائل معلوم کر کے اپنے ان اموال کی جن پر زکوٰۃ فرض ہے پوری ایمانداری اور دیانت کے ساتھ زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام کر کے اللہ کے فرمان اور حکم کی بجا آوری کریں۔ البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ تمام اموال میں زکوٰۃ فرض نہیں ہے بلکہ خاص اصناف میں مخصوص شرائط کے ساتھ زکوٰۃ فرض ہے جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

اموال زکوٰۃ

جن اموال میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وہ دو طرح کے ہیں :

(الف) اموال ظاہرہ

(ب) اموال باطنہ

اموال ظاہرہ درج ذیل ہیں :

۱۔ سائمہ جانور یعنی وہ جانور جو پورا سال، یا سال کا بیشتر حصہ چرنے پر اکتفا کرتے ہوں اور مالک کو ان کا پارہ دینا نہ پڑتا ہو۔ اس طرح سائمہ جانور جن پر زکوٰۃ فرض ہے وہ تین طرح کے ہیں :

(الف) ابل۔ اونٹ۔ اس میں ہر نوع کے اونٹ داخل ہیں

(ب) بقر۔ گائے، بیل، بھینس وغیرہ نر و مادہ

(ج) غنم۔ خسی، بکری، دنبہ اور بھیرلہ

۲۔ کھیت کی ہر طرح کی پیداوار خواہ غلے ہوں یا سبزیاں ہوں یا پھل، عشر، یا نصف عشر واجب ہے یعنی اگر کھاد، پانی وغیرہ کے ذریعے فصل تیار ہوئی ہے تو بیسواں حصہ ورنہ دسواں حصہ واجب ہے۔

۳۔ اموال باطنہ میں نقود اور عروض التجارۃ آتے ہیں۔

نقود یعنی خواہ اثمان خلقیہ ہوں مثلاً سونا، چاندی یا اثمان عرفیہ یعنی مختلف مالک کی کرنسیاں جو ثمن عربی کی حیثیت سے رائج ہوں مثلاً ہندوستانی نوٹ یا سکے یا ریال پونڈ وغیرہ۔

اثمان خلقیہ خواہ سکے ہوں یا زیورات بنائے گئے ہوں۔ اور عروض التجارہ وہ سامان جو تجارت کی نیت سے خرید

کر رکھا گیا ہو اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے خواہ فی الحال تجارت ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو۔

”وجوب زکوٰۃ کی شرط ملک تام“

وجوب زکوٰۃ کی بنیادی شرطوں میں ایک شرط ملک تام بھی ہے۔ اگر کسی شے کا مالک متعین نہیں ہے تو اس شے پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ جیسے وقف کی جائداد اور آزاد چھوڑے ہوئے جانوروں میں ملک نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ شرعاً واجب نہیں ہے چوں کہ زکوٰۃ میں تملیک مستحقین شرط ہے اور غیر ملک میں تملیک متصور نہیں۔

اما الشرائط التي ترحب الى المال فمنها الملك فلا تجب الزكاة في سوائم الوقف
والخيل المسبلة لعدم الملك وهذا لان في الزكاة تمليكاً والتملك في غير
الملك لا يتصور له

ملک تام پر وجوب زکوٰۃ کی حکمت

ملک تام پر زکوٰۃ کیوں واجب ہے اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے علامہ یوسف القرضاوی تحریر فرماتے ہیں :
”ملکیت بڑی نعمت ہے کیونکہ یہ آزادی اور انسانیت کا نتیجہ اور ثمرہ ہے جس سے غلام اور جانور محروم ہوتے
ہیں ملکیت سے آدمی کی قائدانہ حیثیت معلوم ہوتی ہے اور ملک تام کے ذریعہ انسان اپنے مال سے
منتفع ہوتا ہے اور از خود یا اپنے نائب کے ذریعہ مال کے بڑھانے پر قادر ہوتا ہے۔ اس عظیم نعمت کا
شکر یہ ادا کرنا انسان پر لازم ہے کہ جب اس کو یہ نعمت نصیب ہو تو وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے۔“

ملک تام سے مراد

ملک تام سے مراد ملک رقبہ اور ملک ید ہے۔ ملک رقبہ یہ ہے کہ اس شے پر مکمل ملکیت حاصل ہو
اور ملک ید یہ ہے کہ وہ چیز اپنے قبضہ و تصرف میں ہو۔ اگر ملکیت حاصل نہیں ہے جیسا کہ غلام کو اپنے مال پر ملکیت حاصل
نہیں ہے اس کا جو بھی مال ہے اس کے آقا کا ہے یا مدیون (جس پر قرض ہے) کے پاس جو مال ہے اس پر اس کا
قبضہ تو ہے لیکن اس کی ملکیت نہیں ہے۔ یا ملکیت تو حاصل ہے لیکن قبضہ و تصرف میں نہیں ہے یا اس سے انتفاع پر

قدرت نہیں ہے جیسا کہ مہر کی رقم ہے قبضہ سے قبل ملکیت تو ہے لیکن قبضہ تصرف میں نہیں غرض یہ کہ ملکیت قرب یا ملکیت ید دونوں میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

(ومنها الملك التام) وهو ما اجتمع فيه الملك واليد واما اذا وجد الملك دون اليد كالصداق قبل القبض او وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لا تجب فيه الزكاة كذا في السراج الوهاج - ۱۷۹

ملک تام کی مراد میں اختلاف

سیدنا حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام مالکؒ تو یہی فرماتے ہیں کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک رقبہ اور ملک ید دونوں ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ البتہ حضرت امام زفرؒ اور حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک ید شرط نہیں ہے۔ اگر کسی شئی پر مکمل ملکیت ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی خواہ قبضہ و تصرف میں ہو یا نہ ہو۔

ومنها الملك المطلق وهو ان يكون مملوكا لفرقة ويبدأ وهذا قول اصحابنا الثلاثة وقال زفر اليد ليس بشرط وهو قول الشافعي ۱۸۰

مال ضما میں زکوٰۃ

چوں کہ امام زفرؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ملک ید وجوب زکوٰۃ کے لئے شرط نہیں ہے۔ اس لئے ان دونوں حضرات کے نزدیک مال ضما میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک مال ضما میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ چوں کہ مال ضما میں ملک رقبہ تو حاصل ہے لیکن ملک ید مفقود ہے۔

مال ضما کی تفسیر

مال ضما ہر وہ مال ہے جس پر اصل ملکیت تو قائم ہو لیکن انتفاع پر قدرت نہ ہو جیسا کہ بھاگتا ہوا غلام، گم شدہ چیز، مال مفقود، سمندر میں ضائع شدہ مال۔ اسی طرح وہ مال جس کو کسی نے ظلماً لے لیا۔ اسی طرح وہ مال جو جنگل یا بہت پرانے مکان میں دفن کر دیا ہوا اور جگہ یاد نہ ہو یہ سب مال ایسے ہیں کہ ملکیت تو قائم ہے لیکن انتفاع پر قدرت نہیں ہے ۱۸۱

حضرت امام زفر اور حضرت امام شافعیؒ ان تمام روایات سے استدلال کرتے ہیں جو اس باب میں عام ہیں ان میں ملک رقبہ اور ملک ید کی کوئی تفصیل نہیں ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ مال کا وظیفہ ہے اگر کسی مال کا مالک متعین ہے تو اس پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے۔ خواہ وہ قبضہ و تصرف میں ہو یا نہ ہو جس کی دلیل مسافر کے مال پر وجوب زکوٰۃ ہے اگر مال گھر میں دفن کر دیا ہو اور جگہ یاد نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اسی طرح قرض پر قبضہ سے پہلے زکوٰۃ واجب ہے باوجودیکہ ان تینوں صورتوں میں ملکیت تو قائم ہے لیکن مال قبضہ و تصرف میں نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ زکوٰۃ مال کا وظیفہ ہے۔ لہذا مال ضما میں زکوٰۃ واجب ہوگی کیونکہ ملکیت ثابت ہے۔

فرقی اول کی ایک دلیل تو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم لا زکوٰۃ فی مال الضما ہے یعنی مال ضما میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ مال جس سے مالک انتفاع نہ کر سکتا ہو وہ مالک کے حق میں ممدوم ہے اس کے ذریعہ غنی (صاحب نصاب) نہیں سمجھا جائے گا، اور جو صاحب نصاب نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے جہاں تک مسافر کے مال میں وجوب زکوٰۃ کا تعلق ہے تو چوں کہ مسافر اپنے نائب کے ذریعہ اپنے مال میں انتفاع پر قدرت رکھتا ہے اور جو مال گھر میں مدفون ہے اس سے بھی انتفاع ممکن ہے کہ پورے گھر کو کھود کر مال مدفون کی جگہ معلوم کی جاسکتی ہے اسی طرح قرض سے بھی انتفاع ممکن ہے کہ دائن جب چاہے مدیون سے اپنے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے اس لئے ان تینوں صورتوں میں یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ملک ید نہیں ہے لہ

خلاصہ کلام یہ کہ حنفیہ کے نزدیک مفتی بہ قول کے مطابق وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک ید اور ملک رقبہ دونوں ضروری ہے اگر ان میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

جواب ۱: سوال سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خرید و فروخت کا معاملہ مکمل ہو چکا ہے اور خریدار نے پیشگی ثمن بھی دا کر دیا ہے لیکن بائع (فروخت کرنے والے) نے ابھی تک مبیع خریدار کے حوالہ نہیں کیا ہے ایسی صورت میں پیشگی ثمن اور مبیع دونوں پر وجوب زکوٰۃ کا مسئلہ زیر بحث ہے کہ ان دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں۔ اگر واجب ہے تو خریدار پر یا فروخت کرنے والے پر۔

ثمن پر زکوٰۃ : مبیع مکمل ہو جانے کے بعد ثمن پر بائع کا قبضہ ہو یا نہ ہو بہر دو صورت بائع کو ثمن میں تصرف کا شرعاً

اختیار ہوتا ہے۔ اور جب بائع کو ثمن میں تصرف کا شرعاً اختیار ہے تو بائع کے ذمہ ثمن پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ خواہ بائع کا قبضہ ہو یا نہ ہو کیونکہ وجوب زکوٰۃ کی شرط ملک تام (ملک قبہ و ملک ید) پائی جا رہی ہے۔ (اجاز التصرف فی الثمن) بہبہ اوسیع ارغیرہما الوعینا ای مشارالہ (قبل قبضہ) نہ نیز ثمن کی حیثیت دین قوی کی ہوتی ہے اور دین قوی پر دائن (قرض خواہ) کے ذمہ زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ لہذا مذکورہ صورت میں جب کہ ثمن بائع کے قبضہ و تصرف میں آچکا ہے تو بائع کے ذمہ زکوٰۃ واجب ہوگی۔

تشبیہ۔ یہاں پر ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر بائع کے پاس مبیع ہلاک ہو جائے یا کسی دوسری وجہ سے بیع ختم کرنا پڑے تو بائع پر ثمن کی واپسی ضروری ہے۔ اور جب بیع منسوخ ہو جانے کی صورت میں بائع پر ثمن کی واپسی ضروری ہے تو وہ اس ثمن کا مالک کہاں ہوگا کہ اس پر وجوب زکوٰۃ کا حکم لگے۔

تشبیہ کا ازالہ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بائع تو اس ثمن کا مکمل مالک ہو گیا اور جہاں تک بیع کے منسوخ ہونے کی صورت میں ثمن کی واپسی کا سوال ہے تو ثمن کی واپسی بائع کے ذمہ میں ہے عین ثمن کی واپسی ضروری نہیں ہے۔ ثمن کے مثل یا اس کے بقدر کوئی دوسری چیز بھی واپس کر سکتا ہے۔ اگر ثمن پر بائع کو ملکیت حاصل نہ ہوتی تو عین ثمن کی واپسی بائع پر ضروری ہوتی۔ اس کی نظیر بارہ طویلہ میں چند سالوں کی پیشگی اجرت پر زکوٰۃ کی ہے یعنی کسی نے مکان یا دوکان ایک لمبی مدت کے لئے کرایہ لیا اور چند سالوں کا پیشگی کرایہ مالک مکان و دوکان کو ادا کر دیا تو اس پیشگی کرایہ کی رقم پر زکوٰۃ مالک مکان و دوکان کے ذمہ واجب ہوگی۔ اس لئے کہ کرایہ کی رقم پر قبضہ کر لینے کی وجہ سے وہ مالک ہو گیا۔ اور اگر بالفرض اجارہ منسوخ کرنے کی صورت میں کرایہ کی رقم واپس بھی کرنی پڑے تو عین اسی رقم کی واپسی ضروری نہیں ہوگی۔ جو کرایہ میں دی تھی بلکہ اس کی واپسی ذمہ میں ہوگی۔ اس کے بقدر کوئی دوسری مالیت بھی واپس کر سکتا ہے۔

واما زکوٰۃ الاجرة المعجلہ عن سنین فی الاجارة الطریلة التي یفعلها بعض الناس عقوداً و

یشترطون الخیار ثلاثۃ ایام فی رأس کل شہر فمتجب علی الأجر لانه ملکھا بالقبض وعسند

الانطیخ لا یجب علیہ رد عین المقبوض بل قدرہ فکان کدین لحقہ بعد الحول۔ ۳

۳۔ الدر المختار علی هامش رد المختار مطلب فی بیان الثمن والمبیع والدین۔ ج۔ ۲۔ ص ۱۶۵

۴۔ شرح فتح القدیر کتاب الزکوٰۃ مطبوعہ مصر۔ ج۔ ۲۔ ص ۱۶۵

مبيع پر قبضے قبل زکوٰۃ

مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ خرید و فروخت مکمل ہو چکی لیکن مبيع پر خریدار کا قبضہ نہیں ہوا تو مبيع پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ اگر واجب ہے تو خریدار پر یا فروخت کرنے والے پر؟ اس کی تفصیل درجہ ذیل (الف) اصولاً اور شرعاً فروخت کرنے والے کے ذمہ مبيع کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لئے کہ مبيع فروخت کر نیوالے کی ملکیت سے نکل چکی ہے۔

(ب) البتہ خریدار کے ذمہ واجب ہے یا نہیں اس سلسلہ میں کتب فقہ کی عبارتیں مختلف نظر آتی ہیں ان عبارتوں کی روشنی میں کوئی قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ شرح فتح القدیر، درمختار، یوسف القرضاوی کی فقہ الزکوٰۃ کی عبارت اس سلسلہ میں صریح ہے کہ مشتری (خریدار) پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ خریدار کو قبضہ سے قبل مبيع پر ملک تام حاصل نہیں ہے کیونکہ خریدار قبضہ سے قبل مبيع میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا ہے شرح فتح القدیر میں ہے :

ويخرج أيضا المشتري للتجارة اذا لم يقبض حتى حال حول لازكوة فيه اذ لم يستفد ملك التصرف وكمال الملك بكونه مطلقا للتصرف وحقيقته مبيع كونه حاجزا له

فقہ الزکوٰۃ میں ہے :

ولهذا قالوا : لا تجب الزكوة على المشتري فيما اشتراه للتجارة قبل

القبض لعدم اليد له

حضرت علامہ سلا الدین الحنفی درمختار میں تحریر فرماتے ہیں :

ولا فيما اشتراه لتجارة قبل قبضه له

حضرت علامہ شامی اس سلسلہ میں مٹمن نظر نہیں آتے ہیں چنانچہ درمختار کی عبارت قبل قبضہ کے تحت لکھتے ہیں کہ :

”قبضہ کے بعد گزشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ تو قبضہ سے قبل

۱ شرح فتح القدیر ج ۲ ص ۱۵۱ ۲ فقہ الزکوٰۃ مطبوعہ بیروت ج ۱ ص ۱۳۱

۳ الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۲ ص ۱۳۱

ہی واجب ہوگی لیکن اس کی ادائیگی قبضہ کے بعد لازم ہوگی (قولہ قبل قبضہ) اما بعد فی زکیہ

عقاصنی کما فہمہ فی البحر من المحيط لہ

لیکن حضرت علامہ شامی نے فتاویٰ خانہ کے حوالے سے جو جزئیہ نقل کیا ہے اور اس کی روشنی میں اپنی جو رائے دی ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قبضہ کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کرنی ہوگی۔ ملاحظہ ہو شامی کی عبارت :

لکن فی الخانیۃ رجل لہ سائمتہ اشتراها رجل للسیامۃ ولم یقبضها

حتی حال الحول ثم قبضها لا زکوۃ علی المشتري فیما مضی لانہا کانت

مضمونۃ علی البائع بالثمن المذکور مقتضی التعلیل عدم الفرق بین ما اشتراها

للسیامۃ او للمتجارۃ فتأمل لہ

لیکن خانہ میں ہے کہ ایک شخص کے پاس سائمتہ جانور (وہ جانور جو پورا سال یا سال کا بیشتر حصہ جنگل میں چرنے پر اکتفا کرتا ہو) ہے اور دوسرے شخص نے اس کو سائمتہ بنانے کے لئے خریدا اور سال گزرنے کے بعد اس پر قبضہ کیا تو خریدار پر گزشتہ سال کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لئے کہ وہ بائع پر مضمون بالثمن ہے یعنی اگر سائمتہ جانور ہلاک ہو جائے تو بائع پر اس کے ثمن کی واپسی ضروری ہوگی۔ اس علت کا تقاضہ یہ ہے کہ جانور خواہ سائمتہ بنانے کے لئے خریدا ہو یا تجارت کے لئے دونوں کے حکم میں فرق نہ ہو۔ علامہ شامی نے فتاویٰ — کہہ کر اس مسئلہ میں مزید غور و فکر کی دعوت دے دی اور اپنے عدم اطمینان کا اظہار بھی کر دیا۔

مسئلہ کا فقہی جائزہ

چونکہ کتب فقہ کی ان عبارتوں کی روشنی میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہے اس لئے ہم پہلے اس کا فقہی جائزہ لیتے ہیں کہ اس میں وجوب زکوٰۃ کی شرط ملک تام (ملک رقبہ و ملک ید) پائی جاتی ہے یا نہیں اس کے بعد اپنی رائے قائم کریں گے۔

مذکورہ صورت میں غور کرنے کے بعد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے مبیع پر قبضہ سے قبل خریدار کو ملک رقبہ تو حاصل ہے اس لئے کہ بیع مکمل ہونے کے بعد ہی مبیع پر خریدار کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے خواہ مبیع پر خریدار کا

قبضہ ہو یا نہ ہو۔

البيع يمنع بالايجاب والقبول ۱۰ البتہ چوں کہ مبيع پر قبضہ سے قبل خریدار کو تصرف کا حق حاصل نہیں ہے اس لئے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ خریدار کو مبيع پر قبضہ سے قبل ملک ید حاصل نہیں ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں خریدار پر بھی مبيع کی زکوٰۃ واجب نہ ہو۔

قال في الفتح الاصل ان كل عقد يفسخ بهلاك العوض قبل القبض لم يجز التعثر
في ذلك العوض قبل قبضه اذا كان عيناً لا يجوز بيع شيء من ذلك ولا ان يشارك
فيه غيره ۱۱

لیکن اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خریدار کو ملک رقبہ کے ساتھ ملک ید بھی حاصل ہے اس لئے کہ جب بیع مکمل ہو چکی ہے اور خریدار نے نمٹن بھی ادا کر دیا ہے تو اس کو شرعاً مبيع سے انتفاع پر قدرت حاصل ہے کیونکہ وہ جس وقت چاہے فروخت کرنے والے سے مبيع کا مطالبہ کر کے مبيع سے انتفاع حاصل کر سکتا ہے۔ لہذا اس کی حیثیت دین قوی کی ہوگی۔ اور قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

یہ دو نقطہ ہائے نظر ہمارے سامنے آئے۔ علامہ ابن نجیم نے کنز الدقائق کی اپنی مشہور ترین شرح البحر الرائق میں فیط الخسری کے حوالے سے ان دونوں نقطہ ہائے نظر کو نقل کیا ہے — فیط الخسری نے دوسری رائے قبضہ سے قبل خریدار پر مبيع کی زکوٰۃ واجب ہو (کو صحیح قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

وقد منا ان المبيع لا تجب زكوة على المشتري وذكر في المحيط في بيان
اقسام الدين ان المبيع قبل القبض قيل لا يكون نصاباً لان اهلاكه فيه
ناقص باقتصاد اليد والصحيح انه يكون نصاباً لانه عوض عن مال كانت
يده ثابتة عليه وقد امكنه احتواؤه اليه على العوض فمعتبر بده باقية
على النصاب باعتبار التمكن شرعاً ۱۲

علامہ ابن نجیم نے فیط الخسری کی مذکورہ عبارت نقل کرنے کے بعد بہت ہی بہتر اور عمدہ فیصلہ فرمایا ہے کہ زکوٰۃ تو قبضہ سے

قبل ہی واجب ہوگی۔ البتہ اس کی ادائیگی قبضہ کے بعد لازم ہوگی۔ اور دین قوی کی طرح گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ فعلموهذا قولہم لا تجب الزکوۃ معناه قبل قبضہ واما بعد قبضہ فتجب زکوٰۃ فیہما ماضی

کاالدین القوی۔ لہ

خلاصہ جواب

خلاصہ جواب راقم الحروف علامہ ابن نجیم کے مذکورہ فیصلہ سے متفق ہے اور مذکورہ بحثوں کی روشنی میں اپنی رائے بھی یہی رکھتا ہے کہ قبضہ سے قبل مبیع کی زکوٰۃ خریدار پر واجب ہوگی۔ البتہ اس کی ادائیگی قبضہ کے بعد لازم ہوگی اور دین قوی کی طرح اس میں بھی گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

عقد اجارہ میں دی گئی پیشگی رقم بزرگوں کو

[illegible]

لہذا کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم پر زکوٰۃ نہ تو کرایہ دار کے ذمہ واجب ہوگی نہ ہی مالک کے ذمہ واجب ہوگی۔ البتہ کرایہ دار کو وہ رقم جب واپس مل جائے تو پھر اس پر سال گزر جائے یا پہلے سے بقدر نصیب اس کے پاس دوسری مالیت ہو تو اس کے ساتھ منہم کر کے کرایہ دار کو اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی

ولانی مرهون بعد قبضه (در مختار) وقوله ای لاعلی المرتین بعدم ملات

الرقبة ولا على الراهن لعدم اليد العية، وإذا استرد على الراهن لا يزكي عن

السفن الماضية وهو معنى قول الشارح بعد قبضه ويدل عليه قول البعروسي.

موانع الوجوب الرهن الم وظاهره ولو كان الرهن ازيد من الدين الم

مدارس و اداروں میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ

جواب: مدارس یا دینی اداروں میں جمع ہونے والی رقمیں تین طرح کی ہوتی ہیں۔

- ۱۔ چنڈہ دہندگان نے چنڈہ کی رقم کسی خاص مدرسہ یا مسجد یا مدرسہ کی تعمیر پر صرف کرنے کے لئے دیا ہو۔
- ۲۔ ہدایا، عطیات اور صدقات نافلہ کی رقم جو عام مد میں صرف کرنے کے لئے دی گئی ہو۔
- ۳۔ زکوٰۃ، صدقہ فطر، حرم قربانی یا دیگر صدقات واجبہ کی رقمیں۔

پہلی صورت میں چونکہ مدرسہ یا ادارہ کے منتظم و مہتمم چنڈہ دہندگان کے وکیل ہوتے ہیں اس لئے جب تک وہ رقم جس مد پر صرف کرنے کے لئے چنڈہ دہندگان نے دی ہے اس مد پر صرف نہ کر دی جائے چنڈہ دہندگان ہی اس کے مالک رہیں گے۔ وہ جب چاہیں اس رقم کو واپس لے سکتے ہیں اور دوسرے مد میں صرف کر سکتے ہیں۔ یا صرف کرنے کا حکم دے سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں مدرسہ یا دینی ادارہ میں جمع شدہ رقم پر ملکیت کے تمام احکام جاری ہوں گے۔ اور سال گزرنے پر چنڈہ دینے والوں کے ذمہ ان رقم کی زکوٰۃ بھی واجب الادا ہوگی۔

دوسری اور تیسری صورت میں مہتمم و منتظم رقم دینے والوں کے بھی وکیل ہوتے ہیں اور مدارس میں پڑھنے والے طلبہ یا دیگر تمام فقراء و مساکین کے بھی وکیل ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں مذکورہ دونوں طرح کی رقم کے شرعاً مقدار وہ تمام طلباء و فقراء و مساکین ہوتے ہیں جو متعین نہیں ہیں اور جس مال کا مالک متعین نہ ہو اس مال پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے جیسا کہ وقف کی جائداد اور آزاد چھوڑے ہوئے گھوڑے یا اسلامی خزانہ بیت المال میں جمع شدہ رقم زکوٰۃ، صدقات واجبہ، یا صدقات نافلہ، مال فنی، مال غنیمت کا فیس وغیرہ۔ اس طرح عام فقراء و مساکین مجاہدین، یتامی، ربا یا دیگر ابواب خیر پر وقف شدہ اشیاء پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ کیوں کہ ان تمام صورتوں میں مال کا مالک متعین نہیں ہے۔ لہذا مدارس اور دینی اداروں میں جمع شدہ دونوں طرح کی رقم پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیوں کہ ان دونوں صورتوں میں مالک متعین ہے۔ ————— علامہ یوسف القرضاوی لکھتے ہیں

وعلى هذا اذا كان هناك مال لا مالك له واعني بالمالك المالك المعين

فلا زكوة فيه وذلك كما مال الحكومة التي تجمعها من الزكوات او الضرائب
او غيرها من الموارد فلا زكوة فيها لعدم المالك المعين في ملك جميع الأمة
ومنها الفقراء..... ولذا قالوا لا تجب الزكوة في مال فيء ولا في خمس غنيمة لانه
يرجع الى مصرف ومصالح المسلمين وكذلك كل ما يملك ملكية عامة الارض
الموقوفة ونحوها.

وكذلك الموقوف على جهة عامة كالغزاة والمساجد والمجاهدين واليتامى
والرباط والمدارس وغير ذلك من ابواب الخير الصحيح ان لا زكوة فيها له

خلاصہ جواب

(الف) پہلی صورت میں جب کہ مدارس یا دینی اداروں میں جمع ہونے والی رقمیں کسی خاص مد پر صرف
کھننے کے لئے دی گئی ہوں چند دہندگان کے ذمہ اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اگر سال گزر گیا اور وہ
رقم محفوظ ہے تو چند دہندگان اس کی زکوٰۃ ادا کریں گے۔

(ب) دوسری اور تیسری صورت میں جب کہ صدقات واجبہ کی رقم ہو یا ہدایا، عطیات اور صدقات نافلہ کی رقم ہو
مالک متعین نہ ہونے کی وجہ سے ان رقوم پر کسی کے ذمہ بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

مال حرام پر زکوٰۃ کا حکم

جو ادبئے: کسی کے قبضہ میں مال حرام ہونے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(الف) پورا کا پورا مال حرام اور مال خبیث ہو۔ حلال اور طیب مال کچھ بھی نہ ہو۔

(ب) حرام و حلال دونوں مال ہوں لیکن ایک دوسرے سے عمدہ ہوں۔ باہم مخلوط نہ ہوں۔

(ج) حرام و حلال دونوں باہم اس طرح مخلوط ہوں کہ ان دونوں کے درمیان تمیز شکل ہو۔

چوں کہ پہلی اور دوسری دونوں صورتوں میں جب کہ کل مال حرام ہو یا حلال حرام دونوں ہوں اور دونوں یکٹے سے

علوہ ہوں مال حرام پر قبضہ کرنے والے کی ملکیت نہیں ہوتی ہے جیسا کہ علامہ شامی نے "قنیہ" کے حوالے سے نقل کیا ہے :

وفي القنية الرشوة يجب رد ها ولا تملك^۱

اس لئے ان دونوں صورتوں میں مال حرام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیوں کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے ملکیت شرط ہے

"وفي القنية لو كان الخبيث نصاباً لا يلزمه الزكاة لان الكل واجب التصديق

عليه فلا يفيد ايجاب التصديق ببعضه"^۲

اس مال کا حکم یہ ہے کہ اگر مالک معلوم و متعین ہو تو وہ مال اس کے حوالہ کیا جائے۔ مالک کے حوالہ خواہ براہ راست ہو اور یہ کہہ کر دیا جائے کہ تمہارا فلاں مال ہے۔ یا اگر اس طرح حوالہ کرنے میں کوئی شرعی یا قانونی رکاوٹ ہو یا جان و مال کے نقصان یا عزت کی پامالی کا قوی اندیشہ ہو تو بغیر کہے ہوئے کسی بھی ذریعہ سے اس کی ملک تک پہنچا دینا ضروری ہوگا یا اگر مالک معلوم و متعین نہ ہو تو اس کے وبال سے بچنے کے لئے مالک کی طرف سے اس کا تصدق واجب ہوگا۔

"والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رد ما لا فان علم عين الحرام

لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه"^۳

اس مال حرام کو فقراء و مساکین پر صدقہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔ البتہ رفاہ عام پر بھی صرف کرنے کی گنجائش ہے۔^۴

مخلوط مال حرام و حلال پر زکوٰۃ کا حکم

تیسری صورت جب کہ مال حرام و حلال باہم اس طرح مخلوط ہو چکے ہوں کہ ان کے درمیان تمیز مشکل ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں ؟

اس سلسلہ میں امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ چوں کہ مال حرام و حلال دونوں کے باہم مخلوط ہو جانے

۱۔ شامی کتاب القضا ج ۴ ص ۳۱۲ ۲۔ رد المحتار کتاب الزکوٰۃ ج ۲ ص ۲۵۵

۳۔ شامی مطلب فیمن ورث ما لا حراما ج ۴ ص ۱۴۱ ۴۔ اس کی پوری تفصیل تیسرے مجلد فقہ اسلامی میں مذکور ہے۔ وہاں پر بحث دیکھی جاسکتی ہے۔

کی وجہ سے استہلاک پایا گیا اس لئے وہ مال جس کے قبضہ میں ہے وہ اس کا مالک ہے۔ اس میں وراثت بھی جاری ہوگی اور اس پر زکوٰۃ بھی واجب ہوگی۔

جہاں تک ضمان کا تعلق ہے کہ مالک کے آنے پر اس مال کی واپسی ضروری ہے تو اس سلسلہ میں امام صاحب یہ فرماتے ہیں کہ ضمان اس کے ذمہ میں ہے، عین اسی مال کی واپسی ضروری نہیں ہے۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ قبضہ کرنے والا مال حرام کا مالک نہیں ہے، بلکہ وہ مال اس کے پاس بطور امانت ہے ان دونوں حضرات کے نزدیک ملکیت کے احکام اس پر جاری نہیں ہوں گے نہ وراثت جاری ہوگی اور نہ ہی اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی علامہ ابن نجیم نے البحر الرائق میں اور علامہ علاء الدین الحنفی نے درمختار میں "الدول الجبۃ" کے حوالہ سے امام صاحب کے قول کو ارفق بالناس قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ ایسا مال کم ہے جو حرام مال سے خالی ہو۔ اگر اس طرح کے اموال میں وراثت جاری نہ ہو اور زکوٰۃ واجب قرار نہ دی جائے تو وارثین اور فقراء و مساکین کا حق مارا جائے گا۔

اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مفتی بہ قول کے مطابق مذکورہ مغلوط مال پر زکوٰۃ واجب ہے لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ حقیقت میں اس مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اور امام صاحب اور صاحبین کے مابین اختلاف صرف وراثت کے جاری ہونے میں ہے نہ کہ وجوب زکوٰۃ میں۔ امام صاحب کے نزدیک ملکیت کی وجہ سے وراثت جاری ہوگی اور صاحبین کے نزدیک وراثت جاری نہیں ہوگی۔ لیکن تینوں کا اس پر اتفاق ہے کہ مذکورہ مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ اگر امام صاحب کا یہ قول کہ ملکیت ثابت ہو جائے گی تسلیم کر لیا جائے تو بھی ان کے قول کے مطابق زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ وہ مال مضمون بالدين ہے۔ اگر مالک کا پتہ ہو تو وہ مال مالک کے حوالہ کیا جائے گا ورنہ بلا نیت ثواب اس کا تصدق واجب ہوگا۔ اور وجوب زکوٰۃ کے لئے مال کا دیون سے فارغ ہونا بھی ضروری ہے۔

علامہ ابن نجیم نے البحر الرائق میں یہی اشکال کیا ہے۔ اور امام صاحب کے قول کے مطابق وجوب کی ایک شرط "المبتنی" کے حوالہ سے یہ نقل کی ہے کہ :

"زکوٰۃ اس شرط کے ساتھ واجب ہے کہ مالکان نے اس مال کی ادائیگی سے بری کر دیا ہو کیونکہ

بری کرنے سے قبل وہ مال مضمون بالدين ہے اس لئے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔"

علامہ ابن نجیم نے اس قید کو حسن اور اس کو محفوظ کر لینا واجب قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو البحر الرائق کی پوری عبارت :

”ولذا قالوا الرأى سلطاناً غصب مالا وغلطه صار ملكاً له حتى وجبت عليه الزكوة
وروي عنه على قول الحنفية لأن غلط دراهمه بدراهم غيره عنده استهارة
أما على قوله ما فلا يضمن فلا يثبت الملك لأنه فرع الضمان في الروي
عنه لأنه مال مشترك فانه يورث حصته الميت منه وفي الولي الحجة وقوله
أرفق بالناس إذ قلما يغلو مال عن غصب الخ هكذا ذكرنا وهو مشكل لأنه وإن كان
ملكه عند أبي حنيفة بالغلط فهو مشغول بالدين والشرط الفراغ عنه ينبغي
أن لا تجب الزكوة فيه على قوله أيضاً، لذا شرط في المبتغى بالفين المعجمه
أن يبرئه أصحاب الأموال لأنه قبل الإبراء مشغول بالدين وهو قيد
حسن يجب حفظه“

علامہ شامی نے اس موقع سے جو بحث کی ہے وہ بھی قابل ذکر ہے۔ علامہ شامی نے فتاویٰ تارغانیہ
کے حوالے نقل کیا ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے :

(الف) مال حرام و حلال کے مخلوط ہونے کی صورت میں اس پر قبضہ کرنے والا شخص اس مال کا مالک تو
ہو جائے گا لیکن وہ اس مال کا ضامن ہوگا۔

(ب) اگر مال مخلوط کے علاوہ بقدر نصاب حلال و طیب مال نہیں ہے تو مال مخلوط پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں
ہوگی اس لئے کہ وہ مشغول بالدين ہے۔

(۱) اگر مال مخلوط کے علاوہ دوسرا مال بقدر نصاب موجود ہے تو اس مال میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔
البتہ اس صورت میں مسئلہ قابل غور ہے کہ زکوٰۃ صرف زائد مال میں واجب ہوگی جو بقدر نصاب ہے
یا مال مخلوط میں بھی واجب ہوگی۔ اگر مال مخلوط میں زکوٰۃ واجب ہوگی تو پورے مال میں یا صرف جائز و پاک مال میں؟
علامہ شامی کی عبارت سے یہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ صرف زائد مال میں واجب ہوں۔ مال مخلوط
میں زکوٰۃ واجب ہی نہیں ہوگی۔

”وفى الفصل العاشر من التتارخانية عن فتاوى الحجة من ملا الأندلس“

طیبة أو غصب أموالاً و خلطها ملكها بالخلط و يصير فاما ان لم يكن له
سواها نصاب فلا زكوة عليه فيها وان بلغت نصاباً لأنه مدينون و مال المدين
لا ينعقد سبباً لوجوب الزكوة عندنا الخ فأفاد بقوله وان لم يكن له سواها
نصاب الخ أن وجوب الزكوة مقيد بما اذا كان له نصاب سواها.....

لكن لا يخفى أن الزكوة حينئذٍ انما تجب فيما زاد عليها الا فيها...
لیکن اس سلسلہ میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ اگر مال حرام کی مقدار معلوم و متعین ہو تو حرام مال کی
مقدار کے علاوہ جو جائز مال کی مقدار ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور حرام مال کے بقدر صدقہ کرنا ہوگا۔ اور اگر حرام و
حلال دونوں باہم اس طرح مخلوط ہیں کہ ان دونوں میں سے کسی کی بھی مقدار معلوم نہیں ہے تو پورے مال مخلوط
پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ بلکہ پورے مال کو صدقہ کرنا ہوگا۔

مال حرام کا مالک معلوم ہونے اور نہ ہونے پر زکوٰۃ کا حکم

اس موقع سے یہ بحث بھی قابل ذکر ہے کہ اگر مال حرام کا مالک معلوم و متعین ہو تو کیا حکم ہے اور اگر معلوم
و متعین نہ ہو تو کیا حکم ہے؟ دونوں صورتوں میں حکم یکساں ہے یا کوئی فرق بھی ہے؟
علامہ شامی نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ ان کی بحث سے دو رائے سامنے آتی ہیں۔
۱۔ اگر مالک معلوم و متعین نہ ہو تو ایسی صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس لئے کہ وہ دین مانع و وجوب زکوٰۃ
ہے جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ ہو۔ اور جب مالک کا پتہ ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ اس دین کا مطالبہ
کرنے والا کوئی بندہ رہا نہیں۔ علامہ شامی نے اپنے شیخ کی یہی رائے نقل کی ہے۔
۲۔ مال حرام کا مالک معلوم و متعین ہو یا نہ ہو بہر دو صورت زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ بلکہ کل مال کا تصدق واجب
ہوگا۔ علامہ شامی کا رجحان بھی یہی ہے۔

”كما افاده شيخنا بأن المراد ما اذا لم يعلم اصحاب المال المغصوب

لأن الدين انما يمنع وجوب الزكوة اذا كان له مطالب من جهة العباد و يعهل

اصحابہ لا یبقی لہ مطالب فلا یمنع وجوبہا قلت لکن قد مناعنا عن الفنیۃ والبنائز^۲
انما وجب التصدق بکلمہ لا یفید التصدق ببعضہ لأن المنصوب ان علمت
اصحابہ اور رشتہم وجب ردہ علیہم والا وجب التصدق بہ“ لہ

خلاصہ جواب

(الف) اگر مال مخلوط میں مال حلال و حرام کے درمیان تمیز مشکل ہو اور مال حرام و حلال کی مقدار بھی معلوم متعین نہ ہو تو کل مال کا تصدق واجب ہوگا۔ اس طرح کے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔
(ب) اگر مال مخلوط کے علاوہ جائز و طیب مال بقدر نصاب موجود ہو تو اس زائد مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔
(ج) مال مخلوط میں اگر حلال و حرام دونوں کی مقدار معلوم و متعین ہو تو مال مخلوط کے حلال مال کی مقدار پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور مال حرام کے بقدر صدقہ کرنا ہوگا۔

دین پر زکوٰۃ

جواب ۵: دین پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ اگر واجب ہے تو دائن اور مدیون دونوں پر یا کسی ایک پر؟
اس سلسلہ میں درج ذیل تفصیل ہے:

- ۱۔ دائن اور مدیون دونوں پر زکوٰۃ واجب ہو۔ اس کا قائل کوئی بھی فقہ نہیں ہے۔
- ۲۔ دائن اور مدیون دونوں میں سے کسی پر بھی دین کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اس کے قائل حضرت عکرمہ اور حضرت عطاء ہیں۔ ابن حزم نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ کا یہی قول نقل کیا ہے۔ اصحاب طواہر کا مسلک بھی یہی ہے۔ امام مالک کا مسلک بجز چند استثنائی صورتوں کے تقریباً یہی ہے۔
- یہ حضرات فرماتے ہیں کہ دین میں وجوب زکوٰۃ کی بنیادی شرط ”ملک تام“ نہیں پائی جا رہی ہے۔ نہ تو دائن کی ملکیت تام ہے اور نہ ہی مدیون کی۔ مدیون کے قبضہ و تصرف میں ہے، لیکن اصل ملکیت حاصل نہیں ہے اور دائن کو اصل ملکیت حاصل ہے۔ لیکن اس کے قبضہ و تصرف میں نہیں ہے۔ لہذا ملک تام نہ پاتے جانے کی وجہ سے کسی پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

۳۔۔۔ دور صحابہ سے لے کر ان کے بعد تک کے جمہور فقہائے کے نزدیک مدیون پر تو زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ البتہ دائن پر کچھ تفصیل کے ساتھ زکوٰۃ واجب ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

دین کی فتہیں

یہ حضرات دین کی دو قسمیں کرتے ہیں۔

(الف) — دین غیر مرجو — وہ دین جس کے ملنے کی امید نہ ہو مثلاً ایسے نادار اور مفلس پر دین ہو جس کی مالدار کی امید نہ ہو۔ یا ایسے شخص پر دین ہو جو دین کا انکار کرتا ہو اور کوئی شرعی شہادت موجود نہ ہو۔

(ب) دین مرجو — وہ دین جس کے ملنے کی امید ہو مثلاً کسی ایسے صاحب مال پر دین ہو جو اس دین کا اقرار بھی کرتا ہو۔

جس دین کے ملنے کی امید نہ ہو اس پر زکوٰۃ کا حکم

حضرت علی اور حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ :

”جس دین کے ملنے کی امید نہ ہو اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ البتہ اس کی ادائیگی اس پر قہر کے

بعد لازم ہوگی۔ اور قبضہ کے بعد گزشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

حضرت امام شافعی اور حضرت امام زفر بھی یہی فرماتے ہیں۔ اس لئے کہ ان حضرات کے نزدیک ملک سے مراد اس مال کا مکمل مالک ہونا ہے۔ خواہ وہ قبضہ و تصرف میں ہو یا نہ ہو۔ اسی وجہ سے ان حضرات کے نزدیک مال فہار میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جب اس مال میں ملکیت باقی ہے تو جو حق اللہ ہے یعنی زکوٰۃ وہ کیسے ساقط ہو گا۔

امام ابو حنیفہ اور ان کے دونوں شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک اس طرح کے دین کا حکم "مال ضمار" کا ہے۔ مال ضمار (وہ مال جس سے انتفاع پر قدرت نہ ہو) کی طرح قبضہ سے قبل اس دین پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ قبضہ کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ کا وجوب ہوگا۔

یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جب اس دین کے ملنے کی امید نہیں ہے اور نہ اس سے انفعاع پر قدرت ہے تو اس مال کی وجہ سے غنا کا تحقق نہیں ہوگا۔ اور زکوٰۃ غنی (صاحب نصاب) پر واجب ہے نہ کہ غنیر صاحب نصاب پر۔

علامہ یوسف القرضاوی نے ”فقہ الزکوٰۃ“ میں اس مسئلہ پر مدلل اور سیر حاصل بحث کی۔ پتہ اور
اور اخیر میں امام صاحب کی رائے سے مکمل موافقت کا اعلان کیا ہے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔

”ونحن نوافق أبا حنيفة في اعتبار هذا النوع من الدين المجهود والميتوس منه

والعمال الضمار بصفة عامة إذا قبضه صاحبه كالعمال الجديد المستفاد“ ۱۷

جس دین کے ملنے کی امید ہو اس پر زکوٰۃ کا حکم

جس دین کے ملنے کی امید ہو اس سلسلہ میں فقہاء احناف کی دو رائیں ہیں۔

۱۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک جس دین کے ملنے کی امید ہو وہ ”دین قوی“ ہے۔ ہر سال اس
پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی قبضہ کے بعد لازم ہوگی۔ اور قبضہ کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی
ادا کرنی ہوگی لیکن مقتول کی دیت اور بدل کتابت پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ بلکہ قبضہ کے بعد سال
گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

یہ دونوں حضرات فرماتے ہیں کہ :

”بدل کتابت اور مقتول کی دیت کے علاوہ اس طرح کے تمام دیون پر صاحب دین کو ملک تام“
حاصل ہے اس لئے کہ وہ دین کی وصولیابی پر قادر ہے۔ جب چاہے وہ اس کا بدل وصول کر سکتا
ہے لہذا اس طرح کے تمام دیون پر ملک تام“ پانے جانے کی وجہ سے قبضہ سے قبل بھی زکوٰۃ واجب
ہوگی۔ البتہ دیت اور بدل کتابت پر دائن کی ملکیت ناقص ہے اس لئے ان دونوں میں قبضہ سے
قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ دیت پر اس لئے ملکیت ناقص ہے کہ اگر تاتل کے عاقلہ میں سے
کسی کا انتقال ہو جائے تو اس پر جو دیت ہے وہ ساقط ہو جائیگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دیت پر
مقتول کے وارثین کی ملکیت ناقص ہے۔ ورنہ مرنے والے کے ذمہ دین کے ساقط ہونے کا
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے اور بدل کتابت“ درحقیقت دین ہی نہیں ہے اس لئے کہ مکاتب
پر جب تک ایک درہم بھی باقی ہو وہ غلام ہے اور غلام پر آقا کا دین واجب نہیں ہوتا۔ ہے۔

مکاتب جو کچھ بھی کماتے ہیں اس پر من وجہ آقا کی ملکیت بھی رہتی ہے اور من وجہ مکاتب کی بھی۔
آقا کی ملکیت تو اس لئے رہتی ہے کہ غلام کا جو بھی مال ہے وہ آقا کا ہے اور مکاتب کی ملکیت اس
لئے رہتی ہے کہ مکاتب اپنی کمائی میں آزاد ہے۔“

۲۔ امام صاحب اس طرح کے دیون کی تین قسمیں کرتے ہیں۔ دین قوی۔ دین متوسط اور دین ضعیف۔

دین قوی

کسی کا قرض کہ جس کے ذمہ ہو یا تاجر نے سامان تجارت فروخت کیا اور خریدنے والے کے ذمہ
اس کی قیمت باقی ہے، اس کو دین قوی کہتے ہیں۔ اس کا حکم یہ ہے کہ سال گزرنے کے بعد قبضہ سے قبل بھی ہر سال
زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ اس کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب کہ نصاب زکوٰۃ کے $\frac{1}{5}$ کے برابر یعنی چالیس درہم
یا اس کی مالیت کے بقدر رقم وصول ہو جائے۔ اس سے قبل زکوٰۃ کی ادائیگی لازم نہیں ہوگی لیکن ادائیگی کے وقت
گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی حساب کر کے ادا کرنا ہوگی۔

واضح رہے کہ ایک درہم کا وزن تین ماشہ اور $\frac{1}{2}$ رتی چاندی کے برابر ہوتا ہے۔ آٹھ رتی برابر ایک
ماشہ اور بارہ ماشہ برابر ایک تولہ ہوتا ہے۔ اس طرح چالیس درہم کا وزن دس تولہ چھ ماشہ چاندی کے برابر ہوا۔
گویا کہ ”دین قوی“ میں زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب کہ دس تولہ اور چھ ماشہ چاندی یا اس کی قیمت کے
بقدر قرض وصول ہو جائے۔

دین متوسط

وہ قرض جو کسی سامان کی قیمت ہو لیکن وہ سامان تجارت کی قیمت نہ ہو۔ اس کو دین وسط کہتے
ہیں۔ اس دین پر زکوٰۃ واجب ہونے کے سلسلہ میں امام ابو حنیفہؒ سے دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا حکم دین قوی
کی طرح ہے کہ دین قوی کی طرح اس میں بھی گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ البتہ اس میں زکوٰۃ کی ادائیگی
اس وقت لازم ہوگی جب کہ دو سو درہم یعنی ساڑھے باون ($\frac{1}{2} \times 52$) تولہ چاندی یا اس کے بقدر قرض وصول ہو جائے۔
امام صاحب سے دوسری روایت یہ ہے کہ اس میں دین ضعیف کی طرح گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب
نہیں ہوگی، بلکہ قبضہ کے بعد جب سال گزر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔ صاحب بدائع وغیرہ نے اسی دوسرے
قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ ۷

دین ضعیف

وہ قرض جو کسی مال کے عوض دیون پر عائد نہ ہو خواہ وہ کسی چیز کا معاوضہ ہی نہ ہو جیسے حصہ میراث یا وصیت کا مال جو کسی پر قرض ہو یا کسی چیز کا معاوضہ تو ہو لیکن مال کا معاوضہ نہ ہو مثلاً مہر یہ معاوضہ تو ہے لیکن مال کا معاوضہ نہیں ہے بلکہ ملک بضمہ کا معاوضہ ہے جو مال نہیں ہے۔ اس کو دین ضعیف کہتے ہیں۔ دین ضعیف پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ قبضہ کے بعد جب سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ دیون کی مذکورہ بالا تقسیم اور دین قوی "پر زکوٰۃ واجب ہونے اور دین متوسط" اور دین ضعیف پر زکوٰۃ واجب ہونے کے سلسلہ میں امام صاحب کے دو نقطہ نظر ہیں۔

۱۔ پہلا نقطہ نظر یہ ہے کہ دین درحقیقت مال نہیں ہے بلکہ صاحب دین کو مال کا مالک بنادینے اور مال اس کے حوالہ کر دینے کا ایک داعی اور ضروری عمل ہے اور ظاہر ہے کہ عمل مال نہیں ہے لہذا جب دین مال نہیں تو اصولاً تمام دیون میں زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے کیونکہ زکوٰۃ مال میں واجب ہوتی ہے۔ البتہ جو دین مال تجارت کے عوض میں ہو وہ مال کے حکم میں ہے کیونکہ کسی چیز کا بدلہ اس کے قائم مقام ہوا کرتا ہے گویا کہ خود مال تجارت اس کے قبضہ میں ہے جس پر سال گزر رہا ہے لہذا اصولاً و شرعاً "دین قوی" میں زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے۔ دوسرے دیون میں نہیں۔

۲۔ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر دین کو مال مملوک تسلیم کر دیا جائے تب بھی چوں کہ یہ قبضہ تصرف میں نہیں ہے اور نہ ہی اس پر قبضہ کا احتمال ہے کیوں کہ دین ذمہ میں واجب ہے حقیقتاً مال نہیں ہے اور جو چیز ذمہ میں واجب ہو اس پر قبضہ کا احتمال نہیں رہتا ہے اس لئے مال مملوک تسلیم کر لینے کی صورت میں بھی تمام دیون پر اصولاً زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے۔ البتہ جو دین مال تجارت کے عوض میں ہو اس کو مال تجارت کے قائم مقام دیتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس پر قبضہ کا احتمال ہے کیونکہ کسی شے کا بدلہ اس شے کے قائم مقام ہوتا ہے لہذا اس دین پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے۔

دیون کی اس تقسیم اور عدم تقسیم کے سلسلہ میں فتویٰ امام صاحب کے قول پر ہے۔ اسی قول کو عام مشائخ نے اختیار کیا ہے۔ البتہ صاحبین کا قول اختیار کرنا احوط ہے۔ ۱۷

۱۷ دیون کی اس پوری تفصیل کے لئے دیکھئے مبداً فی الصنائع ج ۲ ص ۸۳ تا ۸۴ البحر الرائق ج ۲ ص ۲۷ اور فتاویٰ رضائید

پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر زکوٰۃ

سرکاری محکمے یا پرائیویٹ کمپنیز یا ادارے اپنے اپنے ملازمین کی تنخواہ جو رقم قانوناً اور جبراً ہر ماہ وضع کر کے اس میں اضافہ کے ساتھ ملازمین کے محفوظ کھاتے میں رکھ دیتے ہیں۔ اور ان کے ریٹائرمنٹ کے بعد ان کو یا ان کے انتقال کے بعد ان کے وارثین کو اضافہ شدہ رقم کے ساتھ پوری رقم واپس کر دیتے ہیں جس کو آج کی اصطلاح میں پراویڈنٹ فنڈ کہا جاتا ہے۔ اس پوری رقم کے حقدار وہ ملازمین ہوتے ہیں۔ یا ان کا واجبی حق ہے جو ان کو یا ان کے وارثین کو ملنا ہی ہے۔ لہذا اس کی حیثیت ایسے دین کی ہوگی جس کے ملنے کی امید ہو۔

چوں کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک وہ دین جس کے ملنے کی امید ہو وہ دین قوی ہے اور اس پر ہر سال زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ قبضہ کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنا ہوتی ہے اس لئے ان دونوں حضرات کے نزدیک پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر قبضہ سے قبل بھی ہر سال زکوٰۃ واجب ہوگی اور قبضہ کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنا ہوگی۔ علامہ یوسف القرضاوی نے بھی "فقه الزکوٰۃ" میں یہی بات لکھی ہے اور ان کی رائے بھی صاحبین کی رائے کے موافق ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

"فالذی أرحجه أن ملكه في هذه الحال ملك تام وهي كالدين المرجو الذي

قال فيه أبو عبيد الله بمنزلة المال الذي في يده فحينئذ تجب فيها الزکوٰۃ

فكل حول اذا بلغت نصيباً وتوفرت الشروط الاخرى من السلامة من الدين

ونحوه" ۱۷

البتہ امام ابو حنیفہؒ کے اصول کے مطابق غور کرنا ہوگا کہ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم دیون کی کس قسم میں داخل ہے ؟ یا "دین قوی" میں یا "دین متوسط" میں یا "دین ضعیف" میں یا "مال ضار" میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ "دین قوی" ہو نہیں سکتا ہے اس لئے کہ "دین قوی" مال تجارت کا معاوضہ ہوتا ہے یا دیا ہوا قرض ہوتا ہے اور پراویڈنٹ فنڈ کی رقم ان میں سے نہ تو مال تجارت کا معاوضہ ہے اور نہ ہی دیا ہوا قرض۔ یہ "دین متوسط" بھی نہیں اس لئے کہ "دین متوسط" کسی غیر تجارتی مال کا معاوضہ ہوتا ہے اور پراویڈنٹ فنڈ کی رقم مال کا معاوضہ نہیں ہے بلکہ خدمت کا

معاوضہ ہے جو مال نہیں ہے۔ خدمت مال ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں حسب تصریحات فقہاء "عبد تجارت" (وہ غلام جو تجارت کے لئے ہو) کی خدمت تو مال ہے لیکن کوئی بھی فقیہ آزاد شخص کی خدمت کو مال قرار نہیں دیتا ہے۔ اس رقم کو "مال ضمار" میں بھی شامل نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس دین کے ملنے کی امید ہے۔ اب لایزالہ اس کو "دین ضعیف" میں شامل کرنا ہوگا جس پر قبضہ کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اوپر دیوں کی تفصیل میں یہ بات گزر چکی ہے امام ابوحنیفہ کا قول راجح اور مفتی یہ ہے اور صاحبین کا قول احوط ہے لہذا مفتی بہ قول کے مطابق پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ بلکہ قبضہ کے بعد جب اس پر سال گزر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی یا اگر پہلے سے بقدر نصاب اس کے پاس مال موجود ہو جس پر سال گزر رہا ہو تو مال مستفاد کی طرح اس رقم کو بھی سابق نصاب کے ساتھ ضم کر کے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ قبضہ کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کرنی ہوگی۔

وجوب زکوٰۃ کی دوسری شرط شمار

وجوب زکوٰۃ کی دوسری شرط مال کا "نامی" ہونا ہے۔ مال غیر نامی میں زکوٰۃ شرعاً واجب نہیں ہے۔ وجوب زکوٰۃ کے لئے "مال نامی" کی شرط کیوں ہے۔ اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں :

"زکوٰۃ کی مشروعیت اس لئے ہے تاکہ اللہ تعالیٰ نے جس کو مال و دولت سے سرفراز فرمایا ہے وہ اپنے مال کا کچھ حصہ نکال کر فقراء و مساکین کو دے جس سے ان کی غنوائی ہوگی۔ زکوٰۃ میں اتنا مال نہ دے جس سے وہ خود فقیر ہو جائے۔ اگر ایسے مال میں زکوٰۃ واجب قرار دی جائے جس میں "نمو" کی صلاحیت نہ ہو تو زکوٰۃ دینے والا خود ہی فقیر ہو جائے گا جو اسلامی روح کے خلاف ہے۔"

شمار کی حقیقت

شمار کا لغوی معنی مطلق زیادتی ہے۔ جب مال میں اضافہ ہو تو "نمی المال" کہا جاتا ہے اور جب کسی کے مال میں زیادتی کی دعائی ہو تو اس وقت "انشاء اللہ تعالیٰ" کہا جاتا ہے۔ نمائے لغوی معنی سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ "مال نامی" وہ مال کہلائے گا جس میں حقیقتہً زیادتی ہو۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے اور نہ ہی مقصود ہے۔

بلکہ زیادتی خواہ حقیقت ہو یا مال کو زیادتی کے لئے تیار کیا گیا ہو یعنی تجارت یا سائمہ بنانے کے ذریعہ اس میں زیادتی ہو سکتی ہو۔ بالفاظ دیگر ہر وہ مال "مال نامی" کہلائے گا جس میں اضافہ پر قدرت ہو۔ خواہ براہ راست یا اپنے نائب کے ذریعہ۔ صاحب بدائع الصنائع علامہ کا سانی لکھتے ہیں :

"ومنها ان يكون المال نامياً لان معنى الزكوة وهو النماء لا يحصل الا من المال النامي لئلا معنى به حقيقة النماء لان ذلك غير معتبر وانما معنى به كون المال معدلاً مستقماً، بالتجارة او بالاسامة" ۱

نمار کی قسمیں نمار کی شرعاً دو قسمیں ہیں۔ حقیقی اور تقدیری۔

نمار حقیقی سے مراد یہ ہے کہ تجارت یا سائمہ جانوروں کے ذریعہ حقیقت یعنی بالفعل زیادتی حاصل کی جائے۔ نمار تقدیری سے مقصود یہ ہے کہ زیادتی پر قدرت ہو خواہ براہ راست اضافہ پر قادر ہو یا اپنے نائب کے ذریعہ۔ علامہ شامی البحر الرائق کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں :

"وفي الشرع هو نوعان حقيقي وتقديرى فالحقيقي الزيادة بالتوالد والتناسل

والتجارات والتقديرى تعكسه من الزيادة بكون المال في يده او نائبه بغيره

علامہ زلمی نے کنز الدقائق کی اپنی مشہور ترین شرح "تبیین الحقائق" میں نمار کی حقیقت اور اس کی قسموں پر بحث کرتے ہوئے "نمار" کی دوسری قسم بھی بیان کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ :

"نمار حقیقی اور نمار تقدیری دونوں میں سے ہر ایک کی دو ادو قسمیں ہیں۔ خلقی اور فعلی"

نمار خلقی سے مراد سونا اور چاندی ہے کہ یہ دونوں تجارت کے لئے ہی پیدا کئے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے ان دونوں میں تجارت کی نیت ہو یا نہ ہو بہر دو صورت زکوٰۃ واجب ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر خرچ کرنے کے لئے رکھے گئے ہوں تب بھی شرعاً ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

نمار فعلی سے مقصود یہ ہے کہ اس مال کی خلقت تو نمار کے لئے نہ ہو لیکن بندہ نے اس کو نمار کے لئے تیار کر دیا ہو مثلاً مال کو تجارت کی نیت سے یا جانور کو سائمہ بنانے کی غرض سے خرید اتوان دونوں صورتوں میں نمار

فعلًا پائی جائے گی۔ ملاحظہ ہو تبیین الحقائق کی عبارت:

وینقسم کل واحد منهما إلى قسمين المخلوق وفعلی الخلق الذهب والفضة
لأنهما خلقا للتجارة فلا يشترط فيهما النية والفعل ما يكون مباحدا العبد
وهو العمل بنية التجارة الخ

سوننا اور چاندی کی خلقت تجارت کے لئے ہوئی ہے۔ اس کا مطلب شیخ شبلی نے تبیین الحقائق کے
حاشیہ پر علامہ کمال کے حوالہ سے یہ بیان کیا ہے کہ ان دونوں کی تخلیق ہی اس لئے ہوئی ہے کہ ان کے ذریعہ
دوسری چیزیں حاصل کی جائیں تاکہ ان سے کھانے، پینے، پہننے اور رہائشی وغیرہ کی ضرورت پوری ہو سکے۔ اس
طرح گویا کہ ان کی تخلیق تجارت کے لئے ہوئی ہے۔

”قال الكمال رحمه الله وقولهم في النقد ين خلقا للتجارة معناه انهما خلقا
للتوسل بهما التعميل غيرهما وهذا لان الضرورة ماسة في دفع الحاجة
والحاجة في المأكل والمشرب والملبس والمسكن وهذه غير نفس
النقدين وفي أحد هما على التقلب ما لا يخفى فخلق النقد ان لا يفرض
ان يستبدل بهما ما تندفع الحاجة بعينه بعد خلق الرغبة فيهما
فكانا للتجارة خلقا“

مال نامی کی ایک قسم ”عرنی“ کی بھی ہے۔

نمار عرنی

یعنی وہ مال جس کو اللہ تعالیٰ نے نمو کے لئے پیدا نہیں فرمایا لیکن لوگوں نے اس کو مال نامی
خلقی کے قائم مقام قرار دے دیا۔ اس طرح وہ مال ”عرنی“ مال نامی قرار پایا۔ مثلاً سونا، چاندی کے علاوہ
مختلف مالک کی مختلف کرنسیاں۔ جیسے کاغذی نوٹ، سکے، ڈالر اور ریال وغیرہ۔
اس طرح نمار کی کل چھ قسمیں ہو جاتی ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ نمار حقیقی خلقی ۲۔ نمار حقیقی عملی ۳۔ نمار حقیقی عرنی ۴۔ نمار تقدیری خلقی ۵۔ نمار تقدیری عملی

۶۔ نمار تقدیری عرنی۔

مال غیر نامی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے نمونہ شرط ہے تو اس مال پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے جس میں سرے سے ”نمو“ کی صلاحیت ہی نہیں ہے یا نمو کی صلاحیت تو ہے لیکن مالک کو کسی طرح بھی ”نمو“ پر قدرت نہیں ہے نہ براہ راست اور نہ ہی اپنے نائب کے ذریعہ۔ اسی وجہ سے مال ضمار، مال مفقود، مال مغمضو یا اس طرح کے دیگر اموال پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح ضروریات کے سامان پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لئے کہ اس طرح کے اموال ”مال نامی“ سے خارج ہیں۔ علامہ ابن نجیم نہاد اور اس کی قسموں کو بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں :

” فلا زکوٰۃ علی من لم يتمكن منها في ماله كمال الضمار الخ “ ۱

نمو سے عجز کی دو صورتیں ہیں

اس موقع سے اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ایک ہے مال کا ”نمو“ سے عاجز ہونا مثلاً مال ضمار وغیرہ۔ دوسری صورت ہے مالک کا عاجز ہونا مثلاً مال قبضہ میں ہے لیکن مالک تجارت وغیرہ کے ذریعہ نما پر قادر نہیں ہے۔ پہلی صورت میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ البتہ دوسری صورت میں زکوٰۃ واجب ہے اس لئے کہ مالک کا عجز شرعاً معتبر نہیں ہے کیونکہ وہ ایسا حیلہ اختیار کر سکتا ہے جس سے مال میں اضافہ ہو مثلاً شترت، مضاربہ وغیرہ کا معاملہ کر لے۔ بہر حال اسباب کے مہیا کرنے سے وہ عاجز نہیں ہے۔ لہذا مالک کے عاجز ہونے کے باوجود ”مال نامی“ پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ ۲۔

مال نامی کا دائرہ

مال نامی سے متعلق ایک اہم بحث یہ آتی ہے کہ ”مال نامی“ کا دائرہ محدود و مخصوص ہے یا غیر محدود اور عام؟ اس سلسلہ میں دو نظریے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ ابن شوکانی اور صدیق حسن خان وغیرہ اس بات کے قائل ہیں کہ ”مال نامی“ کا دائرہ محدود ہے

اور انھیں خاص اصناف پر زکوٰۃ واجب ہے جن پر زکوٰۃ لینے کا ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ ابن حزم نے اپنی مشہور کتاب "محلّی" میں ان کی تعداد آٹھ بتلائی ہے۔

۱۔ اہل ۲۔ بقر ۳۔ غنم ۴۔ مرقع ۵۔ شعیر ۶۔ تمر ۷۔ فضہ ۸۔ ذہب

ان کے علاوہ دوسرے اصناف پر جن پر زکوٰۃ لینے کا ثبوت احادیث سے نہیں ہے زکوٰۃ واجب قرار نہیں دیتے ہیں۔ یہ حضرات اس سلسلہ میں دو باتیں فرماتے ہیں:

(الف) مسلمان کا مال محترم ہے جس کا ثبوت نصوص سے ہے لہذا بغیر نفس کے مسلمان کے مال سے کچھ لینا جائز نہیں ہے (ب) زکوٰۃ تکلیف شرعی ہے اس میں تیس کا کوئی دخل نہیں ہے۔

۲۔ جمہور صحابہ، تابعین، محدثین اور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ "مال نامی" کا دائرہ غیر محدود اور عام ہے۔ جس مال میں بھی "نمو" کی صلاحیت موجود ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اگرچہ نصوص سے اس مال پر زکوٰۃ لینے کا ثبوت نہ ہو۔ جمہور کے نسریہ کی بنیاد چند اصولوں پر قائم ہے جو درج ذیل ہیں:

(الف) قرآن کریم کی جن آیات اور احادیث نبویہ کی جن روایات سے زکوٰۃ کا وجوب معلوم ہوتا ہے وہ عام ہیں۔ ان میں کوئی قید نہیں کہ فلاں مال میں زکوٰۃ واجب ہے اور فلاں میں نہیں۔ البتہ روایات سے یہ واضح ہے کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے "مال نامی" ہونا ضروری ہے اس لئے "مال نامی" کی قید لگائی جاتی ہے۔

(ب) ہر مالدار (صاحب نصاب) پر ضروری ہے کہ وہ اخلاقِ رضیہ نخل اور لایج وغیرہ سے پاک صاف ہو اور مال کی محبت اس کے دل سے نکل جائے اور یہ طہارت مال میں زکوٰۃ لکانے کے ذریعہ ہو سکتی ہے جو کسی بھی مال کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ جس مال سے بھی وہ زکوٰۃ دے گا اس کا تزکیہ ہوگا۔

(ج) مال کی طہارت بھی ضروری ہے تاکہ کمائی کے دوران کچھ تشبہات پیدا ہوئے ہوں وہ دور ہو سکیں اور مال کی طہارت اس کی زکوٰۃ دینا ہے۔ جو صرف مذکورہ آٹھ قسموں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر مال نامی کی طہارت ضروری ہے۔

(د) زکوٰۃ کی مشروعیت فقراء و مساکین کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہے اور ان کی ضرورت صرف

مذکورہ اموال سے پوری نہیں ہوگی بلکہ ہر مال نامی سے ان کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ اس کا تقاضہ

تو یہ تھا کہ اموال غیر نامیہ میں بھی زکوٰۃ واجب ہو لیکن چونکہ روایات میں اموال نامیہ کی محدود لگائی گئی ہے

اس لئے اموال غیر نامیہ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

جہاں تک مالِ مسلم کے احترام کا تعلق ہے تو وہ خاص اس کی ملکیت میں ہے۔ زکوٰۃ تو حق اللہ یا بالفاظ دیگر حق الجماعہ ہے۔ اس کی وصولیابی تو بہر حال ضروری ہے۔ اور جہاں تک ان اموال سے زکوٰۃ وصول نہ کرنے کا تعلق ہے تو یہ تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان اموال میں "نمو" کی صلاحیت کمزور تھی اس لئے ان کے مالکان کی رعایت کرتے ہوئے زکوٰۃ معاف کر دیا یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اموال کے مالکان کو اپنا نائب بنا کر زکوٰۃ دینے کا حکم دے دیا ہو۔ بہر حال! جمہور کا مسلک صحیح ہے۔ "مال نامی" کا دائرہ غیر محدود اور عام ہے لہ

وجوب زکوٰۃ کی تیسری شرط — حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہونا ہے

وجوب زکوٰۃ کی شرطوں میں سے ایک بنیادی شرط "اموالِ نامیہ" کا حوائجِ اصلیہ سے زائد ہونا ہے جو مالِ حوائجِ اصلیہ میں شامل ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لئے کہ اس مال کے ذریعہ غنی کا تحقق نہیں ہوتا ہے اور زکوٰۃ شرعاً غنی پر واجب ہے نیز حوائجِ اصلیہ میں شامل اموال پر زکوٰۃ کی ادائیگی خوش دلی سے نہیں ہو سکتی ہے جب کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "ادوا زکوٰۃ اموالکم طیبۃ بھا انفسکم" یعنی اپنے اموال کی زکوٰۃ خوش دلی سے نکالو لہ

حاجت کے ساتھ اصلیہ کی قید کیوں لگائی گئی ہے اس پر بحث کرتے ہوئے علامہ یوسف القرضاوی نے بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ :

"چوں کہ انسان کی حاجتیں بشمار اور لامحدود ہیں۔ خاص طور سے اس زمانہ میں جب کہ تعیش و کمال، حاجت کا اور حاجت، ضرورت کا درجہ اختیار کر چکی ہے اس لئے ہر وہ چیز جس کی خواہش انسان رکھتا ہے اس کو حاجتِ اصلیہ میں شمار کر کے وجوب زکوٰۃ سے خارج نہیں کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ انسان حریص ہے اگر اس کو سونے کی دو وادی مل جائے تو خواہش کرے گا کہ تیسری بھی مل جائے۔"

ملاحظہ ہو عبارت :

"وانما قلنا: الحاجة الاصلية؛ لان حاجات الناس كثيرة ولا تكاد

تقتاھی، وخاصة فی عصرنا الذی تکاد تصیح فیہ الکمالیات حاجیات والعاجیات
ضروریات فلیس کل ما یرغب فیہ الانسان یُعَدُّ حاجة اصلیة لان ابن
آدم لو کان لہ وادیان من ذهب لابتغی ثالثاً ۛ

حاجت اصلیہ کی تعریف

حاجت اصلیہ کسے کہتے ہیں؟ اس کی تعریف علامہ یوسف القرضاوی نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:
”ولکن الحاجات الاصلیة ما لا غنی للانسان عنه فی بقا لکما کله وملبسہ
ومشربه ومسکنہ وما یحییہ علی ذلک من کتب علمہ وفنہ
وادوات حرفتہ ونحو ذلک“

یعنی حاجت اصلیہ ہر وہ چیز ہے جو انسان کی بقا کے لئے ضروری اور معین ہو۔ دگر جو جیسے کہ کھانا،
پکڑا، پانی یا رہائشی مکان یا جس علم و فن کو حاصل کرنے والا ہے اس علم و فن کی کتابیں یا جس پیشہ کو اختیار کر رہے
والا ہو اس پیشہ کے آلات وغیرہ ۛ

فقہاء احناف نے حاجت اصلیہ کی نہایت ہی علمی اور دقیق تفسیر بیان کی ہے۔ چنانچہ علامہ شامی
ابن ملک کے حوالہ سے تحریر کرتے ہیں:

”وهی ما یدفع الہلاک عن الانسان تعقیقاً کالنفقة و رد الیسکنی والآلات
الحرب والشیاب المحتاج الیہا لدفع الحر والبرد او تقدیراً کالدین
فان المدیون محتاج الی قضائہ بما فی یدہ من النصاب دفعاً عن
نفس الحبس الذی ھو کالہلاک والآلات الحرفة واثاث المنزل ودواب
الركوب وکتب العلم لاهلہا فان الجہل عندہم کالہلاک“ ۛ

یعنی حاجت اصلیہ سے مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان کو ہلاکت سے محفوظ رکھے خواہ وہ ہلاکت حقیقی ہو

یا تقدیری حقیقی کی مثال نفقہ، رہائشی مکان، آلات حرب، سردی، گرمی سے بچنے کے لئے ضروری کپڑے ہیں اور تقدیری کی مثال "دین" ہے اس لئے کہ مدیون اس بات کا محتاج ہے کہ اس کے پاس جو مال ہے وہ اس کو دے کر قرض کی ادائیگی کر دے تاکہ قید وغیرہ سے محفوظ رہ سکے کیوں کہ قید ایک طرح سے ہلاکت ہی ہے۔ آلات حرفہ، گھریلو سامان اور سواری کے جانور بھی تقدیری کی مثال ہیں اسی طرح علم دفن حاصل کرنے والوں کے لئے اس علم و فن کی کتابیں ہیں کیوں کہ جہالت ہلاکت کے مانند ہے۔

خلاصہ یہ کہ حاجت اصلیت میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو انسان کی بقا اور اس کے وجود کے لئے ضروری ہیں۔ اور جو اس کو ہلاکت سے محفوظ رکھ سکیں خواہ حقیقتہً ہو یا تقدیراً۔

حاجت اصلیت کا دائرہ

یہاں پر ایک بحث یہ ہے کہ حاجت اصلیت کا دائرہ کیا ہے؟ آیا جس شخص کے مال پر زکوٰۃ واجب ہے اسی کی ضروریات کی چیزیں حوائج اصلیت میں شامل ہوں گی یا دوسرے لوگوں کی ضروریات بھی اس کے حوائج اصلیت کے تحت آئیں گی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حاجت اصلیت کا دائرہ صرف زکوٰۃ دینے والے تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی ضروریات کے ساتھ بیوی، نابالغ اولاد یا جن بالغ اولاد کا نفقہ اس پر واجب ہے۔ اسی طرح والدین اور دیگر رشتہ دار جن کا نفقہ واجب ہے ان سب کی ضروریات اس کے حوائج اصلیت میں شمار ہوں گی۔

”والمعتبر هنا: الحاجات الأصلية للمكلف بالزكاة، ومن يموله

من الزوجة والاولاد - مهما بلغ عددهم - والوالدين والاقارب الذين

تلتزمه نفقتهم فان حاجتهم من حاجته“ ۱۵

حاجت اصلیت کا تعین ہر دور کے اعتبار سے ہوگا

چوں کہ زمانہ، حالات اور ماحول کی تبدیلی سے لوگوں کی حاجت و ضرورت میں تبدیلی آتی رہتی ہے ہر دور میں ہر ایک کی حاجت و ضرورت یکساں نہیں ہوتی۔ ایک چیز ہے جو عام انسانوں کی حاجت و ضرورت ہے

خارج ہے لیکن کسی خاص انسان مثلاً وزیر اعظم کی حاجت و ضرورت میں شامل ہے اس لئے "حاجت اصلیت" کا تعین ہر دور اور ہر زمانہ کے اعتبار سے ہو گا حتیٰ کہ افراد و اشخاص کے اعتبار سے بھی حاجت اصلیت کا تعین علیحدہ علیحدہ ہو گا۔ وقت کے صاحبِ رای اور اولی الامر جو لوگ ہوں گے ان پر چھوڑ دیا جائے گا۔ وہ جس کو "حاجت اصلیت" میں شمار کریں گے اس کا شمار "حاجت اصلیت" میں ہو گا۔ ہر ایک کو "حاجت اصلیت" کے تعین کا اختیار نہیں ہو گا۔

"والذی نرى على كل حال: ان الحاجات الأصلية للانسان قد تتغير وتتطور بتغير الأزمان والبيئات والأحوال - والأولى ان تترك لتقدير أهل الرأي واجتهاد أولى الأمر" ۱۵

دوب زکوٰۃ کی چوتھی شرط - دین سے محفوظ ہونا ہے

دوب زکوٰۃ کی بنیادی شرطوں میں سے ایک شرط "مال نامی" کا دین سے محفوظ ہونا بھی ہے اگر مال نامی "حوالہ اصلیت" سے زائد ہے لیکن دین سے محفوظ نہیں ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی مثلاً کسی کے پاس دس ہزار روپے حوالہ اصلیت سے زائد ہیں لیکن وہ دس ہزار روپے کا مقروض بھی ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں یا پانچ ہزار روپے کا مقروض ہے تو پانچ ہزار روپے میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی البتہ بقیہ پانچ ہزار روپے میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

حضرت عثمان غنیؓ نے ماہ رمضان المبارک میں صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت کی موجودگی میں خطبہ دیا، اور خطبہ کے دوران یہ ارشاد فرمایا :

"فمن كان له مال وعليه دين فليحسب ماله بما عليه ثم ليترك بقية ماله" ۱۶
یعنی اگر کسی کے پاس مال ہے اور اس پر دین بھی ہے تو دین کے بقدر مال الگ کر کے بقیہ مال کی زکوٰۃ دے۔ کسی صحابی نے اس پر کبیر نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مدیون کا مال زکوٰۃ کے عموم سے خارج ہے۔ اور مال کی جو مقدار دین کی ادائیگی کے ساتھ مشغول ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی نیز جو مال دین کی ادائیگی کے ساتھ مشغول ہو وہ حوالہ اصلیت میں سے ہے کیوں کہ دین کی ادائیگی انسان کی حاجت اصلیت میں شمار ہوتی ہے۔ اور جس

مال کا شمار حوائجِ اصلیہ میں ہو اس کی موجودگی میں غنی کا تحقق نہیں ہوتا ہے اور زکوٰۃ غنی پر واجب ہے نہ کہ غیر غنی پر لہذا دین کے بقدر جو مال ہے وہ مال زکوٰۃ نہیں قرار پائے گا۔ اور اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی علامہ کلسانی لکھتے ہیں

”ولأنه محتاج الى هذا المال حاجة أصلية لأن قضاء الدين من الحوائج الأصلية

والعمال المحتاج اليه حاجة أصلية لا يكون مال الزكاة لأنه لا يتحقق به الغنى

ولا صدقة الا عن ظهر غنى عن لسان رسول الله صلى الله عليه وسلم“

اب یہاں پر تین باتیں قابل ذکر ہیں جن پر قدرے تفصیل سے بحث کی جائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۱۔ کس مال میں دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے ؟

۲۔ وہ دین جو مانع وجوب زکوٰۃ ہے اس کی کتنی قسمیں ہیں ؟

۳۔ کون سا دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے ؟

پہلی صورت۔ کس مال میں دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے

کس مال میں دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے اس سلسلہ میں غور کرنے سے فقہاء کرام کے تین اقوال سامنے آتے ہیں۔

(الف) بعض فقہاء اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کے درمیان فرق کرتے ہیں مان کے نزدیک اموالِ باطنہ (نقد اور اموالِ تجارت) میں دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے۔ اموالِ ظاہرہ (سامانہ جانور اور کھیت کی پیداوار) میں نہیں۔

(ب) جمہور کے نزدیک اموالِ ظاہرہ اور باطنہ دونوں طرح کے اموال میں دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے۔ (ج) البتہ امام ابو حنیفہ کا راجح قول یہ ہے کہ کھیت کی جو بھی پیداوار ہو خواہ غلے ہوں یا پھل وغیرہ اس میں دین مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے۔ دین کے باوجود زمین کی کل پیداوار پر عشر یا نصف عشر واجب ہوگا۔ اس لئے کہ عشر زمین کا فرض ہے نہ کہ اموال کا۔ لہذا مالک کے غنا اور فقر کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ زمین سے جو بھی پیداوار ہوگی اس پر عشر یا نصف عشر واجب ہوگا۔ اسی وجہ سے

اراضی موقوفہ کی پیداوار پر بھی عشر واجب ہے۔ یہی قول اخاف کا مفتی بہ ہے اور اسی پر عمل بھی ہے۔

”واما على ظاهر الرواية فلا بد العشر مؤنة الامر خالصة كالمخرج فلا يعتبر

فيه غنى المالك وللهذا لا يعتبر فيه اصل المالك عندنا حتى يجب

في الاراضى الموقوفة وارضى المكاتب“ ۱۷

دوسری صورت۔ اس دین کی قسمیں جو مانع زکوٰۃ ہے

جو دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے اس کی بنیادی دو قسمیں ہیں۔ دین اللہ اور دین العبد۔ پھر ان میں سے
۱۔ ایک کی مختلف صورتیں ہیں جو درج ذیل ہیں :-

۱۔ دین اللہ جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ ہو۔ مثلاً زکوٰۃ، دین اللہ ہے لیکن اس کا مطالبہ کرنے والا بندہ ہے اس لئے کہ اموال ظاہرہ میں تو خود سلطان مطالبہ کرتا ہے۔ اور اموال باطنہ میں اس کے نائب یعنی اصحاب اموال۔ حضرت عثمان غنیؓ کے ابتدائی دور تک تو اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ دونوں کی زکوٰۃ کی وصولیابی حکومت وقت کی جانب سے ہو کرتی تھی لیکن جب بعد میں اموال کی کثرت ہوئی اور زکوٰۃ کی وصولیابی اور تمام اموال کا متبع دشوار ہوا تو حضرت عثمان غنیؓ نے خود اصحاب اموال کو زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دے دیا۔ اس طرح اصحاب اموال سلطان کے نائب اور وکیل قرار پائے۔ اسی وجہ سے اگر اصحاب اموال اموال باطنہ کی زکوٰۃ از خود ادا نہ کریں تو سلطان ان سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ ۱۸

۲۔ دین اللہ جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہ ہو۔ مثلاً حج فرض یا نذریہ نماز، روزہ وغیرہ کا کفارہ کہ یہ سب دین اللہ ہیں لیکن ان کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ان کی ادائیگی پر نہ تو کسی کو مجبور کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی قید و بند کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ دین العبد جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ ہو۔ مثلاً ایسا دین ہے جس کے مالک کا پتہ ہے اس طرح کے دین کا مطالبہ کرنے والا خود مالک یا اس کا نائب موجود ہے۔

۴۔ دین العبد جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہ ہو۔ مثلاً کسی کے پاس مال حرام ہے لیکن اس کے

مالک کا پتہ نہیں ہے تو ایسی صورت میں مال حرام "دین العبد" تو ہے لیکن اس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہیں ہے۔ اسی طرح "مہر مؤجل" کہ اس کی ادائیگی کا وقت موت یا طلاق ہے۔ ہندوستانی عرف و عادت کے مطابق بیوی موت یا طلاق سے قبل اپنے اس دین کا مطالبہ نہیں کر سکتی ہے۔ گویا کہ یہ دین ہی نہیں ہے اس طرح مہر مؤجل دین العبد تو ہے لیکن کوئی عباد اس کا مطالبہ کرنے والا نہیں ہے۔

۵۔ دین العبد اصالتاً ہو۔ یعنی براہ راست یہ دین اس کے ذمہ عائد ہو۔ کسی دوسرے کے دین کی ذمہ داری نہ لی ہو۔

۶۔ دین العبد کفالتاً ہو۔ کسی پر دوسرے شخص کا قرض تھا۔ مقرض شخص اس کی ادائیگی میں مال مثول کر رہا تھا۔ یا اس کی ادائیگی سے قاصر تھا۔ اور قرض دینے والا مسلسل اس سے مطالبہ کر رہا تھا اور پریشان کئے ہو تھا۔ دوسرے شخص نے اس قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری لے لی جس نے قرض کی ضمانت لی ہے اس پر یہ دین اصالتاً نہیں ہوگا بلکہ کفالتاً ہوگا۔ قرض دینے والا اپنے قرض کا مطالبہ ضمانت لینے والے سے بھی کر سکتا ہے۔

۷۔ دین العبد مجمل ہو۔ یعنی وہ دین جس کی ادائیگی فی الفور ضروری ہو۔ دائن ہر وقت اپنے دین کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

۸۔ دین العبد مؤجل ہو۔ وہ دین جس کی ادائیگی فی الفور ضروری نہ ہو۔ دائن وقت سے پہلے اپنے دین کا مطالبہ نہیں کر سکتا ہے۔

یہ دین کی چند صورتیں ہوئیں۔ ان میں سے کون سا دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے اور کون سا نہیں؟ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

تیسری صورت۔ کون سا دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے

تیسری اور اہم بحث یہ ہے کہ مذکورہ بالا دیون میں سے کون سا دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے اور کون سا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء احناف کی یہ تصریحات موجود ہے کہ وہ دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ موجود ہے۔ خواہ وہ دین اللہ ہو یا دین العبد۔ اصالتاً ہو یا کفالتاً اور مؤجل ہو یا مجمل۔ لہذا زکوٰۃ جو دین اللہ لیکن مطالبہ کرنے والا بندہ یعنی سلطان یا اس کا نائب موجود ہے۔ یا کسی کے دین کی ضمانت لے لی ہو یا طویل الاجل دین ہو یہ مانع وجوب زکوٰۃ ہیں۔ علامہ علاء الدین الحنفی درمختار میں لکھتے ہیں :

”فارغ عن دين. له مطالب من جهة العباد سوا ما كان لله كزكاة وخراج او للعبد

ولو كغالة او مؤجلاً الخ“ ۱

البتہ اگر ایسا دین ہے جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہیں ہے وہ مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے لہذا نذور، کفارات، صدقہ فطر اور وجوب حج وغیرہ، یہ دیون مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہوں گے کیوں کہ ان کا مطالبہ کرنے والا کوئی عباد نہیں ہے۔ ان کا اثر احکام آخرت میں ظاہر ہو گا یعنی ان کی ادائیگی پر ثواب اور ترک گناہ ہو گا۔ احکام دنیا میں ان کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہو گا۔ اسی وجہ سے اس طرح کے دیون کی ادائیگی پر نہ توجہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی عدم ادائیگی پر قید و بند۔ بدائع الصنائع میں ہے۔

”واما الديون التي لا مطالب لها من جهة العباد كالنذور والكفارات وصدق

الفطر وجوب الحج ونحوها لا يمنع وجوب الزكاة لان اثرها في حق احكام

الآخرة وهو الثواب بالاداء والاثم بالترك فاما لاثرها في احكام الدنيا

الآتية انه لا يجبر ولا يعبس فلا يظهر في حق حكم من احكام الدنيا فكانت

ملحقة بالعدم في حق احكام الدنيا“ ۲

جہاں تک اس مال حرام کا تعلق ہے جس کے مالک کا پتہ نہیں ہے اصولاً اس کو مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ اس کا مطالبہ کرنے والا کوئی عباد نہیں ہے لیکن یہ بھی مانع وجوب زکوٰۃ ہے اس کی تفصیل مال حرام کی بحث میں گزر چکی ہے۔

مہر مانع وجوب زکوٰۃ ہے یا نہیں ایک بحث مہر کی رہ جاتی ہے کہ مہر مانع وجوب زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں فقہائے کبار تین اقوال ملتے ہیں۔

۱۔ مطلقاً مہر مانع وجوب زکوٰۃ ہے خواہ مہر مہر ہو یا مؤجل اور اس کی ادائیگی کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔

۲۔ مہر مؤجل مانع ہے۔ مہر مؤجل نہیں۔

۳۔ اگر شوہر مہر ادا کرنے کا عزم رکھتا ہو تو مانع ہے ورنہ نہیں۔

علامہ شامی نے قہستانی کے حوالہ سے دوسرے قول کو راجح قرار دیا ہے: "زاد القہستانی عن الجواهر والصحيح انه غير مانع" لہ جب کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تیسرے قول کو راجح قرار دیا ہے۔ یعنی اگر شوہر مہر کی ادائیگی کا ارادہ رکھتا ہو تو مانع ہے ورنہ نہیں لہ راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ اگر مہر مجمل ہے تو یہ مانع وجوب زکوٰۃ ہے خواہ شوہر فی الفور ادائیگی کا ارادہ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اس لئے کہ عورت جس وقت چاہے اپنے مہر مجمل کا مطالبہ کر سکتی ہے، اس میں طلاق اور موت سے قبل بھی مطالبہ کا حق ہے اسی طرح اگر مہر مؤجل ہے اور شوہر فی الحال مہر کی ادائیگی کا ارادہ رکھتا ہے تو مہر مؤجل بھی مانع وجوب زکوٰۃ ہوگا۔ البتہ اگر مہر مؤجل میں فی الحال ادائیگی کا کوئی ارادہ نہیں ہے تو چوں کہ ہندوستانی عرف و عادت کے مطابق موت یا طلاق سے قبل عورت کو مہر کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں ہے اس لئے ایسی صورت میں مہر مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہوگا۔

دین طویل الاجل بھی مانع زکوٰۃ ہے

چوں کہ فقہی تصریحات کے مطابق دین مؤجل بھی مانع زکوٰۃ ہے جیسا کہ اوپر درمختار وغیرہ کے حوالے سے گزر چکا اس لئے سرکار کی جانب سے مختلف پروگراموں کے لئے ملنے والا قرض جس کی ادائیگی کے لئے ایک لمبی مدت مقرر ہوتی ہے، مانع وجوب زکوٰۃ ہے۔ پولے قرض کو منہا کرنے کے بعد بقیہ مال کی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

کمپنیز جس کی مالیت مشترک ہے چند افراد کے درمیان، کسی خاص فرد کی ملک نہیں۔ اور مال مشترک کا حکم یہ ہے کہ اس کی مجموعی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے بلکہ ہر شریک کے حصہ کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ اسی پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جس کے حصہ کی مالیت بقدر انصاف پہنچ جائے لہذا مذکورہ صورت میں وجوب زکوٰۃ کے سلسلہ میں کمپنیز کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ بلکہ ہر فرد کے حصہ کا علیحدہ علیحدہ اعتبار کیا جائیگا۔ جس کے حصہ کی مالیت بقدر انصاف ہو اسی پر زکوٰۃ شرعاً واجب ہوگی۔ مال مشترک پر زکوٰۃ کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو

در مختار اور شامی کی عبارت :

" (ولا تعجب الزکوة عندنا في نصاب مشترك (من سائمة) و مال تجارة
 (وان صحت الخلطة فيه) فان بلغ نصيب احدهما نصاباً
 زكاة دون الآخر (در مختار) (قوله في نصاب مشترك) المراد ان يكون
 بلوغه النصاب بسبب الاشتراك وضم احد المالين الى الآخر بحيث
 لا يبلغ مال كل منهما بالفرادة نصاباً " لہ

ہیرے اور جواہرات پر زکوٰۃ

اصول یہ ہے کہ سونے اور چاندی یا مختلف ممالک کی مختلف کرنسیاں جو "ثمن" کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں اور سائمہ جانوروں کے علاوہ کسی بھی مال میں جب تک اس کو تجارت کی نیت سے حاصل نہ کیا جائے زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے فقہائے صراحۃ لکھا ہے کہ ہیرے، جواہرات مثلاً لعل، یا قوت، زمرد وغیرہ یا جائیداد یا وہ جانور جن کو چارہ کھلایا جاتا ہے یا غلام یا کپڑے یا دیگر سامان وغیرہ میں شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے الا یہ کہ ان کو تجارت کی نیت سے حاصل کیا جائے۔ لہذا مذکورہ صورت میں جو ہیرے اور جواہرات محض انکم ٹیکس سے بچنے کی غرض سے خرید کر محفوظ کر دیئے جاتے ہیں۔ خریدتے وقت ان میں تجارت کی نیت نہیں ہوتی ان پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح جو خواتین ہیرے اور جواہرات کو محض تزئین اور آرائش کے لئے استعمال کرتی ہیں ان پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ گرچہ ان ہیروں اور جواہرات کی قیمت ہزاروں اور لاکھوں روپے کیوں نہ ہوں۔

" (لا زکوة في اللؤلؤ والجواهر) وان سادت الفأ اتفاقاً (الا ان تكون للتجارة)
 والاصل ان ماعد العجربين والسوايم انما يزكينية التجارة (در مختار)
 (قوله والجواهر) كاللعل والياقوت والزمرد وامثالها در عن الكافي
 (قوله وان سادت الفأ) في نسخة الوفا (قوله ماعد العجربين)

ومساعد اذ كره الجواهر والعقارات والمواشي العلوفة والعبيد والشياب
والامتنعة وينعزل لك من العروض . . .

اموال تجارت کی زکوٰۃ میں کس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا

مفتی بہ قول کے مطابق زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت سامان تجارت کی جو قیمت ہوگی اسی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا اور اسی حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ سامان تجارت کی خرید و فروخت جس اعتبار سے ہوتی ہو اسی اعتبار سے قیمت لگائی جائے گی۔ یعنی اگر سامان کی خرید و فروخت تھوک بھاؤ سے ہوتی ہو تو تھوک بھاؤ سے اور اگر بھٹکر کے اعتبار سے ہوتی ہو تو اسی اعتبار سے قیمت لگائی جائے گی۔

وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقال يوم الاداء وفي السوا ثم يوم الاداء اجماعاً
وهو الاصح وفي رد المحتار: وفي المحيط يعتبر يوم الاداء بالاجماع وهو
الاصح . . . وعليه فاعتبار يوم الاداء يكون متفقاً عليه عنده وعندهما . . .

اراضی کی خرید و فروخت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ غلہ حاصل کرنے کے لئے خریدی جائے اور ضرورت پڑنے پر فروخت بھی کی جائے۔ ایسی صورت میں اراضی کی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ اس کی پیداوار پر عشر واجب ہوگا۔ اگر زمین عشری ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اراضی کی خرید و فروخت تجارت کی غرض سے ہو یعنی اراضی کی خرید و فروخت کا کاروبار ہی ہو اور ضمنی طور پر غلہ بھی حاصل کیا جائے ایسی صورت میں جو اراضی سال گزرنے پر مالک کے پاس پچ جائے وہ اموال تجارت میں شمار ہوں گی اور ان اراضی کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت ان اراضی کی جو قیمت ہوگی اس قیمت کا اعتبار کیا جائے گا۔

شیرز کی زکوٰۃ

شیرز چوں کہ تجارتی سرمایہ ہے اس لئے اس پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ یہ مسئلہ قابل غور ہے کہ شیرز کی زکوٰۃ کس اعتبار سے ادا کی جائے گی یعنی زکوٰۃ اصل رقم پر واجب ہوگی یا اصل رقم اور منافع

دونوں پر یا زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت بازار میں اس شیراز کی جو قیمت ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی مثلاً ایک تجارتی کمپنی قائم ہے جس کی مالیت مثلاً ایک لاکھ کی ہے جس میں دس آدمی شریک ہیں۔ زید نے بھی دس ہزار روپے جمع کیا اور دس ہزار روپے کے بقدر کمپنی کا مالک ہو گیا۔ ایک سال کے بعد زید کو ایک ہزار روپے نفع ملے۔ اب کمپنی میں زید کی مالیت گیارہ ہزار روپے ہو گئی۔ اور اسی شیراز کی قیمت بازار میں مثلاً بارہ ہزار روپے ہے۔ تو زکوٰۃ ان تینوں میں سے کس مالیت کے اعتبار سے واجب ہوگی؟

فقہی تصریحات اور اصول کے اعتبار سے زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت اصل رقم اور منافع کی جو مالیت ہے یعنی گیارہ ہزار روپے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس لئے کہ تجارتی اموال میں اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اس میں بازار کی قیمت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ البتہ اگر کوئی شخص شیراز کی خرید و فروخت کا کاروبار ہی کرتا ہے تو ایسی صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت بازار میں اس شیراز کی جو قیمت ہوگی اس قیمت کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بونڈس کی زکوٰۃ

بونڈس جو درحقیقت قرض ہے جس کی ادائیگی کی مدت کمپنی یا حکومت کی جانب سے ۵ سال یا دس سال کی مقرر ہوتی ہے اس کی حیثیت دین قویٰ کی ہے۔ لہذا "دین قویٰ" کی طرح ہر سال اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ اس کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب کہ کم از کم نصاب زکوٰۃ کے $\frac{1}{5}$ کے بقدر رقم وصول ہو جائے قبضہ کے بعد گزشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔



جوابات بابت سوالات زکوٰۃ

ان: مولانا محمد رضوان القاسمی، ناظم دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد

محمداول

۱۔ جس تجارتی سامان کی قیمت پیشگی ادا کی جا چکی ہے مال خریدار کے قبضہ میں نہیں آیا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ علامہ حصکفی نے ایسے سامان تجارت پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کی تصریح کی ہے فرماتے ہیں:

”الانی ما اشتراه للتجارة قبل قبضه“ (۱)

۲۔ کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم کی زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی، اس لیے کہ اس کو اس مال پر ملک تام حاصل ہو چکا ہے، ملک تام کے لیے فقہاء نے ملکیت رقبہ اور قبضہ کی شرط لگائی ہے اور یہ دونوں باتیں یہاں مالک مکان کو حاصل ہیں۔ البتہ جو رقم مالک مکان کو بطور ڈپازٹ دی گئی ہے اور مدت کرایہ مکمل ہونے پر یہ رقم واپس ہونی ہے اس کی حیثیت اگر کرایہ دار کی طرف سے امانت مافی جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہیے مالک مکان پر چوں کہ اس کی حیثیت دین کی ہے اس لیے اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہونی چاہیے، لیکن امانت اور اس زر ضمانت میں فرق یہ ہے کہ امانت کبھی بھی واپس لینا ممکن ہوتا ہے جب کہ یہاں کرایہ دار ہوتے ہوئے اس بات

کا اختیار نہیں رکھتا کہ کرایہ کی رقم واپس لے، اس لیے رقم کی حیثیت "رہن" کی سی ہے، جیسے مال مرہون کی زکوٰۃ نہ راہن پر واجب ہوتی ہے نہ مرہن پر یہی اس کا بھی ہونا چاہیے، کیوں کہ رہن کی طرح اس زر ضمانت کی حیثیت بھی ایک ایسی رقم کی ہے جو وثیقہ کی حیثیت سے اس کے پاس رہتی ہے۔ علامہ شامی نے مال مرہون کے متعلق لکھا ہے:

"ولا نس مرہون اے لاعلى المرتہن لعدم الملك

الرقبة ولا على الراهن لعدم اليد (۱)

۳۔ زکوٰۃ کا مخاطب شریعت نے افراد کو بنایا ہے نہ کہ اداروں کو، اس لیے دوسری عبادت کی طرح زکوٰۃ کا تعلق بھی افراد سے ہے، دوسرے زکوٰۃ کے لیے شریعت نے ملک بلکہ ملک تام کی شرط لگائی ہے اور دینی مدارس اور ایسے دوسرے خیراتی ادارے اپنے فنڈ کے مالک نہیں ہوتے بلکہ واقفین اور معاونین کی طرف سے محض وکیل ہوتے ہیں، اس لیے مدارس وغیرہ کے پاس جو مال ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

۴۔ مال حرام میں بنیادی طور پر زکوٰۃ واجب نہیں لیکن وہ مال حلال کے ساتھ اس طرح مخلوط ہو گیا ہو کہ حرام و حلال مال کے درمیان شناخت ممکن نہ رہے تو دونوں کے مجموعہ پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، یہ فقہاء کا معروف و مسلم اصول ہے، اسی قاعدہ کا اطلاق مال رشوت اور بینک کے سود وغیرہ پر بھی ہوگا۔ شامی میں ہے:

"ولا زکوٰۃ فی المفسوب والمملوك شراء فاسد والمراد

بالمفسوب مالم يخلطه بغيره لعدم الملك (۲)

۵۔ دین کی تین قسمیں کی گئی ہیں۔ دین قوی، دین وسط اور دین ضعیف۔

قرض کی رقوم اور سامان تجارت کا عوض جو باقی ہو دین قوی کہلاتا ہے، تجارتی سامان کے علاوہ کسی اور مال کی قیمت باقی ہو تو اس کو دین وسط کہتے ہیں، جو مال کسی مال کے بدلے میں باقی نہ ہو، بلکہ کسی اور شے کے عوض باقی ہو، جیسے مہر، بدل خلع، دیت وغیرہ تو اس کو دین ضعیف

کہتے ہیں۔ فقہاء کے یہاں قاعدہ یہ ہے کہ دین قوی اور دین وسط میں تو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے لیکن دین ضعیف میں اس وقت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جب کہ وہ قبضہ میں آجائے اور پھر اس پر سال گزر جائے دین قوی اور دین وسط میں قبضہ سے پہلے بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، فرق یہ ہے کہ دین وسط میں تمام رقم اکٹھی وصول ہونے کے بعد زکوٰۃ ادا کرے گا، اور دین قوی میں نصاب کا ایک خس وصول ہونے پر^(۱) یہ زکوٰۃ واجب ہونے کے سلسلہ میں بنیادی اصول ہیں، ان کو سامنے رکھ کر دیون کے سلسلہ میں زکوٰۃ کے وجوب اور عدم وجوب کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

۶۔ پراویڈنٹ فنڈ

پراویڈنٹ فنڈ کی حیثیت اجرت کی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں مہنی قریب کے اکابر علماء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے دو متضاد رائیں منقول ہیں، مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور مفتی محمد جمیل صاحبؒ نے حضرت تھانویؒ ہی کی ایما پر اس مسئلہ میں مزید تحقیق فرمائی اور جس نتیجے پر پہنچے وہ انھیں مغفرت کے الفاظ میں یوں ہے :

”الغرض پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ تو دین قوی میں داخل نہیں ہو سکتا، اور دین متوسط میں داخل

کرنا بھی اس وقت تک کسی روایت پر منطبق نہیں ہے، جب تک کہ خر کی خدمت کو مال

قرار دینے کی تصریح نہ ملے اور بالفرض اس میں داخل مان بھی لیا جائے تو حکم اس کا بھی صحت و رد

پر دین ضعیف کی طرح یہی ہے کہ اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔“ (۲)

راقم سطور کو اس تحقیق سے اتفاق ہے اور یہی رائے راجح معلوم ہوتی ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ

میں وصول و قبضہ سے پہلے زکوٰۃ واجب نہیں۔

حاجتِ اصلیہ

حاجتِ اصلیہ ان اشیاء کو کہا جاتا ہے جو انسان کی شخصی ضروریات کی ہوں، علامہ طحطاوی

نے حاجتِ اصلیہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

”کشیاب المحتاج إليها لدفع الحر والبرد وكالتفقة و دور

السكنی وآلات الحرب والحرفة واساس المنزل و دواب

الركوب وكتب العلم لأهلها“^(۱)

ظاہر ہے جب ”حاجتِ اصلیہ“ کا تعلق انسانی ضروریات سے ہے تو مختلف افراد، مختلف ماحول اور مختلف طبقوں اور پیشوں کے اعتبار سے حاجتِ اصلیہ کا تعین عمل میں آئے گا۔

دین سے محفوظ ہونا

دینِ حنفیہ کے یہاں زکوٰۃ واجب ہونے میں مانع ہے اور اس کا مقصد مدیون کو حرج و تنگی سے بچانا ہے، لیکن آج کل جو ترقیاتی طویل الأجل قرض دیے جاتے ہیں، ان سے مدیون زبردست معاشی فائدہ اٹھاتا ہے اور اسے ہر سال ایک معمولی قسط ہی ادا کرنی پڑتی ہے اس طرح اگر پورا دین اموال زکوٰۃ سے منہایا جاتا رہے تو فقر و حق سے محروم ہوتے ہیں، حالاں کہ ان کی زکوٰۃ ادا کرنے میں مدیون کے لیے ایسا عرج نہیں ہے جس کو شریعت دفع کرنا چاہتی ہے اس لیے درمیانی راستے بہت مناسب ہے کہ ہر سال اس کو جو قسط ادا کرنی ہے اتنا حصہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا جائے اور باقی دین مستثنیٰ کیے بغیر اس کے مال میں زکوٰۃ واجب قرار دی جائے۔

کمپنی پر زکوٰۃ

حنفیہ کے یہاں اموال میں شرکت اور خلط کا کوئی اثر نہیں، یہ متفق علیہ قاعدہ ہے، دوسرے فقہاء کے یہاں حیوانات میں شرکت زکوٰۃ کے واجب ہونے اور نہ ہونے میں مؤثر ہوتا ہے، لہذا کمپنی کے مجموعی حصص پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ کمپنی کے حصہ داروں میں جو مالک نصاب ہوں وہ اپنی شخصی اور ذاتی حیثیت سے زکوٰۃ ادا کریں گے۔

سیرے اور جواہرات میں زکوٰۃ

شریعت میں اموال زکوٰۃ منصوص ہیں اس میں قیاس واجتہاد کو دخل نہیں، اس لیے میرے اور جواہرات جس قدر بھی ہوں اور جس نیت سے رکھے جائیں، ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔
فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”البيواقيت واللالى والجواهر فلا زكوة فيها وان كانت

حلياً الا ان تكون للتجارة“ (۱۸۶/۱)

اموال تجارت پر زکوٰۃ

مال تجارت میں کس قیمت کا اعتبار کیا جائے گا؟ اس میں امام ابوحنیفہ رحمہ اور صاحبین رحمہ کے درمیان اختلاف ہے، صاحبین رحمہ کے نزدیک زکوٰۃ کی ادائے گی کے دن کا امام ابوحنیفہ رحمہ کے نزدیک اس دن کا جس دن کہ زکوٰۃ واجب ہوئی اور نصاب پر سال مکمل ہوا، اسی پر فتویٰ ہے۔ عالمگیری میں ہے:

”ان أدعى القيمة يعتبر بقيمتها يوم الوجوب“ (۱۸۰/۱)

لہذا جس تاریخ کو نصاب پر حولان حول ہوتا ہے تمام سامان تجارت میں بشمول پلائس ارامٹی اسی دن کی قیمت معتبر ہوگی نہ مستقبل میں متوقع قیمت فروخت کا اعتبار ہوگا۔

شیر اور بانڈس کی زکوٰۃ

تجارتی یونٹس کے شیر نیز بھی مال تجارت کے حکم میں ہیں، لہذا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور زکوٰۃ اس کی قیمت کا اعتبار ہوگا، بلکہ حولان حول کے وقت مارکیٹ میں اس کی جو قدر تھی وہی معتبر ہوگی، اور اس کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔ بانڈز کی حیثیت قرض کے سند کی ہے لہذا جو رقم اس کے عوض ادا کی گئی ہے اس کا دین ہونا ظاہر ہے اور فقہاء کی اصطلاح میں یہ دین قوی کے زمرہ میں آتا ہے، اس لیے اس پر ضروری زکوٰۃ واجب ہوگی۔

زکوٰۃ

انہاء — مولانا اعجاز احمد اعظمی، مدرسہ شیخ الاسلام، ٹیپو پورہ

اعظم گڈھ

زکوٰۃ اسلام کے پانچ بنیادی فرائض میں سے ایک ہے جو صاحب نصاب مسلمان پر عائد ہوتا ہے، اس کے احکام و مسائل — جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں — کو مد نظر رکھتے ہوئے فقہاء نے اس کی درج ذیل تعریف کی ہے:

”تمليك جزء مال عينه الشارع من مسلم فقير غير هاشمي

ولامولاه لله تعالى“ (۱)

کسی مسلمان فقیر کو جو نہ ہاشمی ہو، نہ ہاشمی کے موالی میں سے ہو، مال کے ایک حصہ کا جسے شریعت نے متعین کیا ہے اللہ کے واسطے مالک بنانا۔

اور اس کا سبب فرضیت یہ تحریر کیا ہے کہ

”ملك نصاب حولي تام فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد

وعن حاجته الاصلية تام ولو تقديراً“ (۲)

ایسے نصاب کی ملکیت تامہ جس پر سال پورا ہو چکا ہو اور اس پر کوئی ایسا دین نہ ہو جس کا مطالعہ بندوں کی جانب سے ہو، نیز اس کی حاجتِ اصل سے فارغ ہو اور وہ نامی ہو، اگرچہ وہ حکماً ہی ہو۔

سوال نامے کے دونوں محور کا جواب اسی سبب کی تفصیل میں مضمّن ہے، اس میں چند باتیں قابل غور ہیں :

(۱) ملک تام (۲) نصاب حولی (۳) فراغت عن الدین (۴) فراغت عن الحیاة الاصلیة (۵) نماء۔

یہی پانچ نکتے ہیں جن پر اس مجلس میں غور کرنا ہے۔

سوال :- ملک تام سے کیا مراد ہے ؟

”ان المراد بالملك التام المملوكة يدا ورقبة“ (۱)

ملک تام سے مراد یہ ہے کہ شئی کا مالک ہو، اور قبضہ بھی اسی کا ہو، اگر قبضہ نہ ہو تو ملکیت ناقص ہے، یا قبضہ ہو لیکن شئی کا مالک نہ ہو تو یہ بھی ناقص ہے، لیکن بعض اوقات ملکیت ناقص، ملک تام کے حکم میں ہوتی ہے، اس کی تفصیل دین کے اقسام کے سلسلے میں آرہی ہے۔

سوالات کے جواب

(۱) مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو، اور مال بھی وصول نہ ہوا ہو، بحر الرائق میں محیط کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس میں زکوٰۃ مشتری پر واجب ہوگی، لیکن ادائیگی کا وجوب قبضہ کے بعد ہوگا اور سالہائے ماضی کی بھی دینی ہوگی۔

”ذكر في المحيط في بيان اقسام الدين ان المبيع قبل القبض لا يكون نصيبا لان الملك فيه ناقص لاقتصاد المبد والصحيح انه يكون نصيبا لانه عوض عن مال كانت يده ثابتة عليه وقد امكنه احتواء اليه على العوض فتعبر بيده باقية على النصاب باعتبار التمكن شرعا هـ . فعلى هذا قل لهم لا تجب الزكاة معناه قبل قبضه واما بعد قبضه فتجب زكواته فيما معنى كالدين القوي“ (۲)

محیط میں مذکور ہے — اقسام دین کے بیان میں — کہ مبیعہ قبضہ سے پہلے نصاب نہیں ہوتا۔ کیوں کہ قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملکیت ناقص ہے اور صحیح یہ ہے کہ وہ نصاب ہو جاتا ہے، اس لیے وہ ایسے مال کا عوض ہے جس پر اس کا قبضہ ثابت تھا اور اسے عوض پر قبضہ کرنا عین ممکن ہے۔ پس اس کا قبضہ نصاب پر معتبر مانا جائے گا، کیوں کہ شرعاً وہ قبضہ پر قدرت رکھتا ہے اس بنیاد پر فقہانے یہ جو لکھا ہے کہ زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قبضہ سے پہلے زکوٰۃ کی ادائے کی واجب نہ ہوگی، لیکن قبضہ کے بعد ماضی کی زکوٰۃ بھی واجب ہوگی جیسا کہ دین قوی^(۱) میں ہوتا ہے۔

اور قیمت جو پیشگی ادا کر دی گئی، اس پر بائع کی ملک تمام ہو گئی، اس لیے اس کی زکوٰۃ بائع کے ذمے ہوگی، آگے ایک مسئلہ اجارہ کا آرہا ہے اسی میں اس مسئلہ کی دلیل بھی موجود ہے۔ فانتظر۔
(۲) کرایہ کی مد میں دی گئی رقم جو پیشگی ادا کر دی گئی ہو، اس کی زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی، جس نے رقم وصول کی ہے، کیوں کہ وہ اس پر ملکیت تامہ رکھتا ہے۔

”وذكر الشيخ الامام ابو بكر محمد بن الفضل البخاري في الاجارة الطويلة التي تعارفها اهل البخاري ان الزكاة في الاجرة المعجلة تنجب على الاجر لانه ملكه قبل الفسخ“ (۲)
امام ابو بكر محمد بن الفضل بخاری نے ذکر کیا ہے کہ اجارہ طویلہ جس کا تعارف اہل بخاری میں میں ہے، اس میں پیشگی دی ہوئی اجرت کی رقم کی زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی، کیوں کہ جب تک اجارہ فسخ نہ ہو، اس رقم کا مالک وہی ہے۔

اور جو رقم ڈپوزٹ ہوتی ہے اور بعد میں واپس کر دی جاتی ہے وہ بحکم رہن ہے۔ اور رہن کے

(۱) دین قوی کی تعریف آگے آ رہی ہے۔ (۲) بدائع الصنائع ۶/۲

مع ولو استاجر دارا او شيئا واعطى بالاجير رهنا جازاً (فتاویٰ ہندیہ ۵/۲۳۵)

اگر کسی نے مکان کرایہ پر لیا یا کوئی اور چیز اور اجرت کے عوض کوئی چیز بطور رہن کے دی تو جائز ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ ڈپوزٹ رقم جو بعد میں واپسی کے ساتھ مشروط ہوتی ہے وہ رہن اجرت ہی بنے گی۔ خود شئی مستاجر کے عوض تو رہن رکھنا درست نہیں ہے کیوں کہ وہ امانت ہے پس وہ اجرت ہی کے عوض تسلیم کیا جائے گا۔

متعلق تصریح ہے کہ اس میں زکوٰۃ سرے سے واجب ہی نہیں ہوتی، نہ راہن پر نہ مرہن پر۔

”ولانی مرہون بعد قبضہ - قال الشامی - ای لاعلی المرتہن لعدم ملك الرقبة ولا على الراهن لعدم اليد واذا استرده الراهن لا يزكى عن السنين الماضية ۱ (۱)

اور نہ مال مرہون میں قبضہ کے بعد اس پر علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں کہ یعنی نہ مرہن پر ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے اور نہ رہن پر قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے اور جب راہن اس شئی مرہون کو واپس لے لیگا، جب بھی سالہائے گزشتہ کی زکوٰۃ نہیں ادا کرے گا۔

(۳) جس مال کا کوئی مالک معین نہ ہو، جیسے مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

”فلا زکوٰۃ فی سواثم الوقف والتخیل المسبلة لعدم الملك ۲ (۲)
وقف کے جانوروں اور فی سبیل اللہ مہیکے ہوئے گھوڑوں میں زکوٰۃ نہیں ہے، کیوں کہ ان پر کسی کی ملکیت نہیں ہے۔

(۴) وہ مال جو کسی شخص کے قبضہ میں بہ طور حرام آتا ہے، مثلاً رشوت کا مال، بینک کا سود وغیرہ، اگر یہ حرام مال علیحدہ ہے، حلال مال کے ساتھ شامل نہیں ہوا ہے تو اس پر اس کی ملکیت نہیں، اگرچہ قبضہ ہے، اس لیے اگر مالک معلوم ہے تو اسے واپس کرنا واجب ہے اور اگر مالک نامعلوم ہے تو پورے کو فقرا، مستحقین میں تقسیم کر دینا واجب ہے، پس اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

اور اگر اپنے حلال مال کے ساتھ مخلوط کر دیا ہے تو اس خلط کی وجہ سے وہ اس کا مالک قرار دیا جائے گا، لیکن چوں کہ دوسرے کا مال اس کی ملکیت میں غلط طور سے شامل ہو گیا ہے، اس لیے اس مقدار کا وہ ضامن ہوگا، گویا وہ اتنے کا مدیون ہے، اگر بہ قدر دین اور بہ مقدار ضمان علیحدہ کرنے کے بعد، نصاب کے برابر مال موجود ہے، تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور بہ قدر نصاب نہیں پچتا تو چوں کہ یہ مدیون ہے اس لیے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

(۱) فتاویٰ شامی ۲/۲۶۳

(۲) حوالہ سابق ۲/۲۵۹

"فی القنیۃ، لو کان الخبیث نصاباً لایلزمہ الزکوۃ لان کل واجب التصدق
 علیہ فلا یغیب ایجاب التصدق ببعضہ ومثلہ فی ہزازیۃ
 ونفی الفصل العاشر من التاخرخانیۃ عن فتاوی الحجۃ من ملک اموالا غیر
 طیبۃ او غصب اموالا و خلطها ملکها بالخلط ویصیرضامنا وان لم یکن
 له سواها نصاب . زکوۃ علیہ فیہا وان بلغت نصاباً لانہ مدیون ومال
 المدیون لاینفقد سبباً لوجوب الزکوۃ عندنا" (۱)

قنیہ میں ہے کہ اگر ناجائز مال بہ قدر نصاب ہے تو اس میں زکوۃ واجب نہ ہوگی کیوں کہ وہ کل واجب
 التصدق ہے (جب کہ مالک معلوم نہ ہو) اس لیے اس کے کچھ حصے کے صدقہ کا کوئی فائدہ نہیں،
 اور اسی طرح ہزازیہ میں بھی ہے اور فتاوی تاتارخانیہ کی دسویں فصل میں فتاوی جہز
 سے نقل کیا ہے کہ جو حرام مال کا مالک ہو یا اس نے کوئی مال غصب کیا اور اسے اپنے مال کے
 ساتھ مخلوط کر دیا تو خلط کی وجہ سے وہ مالک ہو گیا، لیکن اس کا ضمان دینا ہوگا اور اگر اس کے سوا
 اس کے پاس بہ قدر نصاب مال نہیں ہے تب تو اس پر زکوۃ واجب نہ ہوگی، اگرچہ وہ خود بہ قدر
 نصاب ہو، کیوں کہ وہ مدیون ہے اور مدیون کا مال ہمارے نزدیک وجوب زکوۃ کا سبب
 نہیں ہوتا۔

(۵) دین کی زکوۃ مدیون پر نہیں واجب ہوتی، ہاں اگر مدیون کے پاس دین سے فاضل نصاب
 موجود ہے تو اس کی زکوۃ واجب ہوگی، دین کے ادا کرنے کی قدرت کے باوجود اگر کوئی شخص مال
 مٹول کر رہا ہے تو ظلم ہے، اس کے خلاف دنیا میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے اور آخرت
 میں خدا کے حوالے کرنا چاہیے، لیکن اس کی وجہ سے زکوۃ کے مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، زکوۃ
 کوئی سزا نہیں ہے کہ اس کے اس جرم کے بدلے عائد کی جائے، یہ تو ایک عبادت ہے جو خلوص دل
 اور انشراح صدر کے ساتھ ادا کی جانی چاہیے۔

دین کی اقسام :

و مولیابی کی امید اور نامیدی کے اعتبار سے دین کی تین قسمیں ہیں :-

دین قوی - دین متوسط - دین ضعیف -

دین قوی: وہ دین جو قرض یا مال تجارت کے عوض میں لازم ہوا ہو۔
دین متوسط: وہ دین جو قرض اور مال تجارت کے علاوہ کسی اور مال کے عوض لازم ہوا ہو، جیسے
استعمالی کپڑوں، خدمت کے غلاموں اور رہائشی مکان کی قیمت۔

دین ضعیف: ایسا دین جو کسی مال کے عوض نہ لازم ہوا ہو، جیسے مہر وصیت اور بدل خلع وغیرہ۔

”تسم ابوحنيفة الدين على ثلاثة اقسام قری وهو بدل القبض
ومال التجارة ومتوسط وهو بدل ماليس للتجارة كثمان ثياب
البذلة وعمد الخدمة ودار السكنى وضعیف وهو بدل ماليس بمال
كالمهر والوصية وبدل الخلع والصلح عن دم العمد والدية و
بدل الكتابة والسعاية“ (۱)

امام ابوحنیفہ نے دین کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ قوی اور وہ بدل قرض اور مال تجارت
ہے، اور متوسط وہ ایسے مال کا بدل ہے جو تجارت کے لیے نہ ہوا، جیسے استعمال کے کپڑے، خدمت گزار
غلاموں اور رہائشی مکانات کی قیمت۔ اور ضعیف اور وہ ایسی چیز کا بدل ہے جو مال نہ ہو، جیسے مہر،
وصیت، بدل خلع، صلح عن دم العمد، دیت، بدل کتابت اور سعایت۔

دین قوی کا حکم یہ ہے کہ جب اس پر سال تمام ہوگا تو زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن اس کی ادائے گی کا وجوہ
اس دست مؤخر ہوگا، جب تک اس میں چالیس درہم کے بقدر دین وصول نہ ہو جائے، جب اتنی رقم
مل جائے گی تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ضروری ہوگی، اور اس کے بعد جتنی وصول ہوتی جائے گی، اسی کے حساب
چالیسواں حصہ واجب ہوگا۔

اور دین متوسط میں اس وقت تک وجوب ادا نہ ہوگا جب تک نصاب کے بقدر وصول نہ ہو جائے
لیکن جب اتنا وصول ہو جائے گا تو سالہائے گزشتہ کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی، اور دین ضعیف میں زکوٰۃ اس
وقت تک واجب نہ ہوگی، جب تک بقدر نصاب دین وصول ہو کر اس پر سال نہ گزر جائے۔

”ففي القوي تجب الزكوة اذا حال الحول ويترأخى القضاء، إلى أن يقبض
اربعين ففيها درهم وكذا فيما زاد بحسابه وفي المتوسط لا تجب
ماله يقبض نصاباً ويعتبر لما مضى من الحول في صحيح الرواية
وفي الضعيف لا تجب ماله يقبض نصاباً ويحول الحول بعد القبض
عليه“ (۱)

پس دین قوی میں جب سال گزر جائے گا تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور ادا نہ کی جائے گی چالیس درہم وصول
ہونے تک مؤخر رہے گی، جب اتنا وصول ہو جائے گا تو ایک درہم واجب ہوگا، اور اسی طرح زائد میں
اس کے حساب سے اور دین متوسط میں اس وقت تک واجب نہ ہوگی جب تک نصاب نہ وصول
کر لے، اور اس میں سال گزشتہ کا بھی اعتبار ہے، یہی صحیح روایت ہے اور دین ضعیف میں جب
تک نصاب کے بقدر وصول نہ کر لے، اور اس پر قبضہ کے بعد سال نہ گزر جائے، اس وقت تک
زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

(۲) سرکاری محکموں اور بعض پرائیویٹ کمپنیوں کے ملازمین کی تنخواہوں میں سے ایک حصہ وضع
کر کے ان کے محفوظ کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے اور کچھ فی صد سرکار اس میں اضافہ کرتی ہے
جس کو پراویڈنٹ فنڈ کہتے ہیں، اس رقم کے دو حصے ہیں ایک حصہ اصل تنخواہ والا، دوسرا جو اس
پر اضافہ ہوا ہے۔

اضافہ کی زکوٰۃ کا تو کوئی سوال ہی نہیں، اس لیے کہ اس پر نہ اس ملازم کی ملکیت وارد ہے اور نہ
وہ بہ حکم دین ہے۔ بہ حکم دین اگر کوئی چیز ہے تو وہ اصل تنخواہ والا حصہ ہے، اس لیے اس حصہ اضافی کی زکوٰۃ
اس وقت واجب ہوگی جب کہ اس پر قبضہ ہو جائے اور اس پر سال گزر جائے۔

البتہ اصل تنخواہ میں وضع شدہ رقم کے بارے میں غور کرنا چاہیے کہ آیا وہ دین ہے؟ اگر ہے تو
دین کی تین قسموں میں سے کس میں داخل ہے۔ امام سرخسیؒ نے مبسوط میں اجرت کی حیثیت تفصیل کے ساتھ
لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

وفى الاجرة ثلث روايات عن ابى حنيفة ، فى رواية جعلها كالمهر
لانها ليست ببذل من المال لانها تبدل عن المنفعة وفى رواية جعلها
كبذل ثياب البذلة لان المنافع مال من وجه لكنه ليس بمعجل
لوجوب الزكاة فيه والاصح ان اجرة دار التجارة او عبد التجارة بمنزلة
ثمن متاع التجارة كلما قبض منها الربيعين قلزمه الزكاة اعتبار
البذل المنفعة ببذل العين - (۱)

اجرت کے سلسلے میں امام ابوحنیفہ سے تین روایتیں ہیں۔ ایک روایت میں اس کو مثل مہر کے
قرار دیا ہے، اس لیے کہ یہ مال کا بدل نہیں ہے کیوں کہ یہ منفعت کا بدل ہے اور ایک روایت
میں اسے استعمالی چیزوں کی قیمت کے مانند ٹھہرایا ہے کیوں کہ منافع ایک طرح کے مال ہیں۔ لیکن
وجوب زکوٰۃ کے محل نہیں ہیں، اور اصح یہ ہے کہ گھر یا غلام جو برائے تجارت ہو اس کی اجرت
اور کرایہ سامان تجارت کی قیمت کی طرح ہے، جب چالیس درہم وصول ہوں گے ان کی زکوٰۃ
واجب ہوگی، اس میں بدل منفعت کو بدل عین کے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کرایہ اور اجرت دین میں داخل ہیں، اور اصح روایت کے مطابق جو
عقلم اس شئی کا ہے جس کی اجرت حاصل ہوئی ہے وہی اجرت کی بھی ہے، اگر مال تجارت کی اجرت حاصل
ہوئی تو اس میں اسی طرح زکوٰۃ واجب ہے جس طرح مال تجارت میں واجب ہوتی، گویا یہ دین قوی ہے اور
اگر استعمالی سامانوں کی اجرت حاصل ہوئی تو اس کا قیاس انہیں پر ہے۔

حوالہ بالا میں جو دوسری روایت ہے، منقطع الخالق حاشیہ بحر الرائق میں محیط کے حوالے سے اسے ظاہر
روایت قرار دیا ہے۔ غرض پہلی روایت کی بنیاد پر اجرت دین ضعیف میں داخل ہے اور دوسری روایت
کی روشنی میں وہ دین متوسط میں شامل ہے اور صحیح روایت کے پیش نظر وہ اصل مال مستاجر کے تابع ہے،
لیکن واضح ہو کہ یہ تینوں روایتیں ایسی چیزوں کے کرایہ اور اجرت کے احکام بتاتی ہیں، جو خود مال ہیں مثلاً
مکان، غلام وغیرہ، لیکن یہاں جو اجرت اور تنخواہ زیر بحث ہے وہ کسی مال کی نہیں ہے بلکہ یہ بدل ہے

خدمتِ حرکی، اور حر بر تصریح فقہاء مال نہیں ہے، لہذا اس کی خدمت بھی مال نہیں ہو سکتی، پس یہ تنخواہ غیر مال کی بدل ہے اس لیے یہ دین ضعیف ہے، اور دین ضعیف کا حکم معلوم ہے کہ اس میں قبضہ کے بعد سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، پس پراویڈنٹ فنڈ میں خواہ اصل تنخواہ کی وضع شدہ رقم ہو یا امنائی رقم زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوگی جب وہ بر قدر نصاب قبضہ میں آجائے اور اس پر سال گزر جائے یا اگر اس کے علاوہ نصاب موجود تھا تو یہ رقم اس میں شامل ہو کر اصل نصاب پر سال پورا ہونے کے بعد اسی کے ساتھ اس کی بھی زکوٰۃ نکل جائے گی۔ واللہ اعلم۔

دوسری شرط "نماء"

نماء کے لغوی معنی بڑھنے کے ہیں۔ علامہ شامی فرماتے ہیں:

النماء في اللفظة بالمد الزيادة والقصر بالهمزة خطأ يقال نمى

ينمى نماء وينمو نمواً وانماه الله تعالى كذا في المغرب۔ (۱)

نماء بالمد لغت میں بڑھوتری کے معنی میں ہے اور بغیر مد کے ہمزہ کے ساتھ غلط ہے، کہا جاتا ہے، نمی نمى نماء (ن) اور انماہ اللہ تعالیٰ، کذا فی المغرب۔

اور شریعت کی اصطلاح میں بھی نماء کا وہی معنی ہے جو لغت میں ہے، البتہ یہاں اس کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں، اول یہ کہ حقیقتہً اضافہ ہو، جیسے جانوروں میں تو والد و تناسل کے ذریعے بڑھوتری ہوتی رہتی ہے، اسی طرح تجارت کے واسطے سے مال میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ اضافہ تقدیراً اور حکماً ہو جیسے سونا اور چاندی کہ جب یہ اپنی ملک اور قبضہ میں ہے تو شریعت کی نگاہ میں اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے کیوں کہ اس پر قدرت حاصل ہے، یہ مال نامی تقدیراً ہے، یعنی ظاہراً بڑھتا ہوا نظر نہیں آتا مگر اسے نامی تسلیم کیا گیا ہے۔

وفي الشرع هو نوعان حقیقی و تقدیری فالحقیقی الزيادة بالتوالد

والتناسل والتجارات والتقدیری تمكنه من الزيادة بكون المال

فی بیدہ او بید ناٹبہ - (۱)

شریعت میں نما کی دو قسمیں ہیں، حقیقی اور تقدیری۔ حقیقی وہ نما ہے جو توالد و تناسل اور تجارتوں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ تقدیری کا مطلب یہ ہے کہ نما پر قدرت ہو، اس طرح کہ مال خود مالک کے قبضہ میں ہو یا اس کے نائب کے۔

زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے مال نامی کا لصاب ہونا شرط ہے، اگر کسی کے پاس نما کی دونوں قسموں کے اعتبار سے کوئی مال نامی نہیں ہے، اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔ مثلاً کسی کے پاس زمینیں بہت ہیں یا مکانات ہیں یا کارخانہ ہے، جس میں مشینیں قیمتی قیمتی ہیں، تو گو اس کے پاس مالیت بہت زیادہ ہے لیکن ان میں سے کوئی چیز مال نامی نہیں ہے اس لیے ان کا حساب لصاب زکوٰۃ میں نہ ہوگا۔

تیسری شرط حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجتِ اصلیہ کے دائرہ میں وہ چیزیں آتی ہیں جن کا تعلق انسان کے جان و مال کی حفاظت اور بچاؤ سے ہے، مثلاً نفقہ، رہائشی مکان، لڑائی کے اوزار، گرمی اور سردی کی ضرورت۔ کپڑے، آلاتِ حرفت، گھر کے سامان، سواریاں اور ان کی حفاظت کے گھر، مثلاً اصطبل، گیراج وغیرہ اور اہل علم کے واسطے کتابیں۔

الحاجة الأصلية هي ما يدفع الهلاك من الانسان تحقيقا كالنفقة
ودور السكنى وآلات الحرب والسيارات المحتاج اليها لدفع الحر والبرد
او تقدير كالدین وكآلات الحرفة واثاث المنزل ودواب الركوب و
كتب العلم لاهلها - (۲)

حاجتِ اصلیہ وہ چیزیں ہیں جو انسان سے ہلاکت کو دفع کرتی ہیں، حقیقتاً جیسے نفقہ، رہائشی مکانات، آلاتِ حرب اور گرمی و سردی کے لباس، یا تقدیراً جیسے آلاتِ حرفت، گھر، سامان، سواری کے جانور اور اہل علم کے لیے کتابیں۔

حاجتِ اصلیہ میں مزید کچھ اور تفصیلات ہیں جنہیں فقہاء اپنی کتابوں میں ذکر کرتے ہیں، مثلاً

استعمالی کپڑے کتنی تعداد میں ہوں، رہائشی مکان کس مقدار کا ہو، سواری کے جانور کتنے ہوں، کتابوں کے کتنے نسخے ہوں، تو حاجتِ اصلیہ میں داخل ہوں گے اور کتنے اس سے زائد ہوں گے، لیکن زکوٰۃ کی بحث میں ان تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ یہاں سرے سے حاجتِ اصلیہ سے فراغ کی قید و جوب میں موثر نہیں ہے، کیوں کہ زکوٰۃ کے لیے نصاب نامی شرط ہے اور نصاب نامی بہر حال حاجتِ اصلیہ سے فاصل ہوگا، تو یہ قید درحقیقت کسی احتراز کے لیے نہیں ہے، محض بیان و اقرارِ اہتمام ذکر کے لیے ہے چنانچہ علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ:

فان الحوائج الاصلية اعم من الدين والنامي اعم منها۔ (۱)

یعنی حوائجِ اصلیہ دین سے عام ہیں اور نامی ہونا حوائجِ اصلیہ سے عام ہے، تو جب ایک عام قید اور شرط کسی حکم میں لگا دی گئی تو اس کے ضمن میں خاص خود بخود آگیا، اب اس کے ذکر کی ضرورت احتراز کے لیے نہیں ہوتی، ہاں کسی خصوصیت کے اہتمام کی وجہ سے ہو تو اور بات ہے، پس ثابت ہو گیا کہ مال کا نامی ہونا بنیادی شرط ہے، حاجتِ اصلیہ سے فراغ کی شرط صرف اظہار واقعہ کے لیے ہے چنانچہ علامہ شامیؒ اس کی مثال میں ذکر کرتے ہیں،

لانه يخرج منها كتب العلم لغير اهلها وليس من الحوائج

الاصلية۔ (۲)

دیکھیے غیر اہل علم کے پاس کتابیں حوائجِ اصلیہ میں سے نہیں ہیں، لیکن چوں کہ مال نامی نہیں ہے، اس لیے ان پر زکوٰۃ کا وجوب نہ ہوگا۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

دین سے محفوظ ہونے میں فقہاء نے طویل الاجل اور قصیر الاجل کی کوئی تفصیل نہیں بیان کی ہے، اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دین مطلقاً خواہ وہ طویل الاجل ہو یا قصیر الاجل، نصاب میں سے پورا وضع کیا جائے گا، دیکھیے مہر مؤجل کتنی طویل المیعاد ہوتی ہے، مگر فقہاء نے اسے بھی موانع

زکوٰۃ میں سے شمار کیا ہے، بسن بدائع الصنائع میں بعض مشائخ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ہر موجد مانع زکوٰۃ نہیں ہے، کیوں کہ عرفا اس کا مطالبہ نہیں ہوتا۔

قال بعض مشائخنا ان الموجد لا يمنع لانه غير مطالب به عادة۔^(۱)
ہمارے بعض مشائخ نے فرمایا کہ ہر موجد مانع زکوٰۃ نہیں ہے، کیوں کہ عرفا اس کا مطالبہ نہیں ہوتا۔

اس کی علت لانه غیر مطالب بہ عادتہ پر نظر کی جائے تو بظاہر اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ سالانہ واجب الاداء قسط کے بقدر ہی ہر سال دین وضع کیا جائے، کیوں کہ عادتہ اس سے زائد کا مطالبہ اس سال نہیں ہوتا، نیز یہ کہ امام شافعیؒ کے نزدیک کوئی بھی دین مانع زکوٰۃ نہیں ہوتا۔ اس خیال سے اگر احتیاطاً صرف قسط واجب الاداء کے بقدر وضع کر کے باقی کی زکوٰۃ ادا کی جائے تو مستحسن معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

کمپنیوں پر زکوٰۃ

کسی تجارت میں اگر متعدد شرکا ہوں تو مجموعی سرمایہ پر مجموعی طور سے زکوٰۃ کا وجوب نہ ہوگا بلکہ انفراداً ہر ایک پر علیحدہ زکوٰۃ کا وجوب ہوگا، جب کہ اس کا حصہ بقدر نصاب ہو یا اگر کمپنی میں تو بقدر نصاب نہ ہو، لیکن اس کے پاس اس کے علاوہ مال زکوٰۃ موجود ہو، تو اس کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا۔

فاذا كانت مشتركة بين اثنين فقد اختلف فيه قال اصحابنا انه
يعتبر في حال الشركة ما يعتبر حال الانفراد وهو كمال النصاب
في حق كل واحد منها فان كان نصيب كل واحد منها يبلغ نصابها
تعجب الزکوۃ والا فلا۔ (۲)

بہر حال جب تجارت مشترک ہو تو اس میں اختلاف ہے، ہمارے اصحاب نے فرمایا کہ شرکت کی حالت میں بھی وہی چیز معتبر ہے جو انفراد کی حالت میں ہے اور وہ نصاب تام ہے ہر ایک کے حق میں، پس اگر ہر ایک کا حصہ نصاب کے بقدر ہے تب تو زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں۔

ہیرے اور جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے اور جواہرات اموال نامیہ میں سے نہیں ہیں، اگر بغرض تجارت ہوں تو زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں۔

لا زکوٰۃ فی اللآلی و الجواہر وان سادت الفأ اتفاقاً إلا ان تكون للتجارة - (۱)

موتیموں اور جواہرات میں بالاتفاق زکوٰۃ نہیں ہے گو وہ ہزار کے برابر ہوں مگر یہ کہ تجارت کے لیے ہوں (تو زکوٰۃ واجب ہوگی)۔

تاہم جو لوگ انکم ٹیکس اور دیگر سرکاری قوانین سے بچنے کے لیے نقد روپیوں یا سونے چاندی کی صورت میں اپنے سرمائے کو محفوظ کرنے کے بجائے ہیرے جواہرات لاکھوں روپے کے خرید کر محفوظ کر دیتے ہیں اس میں یہ بات قابل غور ہے کہ یہ نیت کس زمرے میں آئے گی۔ احقر کا خیال ہے کہ یہ نیت درحقیقت تجارت ہی کی نیت ہے کہ ضرورت کے موقع پر اسے فروخت کر کے پھر اسے روپیہ بنالیں گے اور نفع بھی ہاتھ آئے گا۔ آج کا ایک لاکھ کا ہیرا عین ممکن ہے کہ دس سال کے بعد ڈیڑھ دو لاکھ کا ہو جائے، اس لیے ایسے ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

البتہ جو خواتین محض تزئین و آرائش کے لیے جواہرات استعمال کرتی ہیں ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

زکوٰۃ کی ادائے گی میں اصل یہ ہے کہ وہ نصاب کے جز سے ہو، یعنی جس مال کا نصاب ہو، زکوٰۃ اسی میں ادا کی جائے، البتہ اونٹوں میں شریعت نے ایک خاص حد تک بکریاں متعین کی ہیں، پھر اس کے بعد اونٹ کا وجوب ہوتا ہے، اس کے علاوہ تمام اموال میں قاعدہ یہی ہے کہ جس مال کی زکوٰۃ ادا کرنی ہے اسی مال میں سے بہ قدر زکوٰۃ کے علیحدہ کیا جائے۔ صاحب بدائع تحریر فرماتے ہیں:

واما صفة الواجب في اموال التجارة فالواجب فيها ربع عشر معين

وهو النصاب في قول اصحابنا - (۱)

بہر حال اموال تجارت میں واجب کی صفت یہ ہے کہ ان میں عین مال یعنی نصاب کا پابیسواں حصہ واجب ہے۔

لیکن علماء احناف کے نزدیک بجائے عین مال کے اس کی قیمت کو زکوٰۃ میں دینا درست ہے، امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے قول میں تو عین یا قیمت ہر دو میں سے ایک واجب ہے اور صاحبین کے بقول اصل واجب تو عین مال سے ہے، مگر اس کے عوض میں قیمت بھی دی جاسکتی ہے، اس قاعدہ کے پیش نظر مسئلہ کا جواب یہ ہوگا کہ جب سال پورا ہوا تو اس وقت مال کا جو نرخ ہو اسی حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے۔

ثم اختلف اصحابنا فيما بينهم في عند ابي حنيفة الواجب في الدراهم والدنانير و اموال التجارة جزء من النصاب من حيث المعنى لا من حيث الصورة وعند ابي يوسف ومحمد الواجب هو الجزء منه صورة ومعنى لكن يجوز اقامة غيره مقامه من حيث المعنى ويبطل اعتبار الصورة باذن صاحب الحق وهو الله تعالى ويبني على الأصل مسائل الجامع اذا كان لرجل مائة خفيضة حذوة للتجارة تساوي مائة درهم ولا مال له غير ذلك وحال عليها الحول فان ادى من عينها يودي خمسة اقفورة بخلاف لانها هي ربع عشر النصاب وهو الواجب على امرئ ولو اراد ان يودي القيمة جاز عندنا خلافا للشافعي لكن عند ابي حنيفة في الريادة والنقصان يودي قيمتها يوم الحول وهي خمسة دراهم وعندنا في الفصلين جميعا يودي قيمتها يوم الاداء - (۲)

واعتبر القيمة عند حلول الحول بعد ان تكون قيمتها في

ابتداء الحول مائة درهم من الدراهم القابلة عليها الفضة كذا في المضمرات (۲)

پھر ہمارے اصحاب کے درمیان اختلاف ہے، امام صاحب کے نزدیک درہم و دنانیر اور اموال تجارت میں لصاب کا جز معنوی حیثیت سے واجب ہے، صورتہ نہیں، اور صاحبین کے نزدیک واجب اس کا جز، صورت اور معنی کے لحاظ سے ہے، لیکن اس کے علاوہ کو معنوی حیثیت سے اس کی جگہ رکھ سکتے ہیں اور صورت کا اعتبار صاحب حق یعنی اللہ تعالیٰ کے اذن سے ختم ہو جائے گا۔ اسی قاعدہ پر جامع صغیر کا یہ مسئلہ مبنی ہے کہ کسی شخص کے پاس دو سو گز قفیز گہوں تجارت کے لیے ہے اور اس کی قیمت دو سو درہم ہے اور اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی مال نہیں ہے اور اس پر سال گزر گیا، تو اگر گہوں ادا کرنا چاہے تو بغیر اختلاف کے پانچ قفیز ادا کرے گا، اور اگر قیمت ادا کرنا چاہے تو یہ بھی جائز ہے خلافاً للشافعی، لیکن امام صاحب کے نزدیک کمی اور زیادتی ہر صورت میں سال پورا ہونے کے دن کی قیمت ادا کرے گا اور وہ پانچ درہم ہے، اور صاحبین کے نزدیک دونوں صورتوں میں ادا کے دن کی قیمت دے گا۔

تھوک اور پھٹکر تجارت میں زکوٰۃ کے لیے اس کے طریقہ تجارت کا اعتبار ہوگا، یعنی اگر تھوک کا تاجر ہے تو مال کی قیمت تھوک کے حساب سے لگائی جائے گی، ورنہ پھٹکر۔

زمین کی تجارت کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ اگر عشری یا خراجی زمین بغرض تجارت خریدی ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیوں کہ اس کا خریفہ عشر یا خراج ہے، لیکن امام محمد سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر اس میں کھیتی کرے گا تو عشر یا خراج بھی واجب ہوگا۔

ولو اشترى ارض عشر او خراج للمتجارة لا تجب فيها الزكاة و

عند محمد اذا اشترى للمتجارة ارض عشر تجب الزكاة مع العشران زرع^(۱)

اگر عشری یا خراجی زمین تجارت کی نیت سے خریدی تو اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اور امام محمد علیہ الرحمہ سے روایت ہے کہ اگر عشری زمین بغرض تجارت خریدی تو زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر کھیتی کرے گا تو عشر بھی واجب ہوگا۔

اور اگر غیر عشری و خراجی زمین بغرض تجارت لی گئی ہو تو سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اس وقت

کے نرخ کے حساب سے ہوگی۔

شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

شیرز پر مال تجارت ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ فرض ہوگی، ان کی مالیت کا تعین نہ ان کی بنیادی قیمت سے ہوگا اور نہ مارکیٹ کے نرخ سے بلکہ وہ شیر جس مالیت پر مشتمل ہوگا اس کا اعتبار ہوگا، مثلاً شیر کا مالک ابتداء سال میں بقدر نصاب ملکیت رکھتا تھا اور پھر درمیان میں بذریعہ تجارت اس میں اضافہ ہوتا رہا، تو سال کے آخر میں جس قدر مالیت فراہم فراہم ہو گئی ہے اسی سے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔

اب رہا یہ سوال کہ اس مالیت کا پتہ کیسے چلے گا تو موجودہ کاروباری نظام میں اس کے معلوم کرنے کا طریقہ واقعی دشوار ہے، ایسی صورت میں آسان راہ یہ ہے کہ مارکیٹ کا نرخ دیکھ لیا جائے یقینی طور پر تو نہیں لیکن گمان یہ ہوتا ہے کہ بازار کا نرخ اس کی مالیت سے کچھ زائد یا کم از کم برابر ہوتا ہوگا تو احتیاطاً اسی نرخ سے زکوٰۃ ادا کی جائے، تاکہ زکوٰۃ میں کمی کا احتمال نہ رہے کہ خدا کے یہاں مواخذہ ہو، اگر کچھ زیادہ دے دی جائے گی تو مستحسن ہے۔

محور ثانی، نصاب زکوٰۃ

سومنے اور چاندی دونوں کا نصاب اصل ہے، دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے تابع نہیں ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ مال تجارت کی قیمت کا تعین دونوں سے ہو سکتا ہے، لیکن اگر ایک سے نصاب پورا ہوتا ہو اور دوسرے سے نہیں تو جس سے نصاب پورا ہوتا ہو اسی کا اعتبار ہوگا۔ وجوب زکوٰۃ کے اندر بھی اور اسی پر قیاس کر کے حرمت اخذ زکوٰۃ کے اندر بھی، اس لحاظ سے موجودہ دور میں چاندی کا اعتبار ہوگا۔

ثم فی تقویم عرو من التجارة التخییر یقوم باہما شاء من الدراہم

والدناہیں الا اذا كانت لا تبلغ باحدہما نصابا فحينئذ تعین

التقویم بما یبلغ نصابا۔ ہکذا فی البحر الرائق۔ (۱)

پھر سامان تجارت کی تقویم میں اختیار ہے، درہم و دینار میں سے جس سے چاہے قیمت لگائے،
البتہ اگر کسی ایک سے نصاب نہ پورا ہوتا ہو، تو وہ متعین ہے جس سے نصاب پورا ہو۔

محرثالث، مصارف زکوٰۃ

(۱) سوال میں مذکور پہلی صورت زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے یہ کہ درست ہے بلکہ مستحسن ہے جسے اہل مدارس کو اختیار کرنا چاہیے، مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان تو ظاہر ہے کہ وکیل ہے کہ انھوں نے زکوٰۃ کی رقم اسی لیے حوالے کی ہے مدارس میں جو مستحق طلبہ ہیں ان پر خرچ کی جائے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ طلبہ کا نائب بھی ہے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں:

مہتمم مدرسہ کا، قیم و نائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے، جیسا امیر جملہ عالم کا ہوتا ہے پس جو شئی کسی نے مہتمم کو دی
مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے، اس کے قبضہ سے ملک معطلی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہو گیا، اگرچہ وہ
مجمول الکمیۃ والذولت ہوں، مگر نائب معین ہے اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطلی کا بھی ہو سکتا ہے۔

لیکن یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ طلبہ کے نائب اور قیم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے وہ زکوٰۃ کی رقم قبضہ کرنے کے بعد آزاد ہے کہ جہاں چاہے خرچ کرے، بلکہ وہ جن کا نائب ہے اور جن کی نیابت میں اس نے زکوٰۃ وصول کی ہے، انھیں پر خرچ کرنا متعین ہے، اگر وہ صحیح مصرف میں خرچ نہیں کرتا تو حسب تصریح فقہاء زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، انھیں دوبارہ زکوٰۃ دینی ہوگی اور اس کا وبال مہتمم مدرسہ پر پڑے گا۔ اگر کوئی مہتمم ایسا کرتا ہے تو اسے زکوٰۃ کی رقم دینی جائز نہیں ہے، یہ تو مدرسہ کے مہتمم کا مسئلہ ہے، جس کو زکوٰۃ دہندگان پر کوئی ولایت حاصل نہیں ہے، خود صاحب امر اور سلطان زکوٰۃ وصول کرتا ہے، اور صحیح مصرف میں خرچ نہیں کرتا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، چنانچہ مبسوط میں ہے:

فاما ما ياخذ سلاطين زما ننا هؤلاء الظلمة من الصدقات والعشور و
الخراج والجزية فلم يتعمون له محمد رحمه الله في الكتاب وكثير
من ائمة بلخ يفتون باداء ثانيا فيما بينه وبين الله كما في حق البعض

لعلنا انهم لا يصرفون الماخوذ مصارف الصدقة - (۱)

رہے وہ صدقات اور عشور و خراج اور جزیہ جسے ہمارے زمانے کے ظالم حکام وصول کرتے ہیں تو اس سے امام محمد علیہ الرحمہ نے کوئی تعرض نہیں کیا اور بہت سے ائمہ بلخ فتویٰ دیتے ہیں کہ دوبارہ ادا کیا جائے فیما بینہ و بین الثہ جب کہ باغیوں کے متعلق فتویٰ ہے کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ صحیح مصارف صدقہ پر خرچ نہیں کرتے۔

یہاں ایک اور صورت بتائی گئی ہے کہ اگر زکوٰۃ دینے والا خود انھیں ظالم سلاطین کو دینے کی نیت کرے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ کیوں کہ انھوں نے ظلم کر کے اور ناجائز اموال جمع کر کے اپنے اوپر دوسروں کے اتنے حقوق جمع کر لیے ہیں کہ سارا مال دے کر بھی ان حقوق سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ زبردست مدیون ہیں اور اس کی وجہ سے افلاس کے انتہائی مرتبہ پر ہیں، پس انھیں کو مال زکوٰۃ کا مالک نہ دیا جائے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ چنانچہ علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

والاصح انه يسقط ذلك عن جميع ارباب الاموال اذا اتوا بالدفع التصدق
عليهم لان ما في ايديهم من اموال المسلمين وما عليهم من التبعات
فوق ما لهم، فلوردوا ما عليهم لم يبق في ايديهم شيء فممنزلة
الفقراء - (۲)

اور اصح یہ ہے کہ سب مال والوں سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی، جب کہ وہ دیتے وقت خود انھیں کو زکوٰۃ ادا کرنے کی نیت کر لیں، کیوں کہ اتنے اموال مسلمانوں کے غلط طور پر ان کے پاس ہیں اور اتنے تاوان ان پر مسلط ہیں جو ان کے مال سے زیادہ ہیں، اگر وہ سب لوٹا دیں تو ان کے ہاتھ میں کچھ نہ بچے گا وہ بمنزلہ فقراء کے ہیں۔

اس عبارت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، لیکن بحر الرائق میں اس سلسلے میں تھوڑی تفصیل درج ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وظاهر ما صححه السرخسي انه لا فرق بين الاموال الظاهرة والباطنة

وصحح الولوالجی عدم الجواز فی الاموال الباطنة قال وبه یفتی
لانه لیس للسلطان ولایة الزکوة فی الاموال الباطنة فلم یصح
الاحذ - (۱)

امام سرخسی نے جس کی تصحیح کی ہے ظاہراً اس سے معلوم ہوتا ہے اموال ظاہرہ و باطنہ میں کوئی
فرق نہیں ہے، مگر ولوالجی نے اموال باطنہ میں عدم جواز کو صحیح قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اسی پر فتویٰ
ہے کیوں کہ سلطان کو اموال باطنہ کی زکوٰۃ لینے کا حق نہیں ہے پس اس کا لینا صحیح نہیں ہے۔
یہی بات علامہ ابن ہمام نے بھی حاکم شہید کے حوالے سے نقل کی ہے، انھوں نے بھی اسی کو صحیح
قرار دیا ہے، بہر حال یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس کا تعلق ہمارے موضوع زیر بحث سے نہیں ہے، لیکن اس
سے اشتباہ ہو سکتا تھا، اس لیے وضاحت کر دی گئی۔

غرض جب صاحب امر غلط مصرف میں زکوٰۃ خرچ کرے گا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، تو مدرسہ کا مہتمم جو
صاحب امر اور صاحب ولایت بھی نہیں، وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے کیسے خرچ کر سکتا ہے؟ اس مسئلے
میں احتیاط بہت ضروری ہے۔

(۲) زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے مدارس میں جو سفراء و محصلین مقرر کیے جاتے ہیں، یہ لوگ زکوٰۃ پر عامل
نہیں ہیں۔ قرآن نے جن لوگوں کو العالین علیہا کہا ہے وہ دوسرے لوگ ہیں، چنانچہ فقہاء ان
کی تعریف کرتے ہیں،

فہم الذین نصبہم الامام لجباية الصدقات - (۳)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو امام صدقات کی وصولی کے لیے مقرر کیا ہے۔

امام کو جبايت صدقات کا حق اس کی ولایت عامہ کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے اور عاملین اس
کے کارکن ہوتے ہیں، مدارس کے مہتممین کو اہل اسلام پر کون سی ولایت عامہ حاصل ہے، صرف کام کی
ظاہری مشابہت دیکھ کر حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ مہتمم مدرسہ کا مصرف منظم ہے، زیادہ سے زیادہ
جن لوگوں سے اسے چندہ دستیاب ہوتا ہے ان کا وکیل ہے، اس کے کارکنوں پر شریعت کی مخصوص اصطلاحات

کو منطبق کرنا مناسب نہیں ہے۔
 پھر ان سفراء کو زکوٰۃ کی رقم سے کمیشن دینے کا مسئلہ اور نازک ہے، اول تو یہ عالمین علی الزکوٰۃ نہیں
 ہیں کہ انہیں زکوٰۃ لینے کا اس بنیاد پر استحقاق ہو، دوسرے کمیشن کے طور پر زکوٰۃ دینا خود محل نظر ہے بلکہ فقہاء
 کی تصریحات اور تعامل کے خلاف ہے۔

قال العینی اتفق العلماء علی ان العامل فی الصدقات هم السعاة المترون
 قبض الصدقات وانهم لا يستحقون علی قبضها جزءا معلوما سبعا

او ثمننا وانما له اجر عمله علی حسب اجتہاد الامام (۱) (وجزا المسالك ۱۶۸-۱۶۹)
 امام عینی نے فرمایا کہ علماء اس بات پر متفق ہیں کہ عامل فی الصدقات وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ کی وصولی
 کرنے والے ہیں، یہ لوگ زکوٰۃ وصول کرنے کے عوض میں کسی متعین جز یعنی آنٹھوں یا ساتویں
 حصے کے مستحق نہ ہوں گے، ان کے لیے عمل کا معاوضہ امام کے اجتہاد کے مطابق ہوگا۔

عالمین کو جو وظیفہ زکوٰۃ کی رقم سے دیا جاتا ہے وہ بقدر کفایت ہوتا ہے، یہی تمام فقہاء کہتے ہیں،
 اور اسی پر تعامل رہا ہے اس کی شرح یہ ہے کہ اس کی وصول کردہ زکوٰۃ سے اسے اتنی رقم دے دی جائے
 کہ اس کے کام کے زمانے کے اخراجات اس کے اور اس کے گھر والوں کے برہوہلست پور سے سہجائیں،
 اس میں اجرت کی مشابہت تو ضرور ہے مگر اجرت نہیں ہے، اسی لیے اس کو اجرت کے بجائے "عمالہ" کا نام
 دیا جاتا ہے (۲) اس کے برخلاف کمیشن اول سے آخر تک اجرت کا معاملہ ہے، اسی واسطے فقہاء نے اس

(۲) قال القاری فی شرح النقایہ : لیس ما يأخذہ اجرة لانہا لا تكون الا علی عمل معلوم ومدة
 معينة ولا صدقة لانه يأخذ وان كان غنيا ويحل به العمالة بالاجماع ولكن فيه شبهة الصدقة
 فلم یجزہ أخذها للعامل الهاشمی میانة لقربته صلی اللہ علیہ وسلم عن اوساخ

الناس - اوجزا المسالك ۲۱۸-

لما علی قاری نے شرح نقایہ میں لکھا ہے کہ عامل جو کچھ لیتا ہے وہ خالص اجرت نہیں ہے، کیوں کہ اجرت معلوم کام
 اور متعین اجرت پر ہوتی ہے، اور نہ خالص صدقہ ہے اس لیے کہ غنی ہونے کے باوجود اسے عامل لیتا ہے اور عمالہ اس کے لیے
 جائز ہے، لیکن اس میں صدقہ کا شبہ ہے اس لیے عامل ہاشمی اسے نہیں لے سکتا، کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کو
 اوساخ الناس سے محفوظ رکھنا مطلوب ہے۔

طرح کے کمیشن کو ناجائز قرار دیا ہے کہ اجرت بالکل مجہول ہوتی ہے اور یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ اجرت کی جہالت معاملہ کو فاسد کر دیتی ہے، اگر اس اجرت کے فساد سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو بھی بہ طور کمیشن کے زکوٰۃ کی رقم دینا کسی طرح جائز نہیں، کیوں کہ زکوٰۃ کو کسی مال یا خدمت کے عوض دینا درست نہیں ہے۔ البتہ اگر کمیشن زکوٰۃ یا اموال واجبہ التملیک کے علاوہ کسی مال سے ملے کیا جائے تو اس میں صرف کی جہالت کا خدشہ باقی رہے گا۔ اگر یہ دور ہو جائے تو معاملہ صحیح ہوگا۔

زکوٰۃ کی رقم سے تنخواہ دینا درست نہیں ہے، زکوٰۃ صدقہ ہے جو کسی چیز کا عوض نہیں ہوتا، اور تنخواہ اجرت ہے، اجرتوں میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا خلاف موضوع ہے۔

خلاصہ جوابات

پہلی شہر ط ملک تام

- ۱۔ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو لیکن مال کی وصولی نہیں ہوئی ہے، قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی بائع کے اوپر، اور مال جو وصول نہیں ہوا ہے اس کی زکوٰۃ بھی واجب ہوگی، مشتری کے اوپر، لیکن چالیس درہم کے بقدر وصول ہونے کے بعد ادا کرنا واجب ہوگا۔
- ۲۔ کرائے کی مد میں دی گئی پیشگی رقم کی زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی۔
- ب: ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہو جانے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے وہ زمین کے حکم میں ہے، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، نہ مالک مکان پر نہ کرایہ دار پر۔
- ۳۔ جس مال کا کوئی مالک معین نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔
- ۴۔ حرام مال اگر غیر مخلوط اور ممتاز ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور اگر مخلوط و غیر متمیز ہو گیا ہے تو اس کی مقدار جدا کر کے زکوٰۃ واجب ہوگی۔
- ۵۔ دین قوی کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہے، مگر وجوب ادا چالیس درہم کے بقدر وصولیابی کے بعد ہے، دین متوسط کی زکوٰۃ بھی دائن پر واجب ہے، مگر بقدر نصاب وصول ہونے کے بعد، اور

دین ضعیف کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، وصولیابی کے بعد جب کہ بقدر نصاب ہو، سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۴۔ پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، وصولیابی کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

چوتھی شرط، دین سے محفوظ ہونا

(۱) دین کے مانع زکوٰۃ ہونے میں طویل الاجل اور قصیر الاجل کی تفصیل نہیں ہے۔

کمپنیوں پر زکوٰۃ

- ایک تجارت میں کئی افراد شریک ہوں تو انفراداً زکوٰۃ کا وجوب ہوگا، اجتماعاً نہیں۔
- ہیرے جواہرات بغرض تجارت ہوں تو زکوٰۃ واجب ہوگی، سرمایہ محفوظ رکھنے کے لیے اس کو ہیرے جواہرات کی شکل میں رکھ لینے سے اس میں زکوٰۃ کا وجوب ہوگا۔ محض تزئین و آرائش کے لیے ہوں تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔
- اموال تجارت میں زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے نرخ کا تعین وجوب زکوٰۃ کے دن کے لحاظ سے ہوگا۔ عشری اور خراجی زمین جو بغرض تجارت لی گئی ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اس کے علاوہ کوئی زمین یا گھر برائے تجارت لیا گیا تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔
- کمپنیوں کی شیرز تجارتی مال میں اس کے لیے ان کی زکوٰۃ واجب ہے اور قیمت کا تعین ان کی مالیت سے کیا جائے گا۔

محورثانی: نصاب زکوٰۃ

- چاندی اور سونا دونوں نصاب میں اصل ہیں، تجارتی اموال میں جس کے حساب سے نصاب پورا ہوتا ہو، اس کا اعتبار ہوگا۔

محور ثالث، مصارف زکوٰۃ

- ۱۔ طالب علموں کے سلسلے میں ادائیگی زکوٰۃ کی جو صورت سوالنامہ میں درج ہے وہ مستحسن ہے۔
- ۲۔ مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے اور طلبہ کا نائب اور قسیم۔
- ۳۔ مدرسہ کے سفراء، عاملین شرعی نہیں ہیں، اس لیے مد زکوٰۃ سے نہ ان کو تنخواہ دی جاسکتی ہے اور نہ کمیشن، ہاں اگر فقر کی وجہ سے مستحق زکوٰۃ ہوں تو زکوٰۃ انہیں دی جاسکتی ہے۔
- ۴۔ فی سبیل اللہ کے مصداق اصالتہ مجاہد فی سبیل اللہ ہیں۔ اگر ان کے ذیل میں منقطع الحال کو داخل کیا جائے تو گنجائش ہے۔
- ۵۔ فی سبیل اللہ کے جو لوگ مصداق ہیں ان میں فقر بنیادی شرط ہے۔
- ۶۔ مصارف زکوٰۃ آٹھ اصناف میں منحصر ہیں، ان پر قیاس کر کے دوسروں کو مصارف کے دائرہ میں نہیں لایا جاسکتا۔
- ۷۔ فی سبیل اللہ کسی بھی مصرف زکوٰۃ کے دائرے میں ایسی کوئی صورت نہیں آسکتی جس میں زکوٰۃ کی تملیک نہ ہوتی ہو۔

واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب

اسلام میں زکوٰۃ کا مصرف

انہ: — مولانا شبیر احمد قاسمی، دارالافتاء، مدرسہ شاہی مراد آباد

ملک تام کی تعریف

جس شئی میں مالک کو ملکیت اور قبضہ دونوں حاصل ہو جائے اس پر ملک تام کا اطلاق کیا جاتا ہے اور اگر مصرف ملکیت حاصل ہو جائے لیکن قبضہ حاصل نہ ہو جیسا کہ قبضہ سے قبل طے شدہ مہر کی عورت مالک ہو جاتی ہے لیکن مہر پر قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملکیت تامہ عورت کو حاصل نہیں ہوتی ہے اسی طرح اگر مال پر قبضہ تو ہو جائے لیکن ملکیت درحقیقت اپنی نہ ہو بلکہ کسی اور کی ہو تو ایسی صورت میں بھی ملکیت تامہ حاصل نہیں ہوتی ہے جیسا کہ قرض دار شخص جو مال لے کر قبضہ کرتا ہے یا ہبہ وغیرہ کے توسط سے اس کے قبضہ میں آتا ہے تو ایسی صورت میں قرض دار کے قبضہ میں تو مال آگیا ہے لیکن مال کے ساتھ قرض خواہ کا بھی حق لاحق ہو جاتا ہے اور اس کے ذریعہ سے قرض ادا کرنا اس پر واجب ہو جاتا ہے لہذا اس مال کا مالک درحقیقت قرض خواہ ہی ہوا کرتا ہے اس لیے مقرض کے حق میں اس مال میں ملکیت تامہ حاصل نہیں ہوتی ہے، اسی وجہ سے مقرض پر اس مال کی زکوٰۃ بھی واجب نہیں ہوتی ہے۔

”ومنہا الملك التام هو ما اجتمع فيه الملك والييد واما اذا وجد الملك

دون الييد كالصداق قبل القبض او وجد الييد دون الملك كملك المكاتب

والمديون لا تجب فيه الزكاة (۱)

(۱) عالمگیری، کنوئٹہ ۱۴۶/۱، مسئلہ فی الجورہ ۱۳۹/۱

ملک تام وہ ہے کہ جس میں قبضہ و ملکیت دونوں جمع ہو جائے اور بہر حال جب صرف ملکیت حاصل ہو اور قبضہ نہ ہو جیسا کہ قبل القبض عورت کا مہر یا قبضہ حاصل ہو لیکن ملکیت نہ ہو جیسا کہ مکاتب اور مدیون کی ملکیت تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔

قیمت ادا کر کے قبضہ نہیں کیا اس کی زکوٰۃ

جس مال تجارت کی مشتری نے قیمت ادا کر دی ہے لیکن ابھی قبضہ نہیں کیا ہے اس کی زکوٰۃ مشتری پر واجب نہیں ہے۔ (۱)

”ولا فیما اشتراہ لتجارة قبل قبضہ“ (۲)

یعنی جو مال تجارت کی غرض سے خریدا ہے اس پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

”المبیع قبل القبض لا تجب فیہ الزکوٰۃ“ (۳)

یعنی قبضہ سے قبل بیع میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

اور قبضہ کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ مشتری پر واجب ہوگی یا نہیں؟ تو اس میں حضرات فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ قاضی خاں کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ مشتری پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔

”رجل له ساعة اشتراها رجل للسياحة ولم يقبضها حتى حال

الحول ثم قبضها لازکوٰۃ علی المشتري فیما مضى لانها كانت مضمونة

علی البائع بالثمن“ (۴)

کسی شخص کے پاس چکر گزرا کھنے والے جانور ہیں ان کو دوسرے شخص نے نسل بڑھانے اور

چرا کر پالنے کی نیت سے خرید کر قبضہ نہیں کیا ہے حتیٰ کہ سال گزر گیا تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ مشتری

پر واجب نہ ہوگی، اس لیے کہ وہ بائع کی ضمانت میں ہے۔

لیکن راجع اور مفتی بقول یہی ہے کہ مال تجارت میں قبضہ کے بعد مشتری پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا

(۱) عزیز الفتاویٰ ۳۴۶/۱ (۲) الدر المختار کراچی ۲۶۳/۲ (۳) حاشیہ چلپیء علی

ہامش التبیین ۲۵۶/۱ (۴) منہج کراچی ۲۶۳/۲ دھکڑا قاضی خاں علی ہامش المنیۃ ۲۶۷/۱

واجب اور ضروری ہے اس لیے کہ قبضہ سے قبل جو ملکیت ناقص تھی اس پر قبضہ کے بعد استصحابِ حال کے قاعدے سے ملکیت تامہ کا حکم لاگو ہو جاتا ہے۔

”واما بعدہ (ای بعد القبض) فیرکبہ عما مضی“ (۱)

یعنی مال تجارت میں قبضہ کے بعد منین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔

”لا تحب الزکوٰۃ معناه قبل قبضه واما بعد قبضه فتجب

زکوٰۃ فیما مضی الدین القوی الخ“ (۲)

یعنی قبضہ سے قبل مشتری پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے لیکن قبضہ کے بعد منین ماضیہ کی زکوٰۃ بھی

واجب ہے جیسا کہ دین قوی کا حکم ہے۔

اور مشتری نے بیع کی جو قیمت بائع کو ادا کر دیا ہے اس پر بائع کی ملکیت اور قبضہ دونوں جمع ہو کر ملکیت تامہ کے دائرہ میں داخل ہو چکی ہے اس لیے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا بائع پر لازم ہوگا، مشتری پر نہیں ہوگا۔

”رجل اشتراها عبدا للتجارة يساوى مائتي درهم ونقد الثمن

ولم يقبض العبد حتى حال الحول فمات العبد عند البائع كان

على بائع العبد زکوٰۃ العائتين فانه ملك الثمن (والی قولہ)

لا زکوٰۃ على المشتري لان الثمن زال عن ملكه الى البائع“ (۳)

یعنی کسی شخص نے بغرض تجارت ایسا غلام خریدا جس کی قیمت دو سو درہم ہے اور ثمن ادا کر دیا لیکن

قبضہ نہیں کیا حتیٰ کہ سال گزر گیا اور غلام بائع کے یہاں ہلاک ہو جائے تو دو سو درہم کی زکوٰۃ بائع پر

لازم ہے اس لیے کہ وہ اس ثمن کا مالک ہو چکا ہے اور مشتری پر زکوٰۃ نہیں ہے اس لیے کہ اس

کی ملکیت سے نکل کر بائع کی ملکیت میں داخل ہو کر سال گزر چکا ہے۔

کرایہ کی پیشگی رقم اور بکری کی زکوٰۃ

کرایہ دار پیشگی رقم جو یک مشت مالک مکان اور مالک دکان کو ادا کرتا ہے، مالک مکان اس کا مالک

ہو جاتا ہے اس کی زکوٰۃ بھی مالک مکان ہی پر لازم ہوا کرتی ہے کرایہ دار پر اس کی زکوٰۃ لازم نہیں ہے اس لیے کہ اس رقم پر کرایہ دار کی ملکیت تامہ حاصل نہیں ہے۔

” اذا عجل الاجرة لا يعطك الاسترداد : (۱) ”

یعنی اگر کرایہ دار پیشگی اجرت اور کرایہ ادا کر دیتا ہے تو مالک مکان اس کا مالک ہو جاتا ہے، لہذا واپسی کا حق نہیں ہوگا۔

ڈپوزٹ اور بیع الوفاء کی رقم کی زکوٰۃ

اگر اس طرح مکان یا دکان یا زمین وغیرہ خرید و فروخت کی جائے کہ مشتری جو قیمت ادا کرتا ہے وہ بائع کے پاس مثل امانت کے ہے اور جب بائع اتنی رقم مشتری کو ادا کر دے گا تو بیع واپس مل جائے یا عقد کے لیے مدت متعین کی جائے اور مدت پوری ہونے یا عقد فسخ ہونے پر مشتری اور مستاجر کو اپنی دی ہوئی پوری رقم واپس مل جائے تو ایسے معاملہ کو بیع الوفاء، الامانت اور الرهن وغیرہ سے بھی تعبیر کرتے ہیں تو ایسی صورت میں ادا شدہ رقم کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی؟ تو اس میں حضرات فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام ابو بکر محمد بن فضلؒ فرماتے ہیں کہ اگر اجرت رقم کی شکل میں ہے تو اس کی زکوٰۃ صرف بائع پر واجب ہوتی ہے۔

” حکى عن الشيخ الامام ابى بکر محمد بن فضل قال ان كانت الاجرة

من الدراهم او من الدنانير كان زكوتها على الاجر لانه ملكها

بالقبض وعند انفساخ الاجارة لا يلزمه رد عين مقبوض وانما يلزمه

رد غيرها فكان بمنزلة دين بحقه بعد الحول الخ : (۲) ”

شیخ ابو بکر محمد بن فضلؒ فرماتے ہیں کہ اگر اجرت درہم و دینار کی شکل میں ہے تو اس کی زکوٰۃ بائع پر

لازم ہے اس لیے کہ قبضہ کی وجہ سے اس کو ملک تامہ حاصل ہو چکا ہے اور فسخ اجارہ کے وقت

عين مقبوض کی واپسی لازم نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ ادا کرنا لازم ہے تو یہ بمنزلہ اس دین کے ہوگا

جو بعد حولان حول اس پر لازم ہوا ہے۔

۱۔ امام زاہد علی بن محمد بزدوی اور مجد الائمه ختگیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ بائع اور مشتری دونوں پر اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ بائع کے اوپر اس لیے لازم ہے کہ اس کو ملک تام حاصل ہے اور مشتری پر اس لیے لازم ہے کہ وہ بمنزلہ ثمن رہن ہے لیکن علامہ ابن عابدین شامیؒ نے بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی زکوٰۃ صرف مشتری پر واجب ہوگی، اور اسی کو انھوں نے منبغی کے لفظ سے راجح قرار دیا ہے۔

”وقال الشيخ الامام الزاهد علی بن محمد البزدوی ومجد الائمة السرخستیؒ ان زکوٰۃها تجب علی المستاجر ایضا لان الناس یعدون مال الاجارة دیناً علی الأجر و فی بیع الوفاء المعهود بسمرقند تجب زکوٰۃ الثمرة علی البائع و علی قول الشيخ الامام الزاهد علی بن محمد البزدوی ومجد الائمة السرخستیؒ تجب علی المشتري ایضا الخ۔“ (۱)

حضرت امام الزاہد علی ابن محمد البزدوی اور مجد الائمه ختگیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی زکوٰۃ مستاجر پر بھی لازم ہے اس لیے کہ لوگ مال اجارہ کو موجر پر قرض اور دین شمار کرتے ہیں اور وہ بیع وفاق جو سمرقند میں معروف و مشہور ہے اس میں ثمن کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہے اور امام بزدوی اور ختگیؒ کے نزدیک مشتری پر بھی اس کی زکوٰۃ واجب ہے۔

اور علامہ شامیؒ مشتری پر وجوب ثابت کرنے کے لیے یوں عبارت نقل فرماتے ہیں:

”ینبغی لزومها علی المشتري فقط علی القول الذی علیہ العمل الان من ان بیع الوفاء منزل منزلة الرهن و علیہ فیکون ثمن دیناً علی البائع۔“ (۲)

فرماتے ہیں کہ مناسب اور اولیٰ یہی ہے کہ اس کی زکوٰۃ صرف مشتری پر لازم ہو، اس قول کے مطابق جس پر اس زمانے میں عمل ہے اور اس لیے کہ بیع الوفاء کو بمنزلہ رہن قرار دی جاتی ہے لہذا ثمن بائع کے اوپر بطور قرض لازم ہے۔

حاصل یہ نکلتا ہے کہ قول راجح کے مطابق صرف مشتری پر واجب ہے لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ بائع و مشتری دونوں ایسی رقم کی زکوٰۃ ادا کر دیا کریں۔ بیع الوفاء کے جواز کے لیے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے یہ قید لگائی ہے کہ دستاویز کے وقت بیع کو مطلق عن الشرط رکھا جائے، بیع مع الشرط کی عبارت اور قید نہ لگائی جائے۔ (۱)

مدارس مساجد قومی و رفاہی فنڈ کے مال پر زکوٰۃ

مدارس اسلامیہ اور مساجد اور دیگر قومی اور رفاہی فنڈ بیت المال وغیرہ شخص حقیقی نہیں ہے بلکہ یہ سب اشیاء اشخاص حکمی میں شامل ہیں اور اسلامی شریعت نے زکوٰۃ کا فریضہ شخص حقیقی کی ملکیت تامہ پر واجب کیا ہے اور شخص حکمی کی ملکیت پر واجب نہیں کیا ہے اس لیے مساجد، مدارس، قومی فنڈ اور بیت المال وغیرہ کی ملکیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

فلأزکوۃ فی سواکم الوقف والخیل المسبلۃ لعدم الملك و
هذا لان فی الزکوۃ تمليكاً والتملیک فی غیر الملك لا
یتصور الخ (۲)

وقف کے جانور اور رفاہی گھوڑے میں شخص حقیقی کی ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لیے کہ وجوب زکوٰۃ کے لیے کسی شخص کو مالک بنادینا شرط ہے اور غیر کی ملکیت میں تملیک متصور نہیں ہے۔

رشوت اور مال حرام کی زکوٰۃ

سود اور مال رشوت اور مال حرام کا قابض شرعی طور پر مالک نہیں ہوتا ہے اور وجوب زکوٰۃ کے لیے ملکیت تامہ شرط ہے اس لیے ایسے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ (۳)

(۱) فتاویٰ مظاہر علوم ۳۹۵/۱ (۲) بدائع الصنائع ۹/۲، شامی کراچی ۲/۲۵۹، حاشیہ جلیس علی ہامش التبین

(۳) امراء الفناوی ۱۶/۲، کفایت المفتی ۲۳۲/۲، عزیر الفتاویٰ کراچی ۳۶۲/

وفى القنية لو كان الخبيث نصاباً لا يلزمه الزكاة لان الكل واجب
التصدق عليه فلا يفيد ايجاب التصدق ببعضه الخ (۱)
یعنی مال حرام اگر بقدر نصاب ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے بلکہ نادار فقیر پر پورا کا پورا صدقہ کر دینا
واجب ہے اور اس کے بعض حصہ کا تصدق کافی نہیں ہے۔

اور ایسے مال کے بارے میں حکم شرعی اور واجب یہی ہے کہ پورا مال اصل مالک کو واپس کر دیا جائے اور اگر اصل
مالک تنگ رسائی ممکن نہ ہو تو بلا نیت ثواب نادار فقیر کو صدقہ کر دینا واجب ہے۔ صاحب بذل نقل
فرماتے ہیں:

"صرح الفقهاء بان من اكتسب مالاً بغیر حق فاما ان يكون كسبه
بعقد فاسد كالبيع الفاسد والاستئجار على المعاصي والطاعات
او بغیر عقد كالسرقة والغصب والخيانة والفلول ففى جميع
الاحوال المال الحاصل له حرام عليه ولكن ان اخذه من غير عقد لم
يملكه ويجب عليه ان يردّه على مالكه ان وجد المالك والافى
جميع الصور يجب عليه ان يتصدق بعش ثلث الاموال على الفقراء الخ" (۲)
یعنی حضرات فقہار نے اس کی صراحت کی ہے کہ جو شخص بغیر حق کے کوئی مال حاصل کرے جیسا کہ
بیوع فاسدہ، اجارہ فاسدہ اور معصیت اور ممنوع الاجارہ طاعات سے حاصل کرتا ہے یا چوری
غصب، خیانت وغیرہ سے حاصل کرتا ہے تو تمام صورتوں میں حاصل شدہ مال اس پر حرام ہے
وہ اس کا مالک نہیں ہوتا ہے اگر مالک مل جائے تو مالک کو واپس کرنا واجب ہے ورنہ فقراء کو
صدقہ کر دینا واجب ہے۔

اور اگر حاصل شدہ مال حرام کے بارے میں قابض اصل مالک کوتاوان وغیرہ دے کر بری ہو
جاتا ہے یا اس سے صلح کر کے اس کو راضی کر لیتا ہے تو ایسی صورت میں علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے

(۱) مشامی کراچی ۲۹۱/۲، ہزاریہ ۸۶/۳ (۲) اراد المغنیین کراچی ۲۵۵/۲، بذل الجہود ۳۶۱ و مضمونہ فی الشامی

کراچی ۲۹۱/۲ و مثلہ فی فتح الزہر ۱۹۳۔

ہیں کہ قابض مقبوضہ مال کا مالک ہو جاتا ہے اور اس پر زکوٰۃ بھی واجب ہو جاتی ہے۔

"لكن علمت انه لا تجب زكوة الا اذا استبرأ من صاحبه او

صالح عنه فيزول خبثه الخ" (۱)

یعنی لیکن آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ مال حرام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے مگر جب قابض صاحب مال کو عومن وغیرہ دے کر برأت حاصل کرتا ہے یا اس سے صلح کر لیتا ہے تو خبث اور حرمت ختم ہو جاتی ہے۔

اور اگر مال حرام کو قابض نے اپنے حلال مال کے ساتھ مخلوط کر دیا ہے تو اس کی دو شکلیں ہیں:-
شکل نمبر ایک: قابض کے پاس مال حرام کے علاوہ حلال مال بقدر نصاب یا اس سے زائد موجود ہو تو مال حرام کو مستثنیٰ کر کے بقیہ مال کی زکوٰۃ ادا کرنا اس پر واجب ہے۔

شکل نمبر دو: قابض کی ملکیت میں مال حرام کے علاوہ حلال مال بقدر نصاب موجود نہیں ہے تو ایسی صورت میں قابض پر کوئی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس لیے کہ اس کے پاس ملکیت تامہ کے طور پر کوئی نصاب موجود نہیں ہے۔

"واذا لم تميز الاموال المصنوبه عن النصاب مملوكة له

لا تجب عليه بقدر المصنوب وتجب في الزايدة (۲)

جب مال حرام اور مصنوب مخلوط ہوئے کی وجہ سے امتیاز نہ کر سکے تو مقدار مصنوب کو مستثنیٰ کر کے بقیہ پر زکوٰۃ واجب ہے۔

دین اور قرض کی زکوٰۃ کس پر لازم

دینوں کی زکوٰۃ سے متعلق اہم ترین تین شکلیں علی الترتیب یہاں پر درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) وہ دین جو تجارتی مال یا قرض کے طور پر لازم ہے اور مدیون اس دین کا اقرار بھی کرتا ہے اور مدیون ادائے گی پر قدرت بھی رکھتا ہے اور دائن بآسانی اس کو وصول بھی کر سکتا ہے تو ایسے دین کو

دین قوی کہا جاتا ہے اور اس کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہو ا کرتی ہے اس میں شریعت نے یہ رعایت دی ہے کہ وصول ہونے سے قبل ادا کرنا واجب نہیں ہے، بلکہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جب نصاب کے پانچوں حصہ کے بقدر وصول ہو جائے تو اس وصول شدہ کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کرتا جائے گا، اور حضرت امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ کے نزدیک جو کچھ بھی وصول ہوتا رہے گا اس کی زکوٰۃ چالیسواں حصہ کے حساب سے لکالنا واجب ہوگا، اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا راجح اور مفتی یہ ہے۔

”اما القوی وهو الذی وجب بدلائل عن مال التجارة كضمن عرض التجارة

من ثياب التجارة وعبيد التجارة او غلة مال التجارة ولا خلاف في

وجوب الزكوة الا انه لا يخاطب باداء ثلث من زكوة ماضی مالم

يقبض اربعين درهما فكلما قبض اربعين درهما واحداً وعند أبي

یوسف ومحمد كلما قبض ثلثاً یودی زکوٰۃ قله المقبوض او كثر الخ“^(۱)

دین قوی وہ ہے جو مال تجارت وغیرہ کا بدل ہو، جیسا کہ تجارتی کپڑے اور غلام وغیرہ سامان تجارت

کا ثمن یا مال تجارت کی آمدنی اور اس میں وجوب زکوٰۃ میں کسی کا اختلاف نہیں ہے لیکن سنین

ماضیہ کی زکوٰۃ چالیس درہم یعنی نصاب کے پانچویں حصہ کے بقدر قبضہ ہونے سے پہلے زکوٰۃ واجب

نہ ہوگی اور چالیس درہم وصول ہونے پر ایک درہم زکوٰۃ میں ادا کرنا لازم ہوگا، اور حضرات صاحبین

کے نزدیک جو کچھ بھی وصول ہوگا اس کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا، مقبوض کی مقدار کم ہو یا زیادہ۔

(۲) اگر مدیون دین کا اقرار کر رہا ہے مگر مفلس ہونے کی وجہ سے قرض ادا کرنے سے قاصر ہے تو ایسی صورت

میں اگر حاکم نے اس کو مفلس تصور کر کے اس پر افلاس کا حکم نہیں لگایا ہے تو دین متوسط کے حکم میں

ہونے کی وجہ سے قبضہ ہونے کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا بھی دائن پر لازم ہوگا اور اگر حاکم نے

افلاس کا حکم لگا دیا ہے تو مال صمد اور دین ضعیف کے حکم میں ہونے کی وجہ سے قبضہ کرنے کے بعد

سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا حضرت امام محمدؒ کے نزدیک دائن پر واجب نہ ہوگا۔ اس لیے کہ قبضہ

(۱) بدائع ۱۰/۲، مثله رسائل الارکان ۱۶۵/۱، مجمع الانہر ۱۹۵/۱، قاضی خان ۱۲۵۲/۱

البحر الرائق ۲۰۴/۲، قاضی خان ۲۵۲/۱ -

سے قبل اس کے وصول پر دان ہو قدرت حاصل نہیں ہے۔

اور حضرات شیخین کے نزدیک سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہے اس لیے کہ اس میں جانب فقرا کی رعایت پائی جاتی ہے۔ اور صاحب درمختار، صاحب تحفہ اور قاضی خان وغیرہ نے حضرت امام محمدؒ کے قول کو صحیح اور راجح قرار دیا ہے اور باقانی نے کافی سے نقل کر کے شیخین کے قول کو راجح قرار دیا ہے۔

ولو كان الدين (إلى قوله) على معسر أو مفلس أي محكوم بأفائه

أو على جاحد عليه بينة وعن محمد لا زكوة وهو الصحيح (وتحته

في الشامية) ولو لم يفلسه القاضي وجبت الزكوة بالاتفاق (إلى قوله)

(وهو الصحيح) صححه في التحفة كما في غايية البيان وصححه

في الخانية أيضا (إلى قوله) ونفذ الباقي في تصحيح الوجوب عن مكافئ^(۱)

اگر تنگ دست اور مفلس پر قرض ہے اور حاکم اس پر مفلس ہونے کا حکم لگا دے یا منکر پر دین ہے

جس پر گواہ موجود ہے تو حضرت امام محمدؒ کے نزدیک قبضہ ہونے پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ نہیں ہے۔

(اور شیخین کے نزدیک واجب ہے) اور اگر قاضی نے مفلس قرار نہیں دیا ہے تو بالاتفاق سنین ماضیہ

کی زکوٰۃ واجب ہے۔ اور امام محمدؒ کے قول کو تحفہ غایۃ البیان خانیہ نے صحیح قرار دیا ہے اور باقانی

نے کافی سے وجوب کے قول کی تصحیح نقل کی ہے۔

(۳) دین کا اقرار کر رہا ہے اور اس کے پاس ادا کرنے کے لیے مال بھی ہے لیکن ٹال مٹول کر رہا ہے

اور امر وز و فر دایں کئی سال گزر گئے اور دائن کو اس کے حاصل کرنے پر قدرت بھی نہیں ہے تو

ایسی صورت میں قبضہ ہونے کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا دائن پر واجب نہیں ہوگا، صرف

مستقبل کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا۔ (۲)

” يقر المديون بالدين وبملاشته ولا يقدر الدائن على تخليصه

منه فهو بمنزلة العدم“ (۳)

(۱) البدو المختار مع الشامي، کراچی ۲/۲۶۶، ومثله في مجمع الانهر ۱۹۴/۱، غنايه ۱۱۶۳/۱، بدائع ۹/۲

(۲) امداد الفتاوى ۲۵/۲ (۳) شامی کراچی ۲/۳۳۳۔

مدیون دین کا اور مال داری کا اقرار کرتا ہے اور دائن اس کے چھڑانے پر قدرت نہیں رکھتا ہے تو وہ بمنزلہ عدم کے ہے اور عدم پر شرعی حکم لاگو ہو کر زکوٰۃ وغیرہ واجب نہیں ہوا کرتی ہے۔ اور اس کی زکوٰۃ مدیون پر اس لیے واجب نہیں کہ ہے کہ وہ اتنی مقدار مال کا در حقیقت مالک نہیں ہے اور وجوب زکوٰۃ کے لیے ملک تمام شرط ہے اور وہ یہاں مفقود ہے۔ حاصل یہ نکلتا ہے کہ ایسا مال وجوب زکوٰۃ کے دائرہ میں داخل نہیں ہوتا۔ اور دین کی زکوٰۃ مدیون پر کسی حال میں بھی لازم نہیں ہوتی اور دائن پر ہی دین کی زکوٰۃ واجب ہوا کرتی ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ

سرکاری محکموں اور دیگر پرائیویٹ اداروں کے ملازمین کی تنخواہ میں سے جو حصہ فنڈ کے نام کاٹ کر جمع کر لیا جاتا ہے اور اس پر مزید اضافہ کے ساتھ محفوظ کر لیا جاتا ہے اور ریٹائرمنٹ کے وقت اصل رقم اور اضافہ دونوں ملازم کو مل جاتے ہیں تو ایسی صورت میں فنڈ کی زکوٰۃ ملازم پر واجب ہوگی یا نہیں؟۔

تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ فنڈ کی مذکورہ رقم بالاتفاق دین قوی کے دائرہ میں داخل نہیں ہوتی، اور دین ضعیف کے دائرہ میں داخل ہونا زیادہ راجح ہے، اس لیے کہ ملازم کا اس رقم پر کبھی قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملازم کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی ہے، اسی وجہ سے اضافہ شدہ رقم کو سود کے دائرہ میں داخل نہیں کیا جاتا ہے اور دین ضعیف میں قبضہ کے بعد بالاتفاق سنین ماضیہ کی زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی ہے، اور اس رقم کا دین متوسط کے دائرہ میں داخل ہونا امر متردد فیہ ہے لیکن اگر دین متوسط میں داخل کر لیا جائے تو بھی صحیح اور راجح اور مفتی بہ قول کے مطابق اس پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے، اس لیے پراویڈنٹ فنڈ پر ماضی کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ (۱)

”امادین الوسط فما وجب له بدل عن مال ليس للتجارة (القولہ)

وفيه روايتان عنه وروى بن سماعه عن ابی یوسف عن المحنفۃ

(۱) امداد الفتاویٰ ۳۹/۲، فتاویٰ محمودیہ ۵۱/۳، کفایۃ المفتی ۲۸۸/۲ و ۲۳۶، جواہر

الفقہ ۱۳۸۵/۱، فتاویٰ رحیمیہ ۱۳۶/۵، عزیز الفتاویٰ کراچی ۳۶۸/۲۔

انه لا زكوة فيه حتى يقبض المائتين ويحول عليه الحول من وقت
القبض وهو اصح الروايتين عنه الخ ۛ (۱)

بہر حال دین متوسط وہ ہے جو اس کے ایسے مال سے واجب ہے جو مال تجارت نہیں ہے اور
اس کے وجوب میں امام ابو حنیفہؒ سے دو روایتیں ہیں اور ابن سماعہ امام ابو یوسفؒ سے اور
وہ حضرت امام ابو حنیفہؒ سے نقل فرماتے ہیں کہ اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے حتیٰ کہ دو سو درہم
قبضہ کر لے اور اس پر قبضہ کے بعد سال گزر جائے اور یہی امام صاحب کی دونوں روایتوں میں
سے صحیح اور راجح روایت ہے۔

نمو کی تعریف اور وجوب زکوٰۃ کی شرط

نمو کے معنی بڑھوتری کے ہیں اور باب زکوٰۃ میں اس کی دو قسمیں ہیں۔

- (۱) نمو حقیقی :- اس کا مطلب یہ ہے کہ مال توالد و تناسل اور تجارت کی شکل میں بڑھتا رہے۔
- (۲) نمو تقدیری :- اس کا مطلب یہ ہے کہ صاحب مال از خود یا اپنے نائب وغیرہ کے ذریعہ سے مال
کو بڑھانے اور ترقی کرنے پر قدرت رکھتا ہو اور وجوب زکوٰۃ کے لیے مال نامی کا ہونا شرط ہے چاہے
نمو حقیقی ہو یا تقدیری۔

”وفى الشرعى هو نوعان حقيقى وتقديرى فالحقيقى الزيادة بالتوالد
والتناسل والتجارات والتقديرى تمكنه من الزيادة بكون المال
فى بيده أو بيد نائبه الخ ۛ (۱)

اور اصطلاح شرع میں نمو کی دو قسمیں ہیں، نمو حقیقی، نمو تقدیری، اور حقیقی کا مطلب یہ ہے کہ توالد و
تناسل اور تجارت وغیرہ کے ذریعہ اضافہ ہو، اور تقدیری کا مطلب یہ ہے کہ صاحب مال از

(۱) بدائع ۱/۲، منحة الخالق ۲/۲۰۴، ومثله فى الشامى، كراچى ۳/۲۰۶ ومثله فى مجمع

الانهر ۱/۱۹۵ - (۲) شامى كراچى ۲/۲۶۲ -

(۱) شامى كراچى ۲/۲۶۳ ومثله فى البحر الرائق ۲/۲۶۶، تبیین الحقائق ۱/۲۵۵ -

خود یا اپنے نائب کے ذریعہ مال کو بڑھانے پر قدرت رکھتا ہو۔

حوائجِ اصلیہ کی شرط

حوائجِ اصلیہ میں وہ اشیاء داخل ہوتی ہیں جن کے بغیر انسانی زندگی بسر کرنا دشوار ہو جائے اور آج کل کے دور میں بہت سی غیر ضروری اشیاء کو لوگوں نے اپنے لیے یوں ہی ضروری کر لیا ہے جو درحقیقت حوائجِ اصلیہ کے دائرہ میں نہیں آتی ہیں۔ اور حوائجِ اصلیہ دو قسموں پر ہے۔

(۱) حاجتِ اصلیہ حقیقیہ اس کے اندر وہ اشیاء شامل ہوتی ہیں جس کے بغیر انسان کو ہلاکت کا خطرہ ہے، مثلاً ضروری نفقہ اور اخراجات اور رہائشی مکانات اور آلات جنگ اور سردی اور گرمی کے وہ کپڑے جن کی اپنے موسم کے اعتبار سے ہر وقت ضرورت ہوتی ہے۔

(۲) حاجتِ اصلیہ تقدیریہ، اس کے اندر وہ اشیاء داخل ہوتی ہیں انسان جن کے بارے میں ہر وقت صحیح معنی میں متفکر رہتا ہے، مثلاً واجب الادا قرضہ پیشہ اور کارگیری کے اوزار و آلات اور گھر کے ضروری اثاث و سامان اور سواری کے جانور اور علماء کے لیے دینی کتابیں یہ سب حوائجِ اصلیہ میں شامل ہیں، لہذا اگر کسی کے پاس نقد رقم موجود ہے، لیکن اس پر قرض بھی ہے یا کسی عالم نے ضروری کتابیں خریدنے کے لیے کچھ رقم الگ کر رکھا ہے یا کسی کارگیر نے اوزار کے لیے کسی کو رقم دے رکھا ہے یا گھر کے سامان اور سواری کے لیے کچھ پیسہ دے رکھا ہے، اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

”وہی ما یدفع الہلاک عن الانسان تحقیقا کالنفقة و دور السکنی
و آلات الحرب و الثیاب المحتاج الیہا لدفع الحر و البرد او تقدیرا
کالدين فان المديون محتاج الى قضاءه بما فی یدہ من النصاب
دفعاً عن نفسه الحبس الذی هو کالہلاک و کالآلات الحرفة
و اثاث المنزل و دواب الركوب و کتب العلم لاهلہا فان الجہل عندهم
کالہلاک فاذا کان لہ دراهم مستحقة یصرفہا الى تلك الحوائج
صارت کالعدومة کما ان الماء المستحق یصرفہ الى العطش کان

کالمعدوم : (شامی ۲/۲۶۲، بحرہ)

حوائجِ اصلیہ میں ہر وہ شئی شامل ہوتی ہے جو انسان سے حقیقی معنی میں اسبابِ ہلاکت کو دور کرتی ہے جیسا کہ نفقہ، رہائشی مکان، جنگی آلات، گرمی سردی کے ضروری کپڑے یا تقدیر اور باطناً ہلاکت کو دور کرتی ہے، جیسے کہ واجب الادا قرض جو اس کے قبضہ میں بقدر نصاب مال ہے اس کے ذریعہ ادا کیا جائے گا اپنے سے قید وغیرہ کو دور کرنے کے لیے اور قید بھی ہلاکت کے درمیں، صنعت کے اوزار اور گھر کے اثاث اور سواری کے جانور اور علماء کے لیے دینی کتابیں اس لیے کہ چہالت ان کے نزدیک ہلاکت ہے، لہذا ان ضروریات میں خرچ کے لیے جو رقم موجود ہے وہ کالعدم ہوگی، جیسا کہ پیاسے کے حق میں پینے کے پانی کو کالعدم قرار دے کر اس پر وضو واجب نہیں ہوتا ہے۔

شامی کی مذکورہ عبارت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی حقیقت اور علاقہ ہر دور کے اعتبار سے حاجاتِ اصلیہ میں تفاوت ہو سکتا ہے، مثلاً عوام کے لیے کتب حدیث، کتب فقہ وغیرہ حاجاتِ اصلیہ کے دائرہ میں نہیں آتیں اور علماء کے لیے حاجاتِ اصلیہ میں سے ہیں۔ اور ایسی جگہ جہاں جانوروں کو سواری کے کام میں لایا جاتا ہے اور وہاں اسکوٹر، سائیکل وغیرہ چلانے کے لیے کوئی راستہ بھی نہیں ہے وہاں سواری کے جانور حوائجِ اصلیہ میں شامل ہوں گے اور گاڑی اسکوٹر وغیرہ شامل نہیں ہوں گی۔ اور شہر والوں کے لیے یہ سب اشیاء حوائجِ اصلیہ میں شامل ہوں گی، نیز اگر ایسی جگہ جہاں گاڑی وغیرہ چلانے کا راستہ نہیں ہے وہاں کے لوگ اگر گاڑی وغیرہ رکھ لیں تو وہ اشیاء حوائجِ اصلیہ سے اگرچہ زائد ہیں لیکن مال نامی نہ ہونے کی وجہ سے ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

طویل الاجل قرض اور کون سا دین مانع زکوٰۃ ؟

وہ تمام دیون جو مدیون پر واجب الادا ہوتے ہیں وہ سب وجوب زکوٰۃ کو مانع ہیں اس لیے موجودہ دور میں تجارت کو فروغ دینے کے لیے اور فیکٹری اور فرم وغیرہ قائم کرنے کے لیے پبلک حکومت سے جو قرض لیتی ہے اور ادا کیے گی کے لیے سالانہ ماہانہ قسط مقرر کیا جاتا ہے اور طویل الاجل قرض کے بارے میں بھی یہی حکم ہے کہ مقدار قرض کو منہا کرنے کے بعد باقیہ مال اگر نصاب کو پہنچ جاتا ہے تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب

ہوگا اور اگر نصاب کو نہیں پہنچتا ہے تو زکوٰۃ ہی اس مدیون پر واجب نہ ہوگی۔
 نیز اگر ایک کروڑ روپیہ قرض میں لے رکھا ہے اور سالانہ پانچ لاکھ کے حساب سے بیس سال
 میں ادا کرتا ہے تو سالانہ قسط کے لحاظ سے تجزی نہ ہوگا بلکہ پورے ایک کروڑ کو منہا کیا کرے گا۔

”فارغ عن الدين والمراد دين له مطالب من جهة العباد سواء
 كان الدين لهم او لله تعالى وسواء كان المطالبة بالفعل او بعد
 زمان فينقسم الدين المؤجل: (۱)

مال نصاب قرض سے بری ہو اور قرض سے ایسا قرض مراد ہے کہ منجانب العباد اس کا مطالبہ ہو
 چاہے وہ دین بندوں کا ہو یا اللہ تعالیٰ کا اور مطالبہ فی الحال اور بالفعل ہو یا مدت اور زمانے
 کے بعد لہذا دین مؤجل بھی مانع زکوٰۃ میں شامل ہوگا۔

کمپنی اور مشترک کاروبار کے حصہ داروں کی زکوٰۃ

مشترکہ تجارت اور کمپنی فیکٹری وغیرہ کے حصہ داروں کی زکوٰۃ مجموعہ رقم اور مال پر واجب نہیں ہوتی ہے
 بلکہ ہر حصہ دار کی زکوٰۃ اس کے حصہ کے حساب سے ادا کرنا واجب ہوگی، لہذا جس کا حصہ نصاب کو پہنچے گا،
 اس پر اپنے حصہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگی اور جس کا حصہ نصاب کو نہیں پہنچتا ہے اور اس کے پاس اس
 کے علاوہ اتنا مال نہیں ہے جس کو ملا کر نصاب مکمل ہو سکتا ہو، تو ایسے حصہ دار پر زکوٰۃ ہی واجب نہیں ہے اور
 جس کے پاس شرکت کے حصہ کے علاوہ اتنا مال ہے جس کو ملا کر نصاب مکمل ہو جاتا ہے اس پر زکوٰۃ تو واجب
 ہو جاتی ہے لیکن وہ اپنے حصہ کی زکوٰۃ اپنے طور پر نکالا کرے گا۔ (۲)

”ولا تجب الزکوٰۃ عند نافي نصاب مشترك من سائمة و مال
 تجارة وان صحت الخلطة (إلى قوله) وان تعدد النصاب تجب
 اجمعاً ويتراجعان بالحصص فان بلة نصيب احدهما نصاباً زكاه

(۱) مجمع الزہر ۱۹۳/۱ و مشلہ عنایت علی ہامش الفتح ۱۶۶/۱، خانیہ ۲۵۵/۱، شریعہ ۱۴۳/۱، الدر المختار ۲۶۶/۱

البحر الرائق ۲۰۳۶/۱ (۲) استفاد فتاویٰ دارالعلوم ۶۴/۶ -

دون الآخر الخ ۱۱

ہمارے نزدیک جانوروں اور مال تجارت کے ایک مشترک نصاب پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اگر اس میں اختلاط و اشتراک صحیح ہو چکا ہے اور اگر نصاب متعدد ہو جائے تو ان نصابوں کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا، اور حصہ دار حضرات اپنے اپنے حصوں کے حساب سے ایک دوسرے سے مراجعت کریں گے۔ اور اگر کسی کا حصہ نصاب کو پہنچتا ہے اور کسی کا نہیں پہنچتا ہے تو جس کا حصہ نصاب کو پہنچتا ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، دوسرے پر نہیں۔

ہیرے جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے، جواہرات اگر تجارت کے لیے ہیں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے اور اگر تجارت کے لیے نہیں ہیں بلکہ گھروں میں برائے زینت یا کسی اور مقصد سے جمع کر رکھا ہے تو ہیرے و جواہرات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لیے کہ ہیرے جواہرات اگرچہ حوائج اصلیہ سے زائد ہیں لیکن وجوب زکوٰۃ کے لیے مال نامی ہونا بھی شرط ہے اور ان میں نمو اور بڑھوتری کی شرط نہیں پائی جاتی ہے، اس لیے ہیرے جواہرات چاہے کتنے ہی مقدار میں ہوں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔

”أما اليواقيت والسلاسل والجواهر فلا زكوة فيها وإن كانت حلياً إلا أن

تكون للتجارة“ (۱)

یا قوت، موقی، جواہرات اگر تجارت کے لیے نہ ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اگرچہ زیور کی شکل میں کیوں نہ ہوں۔

”والجواهر والیواقیت فلا شئ فیہا“ (۲) فان الحوائج الاصلیة اعم من

الدین والنامی اعم منها لانه یخرج به کتب العلم لغير اهلها

ولیس من الحوائج الاصلیة الخ (۳)

(۱) الدر المختار، کراچی ۳/۳۱، (۲) عالمگیری ۱۸۶/۱ (۳) عالمگیری ۱۸۵/۱ ومنہ کتاب الفقه ۶۱۲/۱

الدر المختار، کراچی ۳/۳۱ (۴) منامی، کراچی ۲/۲۶۲ -

یا قوت و جواہر میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے، اس لیے کہ حوائجِ اصلیہ میں دین بھی شامل ہے اور نمو بھی دین کو شامل ہے اور اسی نمو کی قید کی وجہ سے غیر اہل کے لیے کتبِ دینیہ نصاب کے دائرہ سے خارج ہو جاتی ہے حالانکہ وہ غیر اہل کے لیے حوائجِ اصلیہ میں سے نہیں ہیں۔
غیر نامی اشیاء اگر بقدر نصاب یا نصاب سے زیادہ حوائجِ اصلیہ سے زائد ہو تو مالک پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے اس کی وجہ سے صرف مستحق زکوٰۃ بننے سے محروم ہوتا ہے اس لیے ہیرے و جواہرات میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

”و کذا الکتب وان لم تکن لاهلہا اذا لم تمول للتجارة غیر ان الاہل
لہ أخذ الزکوۃ وان سادت نصابا وتحتہ فی الشامی واما غیر
الاہل فانہم یحرمون بالکتب من أخذ الزکوۃ لتعلق الحرمان بملک
قد رنصاب غیر محتاج الیہ وان لم یکن نامیاً“ (۱)

ایسے ہی کتابیں اگرچہ نااہل کے لیے ہوں اور تجارت کی غرض اس میں نہ ہو (تو اس میں زکوٰۃ نہیں ہے) لیکن اگر باہل عالم کی کتابیں ہیں تو اس کے لیے زکوٰۃ لینا بھی جائز ہوگا، کتابیں چاہے
کئی نصاب کے بقدر کیوں نہ ہوں اور غیر اہل ان کتابوں کی وجہ سے مستحق زکوٰۃ ہونے سے
محروم ہو جائے گا، جب کہ نامی اور تجارتی نہ ہوں۔

تجارتی پلاٹ اور اموال تجارت میں کس نرخ پر زکوٰۃ

اموال تجارت میں ادا زکوٰۃ کے لیے چار قسم کے نرخ سامنے آتے ہیں:
(۱) حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ کے نزدیک جس دن سال ختم ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوا
ہے اگر اسی روز زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے اور پھر بھاؤ میں گھٹاؤ بڑھاؤ ہو جائے تو حوالان حول کے
دن جو بھاؤ عمومی طور پر پایا جاتا تھا اسی بھاؤ کا اعتبار کرتے ہوئے زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا۔
”عند الحی حنیفۃ رحمہ فی الزیادۃ والنقصان جمیعاً یؤدی قیمتہا“

یوم الحول۔ الخ ۱۱

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حولانِ حول کے بعد اگر زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے اور مال کے بھاؤ میں گٹاؤ بڑھاؤ ہو جائے تو جب بھی ادا کرے گا حولانِ حول کے دن کے بھاؤ کا اعتبار کر کے ادا کرے گا۔

(۲۱) حضرت امام ابو یوسفؒ و محمدؒ کے نزدیک اگر یوم الحول میں زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے تو وقت گزر جانے کے بعد جس دن بھی اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی اسی دن کی قوت خرید کے نرخ کا اعتبار کر کے زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا، لہذا اگر بھاؤ گھٹ جائے تو گھٹے ہوئے کی قیمت لگا کر زکوٰۃ ادا کی جائے گی اور اگر بڑھ جائے تو بڑھے ہوئے کی قیمت لگا کر ادا کرنا لازم ہوگا۔

”وعندھما فی الفصلین جمیعاً یؤدی قیمتہا یوم الاداء فی

النقصان (وقولہ) وفی الزیادة الخ ۱۲

اور حضرات صاحبین کے نزدیک عینِ شئی میں سے ادا کرے دونوں صورتوں میں یوم الاداء کے نرخ کا اعتبار ہے چاہے مال کی قیمت کم ہوگئی ہو یا زیادہ۔

(۲۲) متوقع قیمت فروخت کا اعتبار کرتے ہوئے زکوٰۃ ادا کی جائے لیکن یہ ایک امر متروک فیہ ہے، اور زکوٰۃ مال متعین اور مال یقینی اور ملکیت یقینیہ پر ہی واجب ہوا کرتی ہے، اس لیے متوقع نرخ کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

(۲۳) رأس المال اور لاگت کی قیمت کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے یہ ایک امر یقینی اور متعین ہے اگر اس کا اعتبار کیا جائے تو ملکیت تامہ اور ملکیت لازمہ پر زکوٰۃ ادا کرنا پایا جاتا ہے اور شریعت اسلامی نے ملکیت لازمہ پر زکوٰۃ واجب کی ہے ملکیت متروک فیہ پر زکوٰۃ واجب نہیں کی ہے، اس وجہ سے اس شکل کا اعتبار کرنے میں اگرچہ عبارات فقہیہ زیادہ ساتھ نہیں دیتی ہیں لیکن وجوب زکوٰۃ کی اصل علت اور بنیاد پر غور کرنے سے اس شکل کی قوت نظر آتی ہے اس لیے اس صورت کو اگر جائز کہا جائے تو گنجائش معلوم ہوتی ہے اور کتب فقہ کی عبارات اول الذکر دونوں

شکلوں کی مؤید ہیں، لہذا حاصل یہ نکلے گا کہ تیسری شکل کے جواز کے دائرہ میں آنے کے لیے کسی قسم کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور چوتھی شکل اصل بنیاد و علت کے لحاظ سے جواز کے دائرہ میں آسکتی ہے، اور اول و دوم کے لیے کتب فقہ کی صریح عبارات موجود ہیں۔ اس لیے ان تینوں شکلوں میں سے کسی بھی ایک کو معمول یہ بنائی جاسکتی ہے، مگر حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول کے مطابق یوم النحر کے نرخ کا اعتبار کرنا زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے۔ اور تجارتی پلاٹ پر بھی مذکورہ تفصیل اور احکام لاگو ہوں گے۔ اگر پھر فروختگی کا مال ہے تو زکوٰۃ میں پھر بھاؤ کی قیمت لگانا ہوگا، اور تھوک فروختگی کا مال ہے تو تھوک بھاؤ کی قیمت لگانا ہوگا۔

کمپنی کے حصص اور شیز کی زکوٰۃ

کمپنی کے حصص اور شیز میں تجارتی سرمایہ ہونے کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوا کرے گی اور اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی میں لاگت اور منافع دونوں کا اعتبار کر کے دونوں کی زکوٰۃ نکالنا واجب ہے اور اس کے سرمایہ میں سے جتنی مقدار کمپنی کے غیر نامی اثاثوں میں خرچ ہوا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور جو مقدار نامی اثاثوں میں لگا ہے اس کی اس کے منافع کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے اور اگر اس کا پورا حصہ نامی اثاثہ میں لگایا گیا ہے تو پورے حصہ رأس المال اور منافع دونوں کی زکوٰۃ نکالنا واجب ہے۔ اور اگر شیز مارکیٹ میں شیز کو خرید کر فروخت کیا کرتا ہے اور فروختگی کی غرض سے حصص خریدا کرتا ہے تو کل لاگت مال تجارت کے دائرہ میں آکر کل پر زکوٰۃ واجب ہوا کرے گی۔ (۱)

بونڈس اور حکومت کو بطور قرض دی گئی رقم کی زکوٰۃ

حکومت اور کمپنی وغیرہ کو طے شدہ مدت اور معاہدہ کے تحت جو رقم بطور قرض دی جاتی ہے، وہ شرعی طور پر دین قوی کے حکم میں ہوتی ہے، اس لیے قبضہ ہونے کے بعد سنین ماضی کی بھی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوا کرتی ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم مصریؒ کی البحر الرائق کی عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

(۱) مستفاد فتاویٰ رمعیہ ۱۲/۲، جریب فقہی مسائل ۱۳۶/۱، اسلامی فقہ ۲۳۱/۱، جواہر الفقہ ۳۸۵/۱، امراء الفتاویٰ ۲/۱

”الدين على ثلاثة اقسام قوى وهو بدل القرض ومال التجارة (قوله)
ففى القوى تجب الزكاة اذا حال الحول ويستراخى القضاء الى ان يقبض
اربعين درهما ففيها درهم وكذا فيما زاد بحسابه الخ“ (۱)
قرض اور دين تين قسموں پر ہے، دين قوی اور وہ بدل قرض اور مال تجارت ہے تو دين قوی
کے اندر حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے لیکن ادائے گئی چالیس درہم کے قبضہ
کرنے تک موقوف رہے گی اس کے بعد جتنا وصول ہوتا رہے گا اس کا حساب لگا کر زکوٰۃ
ادا کیا کرے گا۔

مصارف زکوٰۃ

مد زکوٰۃ سے طلبہ کی فیس ادا کرنا

اگر طلبہ کے اخراجات کا حساب لگا کر فی کس جتنا بنتا ہے اتنے کا چیک بنا کر مہتمم مدرسہ کے قبضہ میں
دے دیا کرے اور طلبہ اپنے قیام و طعام کی چیز کے نام سے مدرسہ کو دے دیا کریں تو بلاشبہ جائز و درست
ہوگا اور یہ مدارس اسلامیہ میں مال زکوٰۃ کی تملیک کے لیے بہت بہترین اور مناسب شکل ہے اور یہ حیلہ
تملیک نہیں بلکہ تملیک کے دائرہ میں داخل ہو جائے گی اور اگر مال دار اور مستطیع طلبہ سے فی کس کے
تناسب سے فیس لیا کرے تو یہ بھی جائز اور درست ہے البتہ وہ غنی طالب علم جس کی ملکیت میں نصاب
سے زائد مال اور رقم ہے، راجح قول کے مطابق اس کو زکوٰۃ کی رقم دینا یا مد زکوٰۃ سے اس پر خرچ کرنا جائز
نہیں ہے^(۲) اور صاحب درمختار نے جو غنی طالب علم کے لیے اخذ زکوٰۃ کو جائز لکھا ہے اس کو علامہ شامی نے
یہ کہہ کر مسترد کر دیا ہے کہ یہ اس قول کے خلاف ہے جس میں مطلقاً غنی کے لیے حرمت زکوٰۃ کو ثابت کیا گیا
ہے اور جواز کے قول کا کسی نے اعتبار نہیں کیا۔

(۱) البحر الرائق ۲/۲۶۶، مسئلہ فی المناصیۃ ۱/۲۵۴

(۲) امداد الفتاویٰ ۱۹/۲ - احسن الفتاویٰ ۲/۲۵۲ -

”وهذا الفرع مخالف لاطلاقهم الحرمة فسي الغنى ولم يعتمد

احد (۱)

اور یہ جزئیہ فقہاء کے غنی کے حق میں علی الاطلاق حرمت زکوٰۃ کے قول کے مخالف ہے اور
(اس جواز کے قول) کا کسی نے اعتبار نہیں کیا ہے۔

اور اگر فقیر طلبہ کو مہتمم اور ذمہ داران مدرسہ چیک یا رقم پر قبضہ نہ دیں اور خود مہتمم یا دیگر ذمہ دار طلبہ
کے نام سے اپنے طور پر جمع کر لیں پھر اس رقم کو تنخواہ وغیرہ میں صرف کیا جائے تو یہ جائز نہ ہو گا بلکہ اس کے
جواز کے لیے یہ شرط ہے طلبہ صراحتاً ذمہ دار کو اس کام کے لیے وکیل بنادیں، اس کے بغیر جواز کے دائرہ میں
نہیں آسکتا۔

اداء زکوٰۃ میں ضم نصاب کا حکم

وجوب زکوٰۃ کے لیے شریعت اسلامی نے مال نامی ہونے اور حوائج اہلیہ سے فارغ ہونے
کے ساتھ ساتھ نصاب مال کے مالک ہونے کی شرط بھی لگائی ہے تاکہ لا ضرر ولا ضرار کے قانون
کے تحت کسی کو کوئی نقصان نہ ہو اور اسلامی شریعت نے سونا اور چاندی کو الگ الگ معیار قرار دیا
ہے اسی وجہ سے دونوں اپنی اپنی جگہ مستقل اصلیت کا حکم رکھتے ہیں اس لیے بلاوجہ کسی ایک کو ہی اصل
ٹھہرنا بے اصل اور بے دلیل بات ہوگی، اس لیے جب دونوں الگ الگ اپنے نصاب کو پہنچ جائے
تو الگ الگ زکوٰۃ نکالنا بھی واجب ہوتا ہے اور جب تفاوت ہو جائے اور ایک کا نصاب مکمل ہو جائے
اور دوسرے کا مکمل نہ ہو یا کسی کا نصاب کامل نہ ہو تو شریعت نے انفع للفقراء کو پیش نظر رکھ کر ایک کو دوسرے
کے ساتھ ملا کر دونوں کو ایک کے حکم میں قرار دے کر نصاب مکمل کر کے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم فرمایا ہے اور
اس طرح منم نصاب کی صورت میں انفع للفقراء کو ملحوظ رکھنے کا حکم فرمایا ہے اور انفع للفقراء اسی میں ہے کہ
سونے کو چاندی کے ساتھ ملا کر پورے کو چاندی کا نصاب بنا دیا جائے۔ (۲)

(۱) شامی کراچی ۲۴۰/۶ (۲) مستغلا فتاویٰ محمودیہ ۲۶۸ - کفایت المفتی ص ۲۵۳ - امداد الفتاویٰ

”وجوب الضم اذا لم يكن كل واحد منهما نصاباً بان كان اقل فلو كان كل منهما نصاباً تاماً بدون زيادة لا يجب الضم بل ينبغي ان يؤدى من كل واحد زكوة فلو ضم حتى يؤدى كله من الذهب او الفضة فلا بأس به عندنا ولكن يجب ان يكون التقويم بما هو النفع للفقراء“^(۱)

سونا چاندی میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ منم کرنا اس وقت واجب ہوتا ہے کہ جب دونوں کا نصاب مکمل نہ ہو اور نصاب سے کم ہو اور اگر دونوں کا نصاب مکمل ہو تو انضمام لازم و واجب نہیں ہے بلکہ ایسی صورت میں بہتر اور ادلیٰ یہی ہے کہ دونوں کی زکوٰۃ الگ الگ ادا کی جائے اور اگر ملا کر ادا کی جائے تو بھی حنفیہ کے نزدیک کوئی حرج نہیں ہے لیکن واجب یہی ہے کہ اس کے ساتھ قیمت لگائی جائے جس میں فقرا کا زیادہ فائدہ اور نفع ہو۔

مہتمم معطین و طلبہ و نون کا وکیل

مہتمم اور سفراء بالاتفاق معطین کے وکیل ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ طلبہ اور فقراء کے بھی وکیل ہیں یا نہیں؟ تو اگر ان کو صرف زکوٰۃ دہندگان کی طرف سے وکیل تسلیم کیا جائے اور طلبہ کی طرف سے وکیل تسلیم نہ کیا جائے تو زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہ ہوگی جب تک یہ لوگ مصرف میں خرچ نہ کر دیں، لہذا اگر مصرف میں خرچ ہونے سے قبل ضائع ہو جائے تو معطین کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اس پر فریضہ زکوٰۃ بہ دستور باقی رہے گا، لیکن اگر مہتمم اور سفراء کی طرف سے کوئی تعدی نہیں ہوئی ہے تو ان پر تاوان بھی لاگو نہ ہوگا، نیز ایسی صورت میں جن مدارس میں زکوٰۃ کی رقم کئی کئی سال خرچ ہوئے بغیر جمع رہتی ہے اگر بقدر نصاب ہو تو ان کے معطین پر ان سالوں کی زکوٰۃ بھی دوبارہ ادا کرنا واجب ہوگا۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں اس کو خوب وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔^(۲) لیکن ہمارے اکثر اکابر اہل فتاویٰ نے مہتمم کو طلبہ اور معطین دونوں کا وکیل تسلیم کیا ہے اور طلبہ کے

(۱) شامی، کراچی ۳۳/۲ ومثلہ فی الہندیۃ ۱۴۹۸۔

(۲) معارف القرآن ۱۶۹/۴ تحت سورہ توبہ، آیت ۵۴۔

وکیل ہونے کی وجہ سے مہتمم اور اس کے ماتحت لوگوں کے قبضہ کرنے پر زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ اسی وقت ادا ہو جاتی ہے، لہذا اگر طلبہ پر خرچ ہونے سے قبل بلا تعدی ہلاک ہو جائے تو معطین کے وکیل اور امین ہونے کی وجہ سے ان پر کوئی تاوان لازم نہ ہوگا اور طلبہ کے وکیل ہونے کی وجہ سے معطین کی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، نیز کئی سال سے جمع شدہ رقم پر کسی شخص حقیقی کی ملکیت تامہ نہ ہونے کی وجہ سے ان سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنا لازماً نہ ہوگا، حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب محدث مہارن پوری قدس سرہ فرماتے ہیں کہ معطین کے حق میں اہل مدرسہ بیت المال کے عمال کے مثل ہیں اور طلبہ اور آخذین کی طرف سے وکلاء ہیں، لہذا نہ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ ہی معطین زکوٰۃ واپس لے سکتے ہیں۔ (۱)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے اس فتویٰ سے رجوع کر لیا ہے جس میں طلبہ کی طرف سے وکیل ہونے کا انکار کیا ہے، اور رجوع کا تفصیلی فتویٰ جواہر الفقہ ۳۸۴/۴ میں امین اشرف متعلم درجہ تخصص فی الفقہ والافتاء، دارالعلوم کراچی کے ۱۳ ذیقعدہ ۱۳۹۵ھ کے سوال کے جواب کے تحت موجود ہے۔ (۲)

اور یہی مضمون حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی دامت برکاتہم نے فتاویٰ محمودیہ میں نقل فرمایا ہے کہ جب طلبہ نے مہتمم کے اہتمام اور انتظام اور قوانین تسلیم کر کے داخلہ لیا ہے تو گویا کہدیا کر آپ ہمارے وکیل ہیں۔^(۳) اور قطب عالم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ نے بھی صاف اور واضح الفاظ میں مہتمم کو طلبہ کا وکیل قرار دیا ہے۔^(۴) اور قوت دلائل کی روشنی میں اگرچہ مہتمم کو طلبہ کا وکیل نہیں قرار دیا جاسکتا ہے جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے معارف القرآن میں نقل فرمایا ہے لیکن اساطین امت اور اہل فتاویٰ کی ایک بڑی جماعت نے مہتمم اور اہل مدرسہ کو طلبہ کا وکیل قرار دیا ہے، اس لیے ہی مسلم ہوگا کہ مہتمم اور اہل مدرسہ اور سفراء معطین اور طلبہ دونوں کی طرف سے وکیل ہوں گے۔ نیز حضرت تھانویؒ نے بھی امداد الفتاویٰ ترتیب قدیم مطبوعہ رحیمہ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمہ کے مذکورہ جواب کو تحریر فرمایا ہے جس سے شبہ اور تردد بالکل رفع ہو جاتا ہے۔ (۵)

(۱) استفاد فتاویٰ خلیلیہ ۲۱۹/۱ (۲) جواہر الفقہ ۳۸۴/۴ (۳) فتاویٰ محمودیہ ۲۱۸/۲ منلہ فتاویٰ محمودیہ

۳۸۴/۴ (۴) استفاد تذکرۃ الرشید ۱۶۳/۱ حاشیہ فتاویٰ خلیلیہ ۲۲۰/۱

(۵) امداد الفتاویٰ ترتیب قدیم ۲۱۸/۴ -

مذکوٰۃ سے سفر کی تنخواہ

مدارس کے سفر کو عالمین علیہا کے حکم میں قرار دے کر ان کو زکوٰۃ کی رقم میں سے بلا تملیک تنخواہ دینا درست ہو گیا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں ہمارے اکابر میں سے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے سفر کو عالمین علیہا کے دائرہ میں داخل کر کے مذکوٰۃ سے ان کو تنخواہ دینا جائز قرار دیا ہے اور صرف یہ قید لگائی ہے کہ ان کی وصول کی ہوئی رقم کے نصف سے زائد تنخواہ دینا جائز نہیں ہے۔^(۱) نیز حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے امداد المفتیین میں بڑی تفصیل کے ساتھ یہی نقل فرمایا ہے کہ سفر کو عالمین کے حکم میں قرار دے کر ان کو مذکوٰۃ سے تنخواہ دی جاسکتی ہے۔^(۲) لیکن حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں کافی تفصیل کے ساتھ مختلف دلائل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مدارس کے سفر کو عالمین کے حکم میں قرار نہیں دیا جاسکتا اور ان کو عالمین کے حکم میں قرار دے کر مذکوٰۃ میں سے ان کو زکوٰۃ دینا ہرگز درست نہیں ہو سکتا۔^(۳)

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت مفتی صاحب موصوف نے جواز کے فتویٰ سے رجوع کر کے عدم جواز کو اختیار فرمایا ہے اس لیے کہ یہ مسلم بات ہے کہ امداد المفتیین بہت پہلے مرتب ہو گئی تھی اور اس کے طویل عرصہ کے بعد معارف القرآن تحریر فرمائی ہے، تو اب اکابر میں سے جواز کے قائل صرف حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب قدس سرہ تنہا رہ جاتے ہیں اور قریب قریب تمام اکابر اہل فتاویٰ اس پر متفق ہیں کہ سفر کو امیر کی طرف سے مقرر کردہ عالمین کے حکم میں قرار دے کر ان کو مذکوٰۃ سے بلا تملیک تنخواہ دینا ہرگز جائز نہیں ہے۔ امداد الفتاویٰ، عزیز الفتاویٰ، احسن الفتاویٰ وغیرہ سب میں عدم جواز کا حکم موجود ہے۔^(۴) اور یہی حکم محاسبی اور دفتر کے ملازمین کی تنخواہ کے بارے میں بھی ہو گا، خصوصاً جب وہ لوگ حساب زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے کام بھی انجام دیتے ہوں، لہذا مذکوٰۃ سے سفر، دیگر ملازمین کو تنخواہ دینا ہرگز جائز نہیں ہو سکتا۔

۱، کفایۃ المفتی ۲/۲۶۹

۲، امداد المفتیین، کراچی ۳۵۸

۳، معارف القرآن ۲/۱۶۹، سورہ توبہ آیت: ۷۔

۴، امداد الفتاویٰ دیوبند، عزیز الفتاویٰ، کراچی ۳۶۰، احسن الفتاویٰ ۲۸۴۔

اگر باتنخواہ ملازمین کو حسن کارکردگی کچھ شرح فی صد متعین کر کے بطور انعام طے شدہ تنخواہ سے زائد دینا شرط ناجائز اور درست ہے لیکن یہ انعام وصول شدہ چندہ کے نصف سے کم ہی ہونا شرط ہے اور نصف سے کم میں کوئی بھی مقدار حسب صواب دید متعین کی جاسکتی ہے اس لیے کہ نصف یا اس سے زائد امیر کی طرف سے مقرر کردہ عاقلین کو دینا بھی جائز نہیں ہے، اس کو حضرات فقہاء نے ان الفاظ میں واضح کر دیا ہے۔
 لکن لایزاد علی نصف مایقبضہ (۱) لیکن وصول شدہ کے نصف سے زائد ان کو نہ دیا جائے۔
 اور اس کا لحاظ بھی لازم ہوگا کہ سفر از زکوٰۃ کی رقم وصول کر کے تملیک سے قبل اس میں سے خرچ نہ کریں بلکہ خرچ کے لیے مدرسہ سے علی الحساب پیشگی رقم لے لیا کریں اور زکوٰۃ کی وصول شدہ رقم اولاً مکمل مدرسہ میں جمع کر دیں پھر مدرسہ کے فنڈ سے اپنا حساب صاف کر لیا کریں ورنہ تملیک فقراء کی شرط فوت ہو جاتی ہے اور تملیک ادارہ زکوٰۃ کے لیے شرط ہے۔

ویشترط ان یکون الصرف تملیکاً (۲)

ادارہ زکوٰۃ کے لیے تملیک فقراء شرط ہے۔

اور اگر باتنخواہ ملازم نہیں ہے تو اجارہ فاسدہ ہونے کی وجہ سے شرح فی صد متعین کر کے صرف کمیشن کو اجرت قرار دینا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ صحت اجارہ کے لیے اجرت کا تعین شرط ہے۔ لہذا کمیشن کا یہ طریقہ جواز کے دائرہ میں نہیں آسکتا۔ (۳)

”و شرطها کون الاجرة والمنفعة معلومتین الخ“ (۴)

یعنی صحت اجارہ کے لیے منفعت اور اجرت دونوں کا تعین ہونا شرط ہے۔

ولا یصح حتی تکون المنافع معلومة والاجرة معلومة (۵)

یعنی اجارہ اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک منفعت اور اجرت متعین نہ ہو۔

لہذا حاصل یہ نکلتا ہے کہ باتنخواہ ملازم کے لیے بطور انعام کمیشن متعین کرنا جائز ہے اور بے تنخواہ کے لیے جائز نہیں ہے۔

(۱) شامی کراچی ۳۴۶/۲ (۲) درمختار کراچی ۳۴۴/۲ (۳) فتاویٰ احیاء العلوم ۳۳۳/۱، فتاویٰ

محمودیہ ۲۰۴/۴، فتاویٰ محمودیہ ۵۲۴/۱ (۴) درمختار کراچی ۵/۶ (۵) ہدایہ ۳۴۴/۲

زکوٰۃ

ان : — مولانا عبد اللہ قاسمی، استاذ جامعہ اسلامیہ، بنارس

زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر ایک محکم فریضہ ہے جو ہر مالدار مسلمان پر چند شرائط و حدود کے ساتھ عائد کیا گیا ہے۔ جن میں سے کچھ شرائط کا تعلق اس شخص سے ہے جس پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے، کچھ کا اس مال سے جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور کچھ کا اس مصرف سے جہاں زکوٰۃ کی مفروضہ مقدار خرچ کی جاتی ہے۔ فقہاء مجتہدین نے قرآن و حدیث کی نصوص، اجماع اور ان کی روشنی میں قیاس صحیح کے ذریعہ اصولی و فروعی اعتبار سے ان شرائط و حدود کی تشریح کر دی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اختلاف زمانہ اور احوال و ظروف کے تبدل کے ساتھ ہر دور کے جزئی مسائل بھی مختلف ہوا کرتے ہیں، لہذا ان کا حل بھی اصول شریعت کی روشنی میں زمانہ و حال کی رعایت کرتے ہوئے ڈھونڈنا وقت کے فقہاء کی ذمہ داری ہوتی ہے، موجودہ زمانے میں ملکی و عالمی تجارتوں کی کچھ ایسی نئی شکلیں رونما ہوئی ہیں جن کا اثر معاملات کے علاوہ باب زکوٰۃ پر بھی پڑا ہے خصوصاً ان شرائط اور اوصاف پر جن کا تعلق مال سے ہے، بسا اوقات یہ فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ اس مال کی زکوٰۃ واجب بھی ہوئی یا نہیں۔ پیش نظر مقالہ میں سوالنامہ کے اسی جز کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، جب کہ محور ثالث ”مصارف زکوٰۃ“ کے بعض پہلوؤں پر بھی کچھ گفتگو کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلی شرط ملک تمام (محو اول)

ملک تمام کا مطلب : کسی بھی مال میں زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے اس کا مملوک ہونا ضروری ہے، چنانچہ جس مال

کا کوئی شخص حقیقی مالک نہ ہو، اس میں زکوٰۃ فرض نہ ہوگی، پھر علاوہ امام زفر بھی ائمہ احناف کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ اس مال پر شخص حقیقی کو ملکیت کامل طور سے حاصل ہو۔ کامل کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ اسباب تملک میں کسی سبب کے ذریعہ شئی کی ذات پر ملکیت قائم ہونے کے ساتھ ساتھ قبضہ و تصرف میں بھی وہ شئی آجائے۔ شیخ الاسلام ابو بکر بن علی الحداد (متوفی ۸۵۸ھ) الجوهر النیرہ میں فرماتے ہیں:

”قوله ملكاً تاماً يحترز من ملك المكاتب والمديون والمبيع قبل

القبض لأن الملك التام هو ما اجتمع فيه الملك واليد واما اذا وجد

الملك دون اليد كملك المبيع قبل القبض والصدّاق قبل القبض

أو وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لا تجب فيه الزكاة“^(۱)

ملک تام کی قید سے مکاتب اور مدیون کا مال خارج ہو جائے گا، نیز وہ فروخت شدہ سامان جس

پر قبضہ نہ ہوا ہو، کیوں کہ ملک تام اسے کہتے ہیں جس میں ملکیت اور قبضہ دونوں اکٹھا ہوں، چنانچہ

اگر ملکیت تو ہو لیکن قبضہ نہ ہو جیسے کہ مبيع قبل القبض اور عورت کا وہ دین مہر جس پر اسے قبضہ

حاصل نہیں ہے یا قبضہ ہو اور ملکیت نہ ہو مثلاً مکاتب کا مال اور مدیون کا دین جو کسی کا اس

کے ذمہ ہے، ان سب میں زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔

قبضہ و تصرف میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مال مقدور الانتفاع ہو یا بن معنی کہ اس شئی پر بالفعل قبضہ

و تصرف ہونا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اگر کوئی چیز بالفعل قبضہ میں نہ ہونے کے باوجود بھی مالک کے لیے اس

سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو تب بھی کہا جائے گا کہ اسے ملکیت تام حاصل ہے۔

ملک العلماء علاء الدین ابو بکر بن مسعود کاسانی (متوفی ۷۵۸ھ) فرماتے ہیں:

ومنها الملك المطلق وهو أن يكون مملوكاً له رقة ويذا وهذا قول

أصحابنا الثلاثة وقال زفر والشافعي اليد ليست بشرط فلا تجب

الزكاة في مال الضمار عندنا خلافاً لهما..... ثم قال تعليلاً

(۱) شخص حقیقی اور شخص اعتباری کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

(۲) الجوهرة النيرة: ۱/۱۳۴

لهذا الحكم ولأن المال إذا لم يكن مقدور الانتفاع به فليس حق
 المالك لا يكون المالك به غنيا ولا زكاة على غير الغنى.....
 ومال ابن السبيل مقدور الانتفاع به فليس حقه بيبد فائده.....
 وكذا الدين المقرب إذا كان المقر ملبا فهو ممكن الوصول اليه^(۱)
 بمنحله شرائط ملك تام ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذات اور قبضہ ہر دو اعتبار سے اس کا
 مملوک ہو یہی ہمارے تینوں ائمہ کا مذہب ہے۔ امام زفر و شافعی کے نزدیک قبضہ شرط نہیں
 چنانچہ مال منار میں ہمارے نزدیک زکوٰۃ واجب نہ ہوگی برخلاف ان کے۔ آگے اس حکم کی علت
 بتلے ہیں کہ مال جب مالک کے حق میں مقدور الانتفاع نہ ہوگا تو اس کی وجہ سے وہ غنی نہ
 ہوگا اور غیر غنی پر زکوٰۃ نہیں ہوتی۔ آگے فرماتے ہیں، مسافر کا مال جو اس کے گھر ہے اس کے
 حق میں مقدور الانتفاع ہے بایں طور کہ اس کا قائم مقام اس پر قابض ہے۔ آگے فرماتے ہیں
 اسی طرح وہ دین جس کا اقرار کر لیا گیا ہو اور اقرار کر کے والا مال مٹول کرتا ہو وہ بھی مقدور
 الانتفاع ہے کہ اس تک پہنچنا ممکن ہے۔

اس کا لازمی مطلب یہ ہوا کہ مبیع قبل القبض (وہ عین جو بیع مکمل ہو کر خریدار کی ملک بن چکی ہے لیکن
 ابھی تک بائع کے قبضہ میں ہے) اور حبلہ دیون جو کسی کے ذمہ واجب الادا ہوں خواہ قرض ہو یا عورت کا مہر یا تلف
 کی ہوئی شئی کا ضمان یا زخم کا تاوان سب کی زکوٰۃ مالک پر عائد ہونی چاہیے۔ اگرچہ ادائے گی فی الحال واجب
 نہ ہے لیکن قبضہ کے بعد سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔ صاحبین کا یہی مسلک ہے۔

صاحب بدائع فرماتے ہیں :

"وقال ابو يوسف ومحمد الديون كلها سواء وكلها قوبة تجب
 الزكاة فيها قبل القبض إلا الدية على العاقلة ومال المكتوبة فإنه لا تجب
 الزكاة فيها أصلا ما لم تقبض ويحول عليها الحول وجه قوله ما ان
 ما سوى بدل الكتابة والدية على العاقلة ملك صاحب الدين ملكاً

مطلقاً رقبۃ وید التمكن من القبض بقبض بدله وهو العين نتج
ففيه الزكاة كسائر الأعيان المملوكة ملكاً مطلقاً إلا أنه لا يخاطب
بالأداء للحال لأنه ليس في يده حقيقة فإذا حصل في يده
يخاطب بأداء الزكاة قدر المقبوض كما هو مذهبهما في العین
فيما زاد على النصاب بخلاف الدية وبذل الكتابة لأن ذلك ليس
بملك مطلق بل هو ملك ناقص على ما بينا - والله اعلم - (۱)

امام ابو ضیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دیون کے سلسلہ میں اتنا عموم نہیں ہے جو صاحبین کے نزدیک ہے۔
بلکہ آپ دیون کی تین قسمیں قرار دے کر صرف ایک قسم میں قبضہ سے پہلے وجوب زکوٰۃ کی تصریح فرماتے ہیں اور وہ
دین قوی ہے جس کی ادائیگی کم از کم خمس نصاب (نصاب کا پانچواں حصہ) پر قبضہ کرنے کے بعد عمل میں آئے گی
بقیہ دو قسمیں دین ضعیف اور صحیح ترین روایت کے مطابق دین وسطا میں قبضہ کے بعد سال پورا ہونے پر زکوٰۃ
فرم ہوگی اور قبضہ سے پہلے ان پر گزرے ہوئے ایام کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، دین قوی آدمی کا وہ بقایا ہے جو
کسی نے قرض کے طور پر لیا ہو یا کسی سامان تجارت کے عوض کسی شخص پر لازم الادا ہو، اور دین وسطا وہ بقایا
ہے جو سامان تجارت کے علاوہ اشیا، ضروریہ کے عوض پر لازم ہو، مثلاً اپنا خدمت کا غلام بیچا جس کی قیمت
وصول نہ ہوئی یا استعمالی کپڑوں اور رہائش کے گھر کی قیمت جو وصول نہ ہو سکی۔ اور دین ضعیف وہ بقایا جو سرے
سے کسی شئی کے عوض میں نہ ہو، مثلاً وہ دین جو دراشت یا اس کے حق میں وصیت کی وجہ سے اس کی ملک
بن جائے یا ایسی شئی کا عوض جو از قبیل اموال نہیں ہے جیسے عورت کا دین مہر اور مرد کا دین خلع وغیرہ (۲) دیون
کے سلسلہ میں آج تک فتویٰ امام صاحب ہی کے قول پر دیا جاتا ہے کیوں کہ اسی میں لوگوں کی سہولت ہے۔
اب آئیے اس ضمن میں پیدا ہونے والے سوالات کا جائزہ لیتے ہیں۔

خرید کردہ مال تجارت پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ

مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہو سکی ہے تو کیا قیمت

(۱) بدائع الصنائع ۱/۶ (۲) بدائع الصنائع ۱/۶، الدر المنثور علی هامش الدر المنثور ۲/۵۶، مطبوعہ مکتبہ نوائیہ دیرمند

جس پر بائع قبضہ کر چکا ہے اس کی زکوٰۃ اس کے ذمہ واجب ہوگی؟ اس طرح مال جس پر عقد تمام ہو چکا ہے لیکن قبضہ نہیں ہوا آیا اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی اگر ہوگی تو کس پر؟۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک تمام کی جو حقیقت اور ذکر کی گئی ہے اس کی روشنی میں ثمن بائع کی ملک تمام ہو گیا، لہذا سال پورا ہونے پر اس کی زکوٰۃ کا واجب الاداء ہونا یقینی ہے۔ البتہ بیع قبل القبض کا مسئلہ قدرے پیچیدہ ہے۔ اگر صرف اس قدر دیکھا جائے کہ اس پر خریدار کو بالفعل ید اور تصرف حاصل نہیں ہے تو گویا اس پر خریدار کی ملکیت تمام نہیں ہے۔ لہذا اس کی زکوٰۃ واجب نہ ہونی چاہیے جیسا کہ صاحب جوہرہ کی عبارت سے ظاہر ہے لیکن اس سے آگے بڑھ کر اگر یہ دیکھا جائے کہ حقیقت میں یہ مقدور الانتفاع ہے بایں طور کہ اس کے عوض پر اسے قبضہ حاصل تھا اور عوض دے کر عوض پر قبضہ کرنا اس کے لیے ممکن ہو چکا ہے تو پھر اس کا مملوک تمام ہے جس کی زکوٰۃ اس کے ذمہ لازم الاداء ہونی چاہیے۔ فقہاء متاخرین کی عبارتیں اس سلسلہ میں مختلف ہیں۔ محقق ابن نجیم کی رائے وہی ہے جو دوسرے نمبر پر ذکر کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:

”وقد منا أن المبيع قبل القبض لا تجب زكاته على المشتري“ و ذکر

فی محیط فی بیان اقسام الدین أن المبيع قبل القبض لا يكون نصاباً لأن الملك فيه ناقص بافتقار اليد والصحيح أنه يكون نصاباً لأنه عوض عن مال كانت بيده ثابتة عليه وقد أمكنه احتواء اليد على العوض فتعتبر بيده باقية على النصاب باعتبار التمكن شرعاً فعلى هذا قولهم لا تجب الزكاة معناه قبل قبضه وأما بعد قبضه فتجب زكاته فيما مضى كالدین القوی“ (۱)

ہم بیان کر آئے ہیں کہ بیع جس پر خریدار کا قبضہ نہ ہوا اس کی زکوٰۃ اس کے ذمہ لازم نہیں محیط میں اقسام دین کے ضمن میں لکھا ہے کہ بیع قبل القبض کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ وہ نصاب زکوٰۃ نہیں ہے، کیوں کہ قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملکیت ناقص ہے، جب کہ صحیح قول یہ ہے کہ وہ نصاب زکوٰۃ ہے۔ اس لیے کہ وہ ایسے مال کا عوض ہے جس پر اس کا قبضہ ثابت

تھا اور (ثمن دینے کے بعد) عوض پر قبضہ کرنا اس کے لیے ممکن ہو چکا ہے، لہذا تمکن شرعی کے اعتبار سے اس نصاب زکوٰۃ پر اس کا قبضہ باقی تسلیم کیا جائے گا۔ محیط کے اس بیان کی روشنی میں اب یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ فقہاء جو کہتے ہیں کہ زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اس کا مطلب یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے ادائے کی واجب نہیں، رہا قبضہ کے بعد تو سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب الادا رہے گی جیسا کہ دین قوی کا حکم ہے۔

علامہ ابن نجیم کے اس بیان سے تقریباً یہ مستفہ ہو چکا تھا کہ بیع قبل القبض مقدور الانتفاع ہونے کی وجہ سے خریدار کی ملک تام ہے اور فقہاء کی عبارات "لا تجب فیہ الزکوٰۃ وغیرہ کی تاویل بھی یک گونہ ہو گئی تھی لیکن علامہ ابن عابدین شامی نے اس مسئلے کی ایک ایک نظیر پیش فرما کر مسئلے کو مزید غور طلب بنا دیا اور ثابت کیا کہ واقعہ اس کی زکوٰۃ خریدار کے ذمہ نہیں ہونی چاہیے۔ درمختار کی عبارت "فلا زکوٰۃ علی مکاتب لعدم المملک التام ولا فی کسب ما دون ولا فی مرہون بعد قبضہ ولا فیما اشتراہ لتجارة قبل قبضہ" (۱) کے تحت فرماتے ہیں:

"أما بعده فیزکیہ عما مضی کما فہمہ فی البحر من عبارة المحيط
فراجعہ لکن فی الخانیة رجل له ساعة اشتراہا رجل للسیامة
ولم یقبضہا حتی حال الحول ثم قبضہا لازکاة علی المشتري فیما
ضمنی لأنها کانت مضمونة علی البائع بالثمن ومقتضى التعلیل عدم
الفرق بین ما اشتراہا للسیامة او للتجارة، فتأمل۔ (۲)

بہر حال قبضہ کے بعد تو سابقہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دے گا جیسا کہ بحر میں محیط کی عبارت سے سمجھا ہے، لیکن فتاویٰ خانہ میں یہ جریزہ ہے کہ ایک شخص کے کچھ مویشی تھے جنہیں کسی شخص نے سیامت (نمنا) کی غرض سے خرید لیا اور قبضہ نہ کیا یہاں تک کہ بائع کے پاس ان پر سال گزر گیا تو خریدار پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ وہ بائع کے پاس مضمون بالثمن تھے، اس تعلیل کا تقاضا ہے کہ پھر تجارت کے سامانوں اور سیامت کے مویشیوں میں کوئی فرق نہیں ہے، غور کرو۔

علامہ شامی نے جس طرف توجہ مبذول فرمائی ہے وہ واقعی قابل غور ہے اور یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ جب بیع بائع کے پاس مضمون بائعین ہے تو وہ خریدار کی ملک تمام نہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر سامان ہلاک ہو جاتا ہے تو خریدار کا کوئی نقصان نہیں ہوتا، اگر ملکیت تمام ہوتی تو بلا تعدی اس کے ہلاک ہونے سے خریدار کا مال ضائع مانا جاتا، جب کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کی نظیر مسئلہ مرہون بھی بن سکتا ہے جسے علامہ شامی نے ”ولا فی مرہون بعد قبضہ“ کے ذیل میں تحریر فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

”قلت لكن أرجع شیع مشائخنا السائح فی الضعیر فی قول الشارح بعد قبضہ إلى المرتہن ویؤیدہ أن عبارة البحر هكذا ومن موانع الوجوب الرهن إذا كان فی ید المرتہن لعدم ملك الیید ولیس فیہا ما یدل علی أنه لا یزکیہ بعد الاسترد لا لكن قال فی الخانیة: السائقة إذا غصبها ومنعها عن المالك وهو مقر ثم ردھا علیہ لازکوة علی المالك فیما مضی: (رد المحتار ۶/۲)

ہماری نظر میں صاحب بحر کی تعلیل پر علامہ شامی کی تعلیل راجع معلوم ہوتی ہے کیوں کہ محض ممکن شرعی کی وجہ سے اگر اس نصاب پر خریدار کا قبضہ باقی تسلیم کیا جائے تو پھر اس کا مملوک تمام ہونا لازم آئے گا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بلا تعدی ہلاک ہونے کی صورت میں ملک مشتری پر ہلاک ہو، جبکہ ایسا نہیں ہے، باقی اگر یہ کہا جائے کہ جب بائع کی ملکیت سے نکل گیا تو لازماً خریدار کی ملک تمام ہو جانا چاہیے تو یہ کوئی ضروری نہیں کیونکہ مطلق ملکیت بائع سے ہٹ کر معلق رہ سکتی ہے تو تمام ملکیت بدرجہ اولیٰ معلق رہ سکتی ہے، جیسا کہ خیار شرط میں جب کہ خیار مشتری نے لیا ہو، بیع بائع کی ملک سے نکل کر خریدار کی ملک میں داخل نہیں ہوتی۔

الحاصل یہ کہ اس مسئلہ میں ثمن کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہوگی جب کہ بیع کی زکوٰۃ کسی کے ذمہ نہیں بلکہ خریدار کے ذمہ اس وقت ہوگی جب اس پر قبضہ کرے اور اس پر سال گزر جائے، سابقہ سالوں کی زکوٰۃ نہ ہوگی۔

کرائے کی مدین پیشگی رقم کی زکوٰۃ

کرائے کی مدین جو پیشگی رقم دی جاتی ہے اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ اگر یہ محض زر ضمانت ہے

تاکہ کرایہ دار اگر کرائے کی ادائیگی میں نادہند واقع ہو، تو اس رقم میں سے کرائے کی رقم و منوع کر لی جائے گی، ورنہ اجارے کے فسخ ہونے یا مدت پوری ہونے پر یہ رقم کرایہ دار کو واپس کر دی جائے گی تو اس صورت میں یہ کرایہ دار کا مالک مکان پر دین ہوگا اور اس کی ادائیگی زکوٰۃ کرایہ دار پر اس وقت لازم ہوگی جب اس رقم میں سے کم از کم خمس نصاب کے بقدر اسے واپس مل جائے اس وقت سابقہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرے گا۔
لیکن اگر یہ پیشگی رقم بہ طور اجرت معجلہ کے ہے تو مالک مکان کی ملک ہوگئی اور سال پورا ہونے پر اس کی زکوٰۃ مالک کو دینی ہوگی۔ بدائع الصنائع میں ہے:

”ذكر الشيخ الامام أبو بكر محمد بن الفضل البخاري في الاجابة الطويلة التي تعارفها أهل بخاري أن الزكاة في الاجرة المعجلة تجب على الأجير لأنه ملكه قبل الفسخ وإن كان يلحقه دين بعد الحول بالفسخ وقال بعض مشائخنا أنه يجب على المستاجر أيضاً لأنه يعد ذلك مالاً موضوعاً عند الأجير“ (۱)

اس عبارت کی روشنی میں مذکور الصدر و دونوں صورتوں کا حل ہو سکتا ہے، کیوں کہ اول الذکر کرائے دار کا مالک کے پاس رکھا ہوا مال ہے اور ثانی مالک کی ملکیت تامہ۔

مدارس وغیرہ کے سرمایہ میں زکوٰۃ

جس مال کا کوئی مالک معین نہ ہو جیسے مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقمیں ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی کیوں کہ یہ رقم اگر وقف ہے تو ملکیت کا نہ ہونا ظاہر ہے اور اگر یہ وقف نہیں تو کسی شخص حقیقی کی ملک بھی قرار نہیں دی جاسکتی، بلکہ منتظم ادارہ کے اس پر قبضہ کر لینے کے بعد وہ معطلی کی ملکیت سے نکل تو جاتی ہے مگر جب تک کسی مصرف پر خرچ نہیں ہو جاتی اس کی ملکیت موقوف رہتی ہے اور وجوب زکوٰۃ کی بابت وقف کا حکم رکھتی ہے۔

ولا زكاة في المال الموقوف لعدم الملك (۲)

”دأما الشرائط التي ترجع إلى المال فعندها الملك فلا تجب الزكاة نسي
سوائهم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك وهذا لأن نسي الزكاة

تمليكاً والتحكيم في غير الملك لا يتصور“ (۱)

البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ جیسا کہ بعض صورتوں میں فقہاء برہانے ضرورت شخص اعتباری یا شخص
قانونی کا اعتبار کر کے اس پر وہ احکام جاری کرتے ہیں جو اصلاً شخص حقیقی پر ہونے چاہئیں، تو کیا یہ ممکن ہے کہ
مدارس اور اداروں کو شخص اعتباری مان کر یہ قہیں ان کی ملک قرار دی جائیں اور پھر ان پر وجوب زکوٰۃ کا حکم
لگایا جائے؟

اس سلسلہ میں ہمارے ناقص خیال میں جو بات آتی ہے وہ یہ کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان
مدارس اور اداروں کو بعض حالات میں شخص اعتباری قرار دینا ناگزیر ہو جاتا ہے، مثلاً یہی کہ اگر مہتمم سے بلا تعدی
مذکورہ رقوم منائع ہو جائیں یا ادارے کی مصالح میں کسی عقد و معاملہ کے دوران کوئی نقصان ہو جائے تو اس
کا ضمان مہتمم پر نہیں ہوتا بلکہ اس شخص اعتباری ادارے پر ہوتا ہے، جس کی مصلحت کی رعایت میں نقصان
ہوا ہے، اس کے بغیر چارہ کار نہیں۔

لیکن شخص اعتباری مان لینے کے باوجود مسئلہ وجوب زکوٰۃ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس
لیے کہ زکوٰۃ ایک خالص عبادت ہے اور محض حق اللہ جو ہر عاقل بالغ مسلم پر یہ چند شرائط فرض عین ہے حقوق
العباد اس سے وابستہ نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ حقوق العباد کی ادائے گئی حد تک تو شخص قانونی کو معتبر ماننے
کی ضرورت داعی ہے تاکہ اس سے متعلق کسی بندے کا حق منائع نہ ہو اور کما حقہ اس کا حق مل سکے اور قاعدہ ہے
”الضرورات تقدر بقدرها“

البتہ وقت کے بعض فقہاء کے خیال میں وقف زمین کی زرعی پیداوار پر حقیقہ کے نزدیک جو
عشر واجب ہے اس کو زکوٰۃ کے معاملہ میں شخص قانونی کی ایک مثال کہا جاسکتا ہے، لیکن یہ خیال اس
لیے صحیح نہیں ہے کہ فقہاء اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ عشر و خراج کے وجوب کا تعلق مالک سے سرے
سے ہی نہیں بلکہ یہ زرعی زمین کا محصول اور لگان ہے جو فقیر بندوں کا حق ہے چاہے زمین کسی کی ملک ہو یا نہ ہو

حتیٰ کہ ایسا مالک جس میں شرائط وجوب درپائی جائیں اس کی زمین پر بھی عشر واجب ہوتا ہے جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں تصریح ملتی ہے۔

”ولا يمنع الدين وجوب عشر وخراج لأنها مؤونة الأرض النامية

وقال الشافعي حتى يجب في الأرض الموقوفة والمكاتب“ (۱)

”وفيه إشارة إلى أنه لا يلتفت إلى المالك سواء كان بالغا أو

صبيًا أو مجنونًا أو عبدًا أو كانت الأرض وقفًا على الرباطات أو المساجد

أو المدارس“ (۲)

شیخ عبدالرحمن الجزیری الفقہ علی المذاهب الاربعہ میں فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ بچوں اور پاگلوں کے مال میں صرف اس وجہ سے واجب نہیں کہ یہ ایک خالص عبادت ہے برخلاف عشر اور صدقہ فطر کے کہ یہ حق بحقوق العباد ہیں۔

”الحنفية قالوا لا تجب الزكاة في مال الصبي والمجنون ولا يطالب

وليهما باخراجها من مالهما لأنها عبادة محضة والصبي والمجنون

لا يخاطبان بها وإنما وجب في مالهما الفرامات والنفقات لأنهما من

حقوق العباد ووجب في مالهما العشر وصدق الفطر لان فيهما

معنى المؤونة فالتحقا بحقوق العباد“ (۳)

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وقف کی زرعی پیداوار میں عشر ”مؤنة أرض“ ہونے کے باعث واجب ہوتا ہے اور اس کی ادائے گئی ناظر و متولی اس شخص اعتباری (وقف) کا قائم مقام ہو کر ادا کرتا ہے، گویا وجوب عشر اور اس کی ادائے گئی چوں کہ حق العبد ہے اس لیے اس میں شخص اعتباری کا نظریہ مجبوری ہے، برخلاف زکوٰۃ کے جو خالص عبادت ہے۔

(۱) الدر المختار و رد المحتار ۶/۲

(۲) الجوهرة ۱۵۳/۱

(۳) الفقہ علی المذاهب الاربعہ ۱۹۱/۱

مال حرام کی زکوٰۃ

حرام طریقہ سے جو مال کسی شخص کے قبضہ میں آتا ہے اس پر قیام ملک کا تحقق نہیں ہوتا بلکہ اس کا حکم یہ ہوتا ہے کہ اگر اس کا مالک معلوم ہو تو اس تک واپسی لازم ہے ورنہ بلا نیت ثواب واجب التصدق ہے۔ محض قبضہ قیام ملک کے لیے کافی نہیں، اس لیے ایسے مال میں خواہ قابض کے پاس سال بھر رہ جائے اور بقدر نصاب بھی ہو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

لو كان الخبيث نصاباً لا يلزمه الزكاة لأن الكل واجب التصديق عليه
..... إلى قوله ويجب عليه تفريغ ذمته برده إلى أربابه

ان علموا وإلا إلى الفقهاء (۱)

لیکن اگر حرام مال حلال میں اس طرح مخلوط ہو جائے کہ باہم تمیز مشکل ہو تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ استہلاک کی وجہ سے وہ اس کا مالک ہو جائے گا، البتہ جس قدر مال حرام تھا اتنے کا اس کے مالکین کے لیے مریون ہو جائے گا، اس میں زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے دو شرطوں میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے یا تو اس کے پاس اس مخلوط مال سے علیحدہ کوئی نصاب مالی جس میں زکوٰۃ فرض ہو موجود ہو تاکہ اس سے دین کی ادائے گی ہو سکے یا ان اموال حرام کے مالکین معاف کر دیں۔ ثانی الذکر صورت میں جس قدر اس کے پاس مال موجود ہے، سب کی زکوٰۃ اس کے ذمہ لازم ہوگی اور اول الذکر میں حرام مال کی مقدار جو اس کے ذمہ دین ہے وضع کرنے کے بعد باقی ماندہ اگر بقدر نصاب ہو تو زکوٰۃ فرض ہوگی ورنہ نہیں۔ محقق ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

"وبالجملة فوجوب الزكاة عليه مقيد بما إذا ابتكره القراء أو بما

إذا كان له مال يوفى دينه وإلا فلا وبه يندفع الاشكال لكن لا بد أن

يكون معه نصاب ثابت على ما يوفى دينه لأن ما كان مشغولاً بالدين

لا زكاة فيه وإنما يترك ما زاد عليه إذا بلغ نصاباً كما تفيد هذه عبارة السعدية^(۲)

در مختار میں بھی نہر کے حوالہ سے نقل کیا ہے :

(۱) منحة الخالق على هامش البحر الرائق ۴/۳۰۵ (۲) ایضاً تحت قولہ "وهو قيد حسن"

وهذا اذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط منفصل عنه يوفى
دينه والا فلا زكاة كما لو كان الكل خبيثا كما في النهر عن الحواشي
السعدية ۱۱۰

دین کی زکوٰۃ

دین (یا سابقا یا جو ذمہ پر ہوتا ہے) کی زکوٰۃ مدیون پر واجب نہ ہونا تو ظاہر ہے کیوں کہ محض قبضہ مفید ملک نہیں ہوتا۔

”أو وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لا تجب فيه

الزكاة“ (۲)

رہا دائن (جس کا بقایا ہے) کے ذمہ واجب ہونا تو ملک تمام کی تشریح کے ذیل میں آچکا ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک جس قسم کا دین ہے اسی کے مطابق حکم ہوگا، گویا دین ضعیف اور صحیح ترین روایت کے بموجب دین وسطیٰ میں وجوب زکوٰۃ قبضہ کے بعد حوالان حول پر متعلق ہوگا الا یہ کہ اس کے پاس پہلے سے اسی جنس کا نصاب موجود ہو جس کے ساتھ مل کر اس کی بھی زکوٰۃ حوالان حول سے قبل دینی پڑے گی۔

دین قوی (مال تجارت کا بدل جو مدیون کے ذمہ اس کے اقرار یا مینہ سے ثابت ہو) میں زکوٰۃ کا وجوب فی الحال (قبضہ سے قبل) متعلق ہوتا ہے، البتہ ادائے گئی کم از کم خمس نصاب پر قبضہ ہو جانے تک موقوف رہتی ہے اور قبضہ کے بعد سابقہ سالوں کی بھی زکوٰۃ واجب الادا رہتی ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں فقہاء اس صورت کا حکم بھی یہی لکھتے ہیں کہ اگر مدیون باوجود دین کی ادائیگی پر قدرت کے مال مٹول کرتا ہو تب بھی دائن پر ملنے کے بعد سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی کہ اصولی اعتبار سے یہ دین قوی ہے۔

(۳)

”وكذا الدين المقربه اذا كان المقر مليا فهو ممكن الوصول اليه“

لیکن علامہ شامی مصارف الزکوٰۃ کے باب میں درمختار کی عبارت ”ومنہ مالوکان مالہ

سُجِّلًا أَوْ عَلَى غَائِبٍ أَوْ مَعْسِرًا وَجَاهِدَ وَلَوْ أَنَّهُ بَيْنَهُ فِي الْأَمْرِ "کے ذیل میں ارشاد فرماتے ہیں،

"قُلْتُ وَقَدْ مَنَّا أَوَّلَ الزَّكَاةِ اخْتِلَافَ التَّصْحِيحِ فِيهِ وَمَا لِالرَّحْمَتِ الْوَلِ

هَذَا وَقَالَ بَلْ نَفِي زَمَانِنَا يَقْرَأُ الْمَدْيُونُ بِالْمَدِينِ وَبِعِلَّالَتِهِ لَا يَقْدِرُ الدَّائِلُ

عَلَى تَخْلُصِهِ مِنْهُ فَهُوَ بِمَنْزِلَةِ الْعَدَمِ : (۱)

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے علامہ شامی کی اسی ترجیح پر اعتماد ظاہر فرمایا ہے، چنانچہ آپ کا فہم بھی یہی ہے کہ نادہندہ مقروض کا قرضہ دین قوی نہیں اس لیے وصولیابی کے بعد سال پورا ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

"وَمَتَمَكِّي فِيهِ مَا نَفِي رَدِّ الْمَحْتَارِ الْغ : (۲)

پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ

پراویڈنٹ فنڈ جو ملازم کی ماہانہ یافت میں سے سرکاری پرائیویٹ کمپنیز لازماً وضع کر کے رکھتی ہیں اور ختم ملازمت پر اضافہ کے ساتھ اس کو واپس کرتی ہیں، تقریباً حال اور ماضی کے علما، کرام کا اتفاق ہے کہ یہ قسم دین ضعیف یا دین وسط کے تحت آتی ہے اور صحیح ترین روایت کے بموجب ان دونوں میں قبضہ کے بعد سے سال پورا ہونے پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے اس سلسلہ میں دو متضاد فتوے صادر ہوئے تھے، ایک میں دین قوی قرار دے کر گزشتہ کی زکوٰۃ واجب قرار دی گئی تھی، دوسرے میں دین وسط یا ضعیف قرار دے کر قبضہ کے بعد تمامیت سال پر وجوب زکوٰۃ ثابت کیا گیا تھا۔ حضرت اقدس مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمۃ نے اس تعارض کو دفع کرانے کی غرض سے ایک تحقیقی استفتاء حضرت سے کیا جس میں بدائع، بحر اور منحة الخالق کی عبارات کی روشنی میں حضرت کے دوسرے فتوے کی تصویب چاہی گئی تھی۔ مفتی صاحبؒ کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے:

"الغرض پراویڈنٹ کاروبار دین قوی میں تو داخل ہو نہیں سکتا، کیونکہ وہ معاوضہ کسی مال جواز

کا نہیں، بلکہ خدمت کا معاوضہ ہے اور دین متوسط میں داخل کرنا بھی اس وقت تک کسی روایت

پر منطبق نہیں ہے جب تک کہ حرکی خدمت کو مال قرار دینے کی تصریح نہ ملے اور بالفرض اس میں غل
بھی مان لیں تو حکم اس کا بھی اصح روایت پر دین ضعیف کی طرح ہی ہے کہ اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ
واجب نہیں ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس تحقیق سے اتفاق ظاہر فرماتے ہوئے لکھا:
"آپ صاحبوں کی تحقیق صحیح ہے، لہذا میں بھی اسی کو اختیار کرتا ہوں؛ (۱)
چنانچہ اسی کے مطابق مفتی کفایت اللہ صاحب، مفتی عبدالرحیم صاحب، مفتی محمود الحسن صاحب
اور مفتی نظام الدین صاحب وغیرہم نے فتاویٰ موجود ہیں۔

کمپنیوں پر زکوٰۃ

فقہ حنفی کی رو سے زکوٰۃ کا مکلف شخص حقیقی ہے جو تکلفات شرعیہ کا اصل ہو، لہذا چند شرکاء کے
مشترکہ کاروبار سے جو ایک شخص اعتباری کا تصور پیدا ہوتا ہے (کمپنی) اس کے ساتھ فریضہ زکوٰۃ وابستہ نہیں بلکہ
کمپنی کے جن شرکاء کے حصے بقدر نصاب ہیں صرف ان پر ان کے حصوں کے بقدر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر شرکاء
کی تعداد اتنی بڑی ہے، یا مشترکہ مال کی مقدار اتنی کم ہے کہ شرکاء پر ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کرنے پر ان میں
سے کوئی بھی مناسب نصاب نہیں پتا تو کسی پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، خواہ کمپنی کی مجموعی مالیت کروڑوں میں ہو۔ الا
یہ کہ کسی شریک کے پاس اپنا کوئی نصاب شرعی موجود ہو جس کی زکوٰۃ لازم الادا ہو تو اس کے ساتھ وہ کمپنی میں سے
اپنے حصہ مالیت کی بھی زکوٰۃ نکالے گا۔ کمپنی بحیثیت کمپنی پر زکوٰۃ دو وجہ سے نہیں ہے۔ اولاً اس لیے نہیں کہ وہ
شخص حقیقی مکلف نہیں ثابتاً اس وجہ سے نہیں کہ وجوب زکوٰۃ کے سلسلہ میں ایک مخصوص نصاب کی شرط
ضروری ہے جس کا مدار مالکین کے لیے سہولت اور آسانی جہاں کرنے پر ہے، لہذا سہولت اسی میں ہے کہ وہ نصاب
شخص واحد ہی کا ہو، متعدد اشخاص کا مشترک نہ ہو، متعدد اشخاص کی ملک سے کوئی نصاب بن گیا جس کی وجہ
سے سب پر بقدر حصص زکوٰۃ واجب ہو گئی تو یہ اس علت فقہی کے منافی ہوگا۔ لہذا اس کا بھی تقاضا ہے کہ مشترکہ

(۱) امداد الفتاویٰ جلد ۲، ص ۴۲ تا ۵۰ میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے دونوں فتوے مفتی صاحب کا
تحقیقی استفسار اور حضرت کی تصویب ملاحظہ کی جائے۔

نصاب پر زکوٰۃ نہ ہو، جیسا کہ علامہ ابن رشدؒ کی بدایۃ المجتہدین مسئلہ مذکور میں اختلاف ائمہ کے ذیل میں اس علت فقہی پر زور دیتے ہوئے مالکیہ اور احناف کی وکالت میں رقم طراز ہیں:

”اما المسئلة الرابعة فان عند مالك وابن حنيفة أن الشريكين ليس يجب على أحدهما زكوة حتى يكون لكل واحد منهما نصاب^(۱) وعند الشافعي أن المشترك حكمه حكم مال رجل واحد وسبب اختلافهم الإجماع الذي في قوله عليه السلام ليس فيما دون خمس أوراق من الورق صدقة فإن هذا القدر يمكن أن يفهم منه أنه إنما يخصه هذا الحكم لمالك واحد^(۲) وأكثر من مالك واحد إلا أنه لما كان مفهوم اشتراط النصاب أنها هو الرفق فواجب أن يكون النصاب من شرطه أن يكون لمالك واحد وهو لأظهر^(۳)“

شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

کسی بھی تجارتی کمپنی کے شیرز خرید لینا درحقیقت اس کمپنی میں اس شیر (حصہ) کے بقدر شریکت حاصل کرنا ہے اور خریدار اپنے حصہ (مثلاً ہزار روپے) کے بقدر کمپنی کے پورے اثاثے، عمارت، تیار شدہ و خام مال تجارت اور نقد روپیوں میں شریک ہو جاتا ہے اور جوں جوں کمپنی ترقی کرتی رہے گی اس کے حصے کے تناسب سے سرمایہ کی مقدار بھی بڑھتی رہے گی، لہذا اصل منسلک کی رو سے ہونا یہ چاہیے کہ حصہ دار (شیر ہولڈر) کی رقم کا جتنا حصہ کمپنی کی عمارت، آلات حرفت وغیرہ غیر نامی اثاثوں میں لگا ہوا ہے اس کی تو زکوٰۃ لازم نہ ہو اور جتنا سامان تجارت یا نقد کی صورت میں موجود ہے اگر بقدر نصاب ہے تو اس کی زکوٰۃ لازم ہو، اور ادائے گے کی زکوٰۃ کے سلسلہ میں نہ تو شیر کی بنیادی قیمت سے تعلق ہوگا، جس کے عوض اس نے شیر خریدا ہے اور نہ ہی ادائے گے یا وجوب کے وقت شیر کے بازاری نرخ سے کیوں کہ شیر بذات خود کوئی مال متقوم نہیں ہے کہ اسے تجارتی سرمایہ

(۱) یہ صرف مالکیہ کا مسلک ہے، احناف کے نزدیک کسی ایک کا بھی حصہ اگر بقدر نصاب ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔ ”فان بلغ نصيب

أحدهما نصاباً بازکاه دون الآخر الدر المختار ۳۵۲/۲ (۲) بدایۃ المجتہد ۲۵۸/۱

قرار دیا جائے بلکہ یہ ایک امنائی تھی ہے جو اپنے مضاف الیہ کے اعتبار سے معنی خیز بنتی ہے، جیسے دکان کا حصہ، مکان کا حصہ وغیرہ، اسی طرح یہاں مشترکہ تجارت کا حصہ، چنانچہ اس مشترکہ تجارت میں ہر شریک کا جتنا حصہ ہے وہی اس کا اپنا مال ہے جس پر زکوٰۃ کا حکم حسب شرائط عائد ہوگا اسی طرح ہر شریک کو یہ اختیار بھی ہوگا کہ وہ اپنے حصہ کا مال کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دے۔ (۱)

گویا ہر شریک کو کمپنی سے یہ تفصیل دریافت کرنی ضروری ہوگی کہ اس کے سرمایہ کی کل مقدار کیا ہے؟ کتنا حصہ نامی اثاثوں کی شکل میں ہے؟ اور کتنا غیر نامی کی شکل میں؟ تاکہ وہ اپنی زکوٰۃ کا حساب صحیح طور پر لگا سکے۔ اگر تفصیل اسے کمپنی کی طرف سے موصول ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ ضرورتاً اس وقت بازار میں شیر کا جو نرخ ہو اسی کے ذریعہ مالیت کا تعین کیا جائے گا، اس لیے کہ اغلب یہی ہے کہ بازاری قیمت کے مقابلہ میں شیر کی وہ مقدار جو نامی ہے کم ہے اور شیر کی قیمتوں کا اتار چڑھاؤ اصل مالیت کے گھٹاؤ بڑھاؤ کے تابع ہوتا ہے اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ مارکیٹ کی قیمت معیار مالیت قرار دی جائے۔ (۲)

”بونڈس“ حقیقت میں اس کے خریدار کی طرف سے حکومت یا کمپنی کو قرض دینا ہے جس کا سائرفیکٹ اس کے پاس موجود ہے، ظاہر ہے کہ مدت کے اختتام پر اصل رقم کے ساتھ جو منافع ملتا ہے یقیناً بڑا ہے اور اصل رقم بمنزلہ دین قوی ہے، جس کی زکوٰۃ لازم ہے اور ادائے گئی کم از کم خمس نصاب پر قبضہ کرنے کے بعد سابقہ سالوں کی بھی ہوگی۔

دوسری شرط ”نما“ حقیقت اور اقسام

وجوب زکوٰۃ کے لیے مال نامی کا ہونا ضروری ہے، نما کی حقیقت بڑھوتری اور اضافہ ہے۔ شرعی اعتبار سے نما کے تحقق کی دو صورتیں ہیں،

- (۱) حقیقی۔ جانوروں (سوائم) میں بالفعل تو والد و تناسل کے ذریعہ اور دوسرے مالوں میں بالفعل تجارت کے ذریعہ اضافہ ہو رہا ہو۔

(۱) یہاں ان علمی اشکالات سے بحث نہیں جو شیر زکی خرید و فروخت کی بابت پیدا ہوتے ہیں، ان کا کافی و شافی حل حضرت تھانویؒ کے رسالہ ”القصص السنی“ میں ملاحظہ کیا جائے۔ (۲) استفادہ از رسالہ ”القصص السنی“۔ اسرار الفتاویٰ ۲۸۶/۲ تا ۵۱۲۔

(۲) تقدیری :- بالفعل اضافہ تو نہ ہو رہا ہو، البتہ یہ ممکن ہو کہ مالک اگر چاہے تو اس میں زیادتی اور اضافہ کی شکل پیدا کر سکتا ہے بایں طور کہ مال خود اس کے قبضہ میں ہے یا اس کے قائم کے قبضہ میں۔ مثلاً مسافر کا مال جو اس کے وطن میں ہے۔ (۱)

پھر نما، تقدیری کی بھی دو قسمیں نکلتی ہیں۔ خلقی اور فعلی۔

(۱) خلقی :- اس کا مصداق نقدین (سونا اور چاندی) ہیں جو فطری طور پر جملہ حوائج بشری کی تکمیل کی صلاحیت رکھتے ہیں اور خلقت نامی ہیں اس لیے بندوں کی طرف سے نیت کر کے قابل تجارت بنانے کے محتاج نہیں ہیں۔ چنانچہ بقدر نصاب موجود رہنے پر ان میں لازماً زکوٰۃ فرم ہوگی، خواہ تجارت کی نیت سے رکھے گئے ہوں یا کوئی نیت نہ ہو یا اپنے ضروری استعمال میں لانے کی نیت ہو یا نہ ہو۔

(۲) فعلی :- نقدین کے علاوہ بھی اموال میں نما فعلی ہوتا ہے۔ بایں معنی کہ نما، کسی نیت کرنا ضروری ہوتا ہے جانوروں میں اگر یہ نیت کر لی گئی کہ سال کا اکثر حصہ چرا کر ان کی افزائش نسل عمل میں لائی جائے گی، جسے سیامت کہتے ہیں یا سامانوں میں یہ نیت کر لی گئی کہ تجارت کر کے اس میں اضافہ کیا جائے گا تو نما، تقدیری کا تحقق ہو گیا اگرچہ بالفعل ان میں اضافہ نہ ہو سکے۔

البتہ اسامت یا تجارت کی نیت کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہوگا کہ فعل تجارت یا فعل اسامت کے ساتھ نیت پائی جائے ورنہ نیت معتبر نہ ہوگی، خواہ تجارت کی نیت صراحۃً ہو یا دلالت تجارت کی نیت صریح کی مثال مثلاً عقد معاملہ کرتے وقت یہ نیت کرے کہ میں اس عقد سے جس شئی کا مالک ہو رہا ہوں اس کو تجارت میں لگا کر نفع کمائوں گا، چاہے یہ معاملہ خریداری کا ہو یا اجارے کا، ثمن چاہے نقدین کے قبیل سے ہو یا عرومن (سامانوں) کے قبیل سے۔ لیکن اگر اپنے استعمال میں لانے کی نیت ہو یا کوئی شئی اس کی ملکیت میں بغیر کسی عقد و اجارہ کا معاملہ کیے آجائے جیسے وراثت کا مال یا عقد معاملہ کے نتیجہ میں آئے لیکن اس میں "مبادلة المال بالمال" کی حقیقت منفقود ہو، جیسے ہبہ، صدقہ، وصیت یا مہر کے طور پر ملکیت میں کوئی مال آجائے تو اس قسم کے مملوکہ اموال سامان تجارت نہ ہوں گے حتیٰ کہ بعد میں بھی تجارت کی نیت کرنا مفید نہ ہوگا الا یہ کہ تجارت کی نیت سے کوئی عملی اقدام کر ڈالے۔

اور دلائل نیت تجارت کی مثال یہ ہے کہ کوئی سامان ایسے سامان کے عوض خریدے جو اس کے پاس پہلے سے تجارت ہی کے لیے رکھا ہوا تھا یا اپنے اس گھر کو جو تجارت کے واسطے تھا کسی سامان کے عوض کرائے پر دے دیا تو ان صورتوں میں اگرچہ صراحت تجارت کی نیت نہ بھی کرے تب بھی جس سامان کا مالک ہوگا وہ عروض تجارت کے حکم میں ہوگا۔ (۱)

اب آئیے اس ضمن میں پیدا ہونے والے سوالات کا الگ سے جائزہ لیتے ہیں۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

تجارتی سامان چوں کہ نامی ہیں اس لیے ان کی زکوٰۃ فرض ہے اور مالیت کا حساب بازاری نرخ سے لگایا جائے گا، اصل لاگت سے کوئی مطلب نہیں۔ صاحبین کے نزدیک ادائے گی کے دن جو بازار میں قیمت ہوگی، اس کے حساب سے مالیت کا تعین ہوگا اور امام صاحب کے نزدیک جس دن سال پورا ہوا تھا اس روز کی بازاری قیمت معیار قرار دی جائے گی۔

”وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا يوم الاداء ونفى السوائثم يوم الاداء اجمعاً“

وهو الأصح ويقوم في البلد الذي المال فيه (۲)

حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ نے صاحبین کی رائے کو ترجیح دیا ہے۔

”اگر نقصان قیمت میں ہے یا نفع اس قیمت کی زکوٰۃ دیوے جو دینے کے روز اسباب تجارت

کی قیمت ہے“ (۳)

رہی بات تھوک اور پھٹکر کی تو جیسا اس کا کاروبار ہوتا ہو، بایں طور کہ تھوک خریداری اور تھوک

ہی فروختگی ہوتی ہو تو معیار تھوک قیمت ہوگی، ورنہ پھٹکر فروختگی کا اعتبار ہوگا۔

ارضی تجارت کی زکوٰۃ

اموال تجارت میں وجوب زکوٰۃ کا جو کلی ضابطہ فقہاء بیان کرتے ہیں وہ یہ کہ:

(۱) البحر الرائق ۲/۲۱۰-۲۰۹، رد المحتار ۴/۱۳۶، السیاحۃ شرح صمدی ۴/۱۳۶، (۲) الدر المختار ۲/۲۲، البحر الرائق ۲/۲۱۰ (۳) تذکرۃ الرشید ۱/۱۸۶

” أن ما عد الحجرين والسواثم إنما يزكى بنية التجارة بشرط عدم

المانع المؤدى إلى الشئ ۱۱

یعنی تقدیر اور سوائم کے علاوہ میں زکوٰۃ تجارت کی نیت سے واجب ہوتی ہے بشرط کہ نیت کی وجہ سے وجوب زکوٰۃ کی صورت میں ایک ہی مال میں دوم مرتبہ زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہو، چنانچہ کبھی ایسا ہو جائے تو نیت تجارت کے باوجود زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، مثلاً:

” خراجی یا عشری زمین تجارت کی نیت سے خرید کر اس میں کاشت کاری کیا یا تجارت کی نیت سے بیع خرید کر بویا تو اس صورت میں صرف عشر یا خراج واجب ہوگا، زمین یا بیع کی قیمت پر زکوٰۃ نہیں۔“

لیکن ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ہوگا، جب کہ اس زمین کی بوائی کر دی جائے نیز اس کا عشری یا خراجی ہونا معلوم ہو، دونوں باتوں میں سے کسی ایک کے نہ ہونے کے وقت یہ حکم نہ ہوگا، مثلاً تجارت کی نیت سے عشری یا خراجی زمین خریدا اور بوائی نہیں کی یا اس زمین کا سرے سے عشری یا خراجی ہونا معلوم نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر ہندوستان کی زمینوں کا یہی حال ہے تو بلاشبہ اراضی اموال تجارت ہوں گی، اور ان کی متوقع قیمت فروخت کے اعتبار سے ان کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔

ہیرے اور جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے اور جواہرات جو تجارت کی غرض سے رکھے ہوں ان پر نامی ہونے کے باعث زکوٰۃ لازماً ہوگی، باقی اس مقصد سے ان کا ذخیرہ کیا گیا ہو کہ انکم ٹیکس یا دیگر سرکاری قوانین کی زد سے محفوظ رہیں گے تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں خواہ ان کی مالیت لاکھوں کی ہو، زیادہ سے زیادہ ان کے حوائج اصل سے زائد ہونے کی وجہ سے حرمت زکوٰۃ، وجوب صدقہ فطر اور وجوب قربانی وغیرہ احکام آئیں گے۔ البتہ ہیرے جواہرات کا ذخیرہ کرنے والوں کی نیت اگر حکم شرعی (زکوٰۃ) سے فرار اختیار کرنی ہو تو گناہ گار ہوں گے لیکن اصل صورت میں بھی زکوٰۃ ان پر واجب نہ ہوگی۔

"لا زكوة في السلاحي والجواهر وإن سادت ألفاً اتفاقاً إلا أن تكون للمتجارة"^(۱)

یہی حکم ان جواہرات کا بھی ہے جو تزئین اور آرائش کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں بلکہ ان کے متعلق حاجتِ اصلیہ کے تحت شامل ہونے نہ ہونے ہی میں فقہاء کا اختلاف ہے اگرچہ صحیح یہی ہے کہ ایسے قیمتی اثاثے جن کا مقصد محض تزئین ہو، تحققِ غنا کے لیے کافی ہیں، لیکن حرمتِ زکوٰۃ وغیرہ کی حد تک نہ کہ وجوبِ زکوٰۃ کے سلسلہ میں۔

تیسری شرط۔ حاجاتِ اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجاتِ اصلیہ: تعریف اور دائرہ

تیسری شرط مال کا حاجتِ اصلیہ (بنیادی ضرورت) سے زائد ہونا ہے۔ حاجتِ اصلیہ کی تعریف فقہاء یوں کرتے ہیں:

"ما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقاً أو تقديراً" (۲)

حاجتِ اصلیہ ہر اس ضرورت کو کہتے ہیں جس کا استعمال انسان کو ہلاکت سے بچائے خواہ یہ ہلاکت سے بچانا حقیقتہً ہو یا حکماً پھر ہر دو کی تشریح کرتے ہیں:

"فالثانی كالدين والأول كالنفقة ودور السكنى وآلات الحرب و

الشیاب المحتاج الیہا لدفع الحرأ والبرد وکالات الحرفة وأثاث

المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لاهلہاء" (۳)

تقدیراً ہلاکت سے بچانے والی ضرورت مثلاً دین ہے کہ اگر کسی شخص کا بقایا اس کے ذمہ ہو، اور ادا نہ کیے گئے تو ذلت اٹھانی پڑے گی جو ہلاکت کے مرادف ہے، بلکہ اس کی وجہ سے قید بھی ہو سکتا ہے لہذا دین کی ادائے کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اپنی ذلت سے ضرر کا دفعیہ، بلکہ یہ ضرورت دوسری ضروریات کی نسبت زیادہ اہم ہے۔

حقیقتہً ہلاکت سے بچانے والی ضروریات میں رہائش کا گھر، ہتھیار، استعمالی کپڑے جو سردی اور

گرمی سے دفاع کے لیے رکھے جائیں، گھر کے استعمالی ساز و سامان، سواری کا جانور اہل علم کے لیے کتابیں وغیرہ۔

ضرورت کے تحت رکھے ہوئے نقد کی زکوٰۃ

البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی شخص نے نقد رقم اپنی واقعی اور بنیادی ضرورت کی خاطر جمع کر رکھی ہے مثلاً رہائش کا گھر نہیں ہے وہ اس سے گھر خریدنا چاہتا ہے، کپڑے بنوانے ہیں۔ ابھی ان ضرورتوں کی تکمیل ہونے نہ پائی تھی کہ اس سے پہلے اس پر سال پورا ہو جاتا ہے تو کیا اس کی زکوٰۃ ذمہ پر واجب ہوگی؟ یا یہ رقم حاجتِ اصلیہ میں شمار کی جائے گی؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں۔ محقق ابن نجیم شرح الجمع لابن الملک سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”فاذا كان له دراهم مستحقة ليصرفها الى تلك الحوائج صارت كالعدومة اه فقد صرح بان من معه دراهم وامسكها بنية صرفها ا حاجته الاصلية لا تجب الزكاة اذ احوال الحول وهي عنده ويخالفه ما في معراج الدراية في فصل زكاة العروض ان الزكاة تجب في النقد كيف ما امسكه للنماء اول للنفقة اه وكذا في البدائع في بحث النماء التقديرى“ (۱)

جب کسی کے پاس کسی ضرورت کے پیش نظر کچھ دراهم موجود ہوں جو اس ضرورت میں خرچ ہونے ہیں تو وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ابن الملک نے اس کی صراحت کر دی کہ بنیادی ضرورتوں میں خرچ کرنے کی نیت سے رکھے ہوئے دراهم میں خواہ ان پر سال گزر جائے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جب کہ معراج الدراية کی فصل زکوٰۃ العروض میں اس کے خلاف ہے کہ نقد میں بہر حال زکوٰۃ واجب ہو جائے گی، نماء (تجارت) کے لیے رکھا ہو یا خرچ کے لیے۔ اسی طرح بدائع میں نماء، تقدیری کے تحت بھی مذکور ہے۔

علامہ شامی نے دونوں میں بڑی اچھی تطبیق پیدا کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ بدائع اور معراج الدراية وغیرہ کے بیان کا عمل یہ ہوگا کہ نقدی میں زکوٰۃ فرض اس وقت رہے گی جب کسی نے اس ارادے سے

رکھ رکھا ہو کہ اگر کوئی ضرورت پیش آئے گی تو خرچ کر دوں گا، لیکن کوئی ضرورت پیش ہی نہ آئی کہ سال پورا ہو گیا، اب اس کی زکوٰۃ دینی پڑے گی اگرچہ اس کا خرچ کرنے کا ارادہ اب بھی بدستور قائم ہے، لیکن اگر کسی متعین ضرورت کے پیش نظر رکھا تھا، مثلاً رہائش کا گھر بنانا ہے سال پورا ہو گیا اور وہ ضرورت ہنوز باقی ہے تو اس صورت میں ان دراہم کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی جیسا کہ مشرح الجمع میں صراحت ہے۔ (۱)

حاجتِ اصلیہ کا تعین احوالِ ظروف کے اعتبار سے

اس میں شک نہیں کہ حاجتِ اصلیہ کا دائرہ ہر زمانے اور ہر ماحول کے اعتبار سے مختلف ہوا کرتا ہے، جیسا کہ فقہاء کی تعبیر ”کتب العلم لأهلها“ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل علم کے لیے کتابیں حاجتِ اصلیہ ہیں جب کہ غیر عالم کے حق میں حاجتِ اصلیہ نہیں، چنانچہ کسی ماحول میں عام طور سے پانچ چھ جوڑے کپڑے استعمال کے لیے رکھے جاتے ہوں، ایسے ماحول میں کوئی شخص پچیس پچاس یا اس سے زائد جوڑے رکھتا ہو تو ظاہر ہے کہ ماحول کے اعتبار سے یہ اس کی پہننے کی ضرورت سے بہت زائد ہیں، لہذا اس کی حاجتِ اصلیہ سے باہر ہوں گے۔

لیکن اس کا اثر زیادہ سے زیادہ تحققِ غنا پر پڑے گا، جس سے زکوٰۃ لینے کی حرمت، صدقۃ الفطر اور قربانی کا وجوب وابستہ ہوتا ہے نہ کہ وجوب زکوٰۃ پر کیوں کہ اس میں حاجتِ اصلیہ سے زائد ہونے کے ساتھ نامی ہونے کی بھی شرط ہوتی ہے۔

چوتھی شرط۔ دین سے محفوظ ہونا

مال کا دین سے محفوظ ہونا حاجتِ اصلیہ سے زائد ہونے کی شرط کے تحت آجاتا ہے بایں معنی کہ یہ ایک معنوی ضرورت ہے۔ لیکن چوں کہ حسی حوائجِ اصلیہ کی نسبت اس کی تفصیلات و احکام قدرے مختلف ہیں اس لیے فقہاء اس کو الگ سے مستقل شرط کی حیثیت سے ذکر کرتے ہیں، کسی شخص کے مال میں جملہ شرائط وجوبِ نصاب نامی وغیرہ موجود ہوں لیکن اس پر کسی قرض یا بقایا کا بار ہو تو پہلے بقایا کی مالیت اس کے نصاب سے

منہا کر لی جائے گی، اس کے بعد اگر مال بقدر نصاب پچتا ہو تو اس میں وجوب زکوٰۃ کا حکم لگایا جائے گا۔
کس قسم کا دین وجوب زکوٰۃ سے مانع ہے اس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں دیوں ملتی ہے :

”قال فی النہایۃ کل دین لہ مطالب من جہۃ العباد فإنتہ یمنع
وجوب الزکاة سواء کان الدین للعباد أو لله تعالیٰ کدین الزکاة
فالذی لہ مطالب من جہۃ العباد کالقرض وضمن المبیع وضمن
المتلف وأرض الجراحۃ والمہر وسواء کان الدین من النکود أو الکلیل
أو الموزون أو الثیاب أو الحیوان وسواء وجب بنکاح أو خلع أو صلح عن
دم عمد وھو حال أو موجل“ (۱)

یعنی ہر وہ دین جس کا بندوں کی طرف سے کوئی مطالبہ کرنے والا ہو وجوب زکوٰۃ سے مانع ہے چاہے
وہ دین بندوں کا ہو جیسے قرض، بیع کا ثمن، تلف کی ہوئی شئی کا ضمان، زخم کا تاوان اور مہر یا اللہ کا مثلاً دین
زکوٰۃ کیوں کہ اس کا بھی مطالبہ کرنے والا امام موجود ہوتا ہے۔ برخلاف دین کفارہ اور دین نذر کے کہ امام مسکین
کو ان کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہوتا پھر اس دین کا کوئی نقدی کے قبیل سے ہونا ضروری نہیں بلکہ جس قسم
کا بھی ہو، خواہ کیلی ہو، وزنی ہو، مزدعات میں سے ہو یا عردی کے قبیل سے ہو، اس کا ذمہ پر وجوب چاہے
معاملے کے ضمن میں ہوا ہو یا ”قد نکاح کے یا خلع کے یا دم عمد (قصاص) پر عقد صلح کے نتیجہ میں سر دست
واجب الاداء ہو یا ادعار۔

دین طویل الاجل کا حکم

حنفیہ کے نزدیک دین کے وجوب زکوٰۃ سے مانع ہونے کی جو تفصیل اوپر ذکر کی گئی اس کا تقاضا تو یہ ہے
کہ دین خواہ مؤجل ہو یا معجل بہر صورت اس کا ذمہ پر ہونا زکوٰۃ کی فرضیت سے مانع ہے، اس کی مدت لمبی ہو یا
کم، لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ اصل چیز مطالبہ ہے اور مؤجل کا مطالبہ عادتہ معینہ مدت سے قبل نہیں ہوا کرتا، اس
لیے مانع نہیں ہونا چاہیے یہی وجہ ہے کہ عورت کا دین مہر جو مؤجل ہو اس کے بارے میں فقہاء کے درمیان

تین اقوال پائے جاتے ہیں اور مسئلہ خاما مختلف فیہ ہے۔

- (۱) بہر صورت مانع زکوٰۃ ہے۔
 - (۲) معجل، منع سے مؤجل نہیں۔
 - (۳) شوہر اگر ادائے کی کا پختہ ارادہ رکھتا ہو تو مانع ہے ورنہ نہیں۔
- بدائع میں ہے:

”وعلیٰ ہذا یشخرج مہر المرءۃ فانتہ یمنع وجوب الزکاة عندنا معجلًا
کان أو مؤجلًا لأنہا إذا طالبتہ بیؤاخذ بہ، وقال بعض مشائخنا
ان المؤجل یمنع لأنہ غیر مطالب بہ عادة فان کان المعجل فیطالب
بہ عادة فیمنع وقال بعضهم ان کان الزوج علی عزم من قضاہ یمنع
وان لم یکن علی عزم القضاء لا یمنع لأنہ لا یعدہ دینًا“ (۱)

علامہ شامی نے ہستانی سے دوسرے قول کا رائج ہونا نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

”عزاه فی المعراج“ السی شرح الطحاوی وقال وعن ابی حنیفۃ لا یمنع

وقال الصدر الشہید لا روایۃ فیہ ولکل من المنع وعدمہ وجہ

زاد القہستانی عن الجواہر والصحیح أنہ غیر مانع“ (۲)

اس مسئلہ میں ہمارے بزرگوں کے فتاویٰ بھی بہت مختلف نظر آتے ہیں، حضرت تھانویؒ کا تینوں
قولوں کے مطابق فتویٰ موجود ہے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے تیسرے قول پر فتویٰ دیا ہے، اور فتاویٰ
دارالعلوم میں شامی پر اعتماد کر کے دوسرے قول کو اختیار کیا گیا ہے (۵)

آج کل حکومتیں جو اپنے شہریوں کو لمبی لمبی مدت پر بڑی بڑی رقمیں قرض کے طور پر دیتی ہیں جس کی
ادائے کی سالانہ قسط وار کرنی ہوتی ہے ان کا حکم مذکورہ بالا نقول کی روشنی میں بظاہر ہی معلوم ہوتا ہے کہ
سالانہ واجب الادا قسط ہی نصاب زکوٰۃ سے منہا کی جانی چاہیے نہ کہ پوری مقدار قرض۔ اولاً اس وجہ سے کہ ان

(۱) بدائع ۶/۲ (۲) رد المحتار ۵/۲ (۳) امداد الفتاویٰ ۱۰۱۹/۲

(۴) کفایت المفتی ۲۳۶ (۵) فتاویٰ دارالعلوم لاہور ۵/۱ و ۳۶

قرضوں میں لازماً اسی قسط کا مطالبہ ہوتا ہے جو اس سال واجب الادا ہے نہ کہ پورے قرض کا۔ دوسرے اس میں فتنہ کا نفع بھی ہے ورنہ اگر پوری مقدار قرض منہا کر لی جائے تو بسا اوقات زکوٰۃ ہی فرض نہ ہو سکے گی یا ہوگی تو بہت معمولی جب کہ مالکین اس رقم قرض کو تجارت یا کسی دوسری نامی مد میں لگا کر اس سے بھر پور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

محور ثانی - نصاب

چاندی اور سونے میں سے ہر ایک کا نصاب مستقل ہے، البتہ اموال تجارت کی مالیت کا تعین نقدین میں سے کسی ایک سے کرنا پڑے گا اور اس بارے میں مسئلہ بے غبار ہے کہ جس کے ذریعہ قیمت لگانے سے مال تجارت کی مالیت نصاب کے بقدر ہو جاتی ہو وہی معیار ہو گا۔ چنانچہ فی زمانہ جب کہ سونے چاندی کی قیمتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ظاہر ہے کہ معیار چاندی ہی قرار پائے گی کہ اسی کے ذریعہ قیمت لگانے پر مال کی مقدار نصاب تک جلدی پہنچتی ہے۔ باقی اگر دونوں کے ذریعہ نصاب کے بقدر با اس سے زائد مالیت قرار پاتی ہو تو جس میں فقیر کا زیادہ نفع نظر آئے اسی کو اصل تسلیم کیا جائے۔

”ولو بلغ بأحدھما نصاباً دون الآخر تعین ما یبلغ بہ وبلغ بأحدھما

نصاباً وخمساً وبالآخر اقل قسماً بالأنفع للفقیر“ (۱)

یہ تفصیل تو اس نصاب شرعی کے متعلق ہے جس کا تعلق وجوب زکوٰۃ سے ہے باقی وہ نصاب شرعی جس کا مالک شرعاً غنی کہلاتا ہے اور زکوٰۃ کا مال اس کے لیے حرام رہتا ہے خواہ اس پر زکوٰۃ فرض ہو یا نہ ہو اس کا تعین حدیث پاک کے بموجب چاندی کے نصاب سے کیا جائے گا۔

”واستدل له فی الکافی لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم من سأل ولہ

ما یغنیہ فقد سأل الناس الحافاً وما الذی یغنیہ قال ما تادرہم

اوعدلہا“ (۲)

(۱) الدر المختار ۳۱/۲

(۲) رد المحتار ۶۵/۲

محورثالث - مصارف زکوٰۃ

ادائے گی زکوٰۃ کیلئے تملیک شرط ہے

اللہ تعالیٰ نے جہاں بندوں پر ان کے مخصوص اموال میں سے ایک معین حصہ بطور زکوٰۃ لکھا اور فرض قرار دیا ہے وہیں یہ نص قرآنی اس حصہ زکوٰۃ کے مصارف بھی واضح انداز میں بیان فرمادیے ہیں کہ ان ہی مصارف میں یہ زکوٰۃ کا مال خرچ کیا جائے گا، ان کے علاوہ میں نہیں، ساتھ ہی ادائے گی کے صحیح طریقہ اور کیفیت کی بھی نشاندہی کر دی ہے۔ چنانچہ آیات قرآنی و احادیث نبوی کی روشنی میں امت کے جمہور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زکوٰۃ کے معینہ آٹھ مصارف میں زکوٰۃ کی ادائے گی اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جب ان مستحقین میں سے کسی کو زکوٰۃ کے مال پر بلا کسی عومن مالکانہ قبضہ دے دیا جائے، بغیر مالکانہ قبضہ دیے اگر کوئی مال زکوٰۃ کی نیت سے ان ہی لوگوں کے فائدے میں خرچ کر دیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اسی وجہ سے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء امت اس پر متفق ہیں کہ زکوٰۃ کی رقم مدارس، مساجد، شفا خانے اور یتیم خانے وغیرہ کی تعمیر میں صرف نہیں کی جاسکتی، اگرچہ اس سے مستفید مستحقین بھی ہوں گے، کیوں کہ ان صورتوں میں تملیک کا مفہوم مفقود ہے حتیٰ کہ زکوٰۃ کی رقم سے کوئی شئی خرید کر مستحقین کو بطور اباحت مستفید ہونے کا موقع دے دیا جائے، مثلاً بٹھا کر صبح و شام کھانا کھلا دیں تو فقہاء فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ (۱)

ملک العلماء کا سانی نے تملیک کے ضروری شرط ہونے پر استدلال اس طرح کیا ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں زکوٰۃ یا صدقات واجبہ کا حکم ہے وہاں فعل "ایتا" کا استعمال کیا گیا ہے جس کی حقیقت مالک بنادینا ہے۔ نیز قرآن میں زکوٰۃ کو صدقہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا حقیقی مفہوم یہی ہے کہ کسی فقیر حاجت مند کو اس کا مالک بنا دیا جائے۔

طلبہ کو زکوٰۃ کیسے دی جائے؟

ادائے گی زکوٰۃ میں تملیک مستحق کے شرط ہونے کی وجہ سے آج کل دینی مدارس داروں و یتیم خانوں

کے ارباب انتظام کو سخت آزمائش کا سامنا ہے جہاں محتاج طلبہ علم دین اور یتامیٰ جیسے مستحقین زکوٰۃ موجود ہوتے ہیں جن کی خاطر وہ قوم سے زکوٰۃ میں یادگیر صدقات واجبہ وصول کر کے لاتے ہیں اور ان پر حسب حکم شرعی صرف کرنے کے پابند ہوتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان اداروں میں مستحقین کے علاوہ خرچ کی کچھ اور مددات بھی ہوتی ہیں جن میں صدقات واجبہ کی رقمیں صرف نہیں کی جاسکتیں اور کافی سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً ملازمین کی تنخواہیں، ادارے کی تعمیر اور ان پر آنے والے ضروری اخراجات بجلی، پانی، ٹاٹ، فنیچر وغیرہ۔ اور تجربہ شاید ہے کہ ان میں سے اکثر مدارس کو صدقات واجبہ کے علاوہ اتنی رقم فراہم نہیں ہو پاتی جس سے وہ ادارے کے دوسرے اخراجات پورا کر سکیں، اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے فقہ کی بعض جزئیات کو نظر بنا کر نہ جانے کب سے حیلہ متعارفہ کی ایک رسم بدھلی آرہی ہے جس پر بالکلین خوش ہیں کہ ہم نے زکوٰۃ کی رقم مصرف پر خرچ کرنے دی اور منتظمین خوش ہیں کہ ہم نے مصرف پر خرچ کر لی، جب کہ حقیقت میں رقم اپنے مصرف پر خرچ نہ ہوئی، مصرف ہتھ پھیرا ہوا۔ حضرت بھٹانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”قطع نظر درغ سے میرے نزدیک قاعدہ فقہیہ کے رو سے بھی یہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، کیوں کہ

تملیک رکن زکوٰۃ ہے اور تملیک میں جب عاقدین ہاں ہوں تو تملیک نہیں ہوتی اور صورت

متعارفہ میں دونوں شہادت قرائن قویہ معترف ہیں کہ تملیک مقصود نہیں“ ۱۱۱

ایک طرف اس دور جہل و منکالت میں علم دین کی روشنی پھیلانے کے لیے اس طرح کے اداروں کا

قیام و عمل ضروری ہے تو دوسری طرف ان کی بقا، دوام کی راہ میں مختلف مالی مشکلات کا سامنا ہے، ان

مشکلات کے حل کی ایک راہ ڈھونڈی بھی گئی تو تجربہ نے بتایا کہ یہ خطرات سے محفوظ نہیں اس لیے ہمارے

خیال میں حیلہ متعارفہ سے ہٹ کر کوئی ایسی راہ عمل تلاش کرنا ضروری ہے جس سے شریعت کی حکم عدد دلی

سے محفوظ رہتے ہوئے احیائے دین کے ان مراکز کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جاسکے۔ سوالنامہ میں جو دو صورتیں

ذکر کی گئی ہیں ان میں سے اول الذکر پر ہمیں اشکال ہے جب کہ دوسری پر محمد المداہمینان ہے اور وہ حیلہ متعارفہ

کا نعم البدل کہ طالب علم پر آنے والے مجموعی اخراجات طالب علم کے ذمہ واجب الادا ہوں، اور چوں کہ وہ غیر

مستطیع ہے اس لیے زکوٰۃ کی مدد سے اتنی نقد رقم یا اس کا چیک طالب علم کو دے دیا جائے اور وہ اپنے

ادپر عائد قرض کی ادائیگی میں اس کو داخل مدرسہ کر دیا کرے۔

اول الذکر صورت کہ مدرسہ کا مہتمم خود ہی اتنی مقدار رقم بذکوٰۃ سے ادا کر دیا کرے یہ محل اشکال اس وجہ سے ہے کہ اس کی بنیاد مہتمم ادارہ کو مستحقین کا ہر اعتبار سے وکیل تسلیم کرنے کے نظریہ پر قائم ہے جو بجائے محل نظر ہے۔

مہتمم طلبہ کا وکیل یا زکوٰۃ دہندگان کا؟

اس سلسلہ میں کل تین احتمالات ہیں۔ صرف زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے۔ صرف طلبہ کا وکیل ہے، دونوں کا وکیل ہے۔ عام علمائے کرام کا رجحان یہ ہے کہ ہمارے ملک کے مدارس جو عوامی چندوں سے چلتے ہیں ان کے ارباب انتظام صرف مالک۔ سوال کی طرف سے زکوٰۃ کا مال مصرف پر خرچ کرنے کے سلسلہ میں وکیل ہیں اور مستحقین کے نائب یا وکیل نہیں، جیسا کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمۃ کلمہ ہی خیال ہے، فرماتے ہیں:

"آج کل جو اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم یا ان کے بھیجے ہوئے سفراء صدقات یا زکوٰۃ وصول کرتے ہیں ان کا وہ حکم نہیں جو عالمین صدقہ کا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فقراء کے وکیل نہیں بلکہ اصحاب زکوٰۃ یعنی مالداروں کے وکیل ہیں۔ ان کی طرف سے مال زکوٰۃ کو مصرف پر لگانے کا ان کو اختیار دیا گیا ہے، اس لیے ان کا قبضہ ہو جانے کے بعد بھی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک یہ حضرات اس کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں۔"

فقراء کا وکیل نہ ہونا اس لیے ظاہر ہے کہ حقیقی طور پر کسی فقیر نے ان کو اپنا وکیل بنایا نہیں، اور امیر المومنین کی ولایت عامہ کی بنا پر جو خود بخود کالت فقراء حاصل ہوتی ہے وہ بھی ان کو حاصل نہیں، اس لیے بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ ان کو اصحاب زکوٰۃ کا وکیل قرار دیا جائے اور جب تک وہ اس مال کو خرچ نہ کر دیں ان کا قبضہ ایسا ہی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی رقم خود مال دانے کے پاس رکھی ہو ۱۱

لیکن اس صورت میں کئی ایک اشکالات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

(۱) مہتمم اس کو دوسرے اموال میں خلط کر دے تو اسے ہلاک کی وجہ سے اس کی ملک ہو جانا چاہیے اور جو کچھ خرچ کرے گا وہ اس کی جانب سے تبرع ہوگا اور معطین کے لیے اتنے کا ضامن۔

(۲) معطی جب مر جائے گا اور مال مہتمم کے قبضہ میں بدستور باقی ہو تو اس مال کا اس کے ورثہ کی طرف لوٹنا واجب ہوگا جن کی تلاش جستجو اس کی ذمہ داری ہے۔

(۳) جب رقم ارباب اموال کی ملک ہے تو جس معطی نے زکوٰۃ کی رقم مثلاً نصاب یا اس سے زائد مقدار میں دی ہو اور اس پر سال گزر جائے تو اس کی زکوٰۃ بھی مالکین پر لازم ہونی چاہیے کیوں کہ وکیل کا قبضہ خود موقوف کا قبضہ ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ صرف طلبہ اور مستحقین کا وکیل قرار دیا جائے تو اس صورت میں مال کا مہتمم کے قبضہ میں آ جانا گویا طلبہ کے قبضہ میں آ جانا ہے اور وہ ان کی طرف سے ہر ایسے کام میں خرچ کرنے کا مجاز ہوگا جس میں کسی بھی اعتبار سے طلبہ کا فائدہ ہو۔

لہذا تملیک کی بھی ضرورت نہ ہوگی، اسی طرح طلبہ کی خوراک، پوشاک یا نقد کی صورت میں مالک بنانے کے علاوہ تنخواہ ملازمین، مدرسہ کی تعمیر وغیرہ دوسری مدات میں صرف کرنے کا بھی جواز ہوگا، اور جیلہ متعارف جیسے بے کار عمل سے نجات مل جائے گی۔

لیکن اس میں ایک زبردست اشکال یہ رہتا ہے کہ زمانہ شارع علیہ السلام یا آپ کے بعد اسلامی بیت المال میں جو زکوٰۃ وصول ہو کر آتی تھیں روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں مصارف ثمانیہ ہی میں خرچ کیا جاتا تھا، حالاں کہ امیر المؤمنین کی ولایت عام ہونے کی وجہ سے فقراء اور مستحقین کی طرف سے امام کو یقیناً وکالت و نیابت دلائل حاصل تھی امام کا قبضہ خود مستحقین کا قبضہ تھا، گویا کہ مستحقین نے قبضہ کر کے امام کو اس کے خرچ کرنے کا اختیار دے دیا تھا پھر بھی عہد نبوی، عہد خلفاء راشدین یا قرون اولیٰ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ صدقہ واجبہ کی رقم رفاہ عام کے کاموں یا عاملین کے علاوہ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں صرف کی گئی ہو بلکہ اس کے برعکس ابوداؤد شریف میں ایک مرفوع حدیث ہے جس سے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ ہر چند کہ زکوٰۃ پر امام کا قبضہ مستحقین کا قبضہ ہے لیکن ان کو اس کا مالک بنانا ضروری ہے، اور ان کے علاوہ کسی اور جگہ پر صرف کرنا جائز نہیں ہے۔

روایت کے الفاظ یہ ہیں :

" فانما رجل فقال اعطني من الصدقة فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله لم يرض بحكم نبي ولا غيره من الصدقات حتى حكم فيها هو فجزءها ثمانية اجزاء فان كنت من تلك الاجزاء اعطيتك " (۱)

ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا کہ صدقات میں سے مجھے بھی دیا جائے آپ نے ارشاد فرمایا، اللہ صدقات کی بابت کسی نبی یا غیر نبی کے فیصلہ پر راضی نہیں بلکہ خود اس نے مصارف زکوٰۃ کی آٹھ قسمیں کر دی ہیں اگر تو ان میں سے تو میں دے سکتا ہوں (ورنہ نہیں)۔ لہذا جب اسلامی بیت المال کے ذمہ دار کو یہ حق نہیں تو آج کے مدارس کے نظماً، کو کیوں کر یہ حق پہنچے گا اگر غیر مصرف میں زکوٰۃ صرف کر ڈالیں۔

اس لیے تیسری صورت متعین ہو جاتی ہے کہ ہر اعتبار سے مہتمم معطین کا وکیل ہے اور نہ ہر اعتبار سے طلبہ اور مستحقین کا بلکہ بعض بعض پہلوؤں سے ہر دو کے نائب اور وکیل کا درجہ رکھتا ہے، قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ نے پہلی صورت کے تحت مذکورہ اشکالات کے جواب میں یہی بات ارشاد فرمائی ہے :

" مہتمم مدرسہ کا قیم و نائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے جیسا کہ امیر نائب جملہ عالم کا ہوتا ہے پس جوئی کسی نے مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے اس کے ملک معطی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہو گیا اگرچہ وہ مہول الکیت والذوات ہوں مگر نائب معین ہے پس بعد موت معطی کے ملک ورنہ معطی کی اس میں نہیں ہو سکتی اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطی کا بھی ہو سکتا ہے بہر حال نہ یہ وقف مال ہے اور نہ ملک ورنہ معطی کی ہوگی اور نہ خود معطی کی ملک ہے " (۲)

یہی بات حضرت مولانا فہیل احمد صاحب محدث سہارن پوری رحمہ اللہ نے حضرت مولانا اشرف علی صاحب علیہ الرحمۃ کے ایک اشکال کے جواب میں کہی ہے :

عاجزے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں مگر اہل مدرسہ مثل عمال بیت المال معطین اور آخذین

کی طرف سے دکلا، میں لہذا نہ اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور معطین واپس لے سکے ہیں : (۱۱)
یہ حقیقت ہے کہ ارباب مدارس لوگوں کی زکوٰۃ وصول کر کے مصرف میں خرچ کرنے پر الشری طرف
سے مامور نہیں ہیں، جیسا کہ امیر المؤمنین مامور ہے، بلکہ وہ ادارہ چلانے کے لیے مالکین اموال سے صدقات
وصول کرتے ہیں اور دینے والے حضرات مراعات انھیں مصرف پر خرچ کرنے کا وکیل بنا دیتے ہیں، دوسری طرف
ظاہر ہے کہ مستحقین نے مراعات انھیں اپنا وکیل بنایا نہیں لیکن چونکہ احیاء دین کی خاطر مدارس کی دلغ بیل ڈالی گئی
ہے اور ان کا انحصار ان ہی صدقات و عطیات پر ہے اس لیے برہائے ضرورت ارباب انتظام کو (جن کا انتخاب
ارباب صل و عقد کے مشورے سے ہوتا ہے اور عوام و طلبہ عرفان کے اہتمام کو تسلیم بھی کرتے ہیں) امیر المؤمنین کے
قائم مقام تسلیم کر لیا گیا ہے تاکہ وہ پیچیدگیاں لازم نہ آئیں جو پہلی صورت کے ذیل میں بہ طور اشکال ذکر کی گئیں اور
قاعدہ ہے "الضرورات تقدر بقدرها"

لہذا جس قدر ضرورت داعی ہوگی اسی قدر ان کو فقراء کا نائب تسلیم کیا جائے گا، اور یہاں ضرورت
صرف اس قدر ہے کہ مال معطین کی ملک سے نکل جائے تاکہ ان کے مرنے پر ورثہ کی طرف واپسی لازم نہ ہو،
خلط (جس سے بچنا عادتاً نامکن سا ہو گیا) کی وجہ سے استہلاک نہ لازم آئے، اسی طرح اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہونے
زکوٰۃ وصول کر کے لانے والوں کو عاملین کی طرح زکوٰۃ میں اجرت دینا جائز ہو جائے۔ باقی قصداً مال ضائع کر دینے
کی صورت میں ضامن ہونے کی بابت اور مصارف پر صحیح طریقے سے خرچ کرنے کی بابت وہ لانا معطین یعنی
مالکین ہی کے وکیل ہوں گے نہ کہ طلبہ کے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلیہ انعم و احکم۔

مدارس کے سفراء العالمین کے مصداق ہیں؟

مدارس کے سفراء جو وصولی صدقات کے لیے بھیجے جاتے ہیں "العاملین علیہا" کے مصداق
ہیں یا نہیں؟ اس سلسلہ میں علماء کرام کی آراء مختلف ہیں مگر اپنی ناقص معلومات کی حد تک ہم جس نتیجہ پر پہنچے
ہیں وہ یہ کہ ضرورتاً انھیں بھی عاملین کا مصداق قرار دینا چاہیے جیسا کہ ضرورتاً مہتممین کو بعض پہلوؤں سے

(۱) فتاویٰ خلیلیہ ۳۸۱/۱، امراء الفتاویٰ مبرور ۲۶۶/۶، فتاویٰ امراء دیہ موسوم بفتاویٰ اشرفیہ ۲۸۱/۴ میں حضرت

تھانوی اور مولانا خلیل احمد صاحب کی مفید علمی مکاتبت ہے جس سے بہت سے اشکالات رفع ہو جاتے ہیں۔

امیر المؤمنین یا عمال کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے، اس وجہ سے اس سداہ کی بہت سی دشواریاں دور ہو سکتی ہیں مثلاً یہی کہ باعنا بطہ تنخواہ پر سفر اکانقر کر کرنے میں بسا اوقات ان پر جو خرچ ہوتا ہے اس سے مدرسہ کو نقصان پہنچتا ہے آمد کا تناسب کم اور خرچ کا تناسب زیادہ آتا ہے۔ اب اگر ان کو عالمین کے تحت داخل مانا جائے گا تو ان پر عامل کے احکام آئیں گے اور عامل کو اتنی ہی مقدار دی جاتی ہے جو اس کے وصولی پر جانے اور لوٹنے کی درمیانی مدت میں اس کی جملہ ضروریات کی اوسط طریقہ پر کفایت کر سکے اور ساتھ ہی اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس کی اجرت اس کی وصولی کی ہوئی رقم کے نصف سے بڑھنے نہ پائے ورنہ کمی کی جائے گی۔ (۱)

چنانچہ جب سفیر کو اس کی فکر ہوگی کہ اگر صدقات کی وصولی مجھ سے کم ہوئی تو لازماً میرے اوسط درجہ کے اخراجات وصول شدہ رقم کے نصف سے بڑھ جائیں گے اور اس میں میرا نقصان ہوگا تو وہ زیادہ جمع کرنے کی کوشش کرے گا، اس صورت میں بہر حال آمد کا تناسب اخراجات سے زیادہ ہوگا، ہمارے اس خیال کی تائید مفید کفایت اللہ علیہ الرحمہ کے فتویٰ سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

”زکوٰۃ کی رقم وصول کر کے لانے والوں کو اسی رقم میں سے اجرت عمل دینے کی گنجائش ہے خواہ وہ غنی ہوں، مگر کسی حال میں ان کی وصولی کی ہوئی رقم کے نصف سے زیادہ نہیں دی جائے گی۔“

نیو فرماتے ہیں:

”اموال زکوٰۃ قیمت چرم قربانی میں سے اجرت عامل (سفیر چنیدہ) دینے کا جواز تو ناقابل تردد

ہے اور اس صورت میں حیلہ تملیک کی ضرورت بھی معلوم نہیں ہوتی۔“ (۲)

واضح رہے کہ عالمین کے مصداق صرف محصلین اور سفراء ہی ہو سکتے ہیں وہ علم نہیں جو حساب آمد و خرچ کے اندراج پر مامور ہے کیوں کہ قرون اولیٰ میں کہیں سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وصول کر کے لانے والے کے علاوہ محرر بیت المال محافظ وغیرہ کو صدقات میں سے تنخواہ دی گئی ہو۔

کمیشن پر زکوٰۃ کی فراہمی

فقہ حنفی کے اصول بیوع و اجارات کی رو سے ہر ایسا معاملہ جس میں معقود علیہ یا اس کا بدلہ محمول ہو۔

نا جائز ہوتا ہے، چنانچہ مذکورہ مسئلے میں بھی اسی علت کے باعث اہل علم باکمال ارباب افتاء، عدم جواز کا فتویٰ دیتے آئے ہیں۔ کمیشن پر چندہ کرانے میں جو امور عدم جواز کے متقاضی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ اجرت مجہول ہے، کیوں کہ کمیشن وصولی کے تناسب سے ہوگا۔ معلوم نہیں وصولی زیادہ ہوگی یا کم اگر اتنی کم ہوئی کہ جس کے کمیشن سے اس کا سفر خرچ وغیرہ بھی نہ نکل پائے تو یہ مستقل باعث نزاع ہے کہ سفیر فراہمی چندہ کے لیے دردر کی ٹھوکریں کھائے اور نتیجہ صفر ہو، لہذا منظم سے الجھنا عین ممکن ہے، اسی طرح وصولی اتنی زیادہ کر لیا کیوں کہ اس کا کمیشن ہی پچیس تیس ہزار تک پہنچ جاتا ہے تو منتظمین کی نیتیں ڈگمگانے لگتی ہیں، یہ محض احتمال نہیں بلکہ ایسے واقعات رونما ہوتے دیکھے گئے ہیں۔

۲۔ جب سفیر عامل صدقہ کے حکم میں ہے تو اس کے اوپر اخراجات میں میانہ روی برتنا اور اسراف و تفصیر (فضول خرچی و تنگی) سے اجتناب لازم ہوگا، فضول خرچی سے اس لیے کہ یہ مال فقرا کا ہے اور جو کچھ بطور حق خدمت اسے دیا جاتا ہے وہ ضرورت ہے اور ضرورت کو بقدر ضرورت ہی اختیار کیا جاتا ہے اور تنگی سے اجتناب اس لیے لازم ہے کہ خود خسارہ میں نہ پڑے اور بعد کو بد دل ہو کر یہ کام ہی چھوڑ دے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں:

”علی الامام ان یبعث من یرضی بالوسط من غیر اسراف ولا تقصیر“ (۱)

زیر بحث مسئلہ میں اگر سفیر کے ہاتھوں چندہ کم ہوگا تو تبذیر کا مرتکب ہوگا، جو فقرا کی حق تلفی ہے اگرچہ برابر برابر بھی صورت ہو سکتی ہیں لیکن پہلے دونوں امکانات اس کی بہ نسبت زیادہ ہیں اور ”درہ المفاسد اولیٰ من جلب المنافع“ (۲)

عدم جواز کی پہلی علت کے سلسلہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ میں جہالت ایسی نہیں جس سے لازماً نزاع اور جھگڑا پیدا ہو اور جہالت وہی مضر ہے جو مفسد فی النزع ہوتی ہے چنانچہ بہت سے معاملات جس میں معقود علیہ یا اس کا بدل مجہول ہوتا ہے مگر اس کی جہالت باعث نزاع نہ ہونے کی وجہ سے قابل اعتراض نہیں اور وہ معاملے جائز ہیں، مثلاً مزارعت (بٹائی) درختوں پر پھلوں کی بیج جو لازماً مجہول

ہوتے ہیں اور مصاربت وغیرہ۔

لیکن ان معاملات کی حقیقت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چوں کہ لوگوں کی عام ضروریات ان سے وابستہ ہو گئی ہیں اور ان کا عرف و تعامل بن چکا ہے، اس لیے ان کی جہالت کسی کے لیے قابل اعتراض نہیں ہوتی اور کوئی نزاع انہیں ہوتا، مگر جب تک ان میں عرف نہیں ہوتا تب تک دو چند اشخاص اگر اس قسم کے معاملات کرتے ہیں چاہے ان میں بالفعل منازعت نہ بھی ہو تب بھی وہ معاملے ناجائز کہے جاتے ہیں۔ گویا ریوخت مسئلہ میں بھی اجرت کی جہالت باعث نزاع اسی وقت نہیں ہوگی جب اس کا عرف و تعامل ہو جائے ورنہ اکادکا اشخاص اور دو چند اداروں کے ذمہ دار جو اس طرح کا معاملہ کریں خواہ بالفعل ان میں جھگڑا رونما نہ بھی ہو تب بھی معاملہ ناجائز ہی کہا جائے گا، الا یہ کہ اس مسئلہ میں بھی عام ضرورت اور عرف و تعامل معتبر حد تک تسلیم کر لیا جائے جو محل نظر ہے۔ جیسا کہ عرف کی تعریف ”هو عادة جمہور قوم فسی قول او فعل“ سے کی گئی ہے۔

رہی عدم جواز کی دوسری دلیل تو اپنی جگہ پختہ ہے اس لیے مسئلہ کا حل اسی میں ہے کہ اگر سفیر کو مال صدقہ کا مصداق قرار دیا جاتا ہے تو اجرت بھی اسی طرح دی جائے جس طرح عامل کو دی جاتی تھی۔

مصارف زکوٰۃ فی سبیل اللہ

زکوٰۃ کے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ کے مصداق کے سلسلہ میں صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین، متقدمین و متأخرین کا جس پر اتفاق ہے اس سے اختلاف کرنے کی جرأت ہماری نگاہ میں سخت خطرناک ہے ان سب حضرات کی تصریحات کو یکسر پس پشت ڈالتے ہوئے لفظ کے محض ظاہری لغوی معنی کو پکڑ کر تو سب سے یا تعمیم کا نظریہ بالکل غلط ہے۔

جس طرح صوم، صلوٰۃ، زکوٰۃ وغیرہ شریعت کی مخصوص اصطلاحیں ہیں اسی طرح فی سبیل اللہ شریعت کی ایک مخصوص اصطلاح ہے، شریعت نے ان الفاظ کو ان کے لغوی معانی سے نکال کر ایک مخصوص مضمون کیلئے

متعین کر دیا ہے اسی طرح یہ لفظ سبیل اللہ بھی ایک خاص معنی کے لیے متعین ہو کر رہ گیا ہے اور وہ غزوہ اور جہاد عسکری ہے اور جب بھی کتاب و سنت میں یہ لفظ مطلق بولا جاتا ہے تو یہی معنی مراد ہوتا ہے۔

مسئلہ چوں کہ اجماعی ہے اور ماضی و حال کے علماء کے حق نے بحمد اللہ اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے سبھی شکوک و شبہات کا جائزہ خوب اچھی طرح لے کر غلط فہمی یا گمراہی کے جتنے راستے ہو سکتے ہیں سب کو مسدود کر دیا ہے اور منشا شریعت کی بھرپور ترجمانی کر دی ہے (فخر اسم اللہ خیر الجزاء) اس لیے زیر بحث موضوع پر تفصیلی گفتگو کے بجائے ہمارے لیے صرف ایک راہ نظر آتی ہے کہ مسئلہ کی تنقیح کے ضمن میں ذکر کردہ نکات اور سوالات کا جواب صرف ہاں یا نہیں میں دے دیا جائے اور بوقت ضرورت دو چار جملوں میں مقصد کی وضاحت بھی کر دی جائے اور بس۔

(۱) آیت کریمہ میں حصر حقیقی ہے، جہاں تک حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کا تعلق ہے اس آپ کی رائے بھی جمہور امت سے مختلف نہیں ہے، بلکہ آپ نے جس انداز سے آیت کریمہ کی تشریح کی ہے وہ ان لوگوں کے مسخ پر زور دار طمانچہ ہے جو شاہ صاحب کو اپنا نظر بانی مقتدا و پیشوا کہتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے تھکتے نہیں اور نظریہ توسیع فی سبیل اللہ کو حرز جاں بنائے ہوئے ہیں۔ شاہ صاحب پہلے تو جمہور کی طرح صدقات واجبہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کا حق یہ ہے کہ کسی مستحق کو ان کا مالک بنا دیا جائے نہ کہ مساجد، مدارس اور رفاہ عام کے کاموں میں صرف کیا جائے جہاں تملیک مفقود ہوتی ہے۔ پھر اپنے حکیمانہ مزاج کے مطابق مصارف کو تین بنیادی جامع تعمیروں میں سمیٹتے ہوئے فی سبیل اللہ کی جگہ غزاة کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو بالکل جمہور کے مطابق ہے۔ مصارف کی توضیح کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ چوں کہ منافقین حضور پاک کو صدقات کی بابت طعن و تشنیع کے ذریعہ چاہتے تھے کہ ہماری خواہش کے مطابق صدقات کا مصرف محدود کر دیا جائے اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تعبیر اختیار فرمائی کہ نہیں! اس میں تو بہت سے لوگوں کا حق ہے اور اس میں توسیع ضروری ہے جن کا دائرہ ان آٹھ مصارف کی حد تک وسیع ہو گا تاکہ اس سے مسلم معاشرہ میں توازن پیدا ہو سکے۔ ان آٹھوں مصارف سے تجاوز نہ ہو گا۔ اگر شاہ صاحب کی مراد وہی ہو، جیسا کہ ظاہر الفاظ سے متبادر ہوتا ہے کہ حصر صافی ہے اور ان مصارف کا ذکر صرف منافقین کے مقابلہ میں آگیا ہے ورنہ تو ان میں فی نفسہ توسیع کی گنجائش ہے تاکہ غوامی ضروریات انجام پاسکیں تو یہ شاہ صاحب کے انداز تشریح کے سراسر خلاف ہو گا، کیوں کہ جن وجوہ میں تملیک نہیں انھیں سب سے پہلے شاہ صاحب خارج

کر چکے ہیں، باقی فقراء، مساکین، مسافریں اور قرض داروں کو محتاجین میں شامل کر لیا، غازیوں اور عاملین کو حفظ سے تعبیر کر دیا۔ رہا فی الرقاب اور مؤلفہ القلوب تو اس کی انگ سے نشاندہی کی، تو اب لے دے کر صرف اغنیاء بچ جاتے ہیں جن کو نہ دینا واضح ہے کہ مال صدقہ انھیں سے تو وصول کیا گیا ہے۔

(۲) جی ہاں جمہور مفسرین اور فقہاء نے قرآن و حدیث کے تتبع سے جو یہ سمجھا ہے کہ قرآن و حدیث میں کسی قید و قرینہ کے بغیر جب لفظ فی سبیل اللہ بولا جاتا ہے تو اس سے غزوہ اور جہاد عسکری ہی مراد ہوتا ہے اس کے ہم ماننے کے پابند ہیں۔

(۳) احناف کا اصول یہی ہے کہ جب کسی مسلمہ میں مختلف اقوال صحابہ کے دوران پائے جاتے ہوں تو احناف ان ہی میں سے کسی ایک کو ترجیحی دلائل سے منتخب کر لیتے ہیں یا کوئی تطبیق کی صورت پیدا کرتے ہیں۔ ان اقوال کی حد سے تجاوز نہیں کرتے، جیسا کہ شیخ عبدالوہاب شرانی شافعی امام ابو حنیفہ کا قول نقل کرتے ہیں:

”ما جاءنا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فعلى الرأس والعين
بأبي هو وأمي وليس لنا مخالفة وما جاءنا عن أصحابه تخيرنا وما

جاءنا عن غيرهم فهم رجال ونحن رجال“ (۱)

(۴) - (الف): فی سبیل اللہ سے مراد محتاج غازی ہیں، اگرچہ امام محمد رحمہ اللہ نے ضرورت مند حایوں کو بھی اس کا مصداق قرار دیا ہے لیکن احناف کے نزدیک امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف ہی کا قول مفتی بہ رہا ہے۔ فقہاء متاخرین میں سے بعض نے محتاج طلبہ علم دین کو بھی اس میں داخل مانا ہے جس کا مقصد ان کی زیادہ استحقاقیت ثابت کرنا ہے کہ اس میں دہرا اجر ہے۔

(ب): جی ہاں فقر کی شرط ضروری ہے:

”ولا يصرف إلى اغنياء الفزاة لأن المصروف هو الفقراء“ (۲)

(۵) مصارف زکوٰۃ کا تعین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اگر دیکھا جائے تو اس میں فقراء، اغنیاء، کافرا،

(۱) بحوالہ درم ترمذی ۱۰۹/۱ (۲) فتح القدیر ۱۰۵/۲ دار احیاء التراث العربی

(۳) الہدایہ ۱۸۵/۱

اور مسلمان بھی قسم کے لوگ ہیں، مجموعی اعتبار سے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خالص امر تعبدی ہے جس کی پابندی ضروری ہوتی ہے، اس پر کسی دوسرے امر کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں مولانا عبدالرزاق صاحب قاضی شریعت ضلع کٹیہار کی یہ بات کیا خوب ہے۔

”آٹھ مصارف کے بارے میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ان میں تین مال دار بھی ہو سکتے ہیں اور ایک زمانہ بنوی میں کا فر تھا جو عہد فاروقی میں القحط کر دیا گیا اور چار میں فقر و غیرو شریط ہے، سوچنے کی بات یہ ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف مال دار اور غریب کا فرد مسلمان متعناہ صفات والے ہیں۔ یہ بھائے خود دلیل ہے کہ مصارف صدقات واجبہ زکوٰۃ وغیرہ کا تعین انسان کے حیض اختیار سے باہر ہے،“

اس لیے ہمارے نزدیک مصارف زکوٰۃ قیاس شرعی کا محل ہی نہیں کیوں کہ امر تعبدی پر قیاس کرنا جائز نہیں۔

(۶) ظاہر ہے کہ یہ ضرورت بمعنی حاجت ہے نہ کہ ضرورت بمعنی المنظر۔ یہ صحیح ہے کہ حاجت کو بمنزلہ ضرورت بعض مواقع میں تسلیم کیا گیا ہے لیکن صرف ان ہی احکام میں جہاں کوئی نص قطعی موجود نہ ہو بلکہ نص عام ہو یا مسئلہ قیاسی و اجتہادی ہو اور مصارف زکوٰۃ نص صریح قطعی سے متعین کیے گئے ہیں، اس لیے ان میں کسی حاجت کو ذخیل بنانا نص کی مخالفت ہوگی جو جائز نہیں، شیخ مصطفیٰ احمد الزرقا، حاجت و ضرورت کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”أما الأحكام التي تثبت بناءً على الحاجة فهي لا تصادم نصاباً و

لكنها تخالف القواعد والقياس“ (۱)

اس لیے اکیڈمیوں، تنظیموں یا رفاہی اداروں کی یہ ضرورت چنداں اس حکم قطعی کو مس نہ کر سکے گی اور براہ راست صدقات واجبہ کی رقم ان میں خرچ نہیں ہو سکتی۔

وصلی اللہ علی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم وصحبہ

أجمعین



خلاصہ جملہ بات

محور اول، ملک تام

- ۱۔ ٹن کی زکوٰۃ بائع کے ذمہ ہے اور مبیع کی زکوٰۃ خریدار پر قبضہ کے بعد سے واجب ہوگی۔
- ۲۔ کرائے کی پیشگی رقم کرایہ دار کا دین قوی اس کی زکوٰۃ اس کے ذمہ پر لازم ہے۔ ادائے قبضہ کے بعد سابقہ کی بھی ہوگی۔
- ۳۔ حرام مال میں زکوٰۃ نہیں لیکن مخلوط ہونے کی صورت میں اگر علاوہ کوئی نصاب موجود ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔
- ۴۔ مدارس وغیرہ کے سرمائے پر زکوٰۃ نہیں۔
- ۵۔ دین قوی کی زکوٰۃ دائن کے ذمہ ہوتی ہے۔ ادائے گم از کم خمس نصاب پر قبضہ کے بعد کرے گا۔ مقرضین مال مٹول کرے تو قبضہ کے بعد زکوٰۃ فرض ہوگی۔
- ۶۔ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر قبضہ ہونے کے بعد سے زکوٰۃ ہوگی سابقہ کی نہیں۔
- ۷۔ کمپنی بہ حیثیت کمپنی پر زکوٰۃ نہیں بلکہ جو شرکا، مالک نصاب ہوں گے ان کے حصوں میں زکوٰۃ آئے گی۔
- ۸۔ شیر کی زکوٰۃ شیر ہولڈر کے ذمہ ہے، واقعی مالیت جو اس کی کمپنی میں ہے اس کی تفصیل دریافت کر کے اس کے مطابق زکوٰۃ دینی ہوگی تفصیل نہ ملنے پر بازاری نرخ معیار ہوگا، اور بونڈس دین قوی ہے قبضہ کے بعد سابقہ سالوں کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔
- ۹۔ اموال تجارت جو بھی ہوں ادائے گم کے وقت ان کی بازاری قیمت کے حساب سے زکوٰۃ نکالی جائے گی اور زمین کی متوقع قیمت فروخت کے حساب سے۔
- ۱۰۔ ہیرے جواہرات اگر تجارت کی غرض سے نہیں ہیں تو ان کی زکوٰۃ نہیں خواہ لاکھوں کی مالیت کے برابر ہوں۔
- ۱۱۔ حاجت اصلیہ کا تعین حالات و زمانے کے اعتبار سے ہوگا، مگر اس کا اثر وجوب زکوٰۃ پر نہیں پڑتا۔

سوالنامہ کا جواب

انہ، مولانا محمد نعیم الدین، جامعہ عربیہ اسلامیہ، کریم گنج، آسام

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى !

محور اول: زکوٰۃ کس قسم کے اموال میں واجب ہے؟

جواب:- مال نامی پر خواہ حقیقی ہو یا تقدیری، جو دین اور حوائج اصلیہ سے فارغ ہو، زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اور وہ تین قسم پر ہے:-

(۱) نقود (۲) سوائم (۳) اموال تجارت

کما فی طحطاوی علی مراثی الفلاح شرح نور الایضاح (ص ۲۹۹)۔ ہستی تعلیک
مال مخصوص لشخص مخصوص فرصت علی حر مسلم مکلف مالک
انصاب من نقد ولوتبرا او حلیا او آنیۃ او سیاوی قیمنہ من عروض
تجارت فارغ عن الدین و عن حاجة الأصلية نام ولوتقدیرا۔
وفی شرح الوقایۃ: "اعلم ان الزکوٰۃ لاتجب الا فی نام۔ الخ
وفی عمدة الرعاۃ: نام ای موصوف بالنماء تحقیقا وتقديرافانہ
لو وجبت الزکوٰۃ فی غیر نام لا کلت المال وافتنه وهو حرج عظیم وهو

موقوف عنا بنص القرآن۔

وفی عمدة الرعاية ايضا : حاصله ان الزكاة لا تجب فی مال وان بلغ مقدار النصاب وحال علیه الحال ايضا الا اذا وجد ثلاثة اشياء احدها الثمينة وهو ان يكون المال ثمن خلقه بان يكون مخلوقا لان يجعل ثمنًا وعوضًا فی العقود والتجارات وتشتري بها الاشياء وهو الذهب والفضة فتلتزم فيهما الزكاة كيف ما امكهما ولو للنفقة اذا حال عليها الحال وبلغ نصابا. ثانيها : السوم وهو فی الدواب التي تجب فيها الزكاة كالبحر والغنم والابل، فتلتزم فی الدواب الزكاة اذا كانت سائمة وان كان يعلمها فی بيته ويصرف عليها من عنده فلا زكاة عليها وان مضت عليه السنة وبلغت نصابا. وثالثها التجارة وهو فی غیر الثمن الخلق والدواب فلما عداها اذا كانت بنية التجارة تجب فيه الزكاة والافلا۔

وفی الجوهر^(۱) : اعلم ان شرائط الزكاة ثمانية، خمسة فی المالك وثلاثة فی المملوك، وهو ان يكون نصابا كاملا وحولا كاملا وكون المال اما سائمة او للتجارة۔

وفی فتح القدير^(۲) : ثم هي فريضة محكمة وسببها المال المخصوص اعنى النصاب النامي تحقيقا او تقديرا ولذا يضاف اليه فيقال زكاة المال۔

اموال زكاة واجب ہونے کے لیے جو شرائط ہیں ان میں پہلی شرط ملک تام ہے۔ ملک تام سے کیا مراد ہے؟ جواب :- ملک تام سے مراد وہ مال ہے جس میں ملکیت اور قبضہ دونوں ایک ساتھ پائے جائیں۔
کما فی کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعہ^(۳) : الملك التام ان يكون

العمال مملوكا في اليد فلو ملك شيئاً لم يقبضه فلا تجب فيه

الزكاة كصداق المرأة قبل قبضه فلا زكاة عليها فيه -

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے : (۱)

منها الملك التام وهو ما اجتمع فيه الملك واليد ، اما اذا وجد الملك

دون اليد كالصداق قبل القبض او وجد اليد دون الملك كملك المكاتب

والمديون لا تجب فيه الزكاة - كذا في السراج الوهاج -

وفي الجوهرة^(۲) : لان الملك التام هو ما اجتمع فيه الملك

واليد - واما اذا وجد الملك دون اليد كملك المبيع قبل القبض و

الصداق قبل القبض او وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون

لا تجب فيه الزكاة -

اس ذیل میں چند سوالات کے جوابات

جواب ۱: وجوب زکوٰۃ کی شرط ملک تام ہے یعنی ملکیت کے ساتھ قبضہ بھی ہونا ہے، چوں کہ صورت مسئولہ میں

یہ شرط مفقود ہے لہذا زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جب قبضہ ہو جائے گا تو صحیح قول کے مطابق دین قوی میں

شمار کر کے زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا۔

كما في البحر الرائق^(۳) : واطلق الملك فانصرف الى الكامل وهو الملك

رقبة وببد ، فلا تجب على المشتري فيما اشتراه للتجارة قبل القبض

ولا على المولى في عبده المعد للتجارة اذا بق لعدم اليد - الخ -

وفي فتح القدير^(۴) : ويخرج ايضا المشتري للتجارة اذا لم يقبض

حتى حال حول لازكوٰۃ فيه اذا لم يستغند ملك التصرف وكمال الملك

لكونه مطلقا للتصرف -

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے: (۱)

واما المبيع قبل القبض فقیل لا یكون نصابا والصحيح انه یكون نصابا

کذا فی محیط السرخسی -

جواب ۲: کرائے کی مدت میں دی گئی پیشگی رقم کی زکوٰۃ یا ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہو جانے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے ان صورتوں میں فقہاء و مشائخین کرام کے درمیان اختلاف رائے ہے بعض فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ دینا کرایہ دار اور مالک مکان دونوں پر احتیاطاً واجب ہوگی لیکن علامہ شامی کے قول کے مطابق صرف مشتری پر لازم ہوگی اور علامہ شامی کے قول کی تائید ہوتی ہے صاحب بدائع کے بعض مشائخ کے قول سے اور ذخیرہ کے قول سے بھی۔

کما فی خلاصة الفتاویٰ: (۲) الاجارة الطويلة التي يفعلها الناس فی زماننا فزكاة الاجرة المعجلة فی هذه الاجارة الطويلة تجب علی الأجير واما علی المستأجر فتجب ایضا ذکره الشيخ الاسلام محمد الاثمة السرخسی فی الجامع الكبير وعلی هذا فی المبيع الذی اعتاده اهل هذا الديار وهو البيع الذی وعد فیہ الوفاء ان زكاة ذلك علی البائع ان بقى فی يده و يجب ان يلزم المشتري ایضا. و فی الجامع للسید الامام ابی شجاع لازكاة علی المستأجر والاحتياط ان یزکی کل واحد منها۔

وفی البدائع: (۳) - وذكر الشيخ الامام ابوبکر محمد بن الفغل البخاری فی الاجارة الطويلة التي تعارفها اهل البخاری ان الزكاة فی الاجرة المعجلة يجب علی الأجير لانه ملكه قبل الفسخ وان كان يلحقه دين بعد الحول بالفسخ وقال بعض مشائخنا انه يجب علی المستأجر ایضا لانه يعده ذلك مالا موضوعاً عند الأجير۔

وفی رد المحتار علی الدر المختار^(۱)؛ قالوا ثمن المبیع وفاء ان بقی حولاً
فزکاتہ علی البائع لانه ملکہ وقال بعض المشائخ علی المشتري
لانه یعدہ مالا موضوعاً عند البائع فیواخذ بها عنده بدائع وذكر
فی الذخیرة ان زکاتہ علیہما للتعلیلین المذكورین قال ولیس هذا
ایجاب الزکاة علی شخصین فی مال واحد لان الدراهم لا تنقسم
فی العقود والفسوخ وهكذا ذکر فخر الدین البزدوی هذه المسئلة
ایضاً فی شرح الجامع اهـ ومثله فی البزازیة قلت ینبغي لزومها
علی المشتري فقط علی القول الذی علیہ العمل الآن من ان بیع الوفاء
منزل منزلة الرهن وعلیه فیكون الثمن دیناً علی البائع۔ تأمل۔

جواب ۳: دینی مدارس اور اداروں وغیرہ میں جمع ہونے والی رقم پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ کیوں کہ یہ مال موقوف
کے مانند ہے جو متولی یا مہتمم حضرات کے پاس بطور امانت رہتا ہے جن کا خود وہ حضرات مالک
ہونے کی حیثیت سے اپنی ذات کے لیے تصرف کرنے کا بالکل اختیار نہیں رکھتے ہیں۔ لہذا ثابت ہوا
کہ اس قسم کے جمع شدہ مال پر وجوب زکوٰۃ کی شرائط میں سے ملک تمام کی شرط مفقود ہے۔
کما فی کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعہ^(۲)؛ ولا زکاة فی المال
الموقوف لعدم الملك فیہ۔

وفی رد المحتار علی الدر المختار: (۳) فلا زکاة فی سواظم

الوقف والخیل العسيلة لعدم الملك الخ۔

جواب ۴: جو مال کسی شخص کے قبضہ میں بطور حرام آتا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ اگر حلال و حرام اموال مخلوط ہو گئے
ہوں کہ تمیز مشکل ہو جائے اس شرط پر کہ اس کے پاس اس مال مخلوط کے سوا دوسرا اتنا مال بھی پایا جاتا
ہو، جس سے مال مخصوب والا قرض وہ ادا کر سکے تو غاصب کا مال شمار کر کے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی
یعنی کسی کے پاس اپنا ذاتی مال پہلے سے تھا اس نے کسی دوسرے کا مال چھین کر اس طرح ملا لیا کہ

اب چھینا ہوا مال اس سے جدا نہیں ہو سکتا ہے امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ یہ منائع کر دینے کے حکم میں ہے اور اس پر اس مال غصب کا نادان لازم ہوگا لہذا وہ اس مال کا مالک بن گیا۔ لیکن اس ملا ہوا مال کے علاوہ اتنا مال کا وہ خود مالک ہونا ضروری ہوگا، جس سے اس نادان کو ادا کر سکے۔ اس صورت میں اس پر اپنا تمام مال کا زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہوگا ورنہ نہیں۔ صاحبین کے نزدیک غاصب مال مغموب کا کسی صورت میں مالک نہیں ہو سکتا ہے، لہذا زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

کما فی البحر الرائق: (۱) لو ان سلطانا غصب مالا و خلطه الخ۔ اعخلط بماله اذا لم یکن له مال و غصب اموال الناس و خلطها ببعضها فلا زکاة علیه لما فی القنیة لو کان الخبیث نصابا لا یلزمه الزکاة لان الكل و اوجب التصدق علیه فلا یفید ایجاب التصدق ببعضه ومثله فی البزازیة قال فی الشرنبلالیة وبه صرح فی شرح المنظومة و یجب علیها تفریغ ذمته برده الی اربابه ان علموا و الا الی الفقراء۔

وفی رد المحتار علی الدر المختار: (۲) ولو خلط السلطان المال المغصوب بعماله ملکه فیجب الزکاة فیه ویورث عنه لان الخلط استهلاك اذا لم یکن تميزه عند ابي حنیفة رد وقوله ارفق اذ قلما یخلو مال عن غصب وهذا اذا کان له مال غیر استهلكه بالخلط منفصل عنه یوفی دینہ والا فلا زکاة کما لو کان الكل خبیثا کما فی النهر۔

جواب ۵: دائن او مدیون کسی پر فی الحال زکوٰۃ واجب نہیں، چوں کہ زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ملک تمام شرط ہے حالانکہ ان دونوں میں سے کسی کو ملک تمام حاصل نہیں، دائن کی ملکیت ہے تو قبضہ نہیں اور مدیون کا قبضہ ہے تو ملکیت نہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ کے نزدیک دین تین قسم پر ہیں:

دین قوی قرض یا مال تجارت کا بدل ہے، جب نصاب پورا ہو جائے گا اور اس پر سال گزر جائے گا تو زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہو جائے گی، لیکن ادائے زکوٰۃ میں تاخیر کی جائے گی، وصول کے بعد ایام ماضی کی بھی ادا کی جائے گی یعنی جب وصول کرے گا تو ہر چالیس درہم پر ایک ایک درہم زکوٰۃ میں دے گا۔

دین متوسط، یعنی وہ مال تجارت کا بدلہ نہ ہو، بلکہ جانوروں کی قیمت یا خدمت کے غلام ہوں یا تو حوائج اصلیہ میں سے دوسری ملکیت کی چیز ہو تو دوسو درہم قبضہ میں آنے کے بعد زکوٰۃ لازم ہوگی اور سال کا حساب جس وقت فروخت کیا تھا اس وقت سے لگایا جائے گا، شامی نے اسی کو صحیح ترین قول فرمایا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قبضہ میں آنے کے بعد حولان حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ صاحب بدائع کی تحقیق کے مطابق یہی دوسرا قول صحیح الرواۃ قرار پایا۔

اور دین ضعیف وہ ہے جو مال کا بدل نہ ہو جیسے مہر، دیت، بدل خلع وغیرہ اس پر زکوٰۃ اس وقت لازم ہوگی جب اس قسم کے دین میں سے دوسو درہم پر مالک کا قبضہ ہو جائے گا اور اس کے بعد سے حولان حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

ان تمام تفصیلات سے یہ بات طے پائی کہ دین کے اقسام ثلاثہ میں سے دین قوی پر بعد القبض ایام ماضی کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اور دین متوسط کے دوسرے قول کو راجح قرار دے کر اور دین ضعیف ان دونوں قسم پر بعد القبض سے حولان حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اگر مدیون دین ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے اور وصول کی امید ہو تو بعد القبض ایام ماضی کی زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔ لیکن مدیون پر کسی حالت میں زکوٰۃ لازم نہیں ہوگی۔

کما فی رد المحتار (۱): اعلم ان الديون عند الامام ثلثة: قوی ومتوسط و
ضعیف۔ فتجب زکاتہا اذا تم نصابها و حال الحول لكن لا فوراً بل عند قبض اربعین
درهما من الدين القوی، كقرض و بدل مال تجارة فكلما قبض اربعین درهما
يلزمه درهم وعند قبض مائتين منه لغيرها ای من بدل مال لغير تجارة
وهو المتوسط كثمان سائمة و عبید خدمة و نحوهما مما هو مشغول

بجوانح الاصلية كطعام وشراب واملأك ويعتبر ما مضى من الحول قبل القبض في الاصح ومثله مالو ورث ديناً على رجل وعند قبض مأتين مع حولان الحول بعده اى بعد القبض من دين ضعيف وهو يبدل غير مال كمهر ودية وبديل كتابية وخلع الا اذا كان عنده ما يضم اليه الدين الضعيف كما مر - ولو برأ رب الدين المديون بعد الحول فلا زكاة سواء كان الدين قويا ولا خائفة وقيد في المحيط بالعسرا ما المؤسرفهوا استهلاك فليحفظ بحرقا في الشهر وهذا ظاهر في انه تقييد للاطلاق وهو غير صحيح في الضعيف كما لا يخفى -

وفي البدائع (١) : واما الدين الوسط فعاوجب له بدلا عن مال ليس للتجارة كضمن عبد الخدمة وضمن ثياب البذلة والمهنة وفيه روايتان عنه ذكر في الاصل انه تجب فيه الزكاة قبل القبض لكن لا يخاطب باداء مالهم يقبض مأتى درهم فاذا قبض مأتى درهم زكى لما مضى وروى ابن سماعه عن ابي يوسف عن ابي حنيفة انه لا زكاة فيه حتى يقبض المأتين ويحول عليه الحول من وقت القبض وهو اصح الروايتين عنه -

وفي البدائع (٢) : ومال ابن السبيل مقدور الانتفاع به في حقه بيد نائبه وكذا المدفون في البيت لانه يمكن الوصول اليه بالنميش بخلاف المفازة لان النميش كل الصحراء غير مقدور له وكذا الدين المقرب اذا كان مقرمليا فهو ممكن الوصول اليه الخ -

وفي رد المحتار (٣) : ولو كان الدين على مقرملى او على معسر مطلق اى محكوم بافلاسه او على جاحد عليه بيينة وعن محمد لا زكاة

وهو الصحيح ذكره ابن مالك وغيره لان البيئنة قد لا تقبل او علم

به قاض سيجئ ان المفتى به عدم القضاء بعلم القاضى فوصل

الى ملكه لزوم زكاته ماضى۔

جواب ۵۱۔ پراڈیٹنٹ فنڈ کی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں، کیوں کہ پراڈیٹنٹ فنڈ میں جو رقم جمع ہوتی ہے ظاہر ہے کہ یہ دین قوی میں سے نہیں اس لیے کہ یہ قرض نہیں ہے اور کسی مال تجارت کا بدل بھی نہیں۔ اسی طرح دین متوسط بھی نہیں اس لیے کہ یہ کسی جانور کی قیمت یا خدمت کے غلام اور حوائج اصلیہ میں سے کسی چیز کا بدلہ بھی نہیں ہے تو لامحالہ یہی ماننا پڑا کہ یہ دین ضعیف میں شامل ہوگا کیوں کہ وہ کسی چیز کا بدلہ نہیں، بلکہ یہ رقم ملازم کے ماہانہ حقوق میں سے ایک حصہ جمع کر کے رکھ لیا جاتا ہے جو ایام ملازمت کے اختتام پر اس کو واپس دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ اور عطیہ بھی ملتا ہے۔ کچھ حصہ کا وہ خود مالک تھا لیکن قبضہ نہیں تھا۔ اب جب سے ملک تام حاصل ہوگا اس وقت سے حساب کر کے حوالان حول پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ کما مر دلیلہ۔

دوب زکوٰۃ کی دوسری شرط نماز نما کی حقیقت اور اس کی صورتیں

نما دو طرح ہوتا ہے۔ حقیقی یا تقدیری یعنی دوجوب زکوٰۃ کے لیے جو مال ہو وہ بڑھنے والا ہو، خواہ وہ تقدیراً بڑھنے والا ہو، یعنی مالک اپنا مال قبضہ کے ساتھ اس کے بڑھانے پر قدرت رکھتا ہو اگرچہ وہ اپنے نائب اور قائم مقام کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔ یا حقیقۃً یعنی توالد و تناسل اور تجارت کے ذریعہ مال کو بڑھانا ہو۔

كما فى البحر الرائق (۱) والنماء فى اللغة بالمد الزيادة والقصر

بالهمزة خطأ، يقال نما المال ينمى نماء وينمو نمواً وانما الله

كذا فى المغرب - وفى الشرع هو نوعان، حقيقى وتقديرى فالحقيقى

الزيادة بالتوالد والتناسل والتجارات - والتقديرى نماء

الزيادة بكون المال فى يده او بد نائبه فلا زکوٰۃ على من لم يتمكن

حاجت اصلیه کی تعریف اور اس کا دائرہ

ابن مالکؒ نے حاجت اصلیه کی تعریف اس طرح کی ہے کہ مالک اس کے ذریعے اپنے اوپر سے ہلاکت کو دور کرے، خواہ وہ حقیقتہً ہو جیسے اپنے استعمال کے کپڑے اور دوسری وہ تمام اشیا جن کے اوپر ٹیک لگاتا ہوا وہ اپنی زندگی بسر کرے۔ یا تقدیراً جیسے اپنے اوپر کسی کا حق دینا ہے۔

حوائج اصلیه کے دائرہ میں یہ تمام اشیا داخل ہیں

روزمرہ کے اخراجات، رہنے کا مکان، لڑائی کے آلات، جاڑے گرمی کے کپڑے، پیشہ دروں کے اسباب و آلات، سواری کے جانور، اہل علم کی کتابیں۔

کما فی رد المحتار علی الدر المختار (۱): (قوله وفارغ عن حاجة الأصلية) إشارة إلى أنه معطوف على قوله عن دين (قوله وفسره ابن مالك) أي نسر المشغول بالحاجة الأصلية والاولى نسرهما وذلك حيث قال وهي ما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقاً كالنفقة ودور السكنى وآلات العرب والثياب المحتاج إليها لدفع الحرا والبرد۔ أو تقدیراً كالدين فان المدينون محتاجون إلى قضاءه بما في يده من الثياب دفعا عن نفسه الحبس الذي هو كالهلاك وكآلات الحرفة وآثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لاهلها۔

جواب ۱: کتب فقہ سے جہاں تک پہنچتا ہے کہ حوائج اصلیه کا اطلاق کسی زمان، مکان اور اشخاص کے ساتھ محدود اور مقید نہیں، لہذا ہر دور و ماحول کے تغیر تبدیل کا اعتبار کیا جائے گا، اور اس صورت مسئلہ کو سفر حج کے ”راہلہ“ پر بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔

کما فی رد المحتار علی الدر المختار (۱)، (قرنه المحارۃ) اسے معتبر فی کل
ما یلیق بحالہ عادۃً وعرفاً فمن لا یقدر الا علیہا اعتبر فی حقہ بلا
ارتیاب وان قدر بالمحمل او المقتب فلا یعذر ولو کان شریفاً او ذا ثروة۔ اھ
وفی کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ (۲) الحنفیۃ: قالوا۔ الاستطاعۃ
ہی القدرة علی الزاد والراحلة الخ ویمتبر فی الراحلة ما یلیق
بالشخص عادۃً وعرفاً۔ ویختلف ذلک باختلاف احوال الناس۔

چوتھی شرط: دین سے محفوظ ہونا۔ کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے، دین کی قسمیں اور ان کے احکام

جواب:۔ دین تین قسم پر ہے۔ مال زکوٰۃ کا نصاب اس دین سے زائد ہو جس کا بندوں میں سے کوئی مطالبہ کا حق رکھتا ہو۔

اول:۔ وہ دین خالص اللہ کا ہو، جیسے زکوٰۃ و خراج کہ اس دین کا مطالبہ کا حق خلیفۃ المسالین کے عامل کو ہوتا ہے۔

دوم: وہ دین خالص بندہ کا ہو، جیسے بطور کفالت ہو یا وہ میعادی قرض ہو، اگرچہ وہ اس کی بیوی کا ہر مہل ہو، جس کا موت یا طلاق کے وقت ادا کرنا ضروری ہوتا ہو یا اس کے ذمہ قرض ایسا نفقہ ہو جو اس پر قاضی کے فیصلہ کی وجہ سے یا یا ہم رضا مندی سے لازم ہو چکا ہو، سوم: وہ دین خالص اللہ کا ہو، جیسے نذر، کفارہ اور حج کے دین لیکن بندوں میں سے کوئی دنیا میں طلب کرنے والا نہیں ہے۔

قسم اول و دوم دین مانع زکوٰۃ ہے اور قسم سوم مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔

کما فی کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ (۲): الحنفیۃ قالوا ینقسم
الدین بالنسبۃ ذلک الی ثلاثۃ اقسام۔ اول ان یکون دیناً خالصاً
للعبد الثانی ان یکون دیناً للہ تعالیٰ ولکن لہ مطالب من جهة العباد

(۱) کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۲۳۲/۱ (۲) ایضاً ۵۹۳/۱

کدین الزکوۃ والمطالب هو الامام فی الاموال الظاهرة وهي السوائم
وما يخرج من الارض او ثائب الامام فی الاموال الباطنة وهو اموال التجرة
كالذهب والفضة. وثائب الامام هم الملاك لان الامام كان يأخذها
الى زمن عثمان رضي الله عنه ففوضها عثمان الى اربابها فی الاموال
الباطنة. الثالث ان يكون ديناً خالصاً لله تعالى ليس له مطالب
من جهة العباد كديون الله تعالى الخاصة من نذور وكفارات وصدقة
فطرو نفقة حج۔ فالدين الذي يمنع وجوب الزکوۃ هو دين القسمين
الاولين اما القسم الثالث فانه لا يمنع وجوب الزکوۃ۔

جواب علم: زراعت یا تعمیر مکان وغیرہ کے لیے اگر میعادی قرض لیا جائے وجوب زکوۃ کے لیے اموال زکوۃ
سے سالانہ واجب الادا قسط کو وضع کر کے باقی اموال پر زکوۃ واجب قرار دی جائے گی۔ کیوں کہ
اس وقت دائن کی طرف سے پورے قرض کو ادا کرنے کے لیے مدیون پر مطالبہ نہیں۔ لہذا جب زکوۃ
ادا کرنے کا وقت ہوگا اس وقت جو قسط واجب الادا ہوگی، اسی کو وضع کر کے حساب لگایا جائے
گا۔ اور اس کو مہر موصل پر قیاس کیا جائے گا، جس کو زوج فی الفور ادا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے
لہذا وہ عدم مطالبہ کی وجہ سے مانع زکوۃ میں محسوب نہیں ہوگا۔

جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: (۱۱)

ومنها الفراغ عن الدين قال اصحابنا رحم الله كل دين له مطالب من
جهة العباد يمنع وجوب الزكاة سواء كان الدين للمعياد كالقرض وثمن
المبيع وضمان المتلفات وارث الجراحة وسواء كان الدين من النقود او
المكيل او الموزون او الثياب او الحيوان وجب بخلع او صلح عن دم ممد
وهو حال او مؤجل وذكر البزدوي في شرح الجامع الكبير
قال مشائخنا رحمهم الله في رجل عليه مهر مؤجل لامرأته وهو

لایرید اداؤہ لایجعل مانعا من الزکاة لعدم المطالبة فی العادات
وانه حسن ایضا هکذا فی جواهر الفتاوی۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

احناف کے نزدیک مال مشترک میں زکوٰۃ واجب نہیں یعنی ہر شخص کا جدا جدا مال نصاب کو نہ پہنچے
مگر جب شرکا کا مال ملا یا جائے تو نصاب پورا ہو جاتا ہے اور الگ الگ شریک کا مال نصاب کو پہنچ جائے تو
ہر ایک پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ الغرض اس قسم کے مال مشترک میں ہر ایک شخص پر اپنے شریک کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب
ہوگی۔ کما فی رد المحتار علی الدر المختار (۱)

لا تجب الزکاة عند نافی نصاب مشترک من سائمة و مال تجارة وان
صحت الخلطة فيه باتحاد اسباب الاسامة التسعة التي يجمعها او من
من يشفع و بيانه فی شرح المجمع وان تعدد النصاب تجب اجماعاً
و يتراجعان بالحكم و بيانه فی الحاوی بلغ نصيب احدهما نصاباً زكاه
دون الآخر ولو بينه وبين ثمنين رجلاً ثمانون شاة لاشئ عليه
لانه مما لا يقسم خلافاً للثاني۔ سراج۔

ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ

ہیرے موقی جواہرات چاہے جتنی قیمت کی ہو، تجارت کی اگر نیت نہ ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ اس لیے
کہ پیدائش کے اعتبار سے ثمن میں شمار نہیں۔ اسی طرح اگر مال جمع کرنے کی غرض سے خرید کیا تھا پھر نفع حاصل
کرنے کے خیال سے بیچ ڈالا تب بھی اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ ایسا ہی اگر عورتوں نے زینت و آرائش کی غرض سے
زیورات کے طور پر استعمال کیا تب بھی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

کما فی کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۱۲۱۔ وکذا لا تجب فی الجواهر

كاللؤلؤ والياقوت والزبرجد ونحوها اذا لم تكن للتجارة باتفاق المذاكر
وفى رد المحتار على الدر المختار: (۱) ولا زكاة للآلى والجواهر
وان ساوت العا اتفاقا الا ان تكون للتجارة -

وفى الطحاوى على مراقى الفلاح: (۲) - ولا زكاة فى الجواهر
واللآلى الا ان يملكها بنية التجارة كسائر العروض (قوله ولا زكاة
فى الجواهر واللآلى) قال فى الدر الاصل ان ما عدا الحجرين والسوالم
انما يركب بنية التجارة عند العقد - فلو نوى التجارة بعد العقد او
اشترى شيئا للقنية ناويا انه وجد ربحا باعه لا زكاة عليه اهـ
ملخصا -

وفى الجوهرة: (۳) - واما الياقوت واللآلى والجواهر
فلا زكاة فيها وان كانت حليا الا ان تكون للتجارة -

اموال تجارت پر زکوٰۃ

تجارت کا سامان جس کی قیمت نصاب کو پہنچتی ہو زکوٰۃ واجب ہے، یعنی جس طرح نقد میں زکوٰۃ واجب
ہے اسی طرح تجارتی اراضی پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن خراجی زمین میں تجارت کی نیت صحیح نہ ہوگی، کیوں کہ زکوٰۃ
کا دوبارہ دینا لازم آتا ہے۔

اختتام سال پر زکوٰۃ نکلانے کے وقت بازار کا جو نرخ ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور چوں کہ زکوٰۃ مجموعی
نصاب پر واجب ہوگی، اس لیے تھوک کے بھاؤ کا اعتبار کرنا مناسب تھا، لیکن زکوٰۃ نکلانے میں نفع فقیر کا لحاظ مطلوب
ہے اس وجہ سے پسٹک فروختگی کا اعتبار کیا جائے گا۔

کما فى رد المحتار على الدر المختار: (۴) - وفى عرض تجارة قيمته نصاب
بجمله صفة عرض وهو ما ليس ينقد واما عدم صحة النية فى

نحو الارض الخراجية فليقام المانع كما قدمنا لان الارض ليست من العروض
 فتنبه - (قوله لان الارض الخ) رد على ما في الدرجيت اجاب عما اورده في
 بان الارض ليست من العروض بناء على ما نقله عن الصحاح قال في البحر
 وهو مردود لما علمت من ان الصواب تفسيره هنا بما ليس بنقد اهـ
 وايضاً - وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقال يوم الاداء وفي السوائم
 يوم الاداء اجمالاً وهو الاصح ويقوم في البلد الذي المال فيه ولو في مفازة
 ففي اقرب الامصار اليه - فتح - (قوله وهو الاصح) اي كون المعتبر في
 السوائم يوم الاداء اجمالاً هو الاصح فانه ذكر في البدائع انه قيل ان
 المعتبر عنده فيها يوم الوجوب وقيل يوم الاداء اهـ
 وفي المحيط، يعتبر يوم الاداء بالاجماع وهو الاصح اهـ فهو
 تصحيح للقول الثاني الموافق لقولهما وعليه فاعتبار يوم الاداء يكون
 متفقا عليه عنده وعندهما -

شیرز اور پونڈس کی زکوٰۃ

کپنی کے شیرز تین قسم کے ہوں گے۔

- (۱) کپنی ذریعہ آمدنی کے لیے کوئی چیز خرید کر لیتی ہے اور اسی کے استعمال سے نفع حاصل کرتی رہتی ہے
 تو اس صورت میں صرف منافع پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اصل سرمایہ پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اس لیے کہ وہ
 ذریعہ معاش اور حوائج اصل کی چیزیں بن گئی ہیں، جس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔
- (۲) ایسی کپنی جو شیرز کے رویوں سے تجارت کرتی رہتی ہے اس صورت میں اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر
 زکوٰۃ واجب ہوگی، کیوں کہ وہ تجارتی رقم ہے اور تجارتی رقم میں اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر زکوٰۃ واجب
 ہوتی ہے۔

(۳) شیرز ہولڈرس، شیرز خرید و فروخت کرنے کو ایک تجارتی پیشہ سالیوںے تو اختتام سال پر بہ وقت ادائے زکوٰۃ مارکیٹ میں اس شیر کا جو نرخ ہے اس کا اعتبار کیا جائے گا۔
 شیرز اور بونڈس پر تجارتی سرمایہ کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی اور یہ دین قوی میں شامل ہوگی۔
 اس وجہ سے بعد القبض گزرے ہوئے سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگی، جیسا کہ مذکورۃ الصدر اولہ سے مستفاد ہے
 وفي رد المحتار على الدر المختار (۱)؛ وثمانية المال كالدرهم والدنانير
 لتعيينها للتجارة باصل الخلقة فتلزم الزكاة كيف ما امسكها ولو
 للنفقة۔

وفي كتاب الفقه على المذاهب الاربعہ (۲) الحنفية قالوا
 الاوراق المالية، البنکوت، من قبيل الدين القوی الا انها يمكن
 صرفها فضة فوراً فتجب فيها الزكاة فوراً۔

محورثانی نصاب زکوٰۃ

نصاب زکوٰۃ کے سلسلہ میں سامان تجارت کی قیمت سونا یا چاندی کا نصاب جس سے حساب لگانے سے فقیر کا نفع زیادہ ہو اسی کی قیمت سے حساب لگایا جائے گا۔ مثلاً مال تجارت کی قیمت اگر چاندی کے نصاب سے لگائی جاتی ہے تو زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اور اگر سونے کے نصاب سے قیمت لگائی جاتی ہے تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، تو اس صورت میں چاندی کے نصاب سے قیمت لگائی جائے گی، اس لیے کہ اس میں فقراء کا فائدہ ہے۔ اسی طرح اگر کسی کے پاس کچھ سونا اور کچھ چاندی موجود ہو تو اس صورت میں دونوں کی قیمت نکال کر چاندی کے نصاب کو اصل قرار دے کر اس نصاب کے برابر اگر قیمت ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔

كما في رد المحتار على الدر المختار (۳)؛ ولو بلغ باحد هما نصابا دون
 الآخر تعين ما يبلغ به ولو بلغ باحد هما نصابا وخمساً وبالآخر
 اقل قومه بالانفع للفقراء۔ سراج۔

(۱) رد المحتار على الدر المختار ۱/۲ (۲) کتاب الخفۃ على المذاهب الاربعہ ۲/۱ (۳) رد المحتار على الدر المختار ۲/۲

وفی خلاصة الفتاویٰ^(۱) : والفلوس والدراهم الموهمة علی هذا
 لزكاة فیها الا ان تكون للتجارة وقيمتها تبلغ نصابا كذا روى الكرخي
 عن ابی حنيفة رحمہ اللہ واصل هذا ان الذهب يضم إلى
 الفضة لتكميل النصاب عندنا استحصانا والضم
 عند ابی حنيفة رحمہ اللہ باعتبار القيمة وعندهما باعتبار الاجزاء حتى
 لو كان احدهما ثلث النصاب لا بد ان يكون الآخر ثلثي النصاب
 وغير الذهب والفضة انما يكون مال الزكاة اذا كان معد للتجارة
 ويعتبر النصاب فیها بالقيمة ان شاء قومها بالذهب وان شاء
 قومها بالفضة وعن ابی حنيفة رحمہ اللہ انه يقوم بما هو لانفع للفقراء -
 وفي كتاب المبسوط^(۲) ثم عند ابی حنيفة رحمہ اللہ يعتبر فی التقويم
 منفعة الفقراء كما هو اصله حتى روى عنه انه اذا كان للرجل مائة
 وخمسة وتسعون درهما ودينار يماوى خمسة دراهم انه تجب
 الزكاة وذلك بان يقوم الذهب بالفضة وابو حنيفة رحمہ اللہ
 يقول هما عینان وجب ضم احدهما إلى الآخر لا يجاب الزكاة فكان
 الضم باعتبار القيمة كعروض التجارة وهذا لان كمال النصاب لا يكون
 الا عند اتحاد الجنس وذلك لا يكون الا باعتبار صفة المالية دون العین
 فان الاموال اجناس باعتبار اعيانها جنس واحد باعتبار صفة المالية
 فیها -

محرر ثالث مصارف زکوة

جواب ۱: مصارف زکوة کی آٹھ قسموں میں سے پہلی قسم فقراء کی ہے، یعنی مسلمان محتاج کو اس مال کا مالک

بنادینا جس کا نکالنا مشرعا معلوم ہے، اس شرط کی بنا پر اگر ناظم یا مہتمم مدرسہ مستحقین زکوٰۃ طلبہ کو اپنی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے رقم یا چیک بطور تملیک دے دیں گے اور وہ وصول کر کے اپنے ذمہ جو دین ہے وہ ادا کریں گے تو زکوٰۃ کی ادائے کی ہو جائے گی۔ یا تو مستحقین زکوٰۃ طلباء سے مدرسہ میں داخلہ لیتے وقت مہتمم مدرسہ ان کی طرف سے زکوٰۃ کا روپیہ قبول کر کے ان کی ضروریات میں خرچ کرنے کا تحریری وکالت حاصل کر لیں گے تو مہتمم مدرسہ مذکوٰۃ سے ادا کر سکیں گے ورنہ عدم تملیک کی وجہ سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ کما مر دلیل۔

لہذا مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان اور فقراء و مستحقین زکوٰۃ دونوں کی طرف سے بہ حیثیت وکالت مختار کل بن جائیں گے اور ایسا ہی ایک آدمی دونوں طرف سے وکیل بن سکتے ہیں۔ ہدایہ میں ہے،

الواحد يتولى طرفى النكاح -

اور در مختار میں ہے،^{۱۱}

ولو خلط زكاة موكله من وكان متبرعا الا اذا وكله الفقراء -

جواب ۲: (الف) مدارس اسلامیہ کے معلمین اور سفراء کی اجرت اپنے اعمال کے تناسب سے بطور کمیشن دینے کے جواز کی کوئی دلیل کتب فقہ کی کتاب الاجارہ میں میری نظر سے نہیں گزری۔ بلکہ اس طریقہ کے عدم جواز کی دلیل ملتی ہے۔

معارضت اور مزاحمت پر چندہ کے کمیشن کا قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، اس لیے کہ معاربہ میں رب المال اس المال کو دیتا ہے اور معارب تجارت کرتا ہے اور چندہ کی صورت میں مہتمم یا ناظم مدرسہ معلم کو کوئی ملکیت کی چیز سپرد نہیں کرتا ہے۔

اسی طرح مزارعہ میں بھی رب الارض اپنی ملکیت کی زمین حوالہ کرتا ہے اور تحصیل میں ایسی کسی چیز کی ملکیت سپرد نہیں کی جاتی ہے، لہذا ان دونوں پر قیاس کر کے معلمین مدرسہ کے لیے کمیشن کو جائز نہیں قرار دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں فقہاء کرام مزاحمت کے جواز کو مزارعہ ہی کے ساتھ محدود کر دیا اور اس کا جواز خلاف قیاس ہونے کی وجہ سے اور کسی چیز کا مقیس علیہ نہیں بن سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ معلمین مدرسہ کو اپنے کسب کے تناسب سے اسی سے اجرت دینا جائز نہیں، اس لیے

کہ اس صورت میں اجرت الاجیر عن عملہ لازم آتی ہے اور اسی کو اجارۃ فاسدہ میں شمار کیا گیا۔ دوسری ایک اور نظیر ہدایہ جلد رابع کتاب الاضمییر میں ملتی ہے:

ولا يعطى اجرا لجزار من الاضحیة لقوله عليه السلام لعلي تصدق

بجلالها وخطامها ولا تعط اجرا لجزار منها شيئا - متفق عليه -

(ب) شرعی عامل زکوٰۃ تو وہ ہوتا ہے جس کو امام یعنی امیر المؤمنین یا خلیفۃ المسلمین زکوٰۃ، عشر اور خراج وصول کرنے کے لیے مقرر کرتے ہیں۔

کما فی البدائع (۲) :- والعاملین علیہا فہم الذین نصبہم الامام

بجباية الصدقات -

وفی کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعۃ (۳) : والعامل هو الذی

نصبہ الامام لآخذ الصدقات والعشور فیاخذ بقدر ما عمل -

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کے ہتم صاحب کا مقرر کردہ عامل یا سفیر العاملین علیہا کے تحت داخل نہیں مانا جائے گا کیوں کہ وہ امام یا خلیفۃ المسلمین کی طرف سے منتخب کردہ نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ شرعی عامل کی کوئی اجرت امام یا خلیفۃ المسلمین کی طرف سے مقرر نہیں ہے بلکہ جو کچھ ان کو دیا جاتا ہے بطور کفایہ دیا جاتا ہے، اور ہتم مدرسہ کی جانب سے جو عامل مقرر ہوتے ہیں ان کی خاص ایک اجرت اور تنخواہ مقرر ہوتی ہے۔ لہذا حقیقت میں وہ والعاملین علیہا کے تحت داخل نہیں مانے جائیں گے اور ان کی اجرت بھی مدر زکوٰۃ سے نہیں دی جائے گی۔

کما فی شرح النقایۃ - (۴) ، فیعطی بقدر عملہ اے ما یکفیہ ولا عوانہ

ذہابا وایا ہا لانہ فترغ نفسہ لعمل من امور المسلمین لیستحق

الکفایۃ -

وکذا فی البدائع (۵) :- انما یتحق بعملہ لکن علی سبیل

(۱) ہدایۃ کتاب الاضحیہ ۳۳۳/۲ (۲) البدائع ۳۳۲/۲ (۳) کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعۃ ۶۲۱/۱

(۴) شرح النقایۃ ۱۶۱/۱ (۵) البدائع ۳۳۲/۲

الكفاية له ولاعوامته لاعلى سبيل الاجرة لان الاجرة مجهولة اما
عندنا فظاهرا لان قدر الكفاية له ولاعوامته انه غير معلوم وكذا
عنده لان قدر ما يجتمع من الصدقات بجبابية مجهول فكان ثمنه
مجهولا لامحالة وجهالة احد البدلين يمنع جواز الاجرة فجهالة
البدلين جميعا اول فذل ان الاستحقاق ليس على سبيل الاجرة
بل على طريق الكفاية له ولاعوامته -

تیسری وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کو اخذ کرنے کا حق امیر المؤمنین یا خلیفۃ المسلمین کا ہے۔ وہ اپنا عامل بھیج کر زکوٰۃ
وصول کر سکتا ہے۔ اب اگر عامل کے ہاتھ زکوٰۃ کا مال ہلاک ہو جائے صاحب نصاب کی جانب سے واجب ساقط
ہو جائے گا، لیکن اگر صاحب مال عامل کے ہاتھ پر زکوٰۃ نہ دے کر فقیر کو دے دے گا تو ان کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔
بلکہ وہ نفل صدقہ ہو جائے گا۔ امیر کا عامل آنے پر دوسری مرتبہ ان کو زکوٰۃ دینی پڑے گی۔ اور اسی کو زکوٰۃ میں شمار
کیا جائے گا۔ لیکن مدرسہ کی جانب سے جو عامل مقرر ہوتے ہیں ان کے ہاتھ سے اگر مال زکوٰۃ ہلاک ہو جائے، تو
صاحب نصاب سے واجب ساقط نہیں ہوگا، بلکہ فقیر کی تملیک کے بعد واجب ساقط ہوگا۔

كما في فتح القدير (۱)، وفي الفصل الرابع وهو ما اذا قال اديت بنفسى
الى الفقراء ففى المصروف لا يصدق وان حلف وقال الشافعى يصدق،
لانه اوصل الحق الى المستحق ولنا ان حق الأخذ للسلطان فلا يملك
ابطاله بخلاف الاموال الباطنة. (قوله لنا ان حق الأخذ للسلطان)
يمكن ان يضمن منع كونه اوصل الى المستحق بل المستحق
الامام والحق ان الامام مستحق الأخذ والفقير مستحق التملك والانتفاع
فحاصله ان هناك مستحقين فلا يملك ابطال حق واحد منهما ثم
قيل زكاة هو الاول والثانى سياسة وقيل هو الثانى والاول ينقلب
نفلا وهو الصحيح.

وفى البدائع (۱) :- ولو قال ادیت زکاتہا الی الفقراء لا یمصدق وتؤخذ
منہ عندنا وعند الشافعی لا تؤخذ۔ وجہ قولہ ان المصدق لا یأخذ
الصدقة لنفسه لیوصلها الی مستحقها وهو الفقیر وقد ارسل بنفسه
ولنا ان حق الأخذ للسلطان فهو بقوله ادیت بنفسی اراد ابطال حق
السلطان فلا یملك ذلك وكذلك العشر علی هذا الخلاف۔

وفى البحر الرائق (۲) ، ویسقط الواجب عن ارباب الاموال لو هلك

المال فی میده لان میده کید الامام وهو نائب عن الفقراء ولا تكون مقدرة۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ سلطان کا عامل اگر کسی مزارع سے خراج وصول کرنا چھوڑ دے سلطان کے علم کے
بغیر تو اس کے لیے ایسا کرنا حلال ہے جیسا کہ سلطان کسی کا خراج چھوڑ سکتا ہے لیکن مدرسہ کی جانب سے مقرر کردہ
عامل کو یہ حق نہیں ہے۔

کما فی البحر الرائق (۳) : ومن احکام العامل ما ذکره فی البزازیة ان

العامل اذا ترك الخراج علی المزارع بدون علم السلطان یحل له ولو مصرفا

کالسلطان اذا ترك الخراج له۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ عامل شرعی کے لیے چند شرائط ہیں جیسے آزاد غلام نہ ہو، مسلمان ہو، کا فر نہ ہو،
غیر ہاشمی نہ ہو۔ یہ قدرت ہو کہ وہ تجارت کے مالوں کو چور اور ڈاکو سے بچا سکے کیوں کہ تاجروں سے عشر اس لیے
لیا جاتا ہے کہ حکومت ان کے مال کی حفاظت کرتی ہے۔ امام یا خلیفۃ المسلمین ان تمام شرائط کے مد نظر عامل کے
تقرر کا حق رکھتے ہیں۔

ان شرائط میں سے اگر کوئی ایک بھی شرط مفقود ہوگی تو اس کو شرعی عامل نہیں قرار دیا جائے گا، حالانکہ
مدرسہ کی جانب سے اس قسم کا عامل مقرر کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ تو پھر شرعی مصرف میں شامل
کر کے مد زکوٰۃ سے اس کو کیا دیا جائے گا۔ جیسا کہ شامی نے ذکر کیا ہے :

وفى البدائع (۴) ، واما شرط ولاية الأخذ فانواع - منها وجود الحماية

من الامام حتى لو ظهر اهل البفس على مدينة من مدائن اهل
العدل وقريبة من قراهم وغلبوا عليها فاخذوا صدقات سواشعهم
وعشور ارضيهم وخراجها ثم ظهر عليهم اما العدل لا يأخذ منهم
ثانيا لان حق الاخذ للامام لاجل العفظ والحماية ولم يوجد الا انهم
يفتون فيما بينهم وبين ربهم ان يؤدوا الزكاة والعشور ثانيا.....

ومنها وجوب الزكاة..... ومنها ظهور العمال وحضور المالک-

چھٹی وجہ یہ ہے کہ اس بات میں سب متفق ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صاحب انصاب
خود بخود زکوٰۃ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا دیتے تھے اور عاملین کے ذریعہ سے بھی جمع کر لیتے تھے۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین کے دور میں بھی یہ نظام باقی رہا۔ لیکن حضرت عثمانؓ کے
دور خلافت میں انھوں نے اموال باطنہ کو صاحب مال کے حوالہ کر دیا اور یہ اموال تجارت اور سونا چاندی ہیں
اس کے بعد جب خلافت سلطنت سے بدل گئی اور امراء سلطنت پر صحابہ و تابعین
وغیرہ اہل علم حضرات کا اعتماد کم ہونے لگا تو دین کے ایک اہم رکن کی ادائیگی کا ذمہ دار امراء کو قرار
دینے میں ان حضرات کا اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض حضرات شرعی نظام کی خاطر اس کو ان کے ہاتھ میں
دینے کے قائل ہو گئے اور بعض حضرات ان سے حلف لے کر دینے کے قائل ہوئے کہ وہ شرعی طور پر اس امانت کو
صحیح مصرف میں رکھیں گے۔ اس لیے کہ زکوٰۃ اسلام کے بنیادی ارکان خمسہ میں سے ایک اہم رکن ہے،
اگر اس کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے پورے پورے طریقہ پر ادا نہیں کیا جائے گا تو اموال کی
زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی نہ دینے والوں میں شمار ہو کر دوزخ میں جانے کا ایک سبب بن جائے گا۔ بنا بریں
مدارس کے ذمہ دار حضرات تحصیل زکوٰۃ کے لیے جو سفر بھیجتے ہیں ان کو والعاملین علیہا کے تحت عامل قرار
دے کر مد زکوٰۃ سے ان کی تنخواہ نہیں دی جائے گی۔

وفی عمدة القاری شرح بخاری (۱): الحادی عشر قوله (تؤخذ من

اغنیاء هم) دلیل علی ان الامام یرسل السعاة الی اصحاب الاموال

لقبض صدقاتهم وقال ابن المنذر اجمع اهل العلم على ان الزكاة كانت ترفع الى رسول الله صلى الله عليه وسلم وإلى رسله وعماله وإلى من امر بدفعها اليه واختلفوا في دفع الزكاة إلى الامراء فكان سعد بن ابى وقاص وابن عمر وابو سعيد الخدرى وابو هريرة وعائشة و الحسن البصرى والشعبى ومحمد بن على وسعيد بن جبيرة وابورزين والاوزاعي والشافعى يقولون تندفع الزكاة إلى الامراء. وقال عطاء يعطيهم اذا وضعوها مواضعها. وقال طائفة لا يدفع اليهم اذا لم يضعوها مواضعها. وقال الثورى احلف لهم وعدهم واكذبهم ولا تعطهم شيئا اذا لم يضعوها مواضعها.

وفى البدائع (۱): قوله ان الذى يعطى للعامل اجرة عليه ممنوع وقد بينا فساد ما حديث على في فلاحه فيه لان فيه انه فرمى له وليس فيه بيان المفروض انه من الصدقات او من غيرها فيحتمل انه فرض له من بيت المال لانه كان حاضر. الله اعلم.

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب تفسیر معارف القرآن میں فرماتے ہیں کہ

”فائدہ: تفصیل مذکور سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آج کل جو اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم یا ان کی طرف سے بھیجے ہوئے سفیر صدقات، زکوٰۃ وغیرہ مدارس اور انجمنوں کے لیے وصول کرتے ہیں ان کا وہ حکم نہیں جو عاملین صدقہ کا اس آیت میں مذکور ہے کہ زکوٰۃ کی رقم میں سے ان کی تنخواہ دی جاسکے، بلکہ ان کو مدارس اور انجمن کی طرف سے جدا گانہ تنخواہ دینا ضروری ہے، زکوٰۃ کی رقم سے ان کی تنخواہ نہیں دی جاسکتی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فقراء کے وکیل نہیں بلکہ اصحاب زکوٰۃ مالداروں کے وکیل ہیں، ان کی طرف سے مال زکوٰۃ کو مصرف پر لگانے کا ان کو اختیار دیا گیا ہے، اسی لیے ان کے قبضہ ہو جانے کے بعد بھی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک یہ حضرات اس کو

مصرف پر خرچ نہ کر دیں۔

فقر کا وکیل نہ ہونا اس لیے ظاہر ہے کہ حقیقی طور پر کسی فقیہ نے ان کو اپنا وکیل بنایا نہیں، اور امیر المؤمنین کو ولایت عامہ کی بنا پر جو خود بخود وکالت فقراء حاصل ہوتی ہے وہ بھی ان کو حاصل نہیں، اس لیے بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ ان کو اصحاب زکوٰۃ کا وکیل قرار دیا جائے اور جب تک یہ اس مال کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں ان کا قبضہ ایسا ہی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی رقم خود مال مالے کے پاس رکھی ہو۔

اس معاملہ میں عام طور پر غفلت برتی جاتی ہے، بہت سے ادارے زکوٰۃ کا فنڈ وصول کر کے اس کو سالہا سال رکھتے رہتے ہیں اور اصحاب زکوٰۃ سمجھتے ہیں کہ ہماری زکوٰۃ ادا ہو گئی، حالانکہ ان کی زکوٰۃ اس وقت ادا ہوگی جب ان کی زکوٰۃ مصارف زکوٰۃ میں صرف ہو جائے۔

اسی طرح بہت سے لوگ نادانانہ طور پر اس سے ان لوگوں کو عالمین صدقہ کے حکم میں داخل سمجھ کر زکوٰۃ ہی کی رقم سے ان کی تنخواہ دیتے ہیں، یہ نہ دیتے والوں کے لیے جائز ہے نہ لینے والوں کے لیے۔

محرث ثالث، مصارف زکوٰۃ فی سبیل اللہ

- (۱) مصارف زکوٰۃ والی آیت کا حقیقی ہے اور ہی قول راجح ہے۔
- (۲) ہاں بندہ چہور فقہاء کے اس دعویٰ سے متفق ہے کہ فی سبیل اللہ کا استعمال جب کتاب و سنت میں مطلق طور پر ہوتا ہے تو اس سے مراد غزوہ و جہاد ہی ہوا کرتا ہے۔
- (۳) قرون اولیٰ میں زکوٰۃ کے سانچوں مصرف فی سبیل اللہ کی تشریح میں جب دو ہی قول ملتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کریں۔ تیسرا اور چوتھا قول ہم کو اختیار کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔
- (۴) الف: فی سبیل اللہ سے مراد عازمی و مجاہد ہے جس کے پاس اسلام اور جنگ کا مزدوری سامان خریدنے کے لیے مال نہ ہو۔ یا وہ شخص جس کے ذمہ حج فرض ہو چکا ہو، مگر اس کے پاس اب مال باقی نہ رہا، جس سے وہ حج فرض ادا کرے۔
- ب: فی سبیل اللہ کا مصداق جو لوگ بھی ہوں ان کے مستحق زکوٰۃ ہونے کے لیے فقر و حاجت مندی

شرط ہے۔

(۵) مصارف زکوٰۃ قیاس شرعی کا محل ہے اسے میرا ذہن قبول نہیں کرتا۔ اگر قیاس کیا جائے تو پھر بھی جہاد قلمی، جہاد فکری، جہاد ثقافتی وغیرہ کو شامل نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لیے کہ جب فقر و حاجت کا شرط ہے تو جہاد کے لیے مجاہد جو ہوگا، فقیر ہونا پڑے گا، ہاں اگر کوئی فقیر شخص اس قسم کا دینی کام کرنا چاہے تو اس کام کا انجام دینے کے لیے مدد زکوٰۃ سے تائید کی جاسکتی ہے۔

(۶) دورِ حاضر میں مختلف دینی اور دعوتی کاموں کے لیے بے پناہ سرمایہ کی ضرورت ہے اس واقعہ کے انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن جب مصارف زکوٰۃ کے اصول و ضوابط میں اس کو تسلیم کرنے کا کوئی سراغ ملتا ہو، حالانکہ سوا حیلہ تملیک فقراء کے کوئی گنجائش ہی نہیں، کیوں کہ زکوٰۃ نام ہی اس عطیہ کا ہے جو غریبوں کو بغیر کسی معاوضہ خدمت کے دیا جائے۔ اس بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یہ ہدایت دی تھی کہ خذہا من اغنیاءہم و ردہا فی فقرائہم۔ الغرض میری نظر میں مصارف زکوٰۃ کی تعلیم و توسیع والا کوئی قول اختیار کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

(۷) فی سبیل اللہ کے مصرف میں جہور فقہائے کرام اور مفسرین عظام جو مراد لیتے ہیں، اس کے علاوہ اور کچھ مراد لینے کی کوئی دلیل میرے پاس موجود نہیں ہے جو کچھ ہے وہ توسیع کے خلاف ہی ہے۔ کیوں کہ صحابہ کرام جنہوں نے قرآن کریم کو براہ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا اور سمجھا ہے ان کی اور ائمہ تابعین کی جتنی تفسیریں اس لفظ کے متعلق منقول ہیں ان میں لفظ کو حجاج اور مجاہدین کے لیے مخصوص قرار دیا گیا ہے۔ سوائے اس کے اور کوئی قول میری نظر میں قابل قبول نہیں ہے۔

زکوٰۃ

ان:۔ مفتی محمد عبدالرحیم قاسمی، جامعہ حسینیہ خیر العلوم
فور محل روڈ، بھوپال۔

زکوٰۃ کے معنی طہارت و پاکیزگی اور زیادتی و بڑھوتری کے ہیں۔ اسلام کی نظر میں مال کے مقرر
فرمودہ شرعی حصہ کا مسلمان غیر سید فقیر کو مالک بنادینا اور اپنی ملکیت سے خارج کردینا زکوٰۃ ہے۔
جواب، سوال ۱:

زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ملکیت تامہ شرط ہے اور کامل مکمل ملک قبضہ سے ہوتی ہے:

”فقد ذكر في المبداء من الشروط الملك المطلق وقال وهو

الملك يدا ورقبة“ (۱)

لہذا مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہوئی، اس
پر زکوٰۃ واجب نہیں اور وہ قیمت جو ادا کی جا چکی خریدار کے تصرف سے نکل کر بائع کے قبضہ میں داخل ہوگئی
اس پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں۔
در مختار میں ہے:

” فتجب زكاتها اذا تم نصابا وحال عليه الحول لكن لا فوراً بل عند قبض اربعين درهما من الدين القوي كقرض وبذل مال تجارة قال الشامي والحاصل ان مبني الاختلاف في الدين المتوسط على انه هل يكون مال زكوة بعد القبض او قبله فعلى الاول لا بد من مضي حول بعد قبض النصاب وعلى الثاني

ابتداء الحول من وقت البيع الخ (۱)

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ دارالعلوم میں قول اول کو ترجیح دیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں کہ جس وقت جس قدر حصہ ثمن کا وصول ہوگا اسی وقت سے اس کا سال لگایا جائے گا بعد سال بھر کے ادائے زکوٰۃ واجب ہوگی اور بعض روایات میں بقدر وصول مقدار نصاب زکوٰۃ لازم ہوگی اور اسی کو ظاہر الروایہ اور مفتی بہ قرار دیا گیا ہے اور بعض روایات میں قول اول کی تصحیح کی گئی ہے دھو الا قیس کذا فی الشامی۔ (۲)

جواب سوال (۲) :-

مالک مکان کو دی جانے والی رقم کی دو نوعیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پیشگی کرایہ کے نام سے دی گئی ہو اور اس کو کرایہ میں وضع کرنے کا معاہدہ ہو تو اس کی زکوٰۃ مکان دار کے ذمہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ زر ضمانت (ڈپوزٹ) کے نام سے مالک مکان کے پاس رقم جمع کی جائے لیکن عقد اجارہ فسخ ہونے یا مدت پوری ہونے کے وقت کرایہ دار کو واپس کیے جانے کا معاہدہ ہو تو اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر واجب ہے۔ رقم واپس ملنے کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ کرایہ دار کے ذمہ لازم ہوگی۔

در مختار میں ہے:

” وكذا الوديعة عند غير معارفه قال الشامي فلو عند معارفه

تجب الزكوة (۳)

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے:

" اس روپیہ کی زکوٰۃ بعد واپسی کے تمام گزشتہ سالوں کی ادا کرنا لازم ہے، اگر اس خیال سے کہ بعد واپسی کے بہت برسوں گزشتہ کی زکوٰۃ دینی پڑے گی اور رقم کثیر ہو جاوے گی ہر سال موجود روپے کے ساتھ زکوٰۃ کو دے دیا کرے تو یہ بھی درست ہے۔ (۱)

جواب سوال (۳) :-

مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم کا کوئی معین مالک نہیں ہے لہذا اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

" كما في الدر المختار، وسببه اى سبب افتراضها ملك نصاب
حولى قال الشامي، فلا زكاة في سواهم الوقف والغيل المسيلة
لعدم الملك " (۲)

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے:

" مدرسہ کا چندہ جو بقدر نصاب جمع ہوتا ہے اور سال اس پر گزر جاتا ہے اس میں زکوٰۃ

واجب نہیں ہے " (۳)

مدرسہ وغیرہ کے مال میں کسی کو بھی کامل مکمل ملکیت حاصل نہیں اگرچہ ظاہر اچھہ تصرفات کا اختیار ہو مگر ملک تام نہ ہونے کی وجہ سے بھی وجوب زکوٰۃ کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔

جواب (۴) :-

رشوت، سود اور حرام طریقہ پر قبضہ میں آنے والے مال کی زکوٰۃ فرض نہیں، کیوں کہ یہ قابض مالک نہیں، اس لیے قابض پر لازم ہے کہ یہ مال مالک کو واپس کرے اور واپسی نہ ہو سکتی ہو تو بلانیت ثواب صدقہ کر دے، جب پورے مقبوضہ مال کو واجب التصدق قرار دیا گیا ہے تو اس کے بعض کو زکوٰۃ میں ادا کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

" قال الشامي، لو كان الخبيث نصاباً لا يلزمه الزكاة لان الكل

واجب التصديق عليه فلا يفيد ايجاب التصديق ببعضه " (۴)

(۱) فتاویٰ دارالعلوم ۳۶/۲ رد المحتار ۹/۲ (۲) فتاویٰ دارالعلوم ۳۶/۲ رد المحتار ۹/۲ (۳) فتاویٰ دارالعلوم ۳۶/۲ رد المحتار ۹/۲

(۴) رد المحتار ۲۵/۲ - وكذا في عبد الحي ۲۳۳۔

مال حرام کو حلال مال کے ساتھ اس طرح مخلوط کر دینا کہ تمیز مشکل ہو جائے موجب ملک ہے لہذا اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔

”ولو خلط السلطان المال المقتسوب بعماله ملكه فتجب الزکوٰۃ
فيه ويورث عنه لان الخلط استهلاک اذا لم یکن تمييزه عند
ابن حنیفۃ رحمہ اللہ وقوله ارفق ۵ (۱)

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے :

”مال حرام تمام کو بشرط صدقہ کرنا لازم ہے زکوٰۃ اس میں نہیں ہے مگر خلط مال حرام کا موجب
ملک ہے اس وقت اس میں زکوٰۃ بھی لازم ہوگی“

جواب سوال (۵)۔

قرض کی تین قسمیں ہیں :

(۱) دین قوی (۲) دین متوسط (۳) دین ضعیف

اول یہ ہے کہ نقد روپیہ یا سونا چاندی قرض دینے یا تجارتی مال فروخت کرنے کے بعد لینے
والے کے ذمہ اس کی قیمت باقی رہے اور ایک سال یا کئی سال کے بعد وصول ہو تو ایسا قرض فقہی اصطلاح
میں دین قوی ہے۔ بقدر نصاب باقی رہنے کی صورت میں اس قرض پر پچھلے تمام سالوں کی زکوٰۃ فرض ہے
اور یک مشت وصول نہ ہو تو مقدار نصاب کا پانچواں حصہ وصول ہونے پر اس پانچویں حصہ کی زکوٰۃ فرض ہوگی
اور ہر پانچویں حصہ کی زکوٰۃ فرض ہوتی رہے گی، اسی طرح پورے سالوں کی زکوٰۃ نکالی جائے گی۔
درمختار میں ہے :

”عند قبض اربعین درهما من الدين القوی كقرض وبذل مال
تجارة فكلما قبض اربعین درهما يلزمه درهم قال الشافعی و ذکر
فی المنتقى رجل له ثلثة مائة درهم دين حال علیہا ثلثة احوال
فقضى ما تین فعند ابن حنیفۃ یزکی للسنة الاولى خمسة

واللثانية والثالثة اربعة اربعة عن مائة وستين ولا شيء عليه

فی الفضل لانه دون الاربعين (۱)

دوسری قسم یہ ہے کہ مال تجارت کے علاوہ خانگی سامان یا استعمالی اشیاء کی قیمت خریدار کے ذمہ باقی ہو تو یہ دین متوسط ہے ایک سال یا متعدد سالوں کے بعد وصول ہونے پر اس کی گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی فرض ہوگی اور یک مشت وصول نہ ہو تو جب تک مقدار نصاب کے برابر قرض وصول نہ ہو اس کی زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی اور وصولی کے بعد پچھلے سالوں کی زکوٰۃ بھی لازم ہوگی، اگرچہ یہ وصول شدہ قرض بقدر نصاب نہ ہو، لیکن دیگر مال کے ساتھ مل کر نصاب بن جائے تو اس کو شامل کر کے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

"قوله فی الاصح قد علمت انه ظاهر الرواية وعبرة الفتح والبحر

فی صحيح الرواية قلت لكن قال فی البدائع ان رواية ابن سماعه

انه لا زکوۃ فیہ حتی یقبض المأتین ویحول الحول من وقت

القبض هی الاصح من الروایتین عن ابی حنیفة (۲)

تیسری قسم یہ ہے کہ نقد روپیہ اور اشیاء کی فروختگی کے علاوہ کسی اور سبب سے دوسرے کے ذمہ قرض ہو جائے، مثلاً شوہر کے ذمہ بیوی کا مہر یا بیوی پر شوہر کا بدل خلع یا قاتل پر دیت خوں بہا، یا ملازم کی تنخواہ تو یہ قرض دین ضعیف ہے، وصولی کے بعد مالک کے پاس سال گزرنے پر اس کی زکوٰۃ فرض ہوگی، یہ وصول شدہ مال بقدر نصاب نہ ہو اور دیگر مال کے ساتھ شامل کر کے نصاب بن جائے تب زکوٰۃ فرض ہوگی مگر حق دار کو وصول ہونے سے پہلے گزرے ہوئے سالوں کی زکوٰۃ اس پر فرض نہیں۔

در مختار میں ہے:

"وعند قبض مأتین مع حولان الحول بعده أى بعد القبض

من دین ضعیف وهو بدل غیر مال کمہر ودية وبدل کتابة

وخلع الا اذا كان عنده ما یضم الی الدین الضعیف قال الشامی

والحاصل انه اذا قبض منه شیئا وعنده نصاب یضم المقبوض

الى النصاب ويذكره بحوله ولا يشترط له حول بعد القبض (۱)
قرض کے اقسام و احکام کی مذکورہ تفصیل سے یہ مسئلہ واضح ہو جاتا ہے کہ قدرت کے باوجود مدیون
دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کر رہا ہو تب بھی مدیون پر زکوٰۃ کو فرض نہیں کیا جاسکتا، البتہ قرض کی وصولی
سے سال پورا ہونے پر مستقبل کی زکوٰۃ دائن کے ذمہ فرض ہوگی، گزشتہ سالوں کی نہیں۔

”قلت وقد منا اول الزكاة اختلاف التصحيح فيه و مال الرحمتي

الى هذا وقال بل في زماننا يقر المديون بالدين و بعلائته ولا يقدر

الداين على تخليصه منه فهو بمنزلة العدم“ (۲)

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

”دوسرا آدمی اجازت لے کر اپنی رقم سے صاحب مال کی طرف سے زکوٰۃ ادا کر دے تو زکوٰۃ

ادا ہو جاتی ہے مگر بکرنے زید سے روپیہ قرض لیا ہے اس وجہ سے اس کا ادا کرنا سود شمار

ہوگا، لہذا زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، زید کے ذمہ زکوٰۃ باقی رہے گی“ (۳)

جواب سوال (۶)۔

دین کی تینوں قسموں قوی، متوسط، ضعیف کی تفصیل سے پراویڈنٹ فنڈ کی شرعی حیثیت
واضح ہو گئی، مزید تحقیق یہ ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ مال تجارت کا معاوضہ نہیں اس لیے دین قوی میں داخل
نہیں، البتہ خدمت حرک کا معاوضہ ہے اس کو دین متوسط قرار دیں یا دین ضعیف بہر حال اصح روایت
کے مطابق اس پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”خلاصہ یہ ہے کہ دین قوی میں داخل ہونے کی صرف ایک صورت ہے کہ عبد تجارت کی

خدمت یا دار تجارت یا ارض تجارت کا معاوضہ ہو، اس کے سوا کوئی دین اجرت دین قوی

میں باتفاق داخل نہیں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کاروبار جو ملازم کی تنخواہ سے

وضع کیا گیا یا بطور انعام گورنمنٹ کی طرف سے جمع کیا گیا ہے وہ اس میں قطعاً شامل نہیں، اس لیے

اس میں صرف دو ہی احتمال ہو سکتے ہیں کہ دین متوسط ہو یا دین ضعیف اور دین متوسط میں بھی اس کا داخل ہونا اس لیے مشکل ہے کہ دو روایتیں جو بحوالہ محیط منہ السنائی میں لکھی ہیں وہ دونوں عہد کی خدمت کے متعلق ہیں، حرکی خدمت کا وہاں ذکر نہیں اور ظاہر ہے کہ حرکی خدمت کو عہد کی خدمت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ حسب تصریحات فقہاء خدمت عبد فی الجملہ مال ہے اور خدمت حُر مال نہیں ہے، اس لیے ظاہر یہی ہے کہ یہ دین ضعیف میں داخل ہے اور اگر اس کو دین متوسط بھی تسلیم کیا جائے تب بھی اصح روایت کے مطابق امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ کے نزدیک دین متوسط بھی بہ حکم دین ضعیف ہے، اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ کما صرح بہ فی البدائع۔ الغرض پر اوپنٹ فنڈ کاروبار دین قوی میں تو داخل نہیں ہو سکتا اور دین متوسط میں داخل کرنا بھی اس وقت تک کسی روایت پر منطبق نہیں ہے جب تک کہ حرکی خدمت کو مال قسرا دینے کی تصریح نہ ملے اور بالفرض اس میں داخل مان بھی لیا جائے تو حکم اس کا بھی اصح روایت پر دین ضعیف کی طرح یہی ہے کہ اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ (۱)

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے :

” ملازمان کی تنخواہ میں سے جو کچھ روپیہ وضع ہوتا ہے اور پھر اس میں کچھ رقم ملا کر بوقت ختم ملازمت ملازموں کو ملتا ہے وہ ایک انعام سرکاری سمجھا جاتا ہے اس کی زکوٰۃ گزشتہ برسوں کی واجب نہیں ہوتی، آئندہ بعد وصول کے جب سال بھر نصاب پر گزر جاوے گا اس وقت زکوٰۃ دینا لازم ہوگا۔“ (۲)

پراویڈنٹ فنڈ میں اپنی مرضی سے جمع کی ہوئی رقم پر زکوٰۃ فرض ہے اور اس پر ملی ہوئی زائد رقم سود ہے

جیسا کہ فتاویٰ رحیمیہ میں ہے :

” جو نو روپے لازماً کٹتے ہیں اور اس پر جو مزید رقم ملے گی یہ سب سرکاری انعام ہے اس پر زکوٰۃ کا مسئلہ ملنے اور قبضہ میں آنے کے بعد جاری ہوگا، ملنے سے پہلے نہیں، البتہ جو رقم ملائے جمع کرنے کی آپ نے اپنی مرضی سے منظوری دی ہے اس میں زکوٰۃ کا حکم جاری ہوگا، اگرچہ وہ

آپ کے قبضہ میں نہیں ہے جس طرح ہم کسی کو اپنی مرضی سے قرض دیتے ہیں اس پر بھی ہمارا قبضہ نہیں ہوتا مگر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اسی طرح ہم نے جو رقم کسی کے پاس امانت رکھی ہے اس پر بھی ہمارا قبضہ نہیں ہے مگر وہ ہماری ملک ہے اور ہم نے اپنی مرضی سے امانت رکھوائی ہے اس لیے اس پر زکوٰۃ واجب ہے اسی طرح صورت مذکورہ میں بھی زکوٰۃ واجب ہے اور اس رقم پر سود کے نام سے جو رقم ملے گی وہ سود ہوگی، کیوں کہ وہ آپ کی ذاتی رقم کے حساب میں دی گئی ہے۔ (۱)

نما کی حقیقت اور اس کی صورتیں

مال میں زیادتی نما ہے۔ مولیٰ نسل چلانا یا تجارت سے مال کمانا یہ ظاہری بڑھوتری ہے، سونے چاندی اور قیمتی اشیاء کو محفوظ رکھنے کے باوجود ان کی قیمتوں میں اضافہ ہونا بھی نما کی ایک صورت ہے، شہر نیر اور مکانات سے آمدنی حاصل کرنا بھی نما ہے۔

حضرت مولانا عمر احمد عثمانی تحریر فرماتے ہیں کہ

”مال نامی ایسے مال کو کہتے ہیں جس سے آدمی کے سرمایہ میں اضافہ ہوتا ہے، جو مکانات یا دکانیں تجارتی مقصد کے لیے بنائی جاتی ہیں تاکہ ان سے نفع حاصل کیا جائے خواہ فروخت کر کے خواہ کرایہ پر چلا کر وہ مال تجارت ہیں اور ان کی مجموعی قیمت پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔ اس سے جو آمدنی ہوتی ہے اگر وہ آمدنی آدمی کے پاس بچتی ہے یعنی اس کے اخراجات میں صرف نہیں ہو جاتی اور وہ سال بھر تک محفوظ رہتی ہے تو اس پر الگ زکوٰۃ فرض ہوگی۔ ہمارے علماء کو بعض ان روایات اور ائمہ فقہاء کے ان ارشادات سے غلط فہمی ہوئی ہے جن میں مکانات پر زکوٰۃ نہ ہونے کی تصریحات آگئی ہیں۔ حالاں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ہمارے ائمہ فقہاء کے عہد میں مکانات تجارتی مقصد کے لیے نہیں بنائے جاتے تھے لوگ صرف اپنی رہائش کے مکانات بناتے تھے، موجودہ صورت حال اس سے قطعاً مختلف ہے جو قدیم زمانہ میں پائی جاتی تھی لہذا

ان ارشادات کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ آج کل جو مکانات کرایہ پر چلانے کے لیے بنائے جاتے ہیں وہ قطعاً مال تجارت ہیں اور وہ رہائشی مکانات کے ضمن میں نہیں آتے ان کی جو کچھ بھی مجموعی قیمت ہو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں گھوڑوں پر زکوٰۃ نہیں لی جاتی تھی کیوں کہ آپ کے عہد میں تجارتی بنیاد پر گھوڑوں کی پرورش نہیں کی جاتی تھی۔ بلکہ اپنے ذاتی استعمال کے لیے پالے جاتے تھے اس عہد میں گھوڑوں کا وجود غزوہ و جہاد کے لیے آلات حرب کی حیثیت رکھتا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑوں پر زکوٰۃ نہ لینے کا حکم دیا تھا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جہاد کی وسعت کے ساتھ ساتھ گھوڑوں کی اہمیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور لوگوں نے تجارتی مقاصد کے لیے گھوڑوں کی پرورش شروع کر دی تھی، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے عہد میں گھوڑوں پر زکوٰۃ لگانا پڑی تھی۔ بحینہ یہی صورت مکانات کے سلسلہ میں بھی ہے کہ ان حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں بلکہ ہمارے ائمہ فقہاء کے زمانہ میں بھی مکانات کی تعمیر نے کمرشیل حیثیت اختیار نہیں کی تھی، لہذا اس وقت ان پر زکوٰۃ عائد نہیں فرمائی گئی، لیکن آج یہ صنعت تجارتی صورت اختیار کر چکی ہے لہذا انھیں مال زکوٰۃ تصور کر کے ان پر زکوٰۃ عائد کرنی ہوگی۔ (۱)

اور مشنریز کے متعلق مولانا عمر کی رائے یہ ہے کہ

”اسی طرح کارخانوں اور فیکٹریز پر کوئی زکوٰۃ عائد نہیں کی جاتی اور فقہاء کے اس قول کو دلیل میں پیش کیا جاتا ہے اصحاب حرفہ کے آلات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، موجودہ کارخانے اور فیکٹریاں بھی آلات حرفہ میں شامل ہیں لہذا ان پر زکوٰۃ نہیں لی جاسکتی، البتہ کارخانہ دار اس کارخانہ سے جو منافع کماتا ہے صرف اس پر زکوٰۃ لی جاسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں بھی بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے، آلات حرفہ سے مراد دست کاری کے وہ آلات ہیں جو اہل حرفہ استعمال کرتے ہیں، یعنی جن سے وہ اپنے ہاتھوں کے ذریعہ کام لیتے ہیں، مثلاً لوہار کے اوزار معمار کے آلات، جولاہے کی دستی کھڈی، حجام کے اوزار وغیرہ غیر ان آلات پر زکوٰۃ فرض نہیں

ہے، کیوں کہ ان اوزار کے ذریعہ ہی سے وہ اپنی روزی حاصل

کرتا ہے ان کے بغیر وہ اپنی روزی حاصل نہیں کر سکتا ان آلات کو وہ اپنے ہاتھوں سے استعمال کرتا ہے لیکن کارخانوں کی مشینری اس زمرہ میں نہیں آتی قدیم زمانہ میں نہ صنعت و حرفت کی یہ اجتماعی اور تجارتی صورت تھی جو آج ہے اور نہ ہمارے فقہاء نے ان کے متعلق کوئی حکم دیا تھا صنعت و حرفت نے اس عہد میں یہ تجارتی اہمیت حاصل نہیں کی تھی اور پھر کارخانوں اور فیکٹریوں کی مشینیں یوں بھی آلات حرفہ نہیں ہیں کہ انھیں کارخانہ دار اپنے ہاتھوں سے استعمال کر کے اپنی روزی نہیں کماتا بلکہ مشین مینوں اور تربیت یافتہ افراد کو ملازم رکھتا ہے اور ان کے ذریعہ سے ان مشین مینوں سے کام لیتا ہے اور مختلف مصنوعات بنواتا ہے۔ اگر یہ مشین آلات حرفہ ہیں تو وہ ان اہل حرفہ کے آلات ہیں جو انھیں اپنے ہاتھوں سے چلا رہے ہیں کارخانہ دار کے آلات حرفہ نہیں جو ایک سرمایہ دار کی حیثیت سے دفتر میں بیٹھ کر ان تربیت یافتہ مزدوروں سے کام لیتا ہے اور ان کے خون پسینے سے بنائی ہوئی مصنوعات کو ملک کی منڈیوں میں چوگنے اور پانچ گنے داموں پر فروخت کرتا ہے اور اس طرح اپنی تجارتیاں بھر رہا ہے اور یوں سرمایہ جمع کر کے یکے بعد دیگرے کارخانے پر کارخانے اور فیکٹریوں پر فیکٹریاں بناتا چلا جا رہا ہے اور زکوٰۃ میں ایک پائی نہیں دیتا، یاد رکھیے یہ تمام کارخانے اور فیکٹریاں سامان تجارت ہیں اور ان کی قیمت پر نصاب کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہے۔ (۱)

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے :

”کرایہ پر مکان چلانے کے لیے لینا یعنی کرایہ پر دینے کے لیے مکان خریدنا یہ بھی تجارت کے لیے ہی خریدنا ہے پس زکوٰۃ اس کی قیمت پر واجب ہوگی۔“

در مختار میں ہے :

”والاصل ان ما عدا الحجرین والسوائم انما یزکی بنیۃ التجارة بشرط عدم المانع المودی الی الشفی ولشرط مقارنتها لعقد التجارة وهو کسب المال بالمال بعقد شراء او اجارة قوله ما عدا الحجرین الخ“

وما عدا ما ذكر كالجواهر والعقارات والمواشي العلوفة والعبيد
والثياب والامتعة ونحو ذلك من العروض - (شامی)۔

قوله ما لم يبعه اى يوجبه الغنى - (شامی)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اجارہ پر دینے کے لیے خریدنا بھی تجارت کے لیے خریدنا ہے۔ (۱)
سوال (۲۲۳) ایک شخص نے آٹا پیسنے کی مشین لگائی ہے اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟
اجواب: اس مشین کی قیمت پر زکوٰۃ ہے۔ (۲)

فتاویٰ دارالعلوم سے بھی مولانا عمر عثمانی کی تائید ہوتی ہے، لہذا علما، کرام کو حالات حاضرہ اور
دلائل مندرجہ کی روشنی میں کرایہ کے مکانوں اور مشینوں کی قیمتوں پر زکوٰۃ عائد کرنے کے متعلق غور و خوض
کرنا چاہیے۔

حاجتِ اصلیہ

خانگی ساز و سامان، رہائشی مکان، تجارتی دکان، زراعتی زمین، استعمالی سواری، ستر پوشی، روزی
جسمانی ضروریات کا جن چیزوں پر دار و مدار ہے، حاجتِ اصلیہ میں داخل ہیں۔

”قال الشامي سئل عن له ارض يزرعها او حانوت يستغلها
او دار غلتها ثلاثة آلاف ولا تكفي لنفقته ونفقة عياله سنة
يحجل له اخذ الزكاة وان كانت قيمتها تبلغ الوفا وعليه الفتوى
وعندهما لا يحل“ (۳)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

”حضرت استاذی علیہ الرحمۃ کو امام محمد رحمہ کے قول پر فتویٰ دیتے ہوئے دیکھا ہے اور خود
بھی احقر کا اسی پر عمل ہے مگر اس میں قدرے تفصیل ہے وہ یہ کہ اگر اس عقار سے یہ شخص
استغلال نہیں کرتا تب تو خود اس کی قیمت کا اعتبار ہے، پس اگر وہ فاضل از حاجتِ اصلیہ

قیمت میں بقدر نصاب ہے تو مانع اخذ زکوٰۃ و موجب فطر و اضحیہ ہے اور اگر اس سے استغلال کرتا ہے تو اس کے غلہ کا اعتبار ہے اور اگر اس کا غلہ سال بھر کے خرچ سے بمقدار نصاب نہیں بچتا تو مانع اخذ زکوٰۃ و موجب فطر و اضحیہ نہیں، اور امام صاحبؒ کے قول کا تقدم علی الاطلاق نہیں کما فصل فی رسم المفتی: (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ ضروریات زندگی اور حاجت اصلیہ کا تعین دور حاضر میں حالات کا جائزہ لے کر علما ہی کو کرنا چاہیے۔ کفایت، مؤنت، علاقہ اور ماحول اور گرانی و ارزانی کے اعتبار سے مختلف ہونے کی بنا پر حاجت اصلیہ کا معیار مقرر کرنا ضروری ہے۔

”قال الشامی وسئلت عن المرأة هل تصیر غنية بالجهد الذي تنف به الى بيت زوجها والذي يظهر مما مر ان ما كان من اثاث المنزل وثياب البدن واداني الاستعمال مالا يلد لامثالها منه فهو من الحاجة الاصلية وما زاد على ذلك من الحلوى والاداني والامتنعة التي يقصد بها الزينة اذا بلغ نصابا تصير به غنية“ (۲)

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے؟

دین عبد یعنی بندے جس کا مطالبہ کرنے والے ہوں ایسا قرض و جوب زکوٰۃ سے مانع ہے، لہذا اس کو مال سے منہا کر کے باقی ماندہ کی زکوٰۃ دینا فرض ہے۔

”ومديون للعبد بقدر دينه فيزكى الزائد ان بلغ نصاباً“ (۳)
طویل الاجل کثیر دین کی جب تک کل قسطیں ادا نہ ہو جائیں غنا کا تحقق نہیں ہوگا اور زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی۔

”قال الشامی ولا يتحقق الفنى بالمال المستقر من مال لم يقبض“ (۴)

(۱) امداد الفتاویٰ ۳۱/۲ (۲) شامی ۶۵/۲ (۳) درمختار علی ہامش رد المحتار ۴/۲

(۴) رد المحتار ۸/۲

حضرت مولانا عمر احمد عثمانی فرماتے ہیں :

”اگر کسی کے پاس اس قدر مال ہے کہ اس پر زکوٰۃ فرض ہونی چاہیے لیکن وہ اس کے ساتھ ہی مقروض بھی ہے تو اگر اس پر قرض اتنا ہو جو اس کے مال کو محیط ہو جائے یعنی دس ہزار روپیہ کا مال اس کے پاس ہے لیکن دس ہزار روپے ہی اس پر قرض بھی ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی البتہ اگر دس ہزار روپیہ کا مال اس کے پاس ہے اور پانچ ہزار روپیہ کا قرض ہے تو اسے صرف پانچ ہزار روپیہ پر زکوٰۃ دینی ہوگی، اسی زمرہ میں وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو بنکوں سے قرض لے کر کوئی کارخانہ یا فیکٹری لگانے ہیں اگر کارخانہ اور فیکٹری کی قیمت کے برابر سراسر ہی اس پر قرض بھی ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی، البتہ اگر قرض کی مقدار کم ہے تو جس قدر فیکٹری اور کارخانہ کی قیمت قرض سے زیادہ ہے اس مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی اس سے زیادہ پر نہیں“

کمپنی پر زکوٰۃ

کمپنی کی مجموعی مالیت خواہ کتنی ہی ہو اس کے مالک شرکاء ہیں لہذا واجب زکوٰۃ میں ان میں سے ہر فرد کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا۔ جن شرکاء کے حصے بقدر نصاب مالیت کے ہوں گے ان پر زکوٰۃ فرض ہوگی باقی پر نہیں۔ امداد الفتاویٰ میں ہے :

”سوال (۸۷) مشترک تجارت میں حوالان حول کے بعد زکوٰۃ مشترک واجب ہوگی ؟

الجواب : نہیں۔

بقیہ سوال : یا انفراداً ؟ ————— الجواب : ہاں۔

سوال : یعنی کل شرکاء مل کر زکوٰۃ کاروبار نکالیں ؟ ————— الجواب : نہیں۔

بقیہ سوال : اور اگر بعض حصہ دار زکوٰۃ نہ دینا چاہیں تو ہر شخص انفراداً اپنے روپے و مال جو حوالان

حول کے بعد اس کے حصہ میں آوے اس کی زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے ؟

الجواب : ہاں ۵ (۲)

مندرجہ بالا فتویٰ سے معلوم ہوا کہ تمام شرکاء کے مجموعی حصول میں زکوٰۃ نہیں بلکہ ہر شریک انفرادی طور پر زکوٰۃ نکلنے کا ذمہ دار ہے۔

”و سببہ ای سبب افتراضہا ملک نصاب حولی نسبة للحول

لحو لاف علیہ تام بالرفع صفة ملک :-“ (۱)

جن شرکاء کی ملکیت میں بقدر نصاب مالیت کا شیئر ہو، ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور جس شیئر کی مالیت اتنی نہ ہو اس کی زکوٰۃ واجب نہیں۔

ہیرے جواہرات

ہیرے جواہرات کی تجارت کی جائے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہونا ظاہر ہے۔ دور حاضر میں ہیرے جواہرات قیمتی مال ہیں ان کی ذخیرہ اندوزی سے قیمت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اس لیے ہیرے جواہرات کی شکل میں سرمایہ محفوظ کرنے پر بھی زکوٰۃ فرض ہونی چاہیے۔
مولانا عمر عثمانی تحریر فرماتے ہیں کہ:

”ہمارے نزدیک امام ابو یوسفؒ اور امام غزالیؒ کا قول زیادہ صحیح ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمام جواہرات یا تو معدنیات سے تعلق رکھتے ہیں یا سمندری برآمدات سے۔ معدنیات کے متعلق تمام صحیح روایات میں خمس کے وجوب کا حکم آیا ہے، سمندری برآمدات مثلاً مرید، مونگا وغیرہ بھی معدنیات ہی کے مثل ہیں لہذا ان میں خمس واجب ہونا چاہیے، لیکن یہ خمس ان لوگوں پر واجب ہوتا ہے جو ان چیزوں کو زمین سے یا سمندر سے برآمد کرتے ہیں۔ جو ان کو خرید کر اپنے پاس ذخیرہ کرتے ہیں یا بطور زیورات کے انھیں استعمال کرتے ہیں ان پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہیے کیوں کہ یہ مال متقوم ہیں اور سرمایہ کو محفوظ کر لینے کا ایک ذریعہ ہیں۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہمارے فقہاء کرام نے یہ فیصلہ فرماتے وقت کہ جواہرات وغیرہ میں زکوٰۃ نہیں ہوتی اس نکتہ کو کیوں نظر انداز فرمادیا کہ یہ بھی سرمایہ کو محفوظ کر لینے کا ہی ایک ذریعہ ہے۔ جہاں تک

ہمارا خیال ہے ہمارے فقہاء کے دور میں ان چیزوں کو ذخیرہ کرنے اور ان کے ساتھ اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کا رواج نہیں تھا۔ حال خال کچھ لوگ دو چار موتی یا زمرد یا قوت وغیرہ کے نگینے اپنی انگلیوں وغیرہ میں لگو لیتے تھے اسی لیے انھوں نے یہ فیصلہ فرمایا اور نہ ظاہر ہے کہ ہمیں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی کہ آدمی اپنے سرمایہ کو سونے اور چاندی کی شکل میں جمع کرے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اور اگر اسی سرمایہ کو جواہرات کی شکل میں محفوظ کرے تو اسے زکوٰۃ سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ حالانکہ سرمایہ دونوں جگہ موجود ہے، محض اس کی حفاظت کے طریقے مختلف ہیں۔ اس طرح تو ہم سرمایہ دار طبقہ کو زکوٰۃ سے بچنے کے طریقے بتلاتے ہیں کہ وہ اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کے لیے سونے چاندی کو ذخیرہ نہ کریں بلکہ جواہرات کو ذخیرہ کر لیں اس کا ثبوت فقہاء کے عہد میں جواہرات کی صورت میں سرمایہ کو ذخیرہ کرنے کا عام رواج نہ ہوا تھا یہ ہے کہ قرآن کریم نے بھی آیت :

”وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ“

یعنی جو لوگ سونے چاندی کے خزانے جمع کرتے ہیں اور انھیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو (اے پیغمبر اسلام) آپ انھیں دردناک عذاب کی خوش خبری دے دیجیے۔

میں سونے اور چاندی کے ذخیرہ کرنے کا ذکر فرمایا ہے جس سے صاف نظر آتا ہے کہ عہد قدیم میں جواہرات کو ذخیرہ کرنے اور سرمایہ کو اس شکل میں محفوظ کرنے کا طریقہ رائج نہیں تھا، اس لیے اگر فقہاء کرام کے عہد تک بھی یہی صورت حال تھی تو بڑی حد تک انھیں معذور سمجھا جاسکتا ہے لیکن آج وہ صورت حال باقی نہیں رہی ہے اس لیے ان ارشادات کو حرف آخر قرار دے کر سرمایہ دار طبقہ کو زکوٰۃ سے بچنے کے لیے اس طریقہ کو اپنانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی^(۱)۔ میرے جواہرات کے زیورات سے اگرچہ تمول مقصد نہ ہو صرف زینت کے طور پر ہی استعمال کیے جائیں تب بھی ان پر زکوٰۃ فرض ہونا چاہیے۔ ردالمحتار میں ہے :

"سئل الحسن بن علی عن لہا جواہر واللائی تلبسہا فی
الاعیاد وتتزین بہا للزوج ولیست للتجارة هل علیہا صدقة
الفطر قال نعم اذا بلغت نصاباً" (۱)
علامہ شامی فرماتے ہیں:

"وما زاد علی ذلک من الحلی والاوانی والامتعة التي یقصد بہا
الزینة اذا بلغ نصاباً تصیر بہ غنیة" (۲)

سامان تجارت یا اراضی تجارت کی زکوٰۃ

جو سامان تجارت تاجر کے قبضہ میں ہے اداۓ کی کے دن کی قیمت کے اعتبار سے اس کی زکوٰۃ
تکالی جائے گی، تھوک بیوپاری کو زکوٰۃ دیتے وقت تھوک قیمت کا اعتبار کرنا چاہیے اور پھٹکر تجارت
کرنے والے کو پھٹکر قیمت سے ہی زکوٰۃ ادا کرنا چاہیے۔ تجارتی کاروبار کے لیے خریدی گئی زمینوں کی زکوٰۃ ادا
کرتے وقت ان زمینوں کی مارکیٹ میں جو قیمت ہو وہی معتبر ہونا چاہیے۔

"وتعتبر القیمة یوم الوجوب وقالا یوم الاداء وفي السواغم

یوم الاداء اجماعاً وهو الاصح" (۳)

شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

تجارتی شیرز کے اصل سرمایہ اور اس سے حاصل شدہ نفع دونوں پر زکوٰۃ فرض ہے، کرایہ وصول
کرنے والی کمپنیوں کے شیرز میں صرف نفع پر ہی زکوٰۃ ہے۔
فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

"شیرز پر زکوٰۃ ہے۔ شیرز پر جو کمپنی تجارت کرتی ہے جیسا کہ رشیم اور کپڑے کے کارخانے
اور بجلی کمپنی وغیرہ تو اصلی رقم اور اس کے نفع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے اور جو کمپنی تجارت

نہیں کرتی محض کرایہ وصول کرتی ہے جیسا کہ ریلوے کمپنی وغیرہ تو زکوٰۃ صرف نفع پر واجب ہے۔ اصلی رقم پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔ (۱)

ادائے گی زکوٰۃ کے وقت مارکیٹ میں شیر کی جو قیمت ہوگی اسی کے اعتبار سے زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔ فتاویٰ دارالعلوم میں ہے کہ جو قیمت اس وقت ہے یعنی پانچ سو روپے کی زکوٰۃ دیوے۔ (۲)

دوسری جگہ اس طرح ہے:

”سوال (۲۱۸) زید نے ایک کمپنی کے پندرہ حصے پانچ ہزار کے خریدے اس میں جو کچھ نفع ہوتا ہے وہ سالانہ تقسیم ہو مگر حصہ داروں کو ملتا ہے زید کو بھی پانچ سو روپے ملے آیا زید کے ذمہ پانچ ہزار کی زکوٰۃ دینا لازم ہے یا منافع سالانہ کی رقم پر زکوٰۃ لازم ہوگی۔

اجواب: زید کو اس رقم پانچ ہزار کی زکوٰۃ بھی دینی لازم اور فرض ہے۔ کذا فی الدر المختار۔ (۳)

قرض حاصل کرنے والی حکومت یا کمپنی کی طرف سے دیے گئے سٹریفکٹ کا نام بونڈ ہے لہذا یہ قرض دین قوی ہے، مدت معینہ گزرنے کے بعد بونڈ کیش کرانے پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی دینی لازم ہوگی۔ کما فی فتاویٰ دارالعلوم (۱۳۶/۶)۔

نصاب زکوٰۃ

”ولو بلغ باحدهما نصابا دون الآخر تعین ما یبلغ بہ الی قوله

تومہ بالانفع للفقیر“ (۴)

فریض کی ادائے گی میں احتیاط کا تقاضہ اور انفع للفقرا، یہ ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت اور حرمت کے لیے چاندی کے نصاب کو معیار مقرر کرنا مناسب ہے۔

کما فی عامۃ کتب الفتاوی

(۱) فتاویٰ رحیمیہ ۱۱/۳ (۲) فتاویٰ دارالعلوم ۱۳۶/۶ (۳) ایضاً ۱۳۶/۶

(۴) درمختار علی الرد ۲۱/۲

مصارف زکوٰۃ

(۱) غیر مستطیع طلبہ کو نقد یا چیک کی شکل میں مقررہ خرچ دے کر اس کو فیس کے نام سے وصول کیا جائے تو شرعاً زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔
 مہتمم طلبہ کی طرف سے وکیل ہے اس لیے زکوٰۃ پر مہتمم کا قبضہ ہو جانا زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے کافی ہے۔ فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

"مدرسہ کا مہتمم وکیل ہوتا ہے طلبہ فقراء کی طرف سے کہ ارباب اموال سے زکوٰۃ وصول کر کے طلبہ پر صرف کرے اس صورت میں بلاشبہ مختلف ارباب اموال کی زکوٰۃ کو خلط کرنا، مہتمم کے لیے درست ہے۔ درمختار کی جو عبارت سوال میں نقل کی گئی اس کے متصل ہی ایک استثناء بھی مذکور ہے اگر اس پر غور کیا جائے تو ارباب اموال کی طرف سے اذن کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔

خلط زکوٰۃ موکلیہ ضمن وکان متبرعا الا اذا وكله الفقراء اھ۔

(در مختار) وصار خالطا مالہم بعضہ من بعض اھ ۛ (مشافہ ۱۴/۱)۔ (۱)

حضرت فقیہ الامت مولانا مفتی محمود حسن صاحب دامت فیوضہم نے اسی فتویٰ پر اشکال کے جواب میں تذکرۃ الرشید^(۲) سے نقل فرمایا ہے کہ:

"مہتمم مدرسہ کا نائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے، جیسے امیر نائب جملہ عام کا ہوتا ہے پس جو شئی کسی نے مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے، اس کے قبضہ سے ملک معطلی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہو گیا اگرچہ وہ مجہول الکبیت والذات ہوں، مگر نائب معین ہے پس بعد موت معطلی کے ملک درمہ معطلی اس میں نہیں ہو سکتی اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطلی کا بھی ہو سکتا ہے، بہر حال نہ یہ وقف مال ہے اور نہ ملک ورثہ معطلی کی ہوگی اور نہ خود معطلی کی ملک رہے گی۔" (۳)

(۱) فتاویٰ محمودیہ ۲۱۶/۱۰ (۲) تذکرۃ الرشید ۱۶۴، ۱۶۵

(۳) فتاویٰ محمودیہ ۲۱۹/۱۰

فتاویٰ محمودیہ جلد سوم میں ہے کہ :

”مہتمم مدرسہ کو ارباب اموال نے صراحتہً وکیل بنایا ہے کہ ہمارا مال حسب صواب دید مصارف میں صرف کریں۔ غرض کہ بھی وکیل ہے اس طرح کہ طلبہ نے جب اس کے اہتمام کو تسلیم کر لیا تو گویا یہ کہہ دیا کہ آپ ہمارے واسطے ارباب اموال سے زکوٰۃ وغیرہ وصول کر کے ہماری ضروریات (کھانا پٹر وغیرہ) میں صرف کر دیں۔ امداد الفتاویٰ جلد ۴ کے اخیر میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اس کے متعلق سوال کیا ہے اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بہار پوریؒ نے جواب دیا ہے نہایت مفید علی سوال ہے اور ایسا ہی جواب ہے جس سے شبہ مرتفع ہو جائے۔“ (۱)

(۲) مدارس کے سفراء عاملین کے حکم میں نہیں، جیسا کہ امداد الفتاویٰ لکھیں ہے، نیز صحت عقد کے لیے عمل اور اجرت دونوں کا متعین ہونا ضروری ہے، جب کہ کمیشن کے معاملہ میں دونوں مجہول ہیں، لہذا کمیشن پر چندہ کے لیے سفراء کو مقرر کرنا درست نہیں۔ حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں :

”اس طرح معاملہ کرنا کہ جس قدر چندہ لاؤ گے اس میں سے نصف یا ثلث وغیرہ تم کو ملے گا شرعاً درست نہیں، اس میں اجرت مجہول ہے، نیز اجرت ایسی چیز کو قرار دیا گیا ہے جو عمل اجیر سے حاصل ہونے والی ہے کہ یہ دونوں چیزیں شرعاً مفید اجارہ ہیں۔ وتفسد الاجارۃ بجهالة المستی کلہ وبعضہ ولو دفع غزلاً لأجر لیمنجہ بنصفہ و استاجر بفلاً لیحصل لہ طعامہ ببعضہ الخ“ (در مختار) (۳)

اور فتاویٰ محمودیہ جلد عاشریں دلائل تحریر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

”اس کو روپیہ ملنا ارباب اموال کے دینے پر موقوف ہے، گو یہاں اجارہ ایسے عمل پر ہے جو اجیر کے اختیار سے خارج ہے اس کے اختیار میں لوگوں کے پاس جانا اور مدرسہ کی ضرورتاً بتا کر چندہ کی ترغیب دینا ہے مگر اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کہ کتنے گھنٹے روزانہ لوگوں

(۱) فتاویٰ محمودیہ ۴/۳۸۶ (۲) امداد الفتاویٰ ۵۸۶

(۳) فتاویٰ محمودیہ ۵۲۳/۱

کے پاس جانا ہے لہذا یہ منفعت بھی مجہول ہے اور اجرت ایسی چیز کو قرار دیا جائے گا جو
 اجیر کے عمل سے حاصل ہوگی۔ وقت معاملہ وہ معدوم ہے، مستاجر کے پاس نہیں اس
 کے تسلیم کرنے پر مستاجر کو قدرت نہیں، یہ بھی معلوم و متعین نہیں کہ کتنا چندہ سفیر کی ترغیب
 و محنت سے حاصل ہوگا، اس لیے اس کا نصف بھی معلوم و متعین نہیں، پس اجرت
 و ما جو ردونوں مجہول ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تھوڑے وقت میں زیادہ روپیہ وصول ہو جائے
 اور سفیر زیادہ رقم کا مستحق قرار پائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ زیادہ وقت اور محنت میں بھی تھوڑا روپیہ
 ملے یا بالکل نہ ملے اور سفیر تھوڑی رقم کا مستحق قرار پائے یا بالکل ہی محروم رہے، اس کا نتیجہ
 بھی معلوم ہے (۱)

زکوٰۃ سے تنخواہ حساب کتاب کے عملہ کو دی جائے یا دیگر ملازمین کو اس میں دینا جائز نہیں۔



مسئلہ زکوٰۃ پر ایک نظر

ان:۔ مفتی حبیب اللہ القاسمی، جامعہ عربیہ ریاض العلوم، جون پور

زیر نظر مقالہ مسئلہ زکوٰۃ کے محورا دل پر مشتمل ہے، اختصار کے ساتھ زیر بحث عنوان پر روشنی ڈالی جائے گی۔ وبالله استعین وهو الموفق للصواب۔

زکوٰۃ جن اموال پر واجب ہے، اس کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) سوانح۔ (۲) مال تجارت۔
چوں کہ وجوب زکوٰۃ کے شرائط میں سے مال کا نامی ہونا ہے اور نہا بڑھوتری من حیث العین اس سے ہوتی ہے اور من حیث المعنی تجارت سے ہوتی ہے، پھر مال تجارت کی دو قسمیں ہیں۔
(۱) اثمان مطلقہ جسے ثمن خلعتی بھی کہا جاتا ہے، جسے سونا چاندی۔ (۲) سلع۔

البتہ دونوں میں فرق ہے وہ یہ کہ سونا چاندی کی تخلیق ہی دراصل تجارت کے لیے ہوتی ہے اس لیے اس میں تجارت کی نیت وجوب زکوٰۃ کے لیے ضروری نہیں، لہذا خواہ تجارت کے لیے کوئی شخص رکھے ہوئے ہو یا خرچ کے لیے بہر حال اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، بخلاف سونے چاندی کے علاوہ دیگر سامان کہ اس میں جس طرح تجارت کی صلاحیت ہے اسی طرح اس کے عین سے بھی نفع اٹھایا جاسکتا ہے بلکہ اس کی تخلیق کا مقصد اصلی اس کے عین سے انتفاع ہے، اس لیے اس پر وجوب زکوٰۃ کے لیے نیت تجارت ضروری ہے تاکہ یہ مال تجارت ہو جائے۔ (۱)

اور سونا چاندی خواہ جس شکل میں ہوں مضروب ہوں یا غیر مضروب، زیورات ہوں یا تبر استعمال جائز ہو یا نہ ہو، تجارت کی نیت ہو یا نہ ہو۔ (۱)

جن اموال میں زکوٰۃ واجب ہے ان کا بقدر نصاب ہونا بھی ضروری ہے اور نصاب مختلف ہیں مثلاً چاندی میں دو سو درہم، سونے میں بیس مثقال اور اگر مال از قبیل عرومن ہے تو وہ سونے یا چاندی کے نصاب کے بقدر ہو اور اگر مال از قبیل حیوانات ہے تو ان کا متعین مقدار کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ (۲)

مال بقدر نصاب ہونے کے بعد اس میں اوصاف اربعہ کا ہونا ضروری ہے۔

(۱) حوالان حول (۲) نصاب کا ذین اور حاجتِ اصلہ سے فارغ ہونا۔

(۳) نصاب کا نامی ہونا خواہ نما، حقیقتہ ہو یا تقدیراً۔

(۴) نصاب پر ملک تام کا حاصل ہونا۔ (۵)

اوصاف اربعہ میں سے ایک وصف ملک تام ہے، کسی بھی نصاب پر ملک تام کا تحقق اس وقت ہوگا جب ملک اورید (قبضہ کا تحقق ہو، اگر ان دونوں میں سے ایک شرط بھی مفقود ہوگئی تو ملک تام نہیں کہلائے گا۔ مثلاً مہر قبضہ سے پہلے ملک تو موجود ہے لیکن ید مفقود ہے اور مال مکاتب و مدیون میں ید تو ثابت ہے لیکن ملک مفقود ہے، لہذا اصداق قبل القبض اور مال مدیون میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

کما فی سراج الوہاج - (۶)

(۱) صاحب السراج الوہاج کی تشریح کے مطابق وہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو، لیکن مال کی وصولی اب تک نہ ہوئی ہو اس کی زکوٰۃ مشتری (خریدار) پر واجب نہ ہوگی، اس لیے کہ ملک تو ثابت ہے لیکن قبضہ میں ابھی نہیں آیا اس لیے ید کا تحقق نہیں ہوا اور وجوب زکوٰۃ کے لیے ملک اورید دونوں کا تحقق ضروری ہے۔ چنانچہ علامہ شامی نے بھی بحوالہ بحر اس صورت کو مستثنیٰ قرار دیا ہے:

”وخرج به ایضاً کما فی البحر المشتی للتعارة قبل القبض“ (۷)

(۱) تحفۃ الفقہاء ۲۶۴/۱ (۲) ایضاً ۲۶۶/۱ (۳) ملتقى الابحر ۱/۱۹۳

(۴) فتاویٰ ہندیہ ۱۴۳/۱ و مجمع الانور ۲۹۳/۱ (۵) رد المحتار ۲۶۶/۲

لیکن علامہ سرخسی علیہ الرحمۃ کی عبارت محل غور ہے جو بحوالہ عالمگیری میں موجود ہے،
 "واما المبيع قبل القبض فقل لا يكون نصاباً والصحيح انه يكون
 نصاباً" (۱)

اس جزیئہ سے بظاہر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خریدار پر صحیح قول کے مطابق زکوٰۃ واجب
 ہوگی۔ فلیتأمل۔

(۲) کرائے کی مد میں دی گئی پیشگی رقم (ڈپوزٹ) پر کرایہ دار و مالک مکان میں سے کسی پر بھی زکوٰۃ
 واجب نہیں ہوئی چاہیے، مالک مکان پر تو اس وجہ سے نہیں کہ اس کو صرف یہ حاصل ہے
 ملک نہیں، چوں کہ یہ رقم عقد اجارہ کے فسخ یا تکمیل مدت کے بعد واجب الرد ہوتی ہے،
 اور کرایہ دار پر زکوٰۃ اس وجہ سے نہیں کہ اس کو ملک تو حاصل ہے یہ نہیں، اور وجوب زکوٰۃ
 کے لیے مال پر ملک وید دونوں کا جمع ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ مسئلہ رہن کے تحت بیان کر رہے
 تعلیلات فقہائے اس کی تائید ہوتی ہے۔

"ولا فني مرهون اي لا على المرتهن لعدم الملك الرقبة ولا على

الراهن لعدم اليد" (۳)

ابن نجیم صاحب البحر الرائق فرماتے ہیں :

"ومن الموانع الوجوب الرهن" (۴)

البتہ اس رقم کی واپسی کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ کا مسئلہ زیر غور ہے، اگر ڈپوزٹ کو مسئلہ رہن
 پر قیاس کیا جائے تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ راہن پر استرداد کے بعد واجب نہیں ہوگی۔ اور اگر مسئلہ رہن
 پر قیاس نہ کیا جائے تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

"واذا استرده الراهن لا يزكى عن السنين الماضية" (۵)

(۳) مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم کو اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ جب تک وہ قسم

(۱) عالمگیری ۱/۱۴۲ (۲) شامی ۲/۲۶۳ (۳) ایضاً

(۴) رد المحتار ۲/۲۶۳

مستحقین پر صرف نہیں ہوئی، وہ حکماً ملک معطی میں ہے تو یہ نظر انتہاء، انظار دقیقہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے لایخمل ہے اس لیے ایسوا سہل یہی ہے کہ اس کو ملک معطی سے خارج قرار دے کر ملک مدرسہ قرار دیا جائے اور اس کی تائید کتاب الوقف کی بعض جزئیات سے بھی ہوتی ہے۔ (۱)

لہذا معطی پر زکوٰۃ کے واجب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اسی طرح مدرسہ کے مہتمم پر بھی اس کی زکوٰۃ واجب نہیں، چوں کہ یہ رقوم غلۃ الوقف کے درجہ میں ہے اور جس طرح غلۃ الوقف پر زکوٰۃ واجب نہیں، مدارس و اداروں کی رقوم پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں۔ (۲)

البتہ فقہی سمینار اہل مدارس سے سفارش کرے کہ بقدر ضرورت ہی مال کی فراہمی کریں تاکہ مال زکوٰۃ اس طرح مجبوس نہ ہو اور مستحق مدارس محروم نہ ہوں، لیکن اگر اہل مدارس کے پاس زکوٰۃ کی رقم پسماندہ ہو تو احوط یہ ہے کہ اس کو بذریعہ تملیک رقعات وغیرہ واجبہ میں شامل کر لیا جائے اور اس کی احسن صورت یہ ہے کہ کوئی فقیر مہتمم مدرسہ کی ضمانت پر قرض لے کر مدرسہ کو عطیہ دے اور مہتمم مدرسہ مد زکوٰۃ سے فقیر کو قرض کی ادائیگی کے لیے دیدے۔

(۳) اگر پورا نصاب مال حرام ہو تو اس مال پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، چوں کہ وجوب زکوٰۃ کے لیے ملک ضروری ہے اور مال حرام جو اس کے پاس ہے اس کا وہ مالک نہیں، چوں کہ مال حرام واجب الرد ہے لہذا مالک کا پتہ لگا کر وہ یہ مال واپس کرے اور اگر مالک معلوم نہ ہو سکے تو وہ مال واجب التصدق ہے، بلانیت ثواب فقرائے مسلمین کو دیدے۔ (۴)

اور اگر حرام و حلال مخلوط ہو گئے ہوں تو مال حرام نکلنے کے بعد باقی مال اگر بقدر نصاب ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر بقدر نصاب نہ ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ (۵)

لیکن اگر مال حرام مال حلال کے ساتھ اس طرح مخلوط ہو گیا ہو کہ تمیز مشکل ہو تو تحریری کر کے ظن غالب پر عمل کرے اور ظن غالب کے بہت سے نظائر کتب فقہ میں موجود ہیں، نیز اس انداز کے

(۱) ہندیہ ۲۶۰/۲ کتاب الوقف باب ۱۱ فصل ۲ و باب ۵ ص ۴۸ (۲) الکلام البدیع فی احکام التوزیع

(۳) درمختار ۲۹۱/۲، کالوکاد اکل خبیثاً کافی النہر فی القنیۃ لوکان الخبیث نصاباً لایلزمہ الزکوٰۃ لان الکمل واجب

التصدق علیہ الخ - (۴) درمختار ۲۹۱/۲، ولہذا اذا کان لمال غنیواً متعلکہ بالخلط منفصل منہ یوفی بدینہ والا فمال زکوٰۃ الخ

موانع التباس میں تحریر کے نظائر بھی کتب فقہ میں ہیں، گو اعلیٰ و افضل یہ ہے کہ اس طرح کا پورا مال صدقہ کر دے جیسا کہ ہمارے اکابر کا یہی طرز عمل رہا ہے۔

۵ — حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دین کی تین قسمیں ہیں :

(۱) دین قوی (۲) دین وسط (۳) دین ضعیف۔

(۱) دین قوی وہ دین ہے جو مال زکوٰۃ (درہم و دنانیر) یا مال تجارت یا مال تجارت سے حاصل شدہ آمدنی و نفع کے عوض میں واجب ہوا ہو۔

دین قوی کا حکم یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہے لیکن دو شرطوں کے ساتھ۔ بقدر نصاب ہو، سال مکمل گزر چکا ہو، لیکن ادائے کی اسی وقت واجب ہوگی جب دین سے کم از کم چالیس درہم وصول ہو جائے، تب چالیس درہم سے ایک درہم بمذ زکوٰۃ نکالے اور اگر چالیس درہم سے کم ہو تو زکوٰۃ نہیں نکالی جائے گی، لیکن بقدر نصاب حوالان حول چالیس درہم کی شرط اسی وقت ہے جب دین کے علاوہ کوئی دوسرا مال زکوٰۃ نہ ہو اور اگر اس کے پاس اموال زکوٰۃ میں سے کوئی مال ہو تو اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ اگر اس کے پاس موجود مال زکوٰۃ بقدر نصاب ہے تو دین سے جتنی رقم بھی حاصل ہوگی خواہ قلیل ہو یا کثیر وہ نصاب سابق میں ضم کر دی جائے گی اور نصاب سابق کے ساتھ اس کی بھی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی اور اگر مال بقدر نصاب نہ ہو مگر دین قوی سے حاصل شدہ رقم کو شامل کرنے کے بعد نصاب کامل ہو جائے تو دین قوی سے چالیس درہم یا اس کے بقدر وصول ہونے کے بعد ایک درہم بمذ زکوٰۃ واجب الادا ہوگا، اور جب سے نصاب کامل ہوا ہے اس وقت سے سال کی ابتداء ہوگی۔ (۱)

قرض جو اصطلاح شریعت میں دین ہے اور عرف عام میں قرض ہے اگر مقروض وسعت کے باوجود ادانہ کر رہا ہو تو "مطل الغنی ظلم" کے تحت گنہ گار ہوگا، لیکن اس کی زکوٰۃ مقروض پر واجب نہیں بلکہ قرض خواہ پر واجب ہے بشرطے کہ اس کے ملنے کا یقین ہو اور اس کی ادائے کی کا وہی طریقہ ہے جو دین قوی کا ہے جس کی تفصیلات ابھی آچکی ہیں، چوں کہ یہ دین قوی میں داخل ہے اور اگر نہ ملنے کا یقین ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جیسے وہ مال جو سمندر میں گر کر منائع ہو جائے۔ اور اگر یک مشت وصول ہو تو سنین باضیہ

کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

”لو كان الدين على مقر ملئ الى ان قال فوصل الى ملكه لزمه زكوة ما مضى“^(۱)

(۲) دین وسط وہ دین ہے جو اسے مال کے عوض میں واجب ہوا ہو، اگر مالک کے پاس سال بھر رہ جائے تب بھی اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جیسے خدمت کے غلام، ثیاب بذلہ، مال خدمت کا غلام۔

دین وسط کا حکم یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہے لیکن ادا نہ کی گئی اس وقت واجب ہوگی جب دین سے دو سو درہم وصول ہو جائے، اگر اس سے کم وصول ہوا تو زکوٰۃ واجب الادا نہ ہوگی، لیکن دو سو درہم وصول ہونے کی صورت میں سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، یہ حضرت امام ابوحنیفہ کی روایتوں میں سے روایت اصل ہے۔

دوسری روایت جو ابن سماعہ عن ابی حنیفہ ہے وہ یہ ہے کہ قبضہ کے بعد حوالان حول شرط ہے یعنی دو سو درہم وصول ہونے کے بعد جب تک اس پر سال نہ گزر جائے اس میں زکوٰۃ واجب الادا نہ ہوگی۔ دین وسط میں بھی وہی تفصیلات ہیں جو دین قوی کے تحت گزر چکی ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کی دونوں روایتوں میں صحیح اور مفتی بہ روایت ابن سماعہ ہے۔^(۲)
(۳) دین ضعیف: وہ دین ہے جو کسی چیز کے عوض میں واجب نہ ہوا ہو، اس کے دین ہونے میں اس کے کسی فعل کا دخل نہ ہو جیسے میراث یا اس کے فعل کو دخل ہو، جیسے وصیت یا ایسی چیز کے عوض میں واجب ہوا ہو جو مال نہ ہو جیسے دیت علی العاقلہ، مہر، بدل خلع، صلح عن دم العمد، بدل کتابت۔

دین ضعیف کا حکم یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہے لیکن دو شرطوں کے ساتھ۔

(۱) دین سے حاصل شدہ رقم بقدر نصاب (دو سو درہم) ہو۔

(۲) قبضہ کے بعد اس پر سال گزر جائے جس کا حاصل یہ ہے کہ سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب الادا نہیں، یہ ساری تفصیلات حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک کے مطابق ہیں۔

حضرت امام ابو یوسفؒ و محمدؒ کے نزدیک دیون کی صرف دو قسمیں ہیں۔
 ۱۔ دین مطلق۔ ۲۔ دین ناقص۔

دین ناقص: جیسے بدل کتابت، دیت علی العاقلہ ان دونوں دیون کے علاوہ باقی دیون دین مطلق میں داخل ہیں۔

دین مطلق کا حکم ان حضرات کے نزدیک یہ ہے کہ جب تک دین وصول نہ ہو جائے اس کی زکوٰۃ واجب الادا نہیں، خواہ وصول یا بانی قلیل ہو یا کثیر، جتنی وصول ہوگی، اتنے کی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔ اور دین ناقص میں وجوب زکوٰۃ کے لیے دو شرطیں ہیں:

(۱) حاصل شدہ رقم بقدر نصاب ہو۔ (۲) اس پر سال گزر جائے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ دین ناقص میں سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں۔ دین کے سلسلہ کی ساری تفصیلات تحفۃ الفقہاء لعلاء الدین السمرقندی اور درمختار و ردالمحتار سے ماخوذ ہیں۔ (۱)
 ۶۔ پراویڈنٹ فنڈ دو طرح کے ہیں:

۱۔ سرکاری ۲۔ پرائیویٹ۔

(۱) سرکاری پراویڈنٹ فنڈ دین ضعیف کے حکم میں ہے لہذا جو حکم دین ضعیف کا ہے وہی سرکاری پراویڈنٹ فنڈ کا ہے، یعنی سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب الادا نہیں، البتہ وصولی کے بعد اگر وہ بقدر نصاب ہو اور سال گزر جائے تو اس رقم کی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔

(۲) پرائیویٹ کمپنیوں کا پراویڈنٹ فنڈ چوں کہ مستقل ایک ایسی کمپنی کے حوالہ کر دیا جاتا ہے جس میں ملازمین کا بھی ایک نمائندہ ہوتا ہے اور یہ کمپنی ملازمین کی وکیل ہوتی ہے اس لیے کمپنی کا قبضہ ملازم کے قبضہ کے درجہ میں ہے اس طرح فنڈ کی رقم گویا کہ ملازم کی ملک ہو گئی، اس لیے یہ دین نہیں کہلائے گا۔ اور اس پر سال بہ سال زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر ہر سال زکوٰۃ نہیں ادا کی گئی تو وصولی کے بعد سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اور اگر پرائیویٹ کمپنیوں کا حال بھی سرکاری پراویڈنٹ فنڈ کی طرح ہو تب جو حکم سرکاری فنڈ کا

ہے وہی علم پرائیویٹ فنڈ کا بھی ہوگا۔ (۱)

نصاب کے اوصاف اربعہ میں سے وصفِ ثانی نصاب کا نامی ہونا ہے، نام کے لغوی معنی امانت و بڑھوتری کے ہیں اور امانت کبھی حقیقت ہوتا ہے جیسے حیوانات میں توالد و تناسل کے ذریعہ اور دیگر اموال میں تجارت کے ذریعہ اور کبھی تقدیر ہوتا ہے جیسے سونا چاندی اور سکہ رائج الوقت، وجوبِ زکوٰۃ کے لیے مال کا نامی ہونا ضروری ہے خواہ حقیقت نامی ہو یا تقدیراً، لہذا ایسا مال جسے اپنے یا اپنے نائب کے پاس رکھ کر استثناء پر قاعدہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ (۲)

نصاب کے اوصاف اربعہ میں سے وصفِ ثالث نصاب کا حاجتِ اصلہ سے فارغ ہونا۔ حاجتِ اصلہ کی تفسیر ابن ملک کے حوالہ سے علامہ علاء الدین حصکفی اور صاحبِ مجمع الانہر نے یہ کی ہے:

”ایسی چیزیں جو انسان کو ہلاکت سے دور کرنے والی ہوں خواہ تحقیقاً جیسے اس کا اور اس کی بیوی اور بال بچوں کا نفقہ یعنی کھانا، خوراک، گرمی اور سردی سے بچنے کے لیے کپڑے، رہائشی مکان، گھریلو ساز و سامان، سواری کا جانور، خدمت کے لیے غلام، جنگی ساز و سامان، آلاتِ صنعت و حرفت اہل علم کے لیے کتابیں، چوں کہ اہل علم کے نزدیک جہالت باعثِ ہلاکت ہے یا تقدیراً جیسے دین چوں کہ مدیون نے اگر موجود مال سے دین ادا نہیں کیا تو یہ دین اس کو جیل میں ڈال سکتا ہے جو ہلاکت کے درجہ میں ہے، لہذا اگر کسی کے پاس بقدرِ نصاب مال ہے، لیکن وہ مذکورہ بالا حوائج کی تکمیل میں مشغول ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، چوں کہ وہ حاجتِ اصلہ سے فارغ نہیں اور اگر بقدرِ نصاب یا اس سے زائد مال مذکورہ بالا اشیاء کی شکل میں موجود ہو، تب بھی اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، چوں کہ یہ چیزیں نامی نہیں ہیں، جیسا کہ وہ برتن جو گھر کی زینت کے لیے رکھے جاتے ہیں، بشرطِ کہ وہ سونے چاندی کے نہ ہوں اور ایسے ہی وہ آلات جن کی ذات سے نفع اٹھایا جاتا ہو اور اس کا اثر معمول میں باقی نہ رہتا ہو، اس میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں جیسے صابون اور اگر اس کا اثر معمول میں باقی رہے، جیسے کپڑا رنگنے کے لیے رنگ

کھال میں لگانے کے لیے تیل، نمک وغیرہ تو اگر یہ بقدر نصاب ہوں اور سال گزر جائے تو ان میں

زکوٰۃ واجب ہوگی، یہ تفصیلات مجمع الاہنر ہندیہ، شامی، درمختار سے ماخوذ ہیں (۱)

حضرات فقہاء کرام کی بیان کردہ جزئیات سے اتنی بات تو ظاہر ہے کہ حاجت اصلہ کی کوئی ایسی تحدید نہیں جس میں کمی زیادتی کی گنجائش نہ ہو، بلکہ وسعت ہے البتہ لفظ حاجت اور اصلی کے مفہوم کو باقی رکھتے ہوئے اس کے دائرے میں جائز حد تک نمائش سے بچتے ہوئے توسع کی گنجائش ہے مثلاً کچے مکان کی جگہ پختہ مکان، نل کی جگہ ٹرسکی، سواری کے جانور کی جگہ پر موٹر سائیکل، جیپ کار، تیرکمان کی جگہ پر رائفل، بندوق وغیرہ، آلات صنعت و حرفت میں دست کاری کی جگہ مشینیں۔ اسی طرح ضروریات زندگی میں بڑے مکانات میں لفٹ، ٹیلیفون، کاروباری لوگوں کے لیے باکس برلڈ (فریج) کولر، موسم کے اعتبار سے ہیٹر یا اے سی، پینکھا، الغرض اس طرح کی جدید چیزیں جو روزمرہ کی ضروریات زندگی میں داخل ہیں۔ اور جن کی اہل تصریحات فقہاء میں بنیادی حیثیت سے موجود ہیں، وہ سب حاجت اصلہ میں داخل ہیں۔ البتہ ٹی وی۔ وی سی آر جیسی فحش اور ناجائز چیزیں حاجت اصلہ میں داخل نہیں، فلیتأمل۔

نصاب کے اوصاف اربعہ میں سے وصف رابع نصاب کا دین سے فارغ ہونا ہے۔ دین سے مراد ہر وہ دین ہے جس کا مطالب بندہ ہو، خواہ وہ دین بندوں ہی کا ہو جیسے قرض، ثمن، بیع، منمان، متلفات، زخم کا تاوان، بدل خلع، بدل صلح عن دم العمد، نیز خواہ از قبیل نقود ہو یا مکمل و موزون یا از قبیل ثياب اور حیوانات، نیز خواہ حال ہو یا مؤجل یعنی بالفعل اس کی ادائے کی ضروری ہو یا بعد زمان کچھ دنوں کی مہلت ہو، لہذا صدق زوجہ اگرچہ وہ مؤجل الی الطلاق یا الی الموت ہو، وہ بھی دین میں داخل ہے اور مانع وجوب زکوٰۃ ہے۔ یا وہ دین اللہ تعالیٰ کا ہو جیسے دین زکوٰۃ اور ہر وہ دین جس کا مطالب بندہ نہ ہو، جیسے دین نذر، کفارات، صدقۃ الفطر، وجوب حج یہ دین میں داخل نہیں، یعنی مانع وجوب زکوٰۃ نہیں۔

”والمراد دین له مطالب من جهة العباد سواء كان الدين لهم او لله

تعالى وسواء كانت المطالبة بالفعل او بعد زمان فينتظم الدين

المؤجل ولو صدق زوجته المؤجل الى الطلاق او الموت“ (۲)

(۱) مجمع الزوائد، ۱۹۳/۱، رد المحتار، ۲۶۲/۱، الفتاویٰ الہندیہ، ۱۴۲/۱ (۲) مجمع الزوائد، ۱۹۳/۱

” سواء كان الدين للعباد كالقرض وثمن المبيع وضمان المتلفات وارث الجراحة وسواء كان الدين من التقودا والمكيل او الموزون او الثياب او الحيوان وجب بخلع او صلح عن دم عمد وهو حال او موجد او لله تعالى كدين الزكاة “ (۱)

وكل دين لا مطالب له من جهة العباد لا يمنع كذا في المحيط الرخصي “ (۲)

دیون مذکورہ بالا میں جو مال مشغول ہو وہ معدوم کے درجہ میں ہے اس لیے اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

” لان المشغول بها كالمعدوم “ (۳)

اور دیگر حضرات فقہاء کے نزدیک عدم وجوب زکوٰۃ کی علت اس مال کا حوائج اصلیہ کی تکمیل میں مشغول ہونا ہے اور جو مال حوائج اصلیہ میں مشغول ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

” وقد عللوا سقوط الزكاة بالدين بان المديون محتاج الى هذا المال

حاجة اصلية لان قضاء الدين من الحوائج الاصلية والمال المحتاج اليه

حاجة اصلية لا يكون مال الزكاة تأمل “ (۴)

لیکن وہی دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے جو وجوب زکوٰۃ سے پہلے کا ہو، اگر مال بقدر نصاب ہو اور حوالان

حول ہو گیا اس کے بعد یہ مقروض ہو گیا تو یہ قرض مانع نہیں بلکہ زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔

” وهذا اذا كان الدين في ذمته قبل وجوب الزكاة فله حقه بعده

لم تسقط الزكاة لانها تثبت في ذمته فلا يسقطها الحق من الدين

بعد ثبوتها “ (۵)

چوں کہ دین عید لاحق ہے اور دین زکوٰۃ سابق ہے اور لاحق سابق کو ساقط نہیں کر سکتا، فقہاء اگر

کی تصریحات میں یہ بات بھی اچھکی ہے کہ دین بالفعل واجب الادا ہو یا بعد زمان یعنی دین طویل المدت

(۱) ہشتمیہ ۱۰۲۸ (۲) ایضاً (۳) مکتب الانصار ۱۹۳۱ (۴) رد المحتار ۲۶۱/۲

(۵) جوہرہ، رد المحتار ۲۶۱/۲

ہو، دونوں طرح کے دیون مانع وجوب زکوٰۃ ہیں، لہذا مروج طویل الاجل دیون خواہ زراعتی ہوں یا تعمیراتی، جن کی ادائے گی کے لیے پانچ سال سے لے کر چالیس سال تک کی مدت مقرر کی جاتی ہے وہ بھی دین میں داخل ہیں اور مانع وجوب زکوٰۃ ہیں، پورے دین کو بھی اموال زکوٰۃ سے منہا کیا جاسکتا ہے اور اس کی نظیر مہر ہے جو مؤجل الی الطلاق یا الی الموت ہو، نیز تصریح ہے بالفعل یا بعد زمان، البتہ احوط یہ ہے کہ صرف سالانہ واجب الادا قسط وضع کر کے باقی اموال زکوٰۃ کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے، یہ خیال کر کے گویا کہ اس سال واجب الادا دین صرف یہی ہے اور باقی مال میرا ہے لیکن یہ تقویٰ ہے۔ اگر کسی نے عمل کر لیا تو انشاء اللہ ناجور ہوگا۔

کمپنی پر زکوٰۃ

کمپنی کے شرکا، نے اگر کمپنی کو ادا، زکوٰۃ کا ذکیل بنادیا ہو تو کمپنی پر زکوٰۃ واجب الادا، ہوگی، البتہ اگر اثاثے از قبیل آلات (مشینری) ہیں تو وہ مال زکوٰۃ میں شمار نہ ہوں گے، چوں کہ آلات صنعت کا استثناء، حضرات فقہاء نے کیا ہے اور اگر اثاثے از قبیل آلات نہ ہوئے تو مال زکوٰۃ میں اس کو بھی شمار کیا جائے گا، اور اگر شرکا، نے کمپنی کو ادائے زکوٰۃ کا ذکیل نہ بنایا ہو تو ہر حصہ دار اپنے حصہ کی زکوٰۃ ادا کرے، جس حصہ دار کا حصہ بقدر نصاب ہو یا دوسرے اموال زکوٰۃ کے ساتھ مل کر وہ بقدر نصاب ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب الادا ہوگی، اور جس حصہ دار کا حصہ بقدر نصاب نہ ہو اور نہ ہی دوسرے اموال زکوٰۃ اس کے پاس ہوں تو اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔ (۱)

ہیرے جواہرات

ہیرے اور جواہرات اگر تجارت کے لیے نہیں ہیں تو بالاتفاق اس میں زکوٰۃ نہیں، چاہے جواہرات کی قیمت جتنی بھی ہو، لہذا جو لوگ انکم ٹیکس یا دیگر قوانین سے بچنے کے لیے اپنے سرمائے کو ہیرے و جواہرات کی شکل میں محفوظ کر دیتے ہیں اگر ان کے پاس ہیرے و جواہرات کے علاوہ دیگر اموال زکوٰۃ نہیں ہیں تو ان پر زکوٰۃ فرض نہیں، اسی طرح خواتین کے پاس اگر ہیرے جواہرات ہوں خواہ نرین کے لیے ہوں یا تمول کے لیے

بہ شرط کہ تجارت کے لیے نہ ہوں ان پر بھی زکوٰۃ فرض نہیں، چوں کہ ہیرے جواہرات از قبیل اجار ہیں اور اجار میں حجرین (ذہب و فضہ) کے علاوہ میں زکوٰۃ نہیں، چوں کہ ذہب و فضہ کو ثمن خلعی (ثمن مطلق) کی حیثیت حاصل ہے اور ان کے علاوہ باقی از قبیل عروض و سلع ہیں، ہیرے جواہرات بھی از قبیل عروض ہیں اور عروض میں زکوٰۃ نیت تجارت ہی سے واجب ہوتی ہے اس لیے جب تک نیت تجارت نہ ہو ہیرے و جواہرات میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

”لا زکوٰۃ فی اللآلی والجواہر وان ساءت القفا اتفاقاً الا ان تكون للتجارة
والاصل ان ماعدا الحجرین والسواثم انما یزکی بنیۃ التجارة“ (۱)
”وما عدا ما ذکر کا الجواہر والعقارات والمواشی العلوقة والعبيد والثیاء
والامتنعة ونحو ذلك من العر من“ (۲) — وان كانت حلیاً“

لیکن اگر کوئی ہیرے جواہرات کی بھی زکوٰۃ ادا کر دے تو یہ تقویٰ ہے وہ ماجر ہوگا، البتہ شرعاً واجب نہیں۔

آراضی کی زکوٰۃ

سونا چاندی کے علاوہ باقی چیزیں عروض میں داخل ہیں اور عروض کے مال زکوٰۃ بننے کے لیے نیت تجارت شرط ہے لہذا اگر کوئی شخص زمین بہ نیت تجارت خریدے تو اس کا بھی شمار اموال زکوٰۃ میں ہوگا اور حوالان حول کے وقت اس کی جو قیمت مارکیٹ میں ہوگی اسی میں زکوٰۃ فرض ہوگی قیمت خرید کا اعتبار نہیں۔

”وتعتبر القيمة عند حوالان الحول الخ“ (۳)

لیکن اگر کسی نے زمین رہائش کے لیے خریدی پھر تجارت کی نیت ہوگئی یا تجارت کے لیے خریدی پھر رہائش کی نیت ہوگئی تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں اس کی تفصیل درمختار میں موجود ہے۔ (۴)

اموال زکوٰۃ میں کون سی قیمت معتبر ہے؟

اموال زکوٰۃ میں حضرات فقہاء انفع للفقراء کی رعایت کرتے ہیں، چنانچہ بہ کثرت ایسی جزئیات میں

جن میں اس کی تصریح ہے۔ تقویم بالدراہم والدنانیر میں بھی اسی کلیہ کی رعایت کی گئی ہے۔

”انظرهما للفقراء، ومثالثنا حملوا رواية كتاب الزكوة على ما اذا كان

لا يتفاوت النفع في حق الفقراء بالتقویم بایہما کان“ (۱)

ثم ان المعتبر عند محمد الانفع للفقير من القدر والقيمة وعندهما

القدر“ (۲)

اس لیے مال کی قیمت لگاتے وقت اس پہلو کی رعایت تاجر حضرات کے ذہنوں میں رہنی چاہیے ان کو دیکھنا چاہیے کہ تھوک میں فقراء کا زیادہ نفع ہے یا پھٹکر کی قیمت لگانے میں جس میں فقراء کا زیادہ نفع ہو وہ قیمت لگائیں، لیکن بعض دکانیں تھوک ہی کی ہوتی ہیں وہاں پھٹکر سامان نہیں ملتا، اس صورت میں پھٹکر دکان دار پھٹکر کی قیمت لگائیں اور قیمت کی تعیین لاگت سے نہیں بلکہ حوالان حول کے وقت اس کی جو قیمت ہوگی وہی معتبر ہوگی۔

”الزکوة واجبة فی عرو من التجارة کا ثمن ما كانت اذا بلغت قيمتها

نصاباً من الورق والذهب، کذا فی الہدایہ۔ ویقوم بالمضروبة کذا

فی التبیین وتعتبر القيمة عند حوالان حول الزکوة“ (۳)

البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یوم الوجوب کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا یا یوم الاداء کی قیمت کا،

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ کے نزدیک یوم الوجوب کی قیمت معتبر ہے اور حضرات صاحبین کے نزدیک یوم الاداء کی قیمت معتبر ہے، نیز اس شہر کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا جس شہر میں مال ہے، ہیڈ آفس کا اعتبار نہیں۔

”وتعتبر القيمة یوم الوجوب وقالا یوم الاداء..... ویقوم فی

البلد الذی المال فیہ“ (۴)

شیرز

شیرز پر زکوٰۃ واجب ہے بشرطیکہ وہ خود بقدر نصاب ہوں یا دیگر اموال زکوٰۃ کے ساتھ مل کر بقدر

نصاب ہو جائیں اور اصل پونجی میں زکوٰۃ اس وقت فرض ہوگی جب کہ کسی عین میں لگا رکھا ہو، مثلاً

لوہا، سیمنٹ، سامان الکٹریک، ریشم وغیرہ، اور اگر کمپنی نے اس کو آلات میں لگا رکھا ہے، مثلاً نقل و حمل کے لیے ٹرک یا بس وغیرہ، تب اصل پونجی میں زکوٰۃ فرض نہ ہوگی، چوں کہ آلات صنعت کو حضرات فقہاء نے مستثنیٰ قرار دیا ہے، چوں کہ سکہ رائج الوقت ثمن خلقی کے حکم میں ہے اور ثمن مطلق میں تقدیر ارقوت نہ ہوگی وجہ سے مطلقاً زکوٰۃ فرض ہے خواہ تجارت میں وہ لگایا جائے یا نہ لگایا جائے اور صورت مسئلہ میں یہ ثمن مطلق تجارت میں مشغول ہے اس لیے اس میں زکوٰۃ ہے۔

”غیر ان الاثمان خلقت فی الاصل للتجارة فلا تحتاج الى تعيين

العباد للتجارة بالنية فتجب الزکوة فیها وان لم ينو للتجارة او

اصلك للنفقة الخ: (۱)

حولان حول کے وقت ٹیئرز کی جو قیمت ہوگی اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔

”وتعتبر القيمة عند حولان الحول: (۲)

بوند

پرائز بونڈ ہو یا بونڈ سٹریفکٹ، فکس ڈپوزٹ ہو یا انشورنس یہ سب سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حرام ہیں، اس طرح رقم کو محفوظ کر دینا روح شریعت کے خلاف ہے۔

فقہی سہمینار عوام کو اس پر متنبہ کرے، بونڈس پر جو سرمایہ لگایا گیا ہے اصل رقم پر زکوٰۃ فرض ہے، السبب منافع حرام ہونے کی وجہ سے واجب التصدق ہیں۔ بونڈ جب کیش ہوگا اس وقت زکوٰۃ فرض ہوگی اور سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔

”لو كان الدين على مقر ملئ أو على معسر أو مفلس إلى أن قال فوصل

إلى ملكه لزم زکوة ماضی الخ: (۳)

(۱) تحفة الفقہاء ۲۶۵/۱

(۲) عالمگیری ۱۷۹/۱

(۳) درمختار ۲۶۶/۲

خلاصہ حقائق

- ۱۔ ملک تام سے مراد ملک وید (قبضہ) ہے۔
- ۲۔ مالِ مُشْتَرَعِی قبل القبض پر زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ علامہ سرخسیؒ کی عبارت قابل غور ہے۔
- ۳۔ ڈپوزٹ کی زکوٰۃ نہ کرایہ دار پر واجب ہے نہ مالک مکان پر، وصولی کے بعد دونوں احتمال ہے وجوب و عدم وجوب۔
- ۴۔ مدارس و اداروں میں جمع ہونے والی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں۔
- ۵۔ مالِ حرام میں زکوٰۃ واجب نہیں۔
- ۶۔ مالِ قرض میں مقرض پر زکوٰۃ نہیں، قرض خواہ پر زکوٰۃ ہے، وصولی کے بعد سنینِ ماضیہ کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔
- ۷۔ پرائیڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ ہے، سنینِ ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں، آئندہ سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔
- ۸۔ نامی سے مراد بڑھنے والا مال ہے خواہ وہ حقیقۃً نامی ہو یا تقدیراً۔
- ۹۔ حاجتِ اصلیہ سے مراد ایسی چیزیں ہیں جو انسان سے ہلاکت کو دور کرنے والی ہوں خواہ حقیقۃً دافع ہوں یا تقدیراً۔
- ۱۰۔ حاجتِ ادراصلی کے مفہوم کو باقی رکھتے ہوئے جائز حد تک نمائش سے بچتے ہوئے توسع کی گنجائش ہے، البتہ ٹی وی، وی سی آر جیسی فحش و منکر چیزیں حاجتِ اصلیہ میں داخل نہیں۔
- ۱۱۔ دین سے مراد وہ دین ہے جس کا مطالب بندہ ہو، خواہ وہ دین بندوں کا ہو یا اللہ تعالیٰ کا۔
- ۱۲۔ طویل الأجل دین خواہ زراعتی ہو یا تعمیراتی، دین میں داخل ہے، لہذا نصاب سے یہ بھی مستثنیٰ ہوگا۔
- ۱۳۔ اگر کمپنی ادا، زکوٰۃ کی وکیل ہو تو مجموعی مالیت معتبر ہوگی، ورنہ ہر فرد اپنے حصے کی زکوٰۃ ادا کرے۔

- ۱۳۔ میرے جواہرات اگر تجارت کے لیے نہ ہوں تو زکوٰۃ واجب نہیں، خواہ اس کی کتنی ہی مالیت ہو، مرد کے پاس ہو یا عورت کے پاس، تمول کے لیے ہوں یا تزین کے لیے۔
- ۱۵۔ سامان تجارت کی قیمت حولانِ حول کے وقت کی معتبر ہے، جس نوع کی دکان ہو اس کی نوعیت تقویم میں معتبر ہوگی۔ انفع للفقراء کی بھی رعایت کی جائے گی۔
- ۱۶۔ اراضی اگر بہ نیت تجارت خریدی گئی ہوں تو زکوٰۃ واجب ہے اور حولانِ حول کے وقت کی قیمت معتبر ہوگی۔
- ۱۷۔ شیرزیں منافع اور اصل پونجی دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے بشرطے کہ پونجی آلاتِ صنعت میں نہ لگی ہو، حولانِ حول کے وقت کی قیمت معتبر ہوگی۔
- ۱۸۔ بونڈس میں لگائی گئی رقم پر زکوٰۃ واجب ہے، نفع واجب التصدق ہے۔ بونڈس جب کیش ہو اس وقت زکوٰۃ فرض ہوگی، اور سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔



سوال نامہ کا جواب

انہ: ————— مولانا سلیمان بلند شہری، ہریانہ

زکوٰۃ کس قسم کے اموال میں واجب ہے؟

(۱) جس سے نہ ہونے کی وجہ سے ملک ناتمام رہی اور ملک ناتمام ہونے کی صورت میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ البتہ جو رقم بیع کی قیمت میں بطور پیشگی دی گئی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

”اور المراد بالتمام المملوك رقبة وبيدًا“ (۱)

(۲) کرایہ دار پر زکوٰۃ واجب ہوگی، کیوں کہ یہ ڈپوزٹ صاحب مکان کے ذمہ کرایہ دار کو واپس لوٹا دینا واجب ہے اور کرایہ دار کی ملک ہے جو کہ از قسم دین ہے اور ظاہر ہے کہ زکوٰۃ دین دائن پر ہے نہ کہ

میراث پر۔

(۳) ان پر کوئی زکوٰۃ واجب نہیں۔

”وسببہ ای سبب افتراضها ملك نصاب حولی قوله ملك نصاب

فلا زكوة نسی سواشم الوقف والخيل المسجلة لعدم الملك“ (۲)

(۴) اس میں کوئی زکوٰۃ واجب نہیں۔ لعدم الملك۔

ہاں البتہ اگر اس مال حرام میں حلال مال اس طرح مخلوط ہو گیا کہ ان میں باہم تمیز مشکل ہے تو اس صورت میں امام اعظمؒ کے نزدیک زکوٰۃ واجب ہے بشرطے کہ حلال مال مخلوط حرام مال سے بقدر نصاب زائد ہو۔

”ودخل ما ملك بسبب خبيث كفصوب خلطه اذا كان له غيبه
منفصل عنه يوفى دينه (قوله دخل) أى فى ملك النصاب المذكور
نتج (وقوله ما ملك بسبب خبيث) والمراد بالغير ما تحجب

فيه الزكوة كذا فى الشامى - (۵/۲)۔

(۵) دین کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہوتی ہے نہ کہ مدیون پر۔

کل دیون جن کا مدیون اقراری ہو تین قسم ہے۔

(۱) دین ضعیف (۲) دین قوی (۳) دین متوسط۔

دین ضعیف: ہر وہ قرض ہے جس کا دائن بغیر اپنی کوشش اور بغیر کسی چیز کے بدلے مالک
ہوا ہو، جیسے میراث کہ یہ بدل مال نہیں۔ یا اپنی کوشش سے تو مال حاصل ہوا مگر بغیر بدلے کے جیسے وصیت
یا اپنی کوشش اور بدلے میں مال حاصل ہوا مگر بدل مال نہیں، جیسے مہر۔ بدل خلع۔ بدل صلح۔ اس قسم دین میں
امام اعظمؒ کے تین زکوٰۃ واجب نہیں۔

دین متوسط: جو ایسے مال کے بدلے حاصل ہو جو مال تجارت نہ ہو، جیسے خدمت کے
غلاموں کی قیمت اور عام استعمال کے کپڑے۔ بقدر نصاب حاصل ہونے پر گزشتہ ایام کی زکوٰۃ لازم ہے۔
دین قوی: وہ قرض ہے جو مال تجارت کے بدلے میں ہو، اس قرض کے نصاب زکوٰۃ کا پانچواں
حصہ وصول ہونے پر ایام گزشتہ کی زکوٰۃ ادا کرنی لازم ہے۔

”قال فى الفتاوى الهندية (۱): اما سائر الديون المقربها ففى على

ثلث مراتب عند الحى حنيفة رحمه الله تعالى ضعيف وهو كل

دين ملكه بغير فعله لا بد لأى شئ نحو الميراث او بفعله لا بد لأى

عن شئ كالوصية او بفعله بد لأى عمل ليس بمال كالصهر وبدل

الخلع وبذل الصلح عن دم العمدة والسدية وبذل الكتابة لأكوة
 فيه عنده حتى يقبض نصاباً وحال عليه الحال۔
 ووسط : ما يجب بدلا عن مال ليس للتجارة كعبيد الخدمة
 وثياب البذلة اذا قبض ما تين ركني لما مضى في رواية الاصل۔
 وقوم : وهو ما يجب بدلا عن سلعة التجارة اذا قبض اربعين زكى لما
 مضى كذا في الزاھدی ۛ

(۶) پراویڈنٹ فنڈ کی رقوم دین منعیف کی فہرست میں آتی ہیں لہذا ان رقوم میں زکوٰۃ کا لزوم نہیں آتا
 جب تک قدر نصاب پر قبضہ نہ ہو اور حوالان حول نہ ہو۔
 دوسری شرط نما۔

حاجت اصلیه

حاجت اصلیه کا تعین ہر دور اور ماحول میں اس کے اعتبار سے ہوگا۔
 ”ولیس فی دور المسکنی او ثیاب البدن واثاث المنزل ودواب الركوب
 وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زکوٰۃ لانها مشغولة بحاجته
 الاصلية۔ کذا فی الشامی ۶/۴ ۛ

دین سے محفوظ ہونا

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے۔ دین کی قسمیں اور اس کے احکام۔
 سوال میں پیش کردہ صورتوں میں وجوب زکوٰۃ کے لیے اموال زکوٰۃ سے پورے قرض کو منہا نہیں
 کیا جائے گا، بلکہ سالانہ واجب الادا قسط وضع کر کے باقی اموال پر زکوٰۃ لازم قرار دی جائے گی۔
 شامیؒ میں مرقوم ہے:
 ”(قوله أو مؤجلاً) والصحيح انه غير مانع ۛ

کمپنیز پر زکوٰۃ

و جب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ کمپنی کے ہر شریک کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا، یعنی اگر ہر شریک کا اپنا حصہ قدر نصاب کو پہنچا ہوا ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں، مثلاً کمپنی کے دس شرکا ہیں، اور ان دس شرکاء میں سے دو شریکوں کے حصہ کی مقدار صرف تین تین ہزار ہے تو ان تین تین ہزار روپیہ والے حصہ داروں پر زکوٰۃ لازم نہ ہوگی، اور جن کے حصے بقدر نصاب ہیں ان کے ذمہ زکوٰۃ لازم و واجب ہوگی۔

کما فی الدر المختار^(۱) فان بلغ نصیب احدہما نصابا زکاہ دون الآخر

ہیرے اور جواہرات

جو لوگ انکم ٹیکس اور سرکاری قوانین کی زد سے بچنے کے لیے نقد روپیہ یا سونے چاندی کی صورت میں محفوظ کرنے کی بجائے لاکھوں روپیوں کے ہیرے جواہرات خرید کر کے محفوظ کر دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ ہیرے جواہرات حاجتِ اصل میں داخل نہیں ہیں اور بڑی مالیت (جو کم از کم بقدر نصاب ضرور ہوتی ہے) چنانچہ اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

”قال فی الشامی: فی السطر التاسع وی ہذہ ما زاد علی ذلک

من الحلی والاولی والامتعة التي یقصد بہا الزینة اذا بلغ نصابا

تصیر بہ غنیۃ“

اور بسا اوقات خواتین محض تزئین اور آرائش کے لیے ہیرے جواہرات استعمال کرتی ہیں ان کا مقصد تمول نہیں ہوتا۔ ایسے ہیرے، جواہرات پر زکوٰۃ کے وجوب کے بارے میں فقہاء میں اختلاف ہے، اور صحیح تر یہ ہے کہ ان ہیرے جواہرات میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ شامی میں مرقوم ہے:

”لا زکوٰۃ فی اللآلی والحواہر وان ساءت الغا لا ان تكون للتجارة“ (۲)

اموال تجارت پر زکوٰۃ

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ امداد الفتاویٰ میں رقم طراز ہیں اور حضرت والا کی یہ تحریر بعینہ سوال نامہ کے سوال کا جواب ہے۔

تحریر یہ ہے:

”اس تاجر کو اپنے مال تجارت کی زکوٰۃ دینے وقت اس مال تجارت کی قیمت عام نرخ سے لگانی ہوگی، یعنی پھنکر نرخ لگانا ہوگا۔“

شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

سوال میں تحریر کردہ عبارت سے واضح ہے کہ بونڈس درحقیقت مقروض کی جانب سے قرض خواہ کے پاس ایک سند ہے، جو اس بات کی شہادت ہے کہ مقروض اتنے قرض کا اقراری ہے اور جس قرض کا مقروض اقراری ہو، نیز وہ قرض بعوض مال تجارت ہو یا بعوض سونا چاندی ہو تو وہ قرض قوی کہلاتا ہے جس کا حکم یہ ہے کہ اس قرض قوی کی گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ دینا قرض خواہ کے ذمہ واجب ہے، مگر ادائیگی بوقت وصولیابی لازم ہوگی، اور چالیس درہم سے کم کی وصولیابی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، لہذا وجوب ادا کے لیے کم از کم چالیس درہم پر قبضہ ہونا چاہیے۔ الغرض جتنا وصول ہوتا جائے گا اس کی زکوٰۃ ایام ماضیہ بھی دینی ہوگی۔

اس فقہی اصول سے معلوم ہوا کہ بونڈس کے کیش کرانے سے قبل اس کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب نہیں ہے، جس وقت بونڈس کو کیش کرایا جائے گا اس وقت اس کی تمام سالہائے ماضیہ کی زکوٰۃ نیز سال رواں کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔

شامی میں ہے: (۲)

”قوله عند قبض اربعین درهماً، قال فی المحيط لان الزکوٰۃ

۱. لا تجب في كسور من النصاب الثاني عنده ما لم يبلغ اربعين للخرج فكذلك لا يجب الا اذا ما لم يبلغ اربعين للخرج ذكر في المنتقى رجل له ثلاث مائة درهم دين وحال عليها ثلاثة احوال فقبض مائتي (درهما) فعند ان حنيفة رح يزكي للسنة الاولى خمسة وللثانية والثالثة اربعة اربعة من مائة وستين ولا شيء عليها في الفضل۔

نصاب زکوٰۃ

چاندی اور سونے کے نصاب میں چاندی کا نصاب اصل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس سونا اور چاندی دونوں ہیں تو اس کے حق میں اخذ زکوٰۃ کی حرمت وحلت کا مدار چاندی کا بقدر دوسو درہم ہونا معتبر ہوگا یعنی سونے اور چاندی دونوں کی قیمت مل کر اگر دوسو درہم چاندی کی قیمت کو پہنچ گئی تو یہ شخص مذکور صاحب نصاب (غنی شرعی) محسوب ہوگا، اور اس کے حق میں اخذ زکوٰۃ حرام ہوگی، ورنہ نہیں۔
البحر الرائق میں مرقوم ہے؛

”وتضم قيمة العروض الى الثمنين والذهب الى الفضة
..... حتى ان من كان له مائة درهم وخمسة مثاقيل ذهب
قيمتها مائة درهم فعليه الزكوة عنده“

مصارف زکوٰۃ

(۱) ملحوظ خاطر ہے کہ ادائے زکوٰۃ کے لیے شرط فقیر شرعی کا مالکانہ قبضہ ہے، صورت مذکورہ فی السؤال میں مفقود ہے کہ مال زکوٰۃ پر نہ فقیر شرعی کا قبضہ ہوا اور نہ اس کے وکیل کا۔ اور اگر یہ شبہ ہو کہ فقیر شرعی (طالب علم) نے اہل مدرسہ اپنا چیک سپرد کر دیا تو گویا ان کو اپنا وکیل

بالقبض بنادیا۔ تو جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ اس فقیر شرعی کا قبضہ اصالتاً یا وکالتاً ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اول وہ مال اہل مدرسہ کے قبضہ سے خالی ہو، و بعد ازاں اس مال زکوٰۃ پر فقیر شرعی کا قبضہ اصالتاً یا وکالتاً ہو، کہ قبضہ تالی (فقیر شرعی کا قبضہ) کے لیے قبضہ اول (مزکی کا قبضہ) کا ختم ہونا شرط ہے اور وہ یہاں مذکورہ صورت میں مفقود ہے کہ ابھی وہ مال اہل مدرسہ کے قبضہ میں ہے۔

چنانچہ سوال میں ذکر کی گئی صورت درست نہیں ہے۔

اور یہ صورت بعینہ ایسی ہے جیسے مثلاً زید پر بکر کا ایک ہزار روپیہ قرض چاہیے اور بکر اپنی زکوٰۃ کی ادائے گی کے لیے زید کا ہزار روپیہ پر قبضہ کرائے بغیر اس روپیہ زکوٰۃ کو اپنے پاس رکھے اور ادا زکوٰۃ کی نیت کر لے تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں بکر کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

در مختار میں ہے : (۱)

”ہی تمليك) خرج الاباحة فلو اطعم يتبعنا ما ويا الزكات. لم يجزيه

الا اذا دفع اليه المطعوم (قوله الا اذا دفع اليه المطعوم) لانه بالدفع

اليه يملكه فيصير اكلامن ملكه الخ :

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی علیہ الرحمۃ امداد الفتاویٰ میں اور حضرت مولانا عزیز الرحمن عثمانی صاحب علیہ الرحمۃ مفتی اول دارالعلوم دیوبند فتاویٰ دارالعلوم میں رقم طراز ہیں کہ مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگ کا وکیل ہوتا ہے اور مستحقین زکوٰۃ (طلبہ) کا وکیل نہیں ہوتا۔

سوال دوم میں ذکر کی گئی دونوں صورتیں ناجائز ہیں۔

(الف) : زکوٰۃ کے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ کا مصداق راقم الحروف کے نزدیک غازی اور مجاہد ہے

(ب) : صاحب بدائع نے فرمایا ہے کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیک کام یا عبادت کرنا چاہتا ہو اور اس شخص

کو اس کام کی انجام دہی میں مال کی ضرورت ہو تو وہ شخص بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے، لیکن

شرط یہ ہے کہ اس کے پاس اتنا مال نہ ہو کہ اس مال سے اس کام کو انجام دے سکے مثلاً دینی تعلیم

اور علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت۔

یعنی فی سبیل اللہ کے مفہوم میں وسعت پیدا کرتے وقت یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ان امور اسلامیہ کو انجام دینے والے حضرات اسی وقت حتمی زکوٰۃ ہوں گے جب کہ وہ فقیر شرعی ہوں۔

شیخ ابن ہمام رحمہ اللہ نے بھی یہ بات فتح القدیر میں کہی ہے۔

(۵) مصارف زکوٰۃ کو قیاس شرعی کا محل قرار دے کر آٹھ مصارف کے علاوہ کچھ دوسری قسموں کو مصارف زکوٰۃ سے ملحق کرنے پر فقر کا خاص لحاظ رکھا جائے گا۔

اس شرط کو مدنظر رکھتے ہوئے جہاد فکری اور اس کی دوسری اقسام میں صرف زکوٰۃ کی جاسکتی ہے جب کہ مستحقین زکوٰۃ کا اس مال زکوٰۃ پر مالکانہ قبضہ ہو، اگر مالکانہ قبضہ نہ ہو تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ اور آیت "انما"..... میں حصر راقم الحروف کے خیال میں حصر حقیقی ہے حصر اضافی نہیں۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ نے آیت میں حصر کو جو حصر اضافی بیان کیا ہے وہ بہ نسبت طلب منافقین کے ہے۔

نیز حضرت شاہ صاحب نے جو دلیل حصر اضافی کی بیان فرمائی ہے وہ کوئی قوی دلیل نہیں ہے۔ مزید برآں جملہ فقہاء مجتہدین جب مصارف زکوٰۃ کو ان ہی آٹھ اصناف میں محصور فرماتے ہیں تو ان کے علاوہ دوسرے حضرات کی بات کہاں قابل قبول ہو سکتی ہے۔

(۶) ہر امر میں تو قوت دلیل ہی کا اعتبار ہوتا ہے۔ اگر اس قوت دلیل ہی سے صرف نظر کر لی جائے تو پھر قابل اعتبار کیا چیز رہے گی، کسی چیز کا معیار اعتبار باقی نہ رہنے پر سقم و صحت ہی لاپستہ ہو جائے گی۔ چنانچہ مجتہدین کی طے کی ہوئی راہ کو حالات سے متاثر ہو کر ترک کر دینا اپنے کو بے راہ روی میں مبتلا کرنا ہے۔

بنا برہذا راقم الحروف کے خیال میں فی سبیل اللہ کے مفہوم میں اتنی وسعت کی گنجائش نہیں کہ اس وسعت کی وجہ سے ہم جیسے لوگ مجتہد فی الشرع تک کا ساتھ چھوڑیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم

زکوٰۃ کے متعلق سوالات کے جوابات

امنا ————— مولانا افضال الحق - مہتمم دارالعلوم گوردکھپور

- ۱۔ زکوٰۃ کے چند مسئلہ اصول ہیں انہیں مستحضر رکھیے تو تمام سوالات حل ہو جائیں گے۔
 - اصول ۱۔ زکوٰۃ ہر اس مسلمان آدمی پر فرض ہے جو مالک نصاب ہو۔۔۔۔۔ وغیرہ۔
 - اصول ۲۔ زکوٰۃ کے لیے نصاب کی ملکیت اور قبضہ دونوں لازم ہیں دونوں کا نام ہے ملکیت تامہ۔
 - اصول ۳۔ مویشی کی زکوٰۃ کا نصاب تین طرح ہے ۱۔ اگر پالتو ہیں تو ان کی تعداد پر ہے ۲۔ اگر تجارت کے لیے ہیں تو ان کی سال ادائے گی کی مارکیٹ رٹ پر ہے ۳۔ اگر ان کے دودھ، انڈے، بال کی تجارت مقصود ہے تو ان چیزوں کی مارکیٹ قیمت پر ہے۔
 - اصول ۴۔ زمین، مکان یا جائداد کی تجارت کرنے والے پر زکوٰۃ ان کی قیمت پر ہے کہ جس دن سال پورا ہوا اس روز کل مالیت کیا تھی۔
 - اصول ۵۔ آلات تجارت یا زراعت یا معاش پر زکوٰۃ نہیں اس کی پیداوار پر ہوگی، اور پیداوار پر موسم زمین کی نوعیت اور حکومت کی حیثیت کے مطابق ہوگی۔
 - اصول ۶۔ اس حکومت کا مالی نظام سود پر ہی چل رہا ہے، جب کہ شریعت سود کو ہر طرح حرام قرار دیتی ہے اس لیے جب دونوں قانون ٹکرائیں تو بھی شریعت کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے، الا اینکه کوئی شدید خطرہ ہو تو متنی المقدور سود سے پرہیز کرنا چاہیے۔
- ان اصولوں کی روشنی میں آپ کے سوالوں کے جوابات عرض ہیں :

سوال۔ زکوٰۃ شیرز کی قیمت پر یا اس کی آمدنی پر؟

• جواب • حصص کی خریداری کے لیے آپ نے پانچ ہزار کی رقم جو کمپنی کو دی ہے وہ رقم آپ کی ملک ہے مگر قبضہ کمپنی کا ہے اس لیے ملک تام کے بغیر اس پر زکوٰۃ اگھی واجب نہیں ہے۔
• اس رقم کی جو اس پر آپ کو ملی ہے وہ رقم نہیں ہے بلکہ شیر ہے، جو رقم دلا سکتی ہے۔ اس لیے زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

• حصص اگر فرد تجارتی سامان بن جائیں تو بھی زکوٰۃ اس رقم پر آئے گی جو آپ کے قبضے میں آیا ہے اور باقی ہو کیوں کہ آلات تجارت پر زکوٰۃ نہیں ہے۔
• اگر حصص کمپنی کے اندر ہیں اور بطور سامان اس کی قیمت کم و بیش ہو سکتی ہے تو آپ کے قبضے میں جو رقم آئے گی اس رقم مقبوضہ پر زکوٰۃ ہوگی، اور اگر آپ نے بیشگی زکوٰۃ دیدی تو بہتر ہے اگرچہ واجب اس وقت ہوگی جب رقم آپ کے قبضے میں آئے گی۔

سوال۔ مشترکہ کاروبار پر زکوٰۃ

• کمپنی کا منیجر تمام سرمایہ کا امین — مالک نہیں ہے اس لیے اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔
• ہاں اگر فیکٹری ہے اور شخصی ملکیت ہے تو اس پر سالانہ زکوٰۃ واجب ہوگی۔
• ہر حصہ دار پر زکوٰۃ ہے مگر اس رقم پر جو اس کے قبضے میں آگئی جس سے ملکیت تام ہوتی ہے۔
• حصے دار کی جو رقم کمپنی میں ہے وہ اس کے قبضے میں نہیں ہے صرف ملکیت ہے اس لیے زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

سوال۔ زکوٰۃ انڈے پر ہے یا مرغیوں پر؟

• اگر مرغی فارم میں ہے اور مرغیاں فروخت ہوتی رہتی ہیں تو مرغیوں کی موجودہ قیمت پر زکوٰۃ ہوگی، کیوں کہ وہ سامان تجارت ہیں۔
• اگر صرف انڈے فروخت ہوتے ہیں تو مرغیوں سے مطالب نہیں کیوں کہ وہ آلات تجارت ہیں۔

• اگر دودھ کا فارم ہے تو دودھ کی قیمت پر زکوٰۃ ہوگی، بھینس کی قیمت وغیرہ سے کوئی مطلب نہیں کیوں کہ وہ اب آلہ تجارت میں ہے سامان تجارت نہیں ہے۔

• مرغی فارم میں اگر انڈے اور مرغی دونوں کی فروختگی ہوتی ہے تو دونوں کی صرف مالیت پر زکوٰۃ ہے اور انڈے مرغیوں کے لیے پھل کے طور پر ہوں گے جو شامل ہوں گے۔

جواب تجارت خواہ کسی چیز کی ہو تاجر کا کھانا، کپڑا اور مکان تینوں پر جو بھی خرچ ہوا ہے وہ مال زکوٰۃ نہیں تھا، اس خرچ کے سوا بچی ہوئی آمدنی پر جس کی ضرورت سال بھر نہیں ہوئی اس پر زکوٰۃ ہے یا جو تجارت ہوتی رہی اس پر زکوٰۃ ہے۔

• کھانے، کپڑے اور مکان کی حیثیت مالک یا تاجر کی اپنی حیثیت کے لوگوں میں مڈل کلاس اور اوسط درجے کے لوگوں کی مانی جائے گی، لہذا انڈے کا دوکاندار سائیکل رکھ سکتا ہے اور پولیٹری فارم والا اسکوٹر مل مالک کی حیثیت موٹر والے کی حیثیت ہے یہ سب ذاتی اخراجات ہوں گے۔

سوال۔ زمین داری باند کا سود؟

زمین شرعی طور پر میری ملک ہے مگر کمیونٹرزم میں ملکیت ختم اس لیے قائمہ زمین داری کے بعد زمین سے بے دخل کرنا شرعاً غلط تھا اور قانوناً صحیح تھا، اگرچہ اب قانون میں بھی غلط ہو جائے گا۔ اور جب زمین کا مالک ہی تھا تو میری مرضی کے بغیر اسے لینا غصب کرنا ہے، ایسے میں جو رقم ادا کی جا رہی ہے یا باند دیا گیا اور اس پر انٹرسٹ دیا گیا، وہ سب کا سب میری زمین کا معاوضہ ہے۔ اس میں سود کچھ نہیں ہے، بنیادی غلطی قانون کی ہے۔

• اگر ظلم اور زیادتی سے باند خرید کر بیچ سکتے ہیں تو خریدنا جائز ہوگا تاکہ اپنا مال بچایا جاسکے لیکن اس رقم پر جو انٹرسٹ ہوگا وہ سود ہوگا اسے حاصل کر کے غرباء پر تقسیم کر دے۔

• فیکس ڈیازٹ میں ہماری اپنی رقم سے جو بھی زائد ملتا ہے وہ بلا معاوضہ ہے، اس لیے سود ہے اسے بھی حاصل کر کے غرباء کو تقسیم کر دینا لازم ہے۔

• زمین، جائیداد اور مکان خریدنا صرف مال کی حفاظت کے لیے یا تجارت کر کے نفع کے لیے درست ہے اور اس سے نفع کمانا بھی درست ہے، زکوٰۃ مالیت پر ہوگی زمین پر نہیں اس کا نفع انٹرسٹ

نہیں ہے نفع ہے ۔

• جو اور قمار حرام ہے اس لیے کہ اس میں نفع و نقصان متعین نہیں، لیکن اگر دونوں کا امکان ہے اور ہم اس میں دخل دے کر بالبصیرت پیدا کر کے اس پر قابو پاسکتے ہیں تو وہ جواز نہیں ہے اس لیے حصص کی قیمت، کمپنی کی ساکھ، بازار کے دباؤ یا بین الاقوامی حالات سے گھٹتے بڑھتے ہیں اس کی خرید فروخت میں عقل، تجربہ اور بصیرت کی ضرورت ہے، اس کی خرید و فروخت جائز ہے، الا اینکه کوئی خاص صورت پیدا ہو جائے۔ ~~مگر اگر کوئی خاص صورت پیدا ہو جائے~~

زکوٰۃ

اثر: ————— محمد محی الدین بر و ووی، دارالافتاء العلوم فلاح دارین، ترکیسواستوراجھوآ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ
خَيْرًا كَثِيرًا، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِ مُحَمَّدٍ الْمَبْعُوثِ كَافَّةً لِلنَّاسِ
بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۝ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ الَّذِينَ هُمْ تَفَقَّوْا فِي الدِّينِ فَصَارُوا
هَدَاةً وَاسُوةً لِّلْفُقَهَاءِ الْمُجْتَهِدِينَ لَيْلًا وَنَهَارًا ۝

اَمَّا بَعْدُ :

محترم قارئین کرام! اس سال اسلامی فقہ اکیڈمی کی طرف سے جو سوالنامہ جاری کیا گیا
اس کے جواب میں مختصر سی معروضات پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ امید کہ بنظر تحقیق و
تصحيح مطالعہ فرمائیں گے۔ فَإِنْ كَانَ صَوَابًا مِّنَ اللَّهِ وَإِنْ كَانَ خَطَاًا فَصِيتُ -

مُحَوَّلٌ

جن اموال میں زکوٰۃ واجب ہے وہ تین قسم پر مشتمل ہیں :

اول، اثمان مطلقہ، سونا اور چاندی جو طبعی طور پر اموال تجارت ہیں۔ دوم، اموال تجارت
یعنی وہ سامان واسباب جو تجارت کی غرض سے تیار کیا گیا یا خریدا گیا ہے۔ سوم، سوائم وہ جانور
جو سائمہ ہیں۔

مذکورہ اموال پر زکوٰۃ کے وجوب کے لیے پانچ شرائط ہیں : (۱) مطلق ملک (۲) ملک
مطلق یعنی ملک تام (۳) نماء، فواہ حقیقہ ہو جیسے اموال تجارت اور سوائم، فواہ حکم ہو جیسے

سونہ اور چاندی (۴) مال کا حاجت اصل سے فارغ ہونا جس کی وجہ سے غنا کا تحقق ہوتا ہے (۵) مولانا قول اس لیے کہ مال میں نماء کے حصول کی خاطر مدت درکار ہے اور استثناء کے لیے کم از کم ایک سال چاہیے،

ملک تامہ کی تعریف

"وهو ان يكون مملوكا له رقبة ويبدأ وهذا قول اصحابنا الثلاثة، وقال زفر

الميد ليست بشرط وهو قول الشافعي"

"ملک تامہ یہ ہے کہ مال کی ذات پر ملک ہو اور وہ مال قبضہ مالک میں بھی ہو، حضرت زفر و شافعی

کے یہاں ملک تامہ میں قبضہ مشروط نہیں ہے"

"والمراد بالملك التام القدرة على التصرف من غير ان يلزم به هذا التصرف تبعه

في الدنيا ولا في العقبى"۔

"ملک تامہ سے مراد یہ ہے کہ مالک کو تصرف پر اس طرح قدرت حاصل ہو کہ تصرف سے اس پر

کوئی مواخذہ دنیوی یا آخری عائد نہ ہوتا ہو"

ملک تامہ کی روشنی میں آپ کے سوالات کے جواب مطالعہ فرمائیں :

جواب۔ مبیع کے قبضہ مشتری میں نہ آنے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ بیع سلم میں قیمت کی ادائے گی کے بعد مبیع سپرد کرنے کا وقت آنے تک مبیع مشتری کے قبضہ میں نہیں ہے۔

۲۔ خیار شرط کی بنا پر بائع کے قبضہ میں ہو۔

۳۔ بلا کسی شرط کے مبیع بائع کے قبضہ میں ہو۔

۴۔ مبیع بائع کے پاس سے روانہ ہو چکی ابھی راہ میں ہے۔

۵۔ مبیع بائع کے پاس سے روانہ ہو کر گم ہو گئی ابھی مشتری تک نہیں پہنچی، البتہ ریلوے یا

ٹرانسپورٹ وغیرہ کا وثیقہ (رسید) موجود ہے۔

۶۔ راہ میں گم ہوئی لیکن کوئی وثیقہ موجود نہیں، جیسے آنکڑیا کی معرفت۔
 مذکورہ بالا کمت سام صورتوں میں ملک تام کی مذکورہ بالا تعریف کے پیش نظر بائع کو جو قیمت پہنچ چکی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے اگر قیمت مستفاد فی النصاب ہے۔ تو حولان حول کے بغیر زکوٰۃ واجب ہے، اور اسی قیمت سے صاحب نصاب بن رہا ہے تو حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی کیونکہ بائع رقبۃ ویداً قیمت میں متصرف ہے۔

اور مذکورہ بالا جملہ صورتوں میں مشتری پر قبضہ مبیع سے پہلے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیونکہ مشتری متصرف نہیں ہے۔ قبضہ سے پہلے مشتری کے لیے مبیع کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ لہذا اگرچہ قبضہ سے پہلے پورا سال گزر جائے تب بھی مشتری پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

مبیع خواہ ریلوے سے بائع نے روانہ کی ہو یا ٹرانسپورٹ سے خواہ راہ میں گم ہو کر وثیقہ موجود ہو یا نہ ہو، یہ بائع کی طرف سے روانگی ترسیل ہے۔ اور ترسیل بائع کی صورت میں مبیع جب تک مشتری کے پاس پہنچ نہ جائے تسلیم مبیع ثابت نہیں ہوتی۔

چنانچہ علامہ ابن الہمام فتح القدیر میں رقمطراز ہیں :

”ولذا لم یجب فی مال الضمان، ویخرج ایضاً مال المشتراة للتعباس، و

اذا لم یقبض حتی حال حول لان زکوٰۃ فیہ اذ لم یستفد ملک التصرف لہ

اور علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں :

”وخرج به ایضاً کافی البعیر المشتري التجارة قبل القبض والأبوت

المعد للتجارة“

ریلوے ٹرانسپورٹ کے ذریعہ بائع مال بھیجتا ہے تو یہ ترسیل ہے، ترسیل میں تسلیم نہیں ہوتی، ہاں توکیل میں تسلیم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اگر مشتری نے ایک شخص کو معین کر دیا کہ مال اس کو دیدینا اور اس معین شخص نے ذمہ داری لے لی تو یہ شخص مشتری کا وکیل ہو گیا۔ جب اس نے مال پر قبضہ کر لیا تو اصل کا قبضہ شمار ہوگا۔ اس لیے اس صورت میں مشتری پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

چنانچہ حضرت علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں :

”قال للبائع زينه له وابعهه مع غلامك او غلامى فعل وانكسر الوعاء في الطريق فالتلف من البائع الا ان يقول ادفعه الى الغلام لانه توكليل للغلام والله فنع اليه كالدفع الى المشتري“

”مشتري نے بائع سے کہا کہ تم اس کو تول لینا اور اپنے یا میرے غلام کے ساتھ اس کو بھیج دینا بائع نے ایسا ہی کیا اور راستہ میں برتن ٹوٹ گیا، تو بائع کا نقصان شمار ہو گا مگر یہ کہ مشتری نے بائع سے اس طرح کہا کہ اس غلام کو مال دیدینا اور غلام نے ذمہ داری لے لی تو یہ غلام کو وکیل بنانے کی صورت ہو گئی اور غلام کو دیدینا مشتری کو دیدینے کے حکم میں ہو گا پہلی صورت ترسیل کی ہے دوسری صورت توکیل کی ہے۔ ”هذا توكليل والاول ترسييل“

اسی طرح فرماتے ہیں :

”اشترى في المصر خطبا فغصبه غاصباً حال حملته الى منزله فن البائع لان عليه التسليم في منزل الساري للعرق“

”شہر میں لکڑیاں خریدیں پھر مشتری کے گھر پہنچا تے وقت کسی غاصب نے لکڑیاں غصب کر لیں۔ تو بائع کی لکڑی گئی، اس لیے کہ بائع پر مشتری کے گھر پہنچا کر سپرد کرنا ضروری ہے، عرف کی بنا پر۔

علامہ رافعیؒ فرماتے ہیں :

”لا دخل لهذه العلة في الحكم بل العلة هي تحقق الهلاك قبل التسليم وتفرق بين كون المبيع خطبا او غيره“

”عرف کو اس میں دخل نہیں ہے بلکہ اصل علت تسلیم سے پہلے ہلاکت کا تحقق ہے، اسی طرح بیع لکڑی ہو یا دوسری چیز حکم میں کوئی فرق نہیں آئے گا“

مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ اگر مشتری نے کسی کو وکیل بنا دیا ہے تو وکیل کا قبضہ مکمل

کا قبضہ شمار ہوگا، اور تسلیم کامل ہو جائے گی، اور اگر مشتری نے کسی کو وکیل نہیں بنایا تو اس صورت میں اگرچہ مشتری کے امر سے مال بھیجا ہو وہ ترسیل میں داخل ہے، اور ترسیل کی صورت میں تسلیم الی مشتری اس وقت محقق ہوگی جب مال مشتری کے قبضہ میں پہنچ جائے۔

اس لیے ریلوے ٹرانسپورٹ، انگریز وغیرہ ذرائع سے بائع کا مال بھیجا ترسیل ہے، اس صورت میں قبضہ مشتری سے پہلے تسلیم ثابت نہیں ہوتی اور قبضہ بھی نہیں ہے، اور جو مال مشتری کے قبضہ تصرف میں نہ آیا ہو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے اگرچہ مشتری نے قبضہ کرنے کے بعد مال روانہ کیا یا مشتری نے ریلوے ٹرانسپورٹ وغیرہ سے رابطہ قائم کر کے بائع سے مال منگوایا ہے تو ریلوے وغیرہ مشتری کے وکیل ہوں گے ایسی صورت میں مال وصول ہونے پر قبضہ کے وقت سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اور جہد صورتوں میں بائع پر مبيع کی زکوٰۃ فرض نہیں، کیونکہ مبيع بائع کی ملک سے نکل گئی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

جواب — ڈپوزٹ: ڈپوزٹ میں مالک مکان کو عرفاً حق تصرف حاصل ہوتا ہے اور ڈپوزٹ سے مقصد بھی تصرف و انتفاع ہے اس لیے ودیعت و رہن سے اس کی حیثیت کچھ مختلف ہے۔ اس لیے مالک پر دین و قرض کی حیثیت قوی معلوم ہوتی ہے اور خود کرایہ دار (صاحب ڈپوزٹ) کے لیے بھی مالک مکان پر قرض کی حیثیت قوی معلوم ہوتی ہے۔

مستقرض قرض کا مالک ہو جاتا ہے، طرفین کے یہاں تو صرف قبضہ سے مالک ہو جاتا ہے، اور حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک قرض میں تصرف سے مالک ہو جاتا ہے، اس لیے صاحب مکان پر اس رقم کی زکوٰۃ لازم ہوگی، اگر یہ رقم مشغول بالذین نہ ہو۔ یعنی اس کے پاس ڈپوزٹ کے علاوہ رقم ضرورت سے زائد بقدر نصاب موجود ہو، جو ڈپوزٹ کے دین کو ادا کرنے کے لیے کافی ہو، اس صورت میں اگر پہلے سے صاحب نصاب ہے تو ڈپوزٹ مال مستفاد میں داخل ہو کر سال رواں کے حساب میں آجائے گی، ورنہ حوالان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر ڈپوزٹ مؤجل ہے، طویل مدت مقررہ تک کرایہ دار کی طرف سے مطالبہ کا اندیشہ نہیں ہے تو دین مؤجل کے حکم میں آجائے گی۔ جس کا بیان دین کے ذکر میں آ رہا ہے۔

اور کرایہ دار کا مالک مکان پر یہ دین قوی ہے۔ قرض دین قوی میں داخل ہے، اس لیے واپس ملنے کی صورت میں سالہائے گذشتہ کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی۔

حضرت علامہ علاء الدین مصطفیٰ فرماتے ہیں:

"ويعلمك المستقرض القرض بنفس القبيض عندهما أي الامام ومحمد خلافا
للتأني. القرض لا يتعلق بالعائز من الشروط فالفاسد منها لا يبطله ولكنه
يلغوه د شئ آخر"

جواب۔۔۔ اجارہ کی رقم پیشگی ادا کر دینے کی صورت میں مالک مکان پوری رقم کا مالک فوراً نہیں ہو جاتا، بلکہ اجارہ میں
ملک ساعۃ فساعۃ بدلین میں ثابت ہوتی ہے اس لیے کم از کم ایک دن گزرنے پر ایک روز کے کرایہ کا مالک بنے گا،
بقیہ رقم ودیعت سمجھی جائے گی، کرایہ دار کی رقم کرایہ دار کی ملک سے نکلی نہیں ہے۔ فسخ کرایہ پر واپس مل سکتی ہے اس
لیے کرایہ دار پر اپنی رقم کی زکوٰۃ واجب ہوگی، کرایہ دار کی جس قدر رقم حولان حول سے قبل کرایہ میں مستحق بنے گی، زکوٰۃ
سے خارج ہو جائے گی، اور حولان حول کے وقت جو رقم مستحق نہیں بنی ہے حساب زکوٰۃ میں معدود ہوگی۔

مالک مکان پر پوری رقم کی زکوٰۃ لازم نہ ہوگی، بلکہ جس قدر کرایہ کا وہ مستحق بن رہا ہے اس پر زکوٰۃ
واجب ہوگی، جس قدر رقم کا مستحق بن گیا ہے وہ رقم مال مستفاد میں شمار ہو کر دوسرے مال زکوٰۃ کے ساتھ
حساب میں آجائے گی، حولان حول شرط نہیں۔ اگر وہ پہلے سے صاحب نصاب نہیں ہے بلکہ مستحق کرایہ سے
صاحب نصاب بن رہا ہے تو زکوٰۃ کی دیگر شروط کے ساتھ حولان حول پر زکوٰۃ لازم ہوگی۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

"وهكها وقوع الملك في البدلين ساعة فساعة (در مختار) لان المنفعة عوض

لاتبقى زمانين فاذا كان حدوثه كذلك في ملك بدله كذلك قصدا للتعادل"

جواب۔۔۔ مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم وقف ہے کسی کی ملک میں نہیں ہے زکوٰۃ کی رقم ہے
تو اس پر دوبارہ زکوٰۃ نہیں، اس کی تملیک کے بعد مالکین پر صاحب نصاب ہو جائیں تو زکوٰۃ آئے گی۔
وقف کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، اس لیے کہ (مطلق ملک) مفقود ہے۔

"واما الشروط التي ترجع الى المال فمعناها الملك فلا تجب الزكوات في سوائه والوقف

والخیل المسبلة لعدم الملك وهذا لان في الزكاة تعلیكا والتعلیك في غیر الملك

لا يتصور"

جواب۔ جو مال بطور حرام کسی کے پاس آیا، جیسے رشوت کا مال یا سود کا مال یا منسوب مال اگر علیحدہ محفوظ ہو تب تو اس پر زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی، ہاں اگر اپنے مال کے ساتھ اس طرح محفوظ کر دیا کہ تمیز مشکل ہے تو اب حضرت امام ابو حنیفہ کے قول کے مطابق اس شخص کے ذمہ میں مال غیر کا ضمان لازم ہو گیا کیوں کہ مال غیر مستہلک ہو گیا اور جب مال غیر کا ضمان ذمہ میں واجب ہو گیا تو محفوظ مال پورا اس کا مملوک بن گیا، اس لیے اس مال پر زکوٰۃ لازم ہوگی، پورے مال پر زکوٰۃ آئے گی، وراثت بھی جاری ہوگی۔

اس زمانہ میں عام طور پر لوگوں کے مال غیر کے مال سے محفوظ رہتے ہیں، وراثت کی باقاعدہ تقسیم نہ ہونے کی وجہ سے، قمار، ربوا، رشوت اور غصب کی بنا پر۔ اس لیے مالکین کے لیے تمیز و حساب دشوار ہے تو مالکین پر سہولت کی خاطر، نیز فقہاء کے لیے بھی نفع ہے، اس لیے زکوٰۃ پورے مال پر لازم ہوگی۔

لیکن مخلوط مال پر زکوٰۃ کا وجوب اس صورت میں ہے کہ جب مخلوط مال کے علاوہ حلال مال علیحدہ موجود ہو جو بقدر نصاب بھی ہو اور فاضل عن الحاجة والذین بھی ہو، جس میں خود مال حرام کا دین بھی شامل ہے اسی طرح اگر مخلوط مال میں حلال حصہ نصاب زکوٰۃ کو پہنچ جاتا ہے اور علیحدہ حلال مال مخلوط مال میں مال حرام کے دیون کو پورا کر دیتا ہو تب زکوٰۃ پورے مال مخلوط پر آئے گی۔

”لو غلط السلطان المال المنسوب بحالہ ملکہ فتجب فیم الزکوٰۃ ویورث
عنه لان الغلط استهلاك اذا لم يمكن تمیزة منذ ابی حنیفة وقوله ارفق
اذ قلما یخلو مال عن غصب وهذا اذا كان له مال غیر ما استهلكه بالغلط
منفصل عنه یوفی دینه والا فلا زکوٰۃ۔ ای ما اذا احسان له مال غیر ما استهلكه
بالغلط یفصل عنه فلا یحیط الدین بحالہ ای یفصل منه ما یبلغ نصاباً
كما کون الک خبیثاً فی الکلیۃ لو کان الغبیث نصاباً لا یلزمه الرکاة لان
الک واجب التصدق علیہ فلا یغید ایجاب التصدق ببعضہ ای ومثله
فی البزازیة“

یعنی اگر پورا ہی مال خبیث ہو تو واجب التصدق ہی ہے پھر اس کے بعض حصہ کو زکوٰۃ کی حیثیت

سے واجب التصدق کہنے میں کوئی نیا فائدہ نہیں ہے۔

جواب — ”وجلسة الكلام في الديون انتهت على ثلاثة مراتب في قول أبي حنيفة ^{رضي} قوی ودين ضعيف، ودين وسط كذا قال عامة مشائخنا امتا لقوی فهو الذي وجب بدلًا من مال التجارة كثر من عوض التجارة من ثياب التجارة وعبيد التجارة او غلة مال التجارة ولا خلاف في وجوب الزكاة فيه الا انه لا يغاطب باء شئ من زكات ما مضى مالم يفيض اربعين درهما فكلما قبض اربعين درهما ادى درهما واحداً (عند أبي حنيفة) وعند أبي يوسف ومحمد كلنا قبض شيئاً يؤدي زكوة قل المقبوض او كثر، واما للدين الضعيف فهو الذي وجب له لا بدلًا من شئ سواء وجب له بغير صنعه كاليراث او بصفه كالوصية او وجب بدلًا لعمال ليس بعمال كالمهر وبذل الخلع والصلح عن القصاص وبذل الكتابة ولا زكاة فيه مالم يقبض كله ويحول عليه العول بعد القبض۔

واما الدين الوسط فما وجب له بدلًا عن مال ليس للتجارة كثر من عبيد الخدمة وثمر ثياب البذلة والمهنة وفيه الروايتان عنه ذكر في الاصل انه تجب الزكاة فيه قبل القبض لكن لا يغاطب بالاداء مالم يقبض مأق درهم فاذا قبض مأق درهم زكى ما مضى۔ وروى ابن سماعة عن أبي يوسف عن أبي حنيفة ^{رضي} انه لا زكاة فيه حتى يقبض المأتين ويحول عليه العول من وقت القبض وهو اصح الروايتين عنه وقال أبو يوسف ومحمد الديون كلها سواء وكلها قوية تجب فيه الزكاة قبل القبض الا الدية على العاقلة و مال الكتابة فانه لا تجب فيه الزكاة اصلاً مالم يقبض ويحول عليه العول ^{لحم} دين كى تين قسمين ہیں۔ دين قوی، دين ضعيف، دين وسط۔ دين قوی وہ ہے جو کسی

کے ذمہ میں مال تجارت کے بدلہ میں واجب ہوتا ہو۔ جیسے مالی تجارت کا ٹھن، خواہ کڑے یا غلام کا ٹھن ہو، یا مال تجارت کی آمدنی ہو، دین قوی کے اندر وجوب زکوٰۃ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ گزشتہ مدت کی ادائے کی کا مکلف نہیں ہے جب تک کہ چالیس درہم قبضہ میں نہ آجائیں، جب چالیس درہم قبضہ میں آجائیں تب ایک درہم زکوٰۃ لازم ہوگی۔ اور صاحبین رحمہ کے نزدیک جس قدر مقبوض ہو کم یا زیادہ مقبوض کی زکوٰۃ لازم ہوگی۔ دین ضعیف وہ ہے جو کسی کے ذمہ بلا بدل کے واجب ہوتا ہے، خواہ اس کے وجوب میں بندہ کے فعل کو دخل ہو۔ جیسے مال وصیت یا بندہ کا فعل ذخیل نہ ہو، جیسے میراث اور دین ضعیف اس حق کو بھی کہتے ہیں جو غیر مال کے بدلہ میں لازم ہوتا ہے۔ جیسے مہر، بدل خلع اور بدل صلح عن القصاص نیز بدل کتابت، اس کا حکم یہ ہے کہ ایسے دین میں زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی، جب تک پورا مال قبضہ میں آکر اس پر سال گزر نہ جائے۔

دین وسط وہ دین ہے جو مال غیر تجارت کے بدلہ میں واجب ہوتا ہے۔ جیسے خدمت کے غلام کا ٹھن یا روزانہ استعمال کے کپڑوں کی قیمت، حضرت امام ابو حنیفہؒ سے اس دین کے حکم کے بارے میں مرویات ہیں۔ اصل میں مذکور ہے کہ دین وسط میں قبل القبض زکوٰۃ تو واجب ہوتی ہے لیکن ادا کا مکلف نہیں ہے جب تک پورے دو سو درہم مقبوض نہ ہوں جائیں، جب دو سو درہم مقبوض ہو جائیں گے، گزشتہ مدت کی زکوٰۃ لازم ہوگی۔

ادرا بن سماعہ کی روایت عن ابی یوسف عن ابی حنیفہ یہ ہے کہ دین وسط میں زکوٰۃ لازم نہیں ہے یہاں تک کہ دو سو درہم (نصاب کامل) مقبوض ہو کر اس پر قبضہ کے بعد ایک سال گزر جائے دونوں روایتوں میں امتحان روایت بھی ہے، صاحبین فرماتے ہیں، دین سب برابر اور سب قوی ہیں (فرق درجات نہیں ہے) سب سے زکوٰۃ قبضہ سے قبل ہی واجب ہو جاتی ہے۔ سوائے دین علی العاقلہ اور مال کتابت کہ اس میں زکوٰۃ بالکل واجب نہیں ہوتی، یہاں تک کہ قبضہ کے بعد سال گزر جائے۔ انتہی۔

دین میں اس حیثیت سے کہ ذمہ میں ایک حق ہے (کوئی مال مملوک رقبہ ویدائیں ہے) اس لیے زکوٰۃ بالکل واجب ہونا ہی نہ چاہیے، جس طرح مال ضماریں قبضہ نہ ہونے کی بناء پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی

اسی طرح تمام دیون میں قبضہ نہ ہونے کی بنا پر زکوٰۃ واجب نہ ہونا چاہیے، لیکن دین قوی (جس میں قرض بھی شامل ہے، فتح القدیر) مال تجارت کا بدل ہے۔ اور مال تجارت جو مبدل ہے قبضہ کے قابل ایک عین ہے جس طرح مبدل (مبیع) مملوک رقبۃً ویداً ہے، بدل (ثمن) بھی مملوک رقبۃً ویداً سمجھ لیا گیا، اس لیے اس میں زکوٰۃ لازم ہوتی ہے۔

اسی طرح دین وسط میں بھی صحیح روایت کی بنا پر زکوٰۃ لازم نہیں ہے۔ کیوں کہ بدل مال غیر تجارت ہے، چنانچہ مال غیر تجارت جب کہ حقیقۃً مقبوض ہو تو اس پر زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی تو بدل کے اندر بھی زکوٰۃ لازم نہیں ہے، مقبوض ہونے کے بعد حوالان حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

مسئلہ صورت میں اگر دین سے مراد قرض ہے تو قرض پر مقرض کے ذمہ زکوٰۃ فرض ہے کیوں کہ قرض دین قوی ہے اگرچہ ید تصرف اس پر حاصل نہیں ہے، اور مستقرض بھی اس قرض کا مالک بن چکا ہے، اگر یہ قرض مشغول بالدين ہے۔ تو مستقرض پر زکوٰۃ واجب نہیں، اگر قرض مشغول بالدين نہ ہو اور نصاب تک پہنچ جاتا ہو تو مستقرض پر حوالان حول کے بعد زکوٰۃ لازم ہوگی۔ اگر قرض نصاب تک نہیں پہنچتا، اور مستقرض پہلے سے صاحب نصاب خالی عن الدين ہے تو قرض مال استفاد میں شمار ہو جائے گا اور زکوٰۃ واجب ہوگی، مثال مٹول مؤثر نہ ہوگی، قرض مشغول بالدين ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرض مؤجل ہو طویل الابل ہو۔ مثلاً دس سال یا پانچ سال کے بعد ہی ادا کرنا ہے، اس سے پہلے کوئی مٹا نہیں ہوگا، تو اس صورت میں جیسے کہ آئندہ آ رہا ہے، مستقرض پر قرض کی زکوٰۃ آئے گی۔

اگر قرض کے سوا کوئی اور دین قوی ہے مال تجارت کا بدل ہے تو دائن (بائع) پر زکوٰۃ واجب ہوگی، جب مشتری کے پاس سے ثمن وصول ہوگا، مٹھنی کی زکوٰۃ لازم ہوگی، جس قدر وصول ہوتا جائے زکوٰۃ ادا کرتا جائے یا کم از کم چالیس درہم وصول ہونے پر زکوٰۃ ادا کرے گا۔

مدیون (مشتری) کے پاس مال تجارت آچکا ہے اس کا حساب مال تجارت میں ہوگا، مشتری پر بائع کا جو ثمن ذمہ میں باقی ہے۔ مشتری اس کا مالک نہیں ہے، نہ مشتری کا ثمن پر بحیثیت محسوس کوئی قدر قبضہ ہے، مشتری اس لیے مالک نہیں ہے کہ وہ مبیع کا مالک بن چکا اگر بدل کا مالک ہو تو بدین کا ایک ملک میں اجتماع ہو جائے گا۔ جو ظاہر الفساد ہے اس لیے مشتری پر مثال مٹول کرنے کی صورت میں کوئی زکوٰۃ ثمن پر نہیں آئے گی، مثال مٹول کا گناہ ضرور ہوگا اگر بے وجہ ہو، کیوں کہ جو مال تجارت میں مشتری

نے لگایا ہے وہ خود مشتری کا ہے۔ "الَّذِي أَحْبَبَ وَالَّذِي لَا يَتَّعَيْنُ فِي الْعُقُودِ"۔
 ہاں اگر ثمن عرض غیر معین ہو تو جب تک مشتری کے عرض تجارت میں شامل ہے تو عرض تجارت کی
 مجموعی زکوٰۃ میں شامل رہے گا۔ مشتری کے ذمہ زکوٰۃ آئے گی، عرض معین یا منفصل ہو تو مشتری پر زکوٰۃ واجب
 نہ ہوگی، کیوں کہ وہ مالک نہیں ہے، اور بائع پر دونوں صورتوں میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ تسلیم نہیں ہوئی
 اور یہ تصرف حاصل نہیں ہے۔ وَاللَّهُ تَعَالَىٰ أَعْلَمُ بِالْمَعْتُوبِ۔

جواب — پراویڈنٹ فنڈ دین ضعیف میں داخل ہے کیوں کہ بدل نمائیس بیلان ہے اجرت ہے اس لیے
 اس میں مجموعی رقم میں گزشتہ کی زکوٰۃ لازم نہیں ہے، وصول ہونے کے بعد حوالان حول پر زکوٰۃ لازم ہوگی۔
 اگر پہلے سے صاحب نصاب ہے تو مال مستفاد میں شمار ہوگا، اگر ایسا اجیر ہے جس کو ملازمت میں اپنا کچھ
 مال لگانا پڑتا ہو، جیسے صباغ (رنگریز) کہ رنگ اپنی استعمال کرتا ہے تو رنگ کی قیمت مستاجر پر دین
 قوی میں داخل ہو کر اس کی زکوٰۃ وصول ہونے پر ادا کی جائے گی۔

دوسری شرط نما،

نما، کا معنی زیادت و اضافہ ہے، مال نامی میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔
 نما، خواہ حقیقتہً مال میں ہو رہا ہو جیسے اموال تجارت اور سامانہ جانور۔ خواہ نما، حکماً موجود
 ہو جیسے سونا، چاندی میں۔ لیکن کسی بھی صورت میں نما، کا بالفعل ہونا ضروری نہیں ہے، مقصد یہ ہے کہ مال
 کو طلب زیادت کے لیے تیار رکھنا، خواہ بالفعل زیادت ہو رہی ہو جیسے دکان کھلی ہے اور بکری جاری ہے
 یا تقدیراً نما، موجود ہے جیسے دکان بند ہے آٹھ دس روز کے لیے یا کھلی ہے مگر گاہک نہیں ہے تو اگرچہ
 بالفعل نما، نہیں ہے لیکن تقدیراً اس کو مال نامی کہتے ہیں، اسی طرح سونا اور چاندی کہ فطرۃ نما، کے
 لیے ہے کسی بھی تجارت میں ثمن بننے کی صلاحیت فطری طور پر اس میں موجود ہے، طلب زیادت کی
 اہلیت رکھتا ہے، اگرچہ مدتہائے دراز سے قفل میں بند ہو لیکن بالقوة نما، اس میں موجود ہے۔
 ان کے علاوہ وہ اموال جو برائے استعمال ہیں اس میں نما، حاجت اصلیہ سے بڑھ کر نہیں
 ہوتا اس میں نما، ہو بھی جیسے پالتو جانوروں میں تو زیادت بھی حاجت اصلیہ میں مشغول ہوتی ہے۔

حاجتِ اصلیہ کی تعریف اور اس کا دائرہ

”الحاجة الأصلية وهي ما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقاً كالنفقة ودور السكنى والآلات الحرب والثياب المحتاج اليها لدفع الحر والبرد أو تقدير كالدین فان المديون محتاج الى قضاائه بما في يده من النصاب دفعاً عن نفسه الحبس الذي هو كالهلاك وكالات العرف واثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لاهلها فان الجهل عندهم كالهلاك“

”حاجتِ اصلیہ جو انسان کو ہلاکت تحقیقی یا تقدیری سے محفوظ رکھے، ہلاکت تحقیقی سے حفاظت کی صورت نفقہ میں ہے کہ انسان روزمرہ کے خرچ، رہنے کے لیے گھر آلات جنگ اور سردی و گرمی سے بچنے کی خاطر ضروری کپڑوں کے بغیر ہلاک ہو جائے گا، اور تقدیری ہلاکت جیسے کہ قرض ہے، قرض اگرچہ صاحبِ نصاب ہو لیکن اس کو اپنا مقبوض نصاب کی ادائیگی کے لیے خرچ کر دینا ضروری ہوتا ہے، اپنی ذات کو قید سے بچانے کے لیے جو ہلاکت کی طرح ہے، کسب معیشت کے لیے آدمی کو ضروری ہے، آلاتِ حرفت کی، گھر کے ضروری سامان کی، سواری کے لیے جانور کی اور اہل علم کے لیے کتبِ علم بھی ضروریات میں شامل ہیں کیوں کہ جہالت ان کے نزدیک موت کی طرح ہے۔“

حاجتِ اصلیہ کی تعریف جامع ہر زمانہ کی حوائجِ اصلیہ پر حاوی ہے اس لیے کوئی نئی تعریف کی جستجو کی ضرورت باقی نہیں رہتی، نفقہ ہر زمانہ کے معیار اور ہر شخص کی اپنی حالت کی لحاظ سے معتبر ہوگا، اسی طرح گھر کا معیار بھی ملحوظ رہے گا، ہاں آلاتِ جنگ صرف مدافعتِ نفس کی حیثیت و ضرورت کے لحاظ سے مطلوب ہوں گے کیوں کہ اجتماعی مدافعت کی ذمہ داری اس دور میں جنگ کی بدلتی ہوئی شکلوں کے ساتھ حکومت اور خاص فوجوں کی ذمہ داری میں داخل ہے، عوام کو ایسے آلاتِ جنگ کی ضرورت نہیں ہے۔ کپڑے بھی زمانہ، ملک اور موسم کے لحاظ سے مطلوب ہوں گے، اسی طرح آلاتِ حرفت، حرفت کی بدلتی ہوئی

شکلوں کے مطابق ملحوظ ہوں گے، اس زمانہ میں بڑی بڑی فیکٹریاں بھی آلاتِ حرفت میں محسوب ہو جائیں گی، امارت منزل ہر شخص کی اپنی ضرورت، رہن و سہن کے تقاضے کے مطابق مطلوب ہوتا ہے، مثلاً فرنیچر ایک ڈاکٹر کے لیے اس کے معیار کا ہوگا، ایک عالم کے لیے اس کے معیار کا ہونا چاہیے۔ جس میں مثلاً کتب کی الماریاں اور ملنے والے احباب کے لحاظ سے گھر کا اسباب ہوگا، تاجر کے لیے فون اور دیگر خصوصیات کے لحاظ سے فرنیچر ہوگا، مطبع کا اسباب اعلیٰ و ادنیٰ شہر و دیہات کے لحاظ سے جدا ہو سکتا ہے، کوکر گیس، بجلی، فریج وغیرہ جدید کھانے پکانے کے آلات کا معیار ہر شخص کا جدا ہو سکتا ہے، غرض کہ ملک ملک، موسم موسم، عرف عرف اور معیار معیار کا فرق ملحوظ رہے گا، دستی گھڑی بھی اور دیوار یا ٹیمبل گھڑی بھی ضروریات میں داخل ہے آج کل عالم کا کل نظام گھڑی سے وابستہ ہے، سواری کے لیے ایک اسکوٹر، یا کم از کم سائیکل یا بس رکشہ وغیرہ کا کرایہ ضروریات میں داخل ہو سکتا ہے، سفر میں آدمی کی شان کے لحاظ سے A کلاس اور B کلاس کا فرق بھی پیش نظر رہنا چاہیے خاص پیشہ والے جن کو کار کی ضرورت ہو ان کے لیے کار بھی ضروریات میں داخل ہو سکتی ہے۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

اگر حکومت کا دین مؤجل ہے جس کی میعاد طویل الاجل ہو اور عام طور پر حکومت کے قرضہ میں اہل سے پہلے مطالبہ نہیں ہوتا اس لیے اس قسم کے طویل المیعاد قرض مؤجل میں مقروض جس قدر ایک سال میں ادا کرتا ہے اس قدر اموال تجارت میں سے منہا کر کے کل مال تجارت کی زکوٰۃ ادا کرے، کیوں کہ اس قرض میں بالفعل مطالبہ من جہۃ العباد نہیں ہے نیز جب ہر سال ادائیگی جانے والے قرض کو زکوٰۃ کے اموال میں سے منہا کر دیا گیا تو مثلاً پالیس سال میں جو مجموعی رقم گورنمنٹ کو ادا کی ہے، اس مجموعی قرض کی زکوٰۃ منہا ہو جائے گی، اور یہی مطلوب ہے۔

چنانچہ قرض مؤجل کے بارے میں علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں :

”او مؤجلًا۔ مضافاً إلى المعراج إلى شرح الطحاوی وقال عن ابی حنیفۃ لا یمنع

وقال الصدر الشہید لا رواۃ فیہ ولكن من المنع وعدم وجہ زاد القہستانی عن

الجواہر الصیح اند غیر مانع“

کمپنیز پر زکوٰۃ

اگر تمام یا بعض شرکاء صاحب نصاب ہیں تو ان پر زکوٰۃ لازم ہوگی، ان کے اپنے اپنے اموال کے لحاظ سے خواہ وہ اموال کمپنی میں شامل ہوں یا خارج ہوں اگر کوئی بھی صاحب نصاب نہیں ہے تو کمپنی پر مجموعی لحاظ سے (احناف کے نزدیک) زکوٰۃ واجب نہیں ہے، البتہ انفرادی حیثیت سے جو بھی صاحب نصاب ہو اس پر زکوٰۃ آئے گی، ایک شخص ایک کمپنی میں اپنے حساب کے لحاظ سے صاحب نصاب نہیں ہے لیکن اس حصّہ کو اپنے گھر میں رکھے اموال زکوٰۃ کے ساتھ یا دوسرے اموال تجارت کے ساتھ حساب میں لایا جائے تو صاحب نصاب بن جاتا ہے، تو اس حیثیت سے دوسرے اموال زکوٰۃ کے ساتھ اس حصّہ کی زکوٰۃ بھی اس شخص پر لازم ہوگی۔

”ولا تجب الزکوٰۃ عندنا فی نصاب مشترک من سائمة و مال تجارة وان تعدد

النصاب تجب اجماعاً“

ہیرے جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے جواہرات اور اموال غیر نامیہ پر بالاتفاق زکوٰۃ نہیں ہے، اگرچہ ہزاروں کی قیمت پر پہنچیں جس طرح غیر نامی زمین و جائداد پر نہیں ہوتی، اگر تجارت کے لیے ہوں تو اموال تجارت کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اسی طرح غورتوں کے ہیرے جواہرات کے زیور پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

اموال تجارت میں زکوٰۃ وقت ادا میں عام بازاری بھاؤ کے حساب سے ادا کی جائے گی، اگر تھوک ہے تو تھوک کا بازاری بھاؤ، پھنکر ہے تو پھنکر کا بازاری بھاؤ، دونوں طرح تجارت ہو تو تمیز ممکن ہو تو دونوں کے لحاظ سے درجہ غالب جو بھی ہو، اس کا لحاظ کر لیا جائے۔

اگر کوئی شخص گزشتہ کئی سالوں کی زکوٰۃ ادا کر رہا ہے تو ظاہر بات ہے کہ نہ وہ مال اس وقت

موجود ہے نہ وہ بھاؤ ہے اس لیے اس کو گزشتہ ہر سال کے (انتہام پر جو اس کے لیے یوم ادا کا حکم رکھتا ہے) لحاظ سے زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔

”وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقال يوم الاداء وفي السوائف يوم الاداء اجماعاً
وهو الصحيح اي كون المعتبر في السوائف يوم الاداء اجماعاً، هو الصحيح
فانه ذكر في البدائع انه قيل ان المعتبر عنده فيسها يوم الوجوب وقيل
يوم الاداء وفي المحيط يعتبر يوم الاداء بالاجماع وهو الاصح فهو تصحيح
للقول الثاني الموافق لقولهما وعليه فاعتبار يوم الاداء يكون متفقاً عليه
ومندهم“

اراضی تجارت کی زکوٰۃ میں یوم ادا کے بازاری نرخ کا اعتبار کرنا چاہئے۔ متوقع نرخ نہ اس وقت
موجود ہے نہ اس کا حصول ضروری ہے۔ سودا ہی نہ ہو ایک دو سال گزر جائیں یا بھاؤ ہی گھٹ جائیں، اس
لیے متوقع پر مدار رکھا ہی نہیں جاسکتا، متوقع مل جائے گا تو نقد میں مال استفاد کی حیثیت سے شامل
ہو جائے گا۔

شیرز پر زکوٰۃ

شیرز کی حقیقت کے لحاظ سے یہ اشتراک فی التجارت ہے، اس لیے تجارتی سرمایہ ہونے کی
حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر کمپنی میں حصہ دار آلات حرفت (فیکٹری) میں ہے تو آلات حرفت پر زکوٰۃ
نہیں ہوتی، اس لیے ایسے شیرز پر زکوٰۃ نہیں ہوگی، ہاں جو آمدنی شیرز سے حاصل ہوگی، اس پر زکوٰۃ لگے گی
وقت ادا میں شیرز کا بوبھاؤ مارکیٹ میں ہو گا وہ معتبر ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

بوندس

بذکورہ صورت میں بوندس قرض ہے، دین قوی ہے اس کی زکوٰۃ جس قدر وصول ہوتا
جائے ادا کرنی ہوگی، گزشتہ سالوں کی بھی ادا کرنا ہوگی، اگر پہلے سے صاحب نصاب ہے تو حوالان حول کھر
شرط بھی نہیں اگر سال بہ سال کر دیتا ہے اور صاحب نصاب ہے تو جائز ہے، یہ زکوٰۃ مواہل شمار ہوگی۔

محورثانی سونا اور چاندی میں سے جس نصاب کا بھی مالک ہو جائے صاحب نصاب کو غنی قرار دیا جائے گا، اس بارے میں ادنیٰ نصاب کا اعتبار ہوتا ہے، اسی طرح مال تجارت کے نصاب کی تقویم کے لیے ادنیٰ نصاب کا اعتبار ہوگا، اس زمانہ میں چاندی ادنیٰ ہونے کی وجہ سے تقویم کے لیے متعین ہے، نفع للفقراء بھی یہی ہے،

”ولو بلغ باحدھما نصابا دون الآخر تعین ما یبلغ بہ“

محورثالث مصارف زکوٰۃ

غیر مستطیع طالب علم کو اگر زکوٰۃ کا چک دیدیا جائے اور طالب علم اس چک کے وصول کرنے کا مجاز مدرس کو بنا دے، مدرس چک کی رقم وصول کر لے یا خود طالب علم چک کی رقم وصول کر کے مدرس میں دیدے تو تملیک کی صورت ہو جاتی ہے یہ صورت جائز ہے۔

مہتمم کی وکالت مہتمم مدرسہ مستحقین زکوٰۃ (طلبہ) کا وکیل نہیں ہے اس لیے کہ طلبہ نے اس کو وکیل نہیں بنایا تو وکیل نام ہے اقامۃ الغیر مقام نفسہ، تو جب تک طلبہ کی طرف سے اپنی خاطر کسی خاص رقم کے وصول کرنے کیلئے مہتمم کو وکیل بنایا نہیں جائے گا، تو وکیل وجود میں نہیں آئے گی، معین طلبہ یا طلبہ کی انجمن مہتمم کو وکیل بنا دے یا ہر طالب علم سے داخلہ کے وقت داخلہ فارم میں تو وکیل کرائی جائے تو مہتمم وکیل بن جائے گا۔ وکیل کو کل کا نائب ہوتا ہے:

”لیس کل اجر توکیل بل لا بد مما یضیکون فعل المامور بطریق النيابة عن

الأخر۔ فلیحفظ“

کیا سفیر عاملین علیہا میں داخل ہے؟

چندہ وصول کرنے والا سفیر محض سفیر اور رسول ہے، وکیل و نائب نہیں ہے، رسول کے لیے کسی بھی عقد میں عقد کی اضافت مرسل کی طرف ضروری ہوتی ہے، وکیل کے لیے کسی کام میں وکیل کی طرف نسبت ضروری نہیں ہے، سوائے امور چند کے (نکاح، خلع، صبیہ وغیرہ)

سفیر معطین زکوٰۃ کا نائب ہے نہ مستحقین کا، اس لیے کہ عمل تو وکیل حقیقتاً حکماً موجود نہیں ہے

سفیر صرف مدرسہ کا رسول (قاصد) ہے، سفیر مدرسہ کے نام سے چندہ کرتا ہے، مدرسہ کی رسید پیش کرتا ہے، تب ہی اس کو معطین معتمد سمجھتے ہیں، یہی رسالت کی حقیقت ہے، نام بھی تو اس کا سفیر ہے۔
جب سفیر کسی کا نائب نہیں ہے تو سفیر کو "العالمین علیہا" کے حکم میں شمار نہیں کیا جاسکتا، عامل زکوٰۃ سلطان کا نائب ہوتا ہے؛

”واما العالمون علیہا فہم الذین نصبہم الامام لجباية الصدقات“

عالمین وہ ہیں جن کو امام وصول صدقات کے لیے مقرر کرتا ہے۔ (بدائع)

عامل کا پورا وقت تحصیل زکوٰۃ میں صرف ہوتا ہے، عامل کو جو کچھ بھی ملتا ہے وہ بطور اجرت نہیں بلکہ اپنے اور اپنے اعوان کی کفایت کی حیثیت سے ملتا ہے، عامل خود مصرف میں شامل ہے، اس کا حق اس مال زکوٰۃ سے متعلق ہوتا ہے جو اس نے وصول کیا ہے اگر اس کا وصول کردہ مال ہلاک ہو جائے تو عامل کا حق بھی ساقط ہو جاتا ہے، نیز عامل کا یہ حق مال زکوٰۃ میں اس لیے متعلق ہوتا ہے کہ درحقیقت اصحاب مال کے کام میں وہ مصروف ہے یعنی ان کی زکوٰۃ سلطان یا امیر تک لے جاتا ہے، اس لیے ان کے اموال میں اس کی کفایت متعلق ہوتی ہے۔

اس کی عمارت کو اجرت قرار نہیں دے سکتے اس لیے کہ عمارت مجہول ہے کیوں کہ عامل اور اس اعوان کے لیے کفایت کی مقدار متعین نہیں مجہول ہے، حضرت امام شافعیؒ کے یہاں بھی اس کو اجرت قرار نہیں دے سکتے، اس لیے کہ عامل کا عمل مجہول ہے، وہ کس قدر صدقات لائے گا معلوم نہیں اس لیے اجرت نامعلوم ہو جائے گی، اور اجارہ میں بد لین میں سے کسی کی بھی جہالت اجارہ کے جواز کے لیے مانع ہے تو پھر یہاں تو دونوں بدل مجہول ہیں۔

ظاہرات ہے کہ سفیر مدرسہ نہ سلطان کی طرف سے ساعی ہے کہ اس پر ذمہ داری ہے، خود کو تحصیل زکوٰۃ کے لیے فارغ رکھنے کی نہ مدرسہ تحصیل زکوٰۃ کا حق لازم رکھتا ہے نہ معطین پر مدرسہ میں دینا واجب ہے سفیر کی حیثیت محض اجیر کی ہے، عامل کی حیثیت اجیر کی نہیں ہے اس لیے سفیر عامل کے حکم میں نہیں ہے، ہاشمی کو عمارت سے ممانعت ہے، عمارت اگر اجرت ہوتی تو ہاشمی کو ممانعت نہ ہوتی۔

سوالات کے جوابات

مبیع قبل القبض کی زکوٰۃ

از۔ مولانا انور علی الاعظمی۔ دارالعلوم، ملتان، یو پی۔

۱۔ جس مال کی قیمت ادا کر دی گئی لیکن اب تک مال کی وصولی نہیں ہو سکی ہے اگر مبیع مکمل ہے تو قبضہ سے پہلے مبیع کو اپنے اموال زکوٰۃ میں شمار کیا جائے گا اور مشتری پر اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی، جیسا کہ محیط سرخسی کے حوالہ سے عالمگیری میں مذکور ہے :

”واما البیع قبل القبض لا يكون نصابا والصحيح انه يكون نصاباً“

اور جو رقم بطور ثمن کے بائع کے حوالہ کی جا چکی ہے اس کا ذمہ دار بائع ہے، اگر بائع صاحب نصاب ہے تو زکوٰۃ میں اس قیمت کو بھی شامل کرے گا، کیوں کہ یہاں ملکیت اور قبضہ دونوں موجود ہیں

ڈپازٹ کی زکوٰۃ کا حکم

۲۔ کرایہ کے مد میں دی گئی پیشگی رقم جو عقد اجارہ فسخ ہو جانے پر کرایہ دار کو واپس کی جاتی ہے اس کی زکوٰۃ کسی پر واجب نہیں نہ کرایہ دار پر نہ مالک مسکن پر، بلکہ وہ مثل رهن کے ہے، رهن کی زکوٰۃ رهن پر بھی نہیں ہوتی، کیوں کہ اس کا قبضہ نہیں اور مرہن پر بھی نہیں، اس لیے کہ اس کی ملک نہیں تو ملک تام جو ملکیت اور قبضہ کے مجموعہ سے وجود میں آتی ہے وہ کسی کے حق میں موجود نہیں، لہذا زکوٰۃ کا وجوب کسی پر نہیں ہوگا :

”ولا في مرهون بعد قبضه اي لا على الرهن لعدم ملك الرقبة ولا على“

مال حرام کی زکوٰۃ کا حکم

۳۔ سود اور رشوت کے مال کا صدقہ بلا نیت ثواب واجب ہے یا اگر مالک اصلی کی طرف لوٹانا ممکن ہو تو لوٹانا واجب ہے، اس لیے ایسے مال میں زکوٰۃ کے وجوب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کیوں کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے جس کو ثواب ہند کے لیے کیا جاتا ہے۔

حرام مال حلال میں اس طرح گھل مل گیا کہ تمیز مشکل ہے تو اس صورت میں بھی صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک ملکیت ثابت نہیں ہوگی، لہذا زکوٰۃ کا وجوب اور وراثت اصل مالک ہی سے متعلق ہوں گے، لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس صورت میں حق غیر کا تعلق ذمہ سے ہوگا، عین مال سے نہیں، لہذا عین مال حرام کا امتیاز ختم ہو جانے کی بنا پر پورے مال پر ملکیت ثابت ہوگی، اور زکوٰۃ کا تعلق مجموعہ مال سے ہوگا، علامہ مصطفیٰ فرماتے ہیں امام صاحب کا قول قول ارفق ہے اور قابل عمل ہے۔

دین کی زکوٰۃ کا حکم

۴۔ دین کی زکوٰۃ دائن ہی پر واجب ہوگی، مدین پر نہیں، مدین صاحب غنا ہونے کے باوجود ادا کرنے میں ٹال مٹول کر رہا ہے تو وہ اپنے اس رویہ میں بلاشبہ ظالم ہے، لیکن وہ اس مال کا مالک نہیں، البتہ اس کے ذریعہ جو نفع کما رہا ہے اس کی زکوٰۃ کا وہ ذمہ دار ہے۔

موجودہ تجارتی نظام میں بڑے پھوٹے ہر طرح کے تاجر کے مال کا بڑا حصہ ادھار رہتا ہے، بغیر ادھار کے اس زمانہ میں تجارت اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، تجارتی قرض جو فقہاء کے یہاں دین قوی کہا جاتا ہے، اس کی زکوٰۃ واجب ہے، امام ابوحنیفہ قبضہ کے بعد وجوب کے قائل ہیں، لیکن اگر متوقع قرض کی زکوٰۃ مالک اپنے موجودہ مال کی زکوٰۃ کے ساتھ ادا کر دے تو اس میں اس کے لیے بڑی آسانی ہے اس لیے کہ تجارتی قرض وقفے وقفے سے وصول ہوتا ہے تو ہر قرض کے وصول ہونے پر زکوٰۃ کا اہتمام

کرنا ایک مشکل امر ہے، ابو عبید نے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابن عمرؓ اور جابر بن عبد اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے، اور تابعین میں سے حضرت جابر بن زید، مجاہد اور ابراہیمؒ بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں، لیکن اگر قرض دو چار سال تک موصول نہیں ہوتا اور مالک اس کی زکوٰۃ بھی نہیں دیتا، تو ملنے کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دے گا، البتہ ایسا قرض جس کے ملنے کی امید نہیں ہے جو شریعت کی اصطلاح میں مال ضمار کہلاتا ہے اس کی زکوٰۃ وصولیابی کے بعد سال گزرنے پر ادا کی جائے گی، ایام ماضیہ کی زکوٰۃ احناف کے نزدیک واجب نہیں۔

پراویڈنٹ فنڈ

۵۔۔۔ پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ وصول ہونے کے بعد سال گزرنے پر ادا کی جائے گی مدت ملازمت میں جب کہ وہ رقم ہماری ملک تمام میں نہیں آئی اور اس کا کوئی فائدہ بھی ہم کو نہیں پہنچ رہا ہے تو اس کی مالک ذمہ داریاں بھی ہم پر عائد نہیں ہوتی، اور اس رقم کی مثال مال ضمار کی سی ہے، اس مال پر صاحب مال کی ملکیت ہے، لیکن اس سے کوئی نفع حاصل نہیں ہوتا، اس کی زکوٰۃ بھی وصولیابی اور مولان تول کے بعد واجب ہوتی ہے۔

”لا زکوٰۃ فی مال الضمار وهو مال لا يمكن الانتفاع به مع بقاء المثل“

دوسری شرط ”نما“

کوئی سادین مانع زکوٰۃ ہے؟ جس دین کا مطالبہ من جہتہ العباد ہو دین مانع زکوٰۃ ہے، مہر مؤجل جس کا عورت کی طرف سے سالہا سال تک کوئی مطالبہ نہیں ہوتا وہ مانع زکوٰۃ نہیں، اس کے علاوہ دوسرے دیون مؤجلہ کے مانع زکوٰۃ ہونے میں مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ تینوں مسلک کے مجہور فقہاء کی اراہ اثبات میں ہیں، معراج میں شرح طحاوی کے حوالہ سے منقول ہے کہ مانع نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ سے یہاں مروی ہے، لیکن صدق شہیدؒ کی رائے یہ ہے کہ اس مسئلہ میں صاحب مذہب سے کوئی روایت نہیں، اور مانع ہونے اور نہ ہونے میں دونوں کی وجہ موجود ہے، اور قہستانی نے جواہر کے حوالہ سے یہ اضافہ کیا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ دین مؤجل مانع نہیں ہے، حکومت کی طرف سے ملنے والے طویل الیعاد قرضے بھی مؤجل ہوتے ہیں، لہذا ایک سال میں جو واجب الاداء

قسط ہے وہ زکوٰۃ سے مانع ہوگی، اور بقیہ اقساط مانع نہیں ہوں گی۔

کمپنی پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی حالت کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ شرکاء کی انفرادی حیثیت کا اعتبار ہوگا، ایک مسلمان کے حصے میں کمپنی کا جو حصہ آتا ہے اس میں جو مقدار عمل زکوٰۃ ہے اگر وہ نصاب کو پہنچ جائے تو اس کی زکوٰۃ دی جائے گی، اور اگر وہ تنہا نصاب کو نہیں پہنچتی، لیکن حصہ دار کے پاس الگ سے نصاب موجود ہے، یعنی دونوں ملکر نصاب کو پہنچ جاتے ہیں تو وہ زکوٰۃ دے گا ورنہ نہیں۔ الغرض کمپنی کی زکوٰۃ اس کے ڈائریکٹر کو نہیں نکالنی چاہیے، بلکہ حصہ داروں کو اپنا حصہ معلوم کر کے خود اس ذمہ داری پر عمل درآمد کرنا ہوگا۔

ہیرے اور جواہرات کی زکوٰۃ

۱۔ خواتین جو آرائش کے لیے ہیرے اور جواہرات استعمال کرتی ہیں، اس کی ان پر زکوٰۃ نہیں، اسی طرح مرد جو سرمایہ محفوظ کرنے کی نیت سے ہیرے جواہرات خرید کر اکٹھا کرتے ہیں، اصولی طور پر ان پر بھی زکوٰۃ کو واجب نہیں، کہا جاسکتا لیکن ظاہر ہے اگر ان کا مقصد زکوٰۃ سے فرار حاصل کرنا ہوگا تو چاہے وہ اس حیلے سے اپنی زکوٰۃ بچالیں، مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں مواخذہ سے نہیں بچ سکتے۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

۲۔ اموال تجارت کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ مال جو تاجر خود تیار کرتا ہے اور دوسرے وہ مال جو بازار سے خریدتا ہے، دونوں قسموں پر حولان حول کے بعد حقوق قیمت فروخت کو بنیاد بنا کر زکوٰۃ نکالی جائے گی، یعنی زکوٰۃ نکالنے میں اصل سرمایہ اور اضافہ شدہ مال یعنی منافع دونوں ہی جوڑے جائیں گے، جمہور فقہاء کی یہی رائے ہے، اگرچہ ابن عباسؓ کی رائے میں فروخت ہونے تک انتظار کریں گے اور بقول ابن شداد قیمت خرید کا اعتبار ہوگا، لیکن جمہور فقہاء کی رائے وی ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔

شیرز اور بونڈش کی زکوٰۃ

تجارتی کمپنیوں کے شیرز پر زکوٰۃ واجب ہوگی، کیوں کہ شیرز کمپنی میں لگے ہوئے سال تجارت کا ہی حصہ ہوتے ہیں جس طرح دوسرے اموال تجارت زکوٰۃ کا محل ہیں اس طرح یہ شیرز بھی ہیں ان پر بھی زکوٰۃ نصاب کی مقدار کو پہنچنے کے بعد یا اپنے دوسرے مالوں کے ساتھ مل کر واجب ہوگی، شیرز کی مالیت کا تعین ادا لے گی کے وقت بازار کے بھاؤ سے ہوگا، کیوں کہ زکوٰۃ اصل مالیت اور منافع کے مجموعہ پر جاری ہوتی ہے۔

بونڈش ایک قرض ہے جو مالک اپنے اختیار سے کسی کمپنی یا حکومت کو دیتا ہے اور یہ قرض دین قوی کے قبیل سے ہے اس لیے تمام سالوں کی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی، چاہے تو اپنے دیگر مالوں کے ساتھ سال بسال دیتے رہیں یا بونڈش کیش کرانے کے بعد بھی گزرے ہوئے سالوں کی اکٹھا دیں۔

نصاب زکوٰۃ

چاندی اور سونے کے نصاب وہی نصاب بنیاد تسلیم کیا جائے گا جو انفع للفقراء ہو، بعض عرب علماء، جیسے علامہ یوسف قرضاوی اور احمد عبدالعزیز المزینی اور دوسرے لوگوں نے بھی اس زمانہ میں سونے کے نصاب کو اصل قرار دیا ہے، استاذ ابو زھرہ، خلاف ابو حسن کی بھی یہی رائے ہے، علامہ یوسف قرضاوی تحریر فرماتے ہیں کہ ہماری رائے میں سونے کے نصاب کو اصل بنانا معنی براعتدال و بلحاظ قوی ہے، ہم دیگر اموال کے نصاب کے ساتھ اس کا تقابل کرتے ہیں تو موجودہ زمانہ میں ہمیں سونے کا نصاب ہی ان سے قریب تر دیکھنا دیتا ہے، آج پانچ اونٹ یا چالیس بکریوں کی قیمت تقریباً چار سو دینار ہوتی ہے پھر کس طرح ممکن ہے کہ نقدی کی اتنی قلیل مقدار پر زکوٰۃ عائد کی جائے کہ جس سے ایک بکری بھی نہ خریدی جاسکے علامہ یوسف قرضاوی کی اس دلیل سے ہمیں اتفاق نہیں، ممکن ہے کہ ان کے ملک میں چاندی بہت سستی ہو، اور بکریاں بہت مہنگی ہوں لیکن ہمارے ملک میں ساڑھے باون تولہ چاندی تقریباً پانچ ہزار روپے کے برابر ہوتے

ہیں اور اتنے روپے میں دس کمریاں بآسانی خریدی جاسکتی ہے لہذا چاندی کو نصابِ زکوٰۃ کے مسئلہ میں اصل حیثیت آج بھی حاصل ہوگی۔

مصارفِ زکوٰۃ

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے جو شکلِ سوال میں تحریر کی گئی ہے وہ بہت موزوں اور واقعہ کے مطابق ہے صمیم ہے کہ مدرسہ کا سارا خرچ طلبہ کی خدمت یا متعلقہ اتمغائی امور پر ہوتا ہے اس لیے سارے خرچ کو ماہانہ طلبہ پر تقسیم کر دیا جائے اور نقد رقم یا چیک دیکر ان سے وصول کر لیا جائے، بہتر یہ ہے کہ وصول کی جانے والی رقم سے دس بیس روپے زیادہ ہی ان کو دیا جائے تاکہ مکمل طور پر تملیک کا اظہار ہو اور میلہ تملیک سے نجات مل جائے، اگر یہ طریقہ اہل مدارس قبول کر لیں تو زکوٰۃ دینے والوں اور مدارس کے اربابِ اہتمام دونوں ہی صمیم طور پر اپنے اپنے فرائض منصبی سے بری الذمہ ہو جائیں گے۔

۳۔۔۔۔۔ مدارس کے سفر نامہ "والعالمین علیہا" کا مصداق نہیں ہیں۔ عامل وہ شخص ہے جس کو مسلمانوں کا امیر و مولیٰ مہدقات کے کام پر مامور کرے، جصاص کی احکام القرآن میں اس بات کی صراحت ہے:

"هو الذی یبعثہ الامام لایخذ الصدقات"

مدارس کے ذمہ داران امام نہیں اور ان کے متعین کیے گئے ہر شخص کو جبری و مولیٰ کا اختیار بھی نہیں ہے سفر نامہ کے تقریر اور تنخواہ کے مسئلہ میں دو صورتیں ہیں۔ پہلی دیگر کام کرنے والے ملازمین کی طرح باقاعدہ ماہانہ تنخواہ پر سفیر رکھے جائیں، یا اگر مدرسین ہی سے ٹیٹیوں میں کام لیا جا رہا ہے تو ان کی تنخواہ ڈبل کر دی جائے پھر ادارہ اپنے حالات کے اعتبار سے ان میں نشاط پیدا کرنے کے لیے مزید سہولیات مثلاً سفر خرچ اور انعام و اکرام وغیرہ دے سکتا ہے، اس سے آمدنی میں اضافہ کا امکان بھی بحال رہے گا، اور بے اعتدالی نہیں پیدا ہوگی، کمیشن پر چندہ کرنے سے ہمیں اتفاق نہیں، اگرچہ موجودہ حالات میں ہر کاروبار میں کمیشن کا رواج ہو جانے سے اسے جہالتِ اجرت مغضی الی النزاع کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، لیکن اس لائن سے دوسری بے اعتدالیوں پیدا ہونے کے شدید امکانات ہیں۔ کمیشن کی اجازت کے بعد سب سے بڑا مسئلہ اس کی تحدید کا پیدا ہوگا، بعض چھوٹے مدارس میں پچاس فیصد کمیشن ملے کر کے سفر نامہ کا کام نہیں چلے گا، اور بڑے مدارس میں پانچ فیصد کمیشن پا کر ایک مہینہ میں پچاس ہزار کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

فی سبیل اللہ

فی سبیل اللہ کے موضوع پر لمبی گفتگو کی ضرورت نہیں محسوس ہو رہی ہے، قرآن کے اولین مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ہیں، ان کے علوم کے امین اور محافظ تابعین اور تبع تابعین ہیں، یہ تینوں ادوار مشہود لہذا بالخیر جس چیز پر متفق ہیں ان سے تجاوز کرنا ایک بڑے خطرہ کا پیش خیمہ ہے، آج ہم میں تقویٰ، خشیتِ الہی کا فقدان ہے، آماشا اللہ فی سبیل اللہ پر ایک بندھن اور روک ہے اور اسے ختم کر دیا گیا، اور صحابہ اور تابعین کی فہم سے عدول کیا گیا، تو کس ونا کس فی سبیل اللہ کے نام سے صدقات کھائے گئے اور وصول کر کے ذخیرہ کرے گا۔ مستحق افراد یا اداروں کے لیے آج بھی راستے کھلے ہیں اور جو آدمی یا ادارہ خواصۃً للہ کام کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی کفالت فرما رہے ہیں، پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ادارے اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں، لیکن ان اداروں کی ضروریات کو سامنے رکھ کر اگر فی سبیل اللہ میں توسیع کی گئی تو بدنیت اور حریص عناصر اس کا غلط استعمال کریں گے، آج بھی کرتے ہیں لیکن پھپکرا، اور علم امر کی تصدیق کے بعد علی الاعلان کریں گے، اس لیے فی سبیل اللہ کے بارے میں میرا موقف وہی ہے جو صحابہ اور تابعین اور ائمہ مجتہدین کا ہے۔

(فقط واللہ اعلم بالصواب)

نصاب زکوٰۃ

انہ ————— مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی (مدرسہ احمدیہ ابا بکر پورہ، ضلع ویشالی)۔

نصاب زکوٰۃ میں قدر مشترک غنا اور مالداری ہے اور مصارف میں وجہ استحقاق کی قدر مشترک ناداری اور افلاس، اس لیے اصل نصاب کی تعیین میں دونوں کے مفاد کی رعایت ضروری ہے تاکہ شریعت کا منشا بھی پورا ہو اور مالداروں پر غیر ضروری بوجھ بھی نہ پڑے، یہی وجہ ہے کہ اہادیث مقدمہ میں مختلف اصناف مختلف انواع اشیا میں وہ کم سے کم مقدار اور مالیت کی تعیین کر دی گئی ہے، جس کی موجودگی میں انسان صاحب نصاب اور مالدار سمجھا جاتا ہے، اور جنہیں فقہ کی متداول کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے، یہاں اس تفصیل میں جانے کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ موقع، بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اگر مختلف اشیا کا نصاب الگ الگ اقل حد کو پہنچ رہا ہو تو زکوٰۃ کی ادائے کی مقررہ اور متعین مقدار و تعداد میں کمی جائے گی، اور اسے ہی اصل مانا جائے گا۔

بحث طلب مسئلہ یہ ہے کہ مختلف اشیا موجود ہوں، مگر ان میں سے کوئی الگ الگ نصاب کی اثر مد تک نہ پہنچے یا اموال تجارت ہوں تو ایسے میں کیا کیا جائے، ضم نصاب میں کس کی رعایت کی جائے اور تقویم میں کسے معیار مانا جائے۔

اس سلسلے میں دو اہم اصول فقہاء نے بیان کیے ہیں: ————— پہلا یہ کہ تعیین نصاب اور ضم نصاب میں فقرا کی رعایت کی جائے گی اور دیکھا جائے گا کہ نفع للفقرا کی صورت کون سی ہے، فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے:

”يقومها بعماهو انفع للمساكين احتياطاً لحق الفقراء“ ۱

فقرالدین عثمان بن علی زلمی لکھتے ہیں :

”ويعتبر فيهما الانفع ابهما كان انفع للمساكين“ ۲

فتاویٰ ہندیہ میں ہے :

”يجب ان يكون التقويم بعماهو انفع للفقراء قدرًا وسرًا“ ۳

۲۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ تقویم میں تخمیر کے باوجود اعتبار اس کا ہوگا، جس سے نصاب کی تکمیل ہو سکے۔ بنایہ میں ہے :

”لا بد ان يقوم بما يبلغ نصاباً حتى اذا قومت بالدراهم تبلغ نصاباً واذا قومت

بالذهب لا تبلغ نصاباً يقوم بالدراهم وبالعكس كذلك“ ۴

بحر الرائق میں ہے :

”وفي النهاية لو كان تقويمه باحد التقدين يتم النصاب وبالأخر لا فإنه يقوم

بما يتم به النصاب بالاتفاق فقد قال في الظهيرية رجل له عبد للتجارة

ان قوم بالدراهم لا تجب فيه الزكاة وان قوم بالدينار تجب فعند ابن حنيفة يقوم

بما تجب فيه الزكاة دفعا لحاجة الفقير وسد الخليفة“ ۵

اور آخر میں ساری بحثوں کا خلاصہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”فالحاصل ان المذهب تغيراً الا اذا كان لا يبلغ باحدهما نصاباً تعيين التقويم

بما يبلغ نصاباً“ ۶

درمستار میں ہے :

”ولو بلغ باحدهما نصاباً دون الآخر تعين ما يبلغ به“ ۷

صاحب ہدایہ اور کچھ دوسرے فقہاء کا رجحان یہ ہے کہ یہ دونوں اصول الگ الگ نہیں بلکہ

۱۔ ہدایہ، باب زکوۃ الاموال ۱/۱۵۱ ۲۔ تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ۱/۲۴۹ ۳۔ فتاویٰ ہندیہ ۱/۱۶۹ - ۴۔

بنایہ علی ہاشم ہدایہ ۱/۱۵۱ ۵۔ بحر الرائق لابن نجیم ۲/۲۲۹ ۶۔ درمستار ۲/۲۱ -

ایک ہی ہے اور انفع للفقراء کا مطلب یہ ہے کہ نصاباً پہلے۔
تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق میں ہے:

”وامتبار الانفع مذهب ابی حنیفہ ومعتاداً یقوم بہا یبلغ نصاباً“
شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں:

”ومن ابی حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فی الامالی انہ یقوم بہا بانفع التقیین للفقراء“
بہر کیف ان دونوں اصولوں کے ساتھ اصل نصاب کی تعیین میں ایک اور بات خاص طور پر قابل
ذکر ہے وہ یہ کہ پابندی کا نصاب متفق علیہ ہے، اور اس سلسلے میں واضح احادیث موجود ہیں،
ہدایۃ المجتہد میں ہے:

”فانہم اتفقوا علی انہ خمس اواق لقولہ علیہ السلام الثابت لیس فیہا دون خمس
اواق من الورق صدقۃ“

اس کے برعکس سونے کے نصاب میں کافی اختلاف ہے جس کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے
معاصر ہدایۃ المجتہد لکھتے ہیں:

”وسبب اختلافہم فی نصاب الذہب انہ لم یثبت فی ذالک شیء عن النبی
صلی اللہ علیہ وسلم کما ثبت ذالک فی نصاب الفضة“

سوالات کے جوابات

۱۔ ان مقدمات اور مباحث کی روشنی میں میرا خیال ہے کہ اصل نصاب پابندی کو قرار دیا جائے
اس لیے کہ:

(الف)۔ یہ فقراء کے لیے زیادہ نفع بخش ہے۔

(ب)۔ سونے کی بہ نسبت سستی ہونے کی وجہ سے نصاب کی تکمیل آسانی سے ہو سکتی ہے۔

(ج) — اس کا نصاب صحیح حدیث سے ثابت ہے اور فقہاء صاب کے سب متفق ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

زیادہ سے زیادہ چاندی کے نصاب کو اصل تسلیم کرنے میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں مالدار کی کی رعایت نہیں کی گئی ہے، حالانکہ معاملہ قطعاً ایسا نہیں ہے صاحب فتح القدیر نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے :

”ان المال كان في يد السالك ينتفع به زماناً طويلاً فلا بد من اعتبار منفعة الفقراء

عند التقويم“

بنایہ میں ہے :

”المالك استقط حقه بالاستثمار مدة الحول فيؤخر حفظه الفقراء بالتقويم بالانفع مراعاة

للحقين بقدر الامكان“

معاصر علم کی آرا

دوسری فقہی سیمینار میں کرنسی نوٹ کی زکوٰۃ پر معاصر علماء نے جو کچھ لکھا تھا اور جو فیصلے ہوئے تھے اس کا ماحصل بھی یہی تھا کہ اصل نصاب چاندی کو جانا جائے، چنانچہ مولانا خالد سیف اللہ لکھتے ہیں :

”احکام زکوٰۃ میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ جس پہلو میں فقراء کا فائدہ ہو اس کو اختیار کیا جائے، اس طرح زکوٰۃ

کی مدت ان سکوں اور نوٹوں کے لیے اصل چاندی ہی ہوگی اور اتنی رقم کا مالک ہونے پر جس سے

چاندی کا نصاب خرید کیا جائے زکوٰۃ واجب ہوگی“

مولانا عبدالرحیم لاہوری کا بھی خیال یہی ہے کہ :

”جتنے روپے میں ساڑھے ہاون تولہ چاندی خریدی جاسکے اتنے روپے کے مالک کو صاحب نصاب

قرار دیا جائے گا“

۲۔ حرمت زکوٰۃ کے لیے کسی بھی نصاب کی مقررہ و متعینہ حد و مقدار کا مالک ہونا کافی ہے، خواہ الگ الگ مختلف چیزوں کا مالک ہو جو نصاب کے حد تک پہنچ جاتے ہوں، یا مجموعی طور پر وہ اتنی مالیت ان شرائط کے ساتھ رکھتا ہو جو وجوب زکوٰۃ کے لیے کافی ہوں، بہر صورت وہ ضمنی اور صاحب نصاب قرار دیا جائے گا، زکوٰۃ لینا اس لیے حرام ہوگا، اور زکوٰۃ دینا واجب۔
درمختار میں ہے،

”ولا يصرف الزكاة الى غنى يملك قدر نصاب — من اى مال كان“
”وفي الغاية فلا يجوز دفع الزكاة الى من ملك نصابا سواء كان من النقود او
السواك والعروض“

(هذا ما عندى والله تعالى اعلم)

نصاب زکوٰۃ

انہ ————— مولانا افضل حسین (بستی) —————

اس زمانے میں جب کہ چاندی سونا کے مقابلے میں بہت ہی سستی اور سونے کی قیمت بہت زیادہ ہے، لہذا نقد روپیہ یا مال تجارت وغیرہ چاندی کا نصاب تو جلد تیار ہو جائے گا اور سونے کا نصاب کافی نقد یا تجارتی مال کے زیادہ ہونے پر تیار ہوگا، کتب فتاویٰ میں اس کی تصریح موجود ہے، کہ مال میں زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے وہ نصاب معتبر ہے جو نفع للفقراء ہو اور ظاہر ہے کہ چاندی کا نصاب جلد تیار ہو جانے کی وجہ سے فقیروں کے لیے زیادہ نفع بخشش ہے کیوں کہ ساڑھے باون (۵۲ ۱/۲) تولہ چاندی کے بقدر مال جب کہ سال گزر گیا ہو اور ضرورت اعلیٰ سے فارغ ہو، زکوٰۃ واجب ہونے پر فقیروں کو نفع پہونچے گا، برخلاف سونے کے نصاب کے کہ اگر اس کا اعتبار کیا جائے تو بہت کم صورتوں میں (یعنی جس کے پاس ساڑھے سات تولہ سونا کے بقدر مال ضرورت اعلیٰ سے فارغ ہو اور اس پر سال بھی گزر گیا ہو) زکوٰۃ واجب ہو سکے گی، کیوں کہ ساڑھے سات تولہ سونا کی قیمت آج کل کے نرخ کے اعتبار سے تقریباً تیس ہزار (۳۰۰۰۰) روپے ہوگی، پس اگر سونے کے نصاب کو اصل قرار دیکر اسی کا اعتبار کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے پاس تیس ہزار نقد روپے ضرورت اعلیٰ سے فارغ ہوں یا اس کے بقدر مال تجارت ہو اور اس پر سال بھی گزر گیا ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی جو فقیروں کے لیے کسی طرح بھی نفع بخش نہیں ہے، اور اگر چاندی کے نصاب کو اصل قرار دیکر اس کا اعتبار کیا جاتا ہے تو تقریباً ۱/۲ ہزار نقد روپے یا اس کے بقدر مال تجارت ہونے پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی، پس

چاندی کے نصاب کو اصل قرار دینے میں زکوٰۃ جلد واجب ہوتی ہے، اور سونے کے نصاب کو اصل قرار دینے میں زکوٰۃ دیر سے واجب ہوتی ہے، ایسی صورت میں نصاب نقدین میں سے اس سے بنایا جائے گا، جو فقروں کے لیے انفع ہو۔

یہی بات اس کی کہ نقدین میں سے کونسا نصاب اصل ہے تو دونوں نصاب اصل ہیں مگر اس زمانے میں اعتبار چاندی کے نصاب کا کیا جائے گا، ہاں اگر پھر وہی زمانہ لوٹ آئے کہ بینا مشقال سونے کی قیمت وہی ہو جائے جو دو سو درہم کی قیمت ہے، تو اختیار رہے گا چاہے جس کو نصاب بنالیا جائے گا،

”او اعرض تجارۃ قیمتہ نصاب من ذهب او ورق مقوم باحدھما ان استویا فلو

احدھما اروج تعین التقویم بہ، ولو بلغ باحدھما نصابا دون الآخر تعین ما یبلغ بہ

ولو بلغ باحدھما نصابا خمساً وبالآخر اقل قومیۃً بالا نفع للفقیر“

اس عبارت میں انفع للفقیر کی رعایت یہاں تک کی گئی ہے کہ اگر نصاب دونوں سے بن جاتا ہے مگر ایک کیساتھ تقویم سے نصاب اور دوسرے نصاب بن جاتا ہے، اور دوسرے سے صرف نصاب یا نصاب اور دوسرے سے کم ہوتا ہے جس نقد کے ساتھ تقویم سے نصاب اور دوسرے نصاب بنتا ہو اسی سے قیمت لگا کر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ (ولو بلغ باحدھما نصابا وخمساً) کے تحت شامی نے اس کی تصریح کی ہے

”بیانہ ما فی الشہوعن السراج لو کان بحیث لقومہا بالدرہم مائتین واربعین ولدنانیر

بالدنانیر ثلاثا وعشرین قومہا بالدرہم لوجب مستۃ فیہا بخلاف الدنانیر فانہ یجب

فیہا نصف دینار و قیمتہ خمسہ ولو بلغت بالدنانیر اربعۃ وعشرین وبالدرہم مستۃ

وثلاثین قومہا بالدنانیر“

معلوم ہوا انفع للفقیر کی رعایت بہر صورت کی جائے گی، پس چاندی اور سونے کے نرخ میں تفاوت چاہے جتنا ہو جائے دونوں نصاب اپنی جگہ پر اصل کی میثیت رکھتے ہیں مگر فی زمانہ اموال کے اندر چاندی کے نصاب کا اعتبار کیا جائے گا۔

مقوم باحدھما کے تحت علامہ شامی نے تصریح فرمائی ہے کہ اموال کی قیمت لگانے کا اختیار

اس وقت ہے جب کہ سونا چاندی دونوں برابر ہوں (یعنی نصف دینار برابر پانچ درہم کے ہوں) لیکن اگر دونوں کے نرخ میں تفاوت ہے تو پھر اعتبار انفع کا ہوگا۔ (ای انفع للفقیر ولا انفع لصاحب المال)

”قال ومحل التخییر اذا استويا فقط واما اذا اختلفا قوم بالانفع۔“

صاحب بحر نے بھی اس کی تصریح ان لفظوں میں فرمائی ہے :

”وفی عروض تجارة بلغت نصاب ورق او ذهب قال بعده ای یجب ربع العشر فی عروض

التجارة اذا بلغت نصاباً من احدهما وقال بعده عدة سطور واما بقوله ورق او ذهب

الی انه مخیر ان شاء قومها بالفضة وان شاء بالذهب لأن الثمنین فی تقدیر

قیم الاشیاء بهما سواء وفی النہایة لو کان تقویمہ باحد النقدین یتسم النصاب

وبالآخر لا فانه یقومہ بما یتسم بہ النصاب بالاتفاق۔“

بہر حال اصل مذہب تخییر کا ہے یعنی نصاب چاہے چاندی کو قرار دے کر اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرے چاہے تو سونے کے نصاب کو مان کر زکوٰۃ ادا کرے، لیکن یہ اختیار اس وقت تک ہے جب کہ نصاب دونوں نقدوں سے بن جاتا ہو، اور اگر نصاب کسی ایک سے بنتا ہے اور دوسرے سے نہیں بنتا تو تقویم ذی نصاب سے متعین ہو جائے گی، جیسا کہ اس کی تصریح در مختار کی عبارت کے اچکی ہے، صاحب بحر نے بھی اس موقع پر اس کی تصریح ان الفاظ میں فرمائی ہے :

”قالعاصل ان المذہب تخییر الا اذا کان لا یبلغ باحدہما نصاباً تعین التقویم بما یبلغ نصاباً

وهو مراد من قال یقوم بالانفع ولذا قال فی الہدایة وتفسیر الانفع ان یقوم بہا بما یبلغ

نصاباً۔“

”انفع“ کی تفسیر سے متعلق ایک جزئیہ در مختار کا بھی گزرا ہے کہ اگر نقدین میں ایک کے ساتھ تقویم سے مال نصاب تک پہنچتا ہے اور دوسرے سے نصاب اور خمس تک پہنچتا ہے تو ایسی صورت میں انفع یہ دوسری صورت ہوگی، کیوں کہ خمس نصاب سے کم میں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب نہیں ہوتی لیکن جب خمس نصاب بعد تکمیل نصاب ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ اسی اعتبار سے واجب ہوگی، پس

ظاہر ہے اس نقد کے ساتھ تقویم میں دوسرے کے مقابلے میں زکوٰۃ زیادہ نکلے گی، جو فقیروں کے لیے زیادہ نفع بخش ہے، بہر حال اس جزئیہ سے یہ بات صراحتہ جانی اور سمجھی جاتی ہے کہ جب انفع کا اعتبار بعد تکمیل نصاب بھی کیا جائے گا تو نصاب بنانے وقت کیوں اس کا لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ ضرور کیا جائے گا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص (جو کہ دونوں نصابوں کا مالک ہے) ایک نصاب کو دوسرے نصاب کے ساتھ ملا کر کل زکوٰۃ سونے سے یا چاندی سے ادا کرنا چاہتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے البتہ اس کا لحاظ ضرور کرنا ہوگا کہ جس کے ساتھ ملانے سے فقیروں کا زیادہ نفع ہو اس کے ساتھ ملایا جائے گا، پس جس کے ساتھ ملانے سے زکوٰۃ زیادہ نکلتی ہو، اسی کے ساتھ ملا کر دونوں کی زکوٰۃ ادا کرے،

”ولو ضم احد النصابين الى الآخر حتى يودي كلمة من الذهب او من الفضة لا بأس به
لكن يجب ان يكون التقويم بما هو انفع للفقراء قدرًا ورجاءًا والافيدى من كل
واحد ربع عشرة كذا في محيط السرخس“ عالمگیری ص ۱۶۹۔

”وايضاً في تقويم عروض التجارة التخيير يقوم بايهما شاء من الدراهم
والدينار الا اذا كانت لا تبلغ باحدهما نصاباً فينشد تعين التقويم بما يبلغ نصاباً
لهكذا في البحر الرائق“۔

خلاصہ بحث

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سونے چاندی کے نرخ میں چاہے جتنا تفاوت ہو جائے دونوں نصاب اپنی جگہ پر اصل میں، ممبرہ جزئیات سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اموال کی تقویم میں تخیر اس وقت ہے جب کہ دونوں قیمت میں برابر ہوں (یعنی نصف مثقال برابر پانچ درہم کے ہو جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا) پس اگر تفاوت نرخ کی وجہ سے ایک ساتھ تقویم میں نصاب تک نہیں پہنچتا اور دوسرے سے پہنچ جاتا ہے تو دوسرے ہی سے قیمت لگانی ضروری ہوگی۔

لہذا نصاب حرمت زکوٰۃ اسی طرح نصاب موجب زکوٰۃ کی کم سے کم مقدار چاندی کے نصاب سے مقرر کی جائے گی۔

زکوٰۃ

اس ————— حضرت مولانا محمد افضال الحق صاحب مہتمم دارالعلوم گورکھپور

سوال ————— کا جواب، ملک تاسم :

(الف) ————— اگر وہ رمضان کو سال تمام کا حساب بنایا ہے تو ان کی تجارت کو موجودہ مالیت پر زکوٰۃ ہے یا مال پر ہے۔

(ب) ————— آپ نے جو رقم مثلاً بیع سلم کے لیے کسی کو دیدی ہے اور طے کر لیا ہے کہ وہ آپ کی نہیں ہے فریق ثانی کی رقم ہے، اس کی زکوٰۃ آپ پر واجب نہیں، اگر قرض دیا ہوتا تو آپ کی رقم ہوتی، مگر ادائیگی کی ہے تو اس کا مال ہے جس کو دیا ہے۔

(ج) ————— جو مال آپ نے بیع سلم میں مثلاً خرید لیا ہے اور اب تک آپ کے قبضہ میں نہیں آیا ہے، اس کی زکوٰۃ آپ پر اس لیے واجب نہیں کہ آپ کا قبضہ نہیں صرف ملکیت ہے، ملکیت اور قبضہ دونوں ضروری ہے زکوٰۃ کے لیے۔

سوال ————— ڈپازٹ و فیوچر، یہ رقم آپ کی ہے مگر آپ کا قبضہ نہیں ہے اس لیے زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب رقم آپ کے ہاتھ میں آجائے گی، ہاں اگر آپ کے پاس جمع کرنے کا ثبوت پکا ہے تو احتیاطاً ادا کر سکتے ہیں آج ہی۔

سوال ————— مہمل سوال ہے، کیوں مدرسہ کا مہتمم یا ناظم بیت المال کی رقم کا صرف امین اور وکیل ہے جو خرچ کر سکتا ہے، نہ وہ مالک ہے نہ زکوٰۃ و فیوچر کی جمع شدہ رقم کسی کی ملک ہے وہ تو مال موقوفہ ہے اس لیے غیر متعلق سوال ہے۔

سوال ————— یہ عجیب سوال ہے، مال مسرام کا کمانا، وصول کرنا، رکھنا سب حرام

اس کو واپس کرنا یا کسی غریب کو دے کر بری الذمہ ہونا واجب ہے پھر اس کی زکوٰۃ کی کیا بحث، زکوٰۃ تو ملک پر ہے اور مال حرام شرعاً کالعدم ہے، کیونکہ وہ غاصب ہے آج بھی مالک وہی ہے جس کا مال لیا ہے اس لیے غاصب کا قبضہ ہے ملکیت نہیں ہے، زکوٰۃ کیسی ؟

۱۔ اگر حلال مال، حرام مال مخلوط ہے تو حلال کا حساب کر کے زکوٰۃ دے گا، ورنہ تمیز کرے گا، جیسے بھی کرے۔

۲۔ حرام کی یا حلال کی کثرت و قلت یا غلبہ کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ وہ حرام ہے تو شرعاً کالعدم ہے، اعتبار کیسے ہوگا۔

۳۔ اگر حرام و حلال میں تمیز مشکل ہے تو زکوٰۃ کا سوال ہی کیوں پیدا ہوگا ایسی کمائی والے کے یہاں۔

سوال۔ جو قرض دیا گیا ہے وہ ملک آپ کی ہے مگر قبضہ مدیون کا ہے اب اگر دینے کا ثبوت ہے اور مدیون کو انکار نہیں ہے تو واپسی کے بعد پوری مدت کی زکوٰۃ واجب ہے اور اگر ثبوت کم ہے یا مدیون کو انکار ہے یا مال مفقود ہے تو شرعاً وہ مال ضمہ ہے، حدیث میں ہے ”لَا زَكَاةَ فِي الضَّمَمِ“ اب اس کی زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب وہ دین واپس ہوگا یا مال مل جائے گا اور از سر نو واجب ہوگی، یہ ہے شرعی رحمہ دلی۔

۱۔ مدیون کے مال مثول سے وہ گناہ گار ہے اس کے انکار سے آپ پر زکوٰۃ لازم نہیں ہوگی کیوں کہ قبضہ نہیں ہے اور ثبوت بھی کمزور ہے، اصول زکوٰۃ کے لیے ملکیت اور قبضہ دونوں بنیادی شرطیں ہیں، دونوں سے مل کر ملکیت تامہ ہوگی۔

سوال۔ پنی فنڈ میں آپ کی تنخواہ سے جو رقم مبرا ہوتی ہے وہ آپ کی ملک ہے مگر قبضہ نہیں ہے، قبضہ سرکار کا ہے لہذا اس کے بعد ہی قبضہ ہوگا اور زکوٰۃ ہوگی، پوری مدت کی زکوٰۃ۔

۲۔ سرکار نے جس رقم کے ملانے کا وعدہ کیا ہے وہ نہ آپ کی اب تک ملک ہے نہ قبضہ، جب ہوگا تب زکوٰۃ شروع ہوگی، اور مولان مول کے بعد ہوگی۔

۳۔ اور سود کی جو رقم ملے گی وہ آپ کی بونس ہے اسے غریبوں کو تقسیم کر دیجئے ہرگز نہ رکھئے زکوٰۃ کا سوال ہی نہیں، کیوں کہ مال حرام کالعدم ہے۔

دوسری شرط نمونہ ہے

یہاں مال صرف تین ہیں۔ ٹمنٹ ————— چوپائے ————— سامان تجارت —————
مال کی تین قسمیں ہیں؛

۱۔ ————— تو سونا چاندی شرعاً ٹمنٹ ہیں، لین دین کے لیے قدرت نے اس کو بنایا ہی ہے اس لیے ان پر زکوٰۃ واجب ہے، شرطیکہ قبضے میں ہو، مال مفقود یا مال قمار نہ ہو۔

۲۔ ————— جانور اگر نرمادہ دونوں ہوں، چرائی پر گزر بسر کرتے ہوں تو ان میں نمونہ ہوگا، ان پر ایک خاص نصاب ہو تو زکوٰۃ واجب ہے، تفصیل کے لیے فقہ دیکھیے۔

۳۔ ————— مال تجارت چاہے کوئی سامان ہو، مٹی سے ہیرے تک ان کی مالیت پر زکوٰۃ ہوگی، اور پورا سال گزرنے کے بعد ہوگی تاکہ بھاؤ کے اتار و چڑھاؤ سے ان کی مالیت کا نمونہ ممکن ہو سکے۔

تیسری شرط حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا ہے

سوال ————— انسان کی بنیادی ضرورتیں شرعاً ۹ ہیں اگر وہ پوری ہو جائیں تو مسلمان غنی ہے ورنہ فقیر اور قابل امداد ہے،

اول ————— نفقہ یعنی کھانے پینے کے لیے غلہ، دال، نمک، گوشت، ترکاری وغیرہ سال بھر مہیا کر کے۔

دوم ————— سکنتی، اپنی حیثیت اور ضرورت کے مکان پر یا مالکانہ حقوق حاصل ہوں خواہ مکان ہو یا کوٹھی یا چھپر ہے سامان زندگی یا کرایہ کا مکان ہو۔

سوم ————— سواری، گھوڑا، گدھا، ہاتھی، موٹر، سائیکل سب حیثیت سب ماحول مع ضروریات و لوازم۔

چہارم ————— نوکر، چاکر یا لونڈی، اگر فروش مال گھرانہ ہو یا ڈرائیور وغیرہ جو موٹر چلا سکے۔
پنجم ————— آلات معاش مثلاً کسان کے لیے کھیتی کے سامان، لوہار، بڑھتی، ڈاکٹر، انجینئر وغیرہ کے کاروباری سامان جن کے بغیر معاشی مسائل کا حل نہ ہو سکتا ہو۔

سکس۔ ششم۔ اپنے لیے بچوں کے لیے پہننے، اوڑھنے، بچانے کے وہ سامان جو ہر موسم کو عبیل

ہفتم۔ بچوں کی پڑھائی یا تربیت کے سامان اور صاحبِ علم ہو تو اچھی لائبریری کی ضرورت
ہشتم۔ اس پر کسی کا قرض نہ ہو، اتنا قرض جو اس کی بچت کی رقم کو منہا کر دے یا نصاب
نہ پورا ہونے دے۔

نہم۔ ان تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے باوجود اگر بچت کی رقم ہے اور وہ رقم پورے
سال تجارت میں یا بینک میں یا تجوری میں یا کہیں محفوظ رہ گئی ہے، اور اس کی مقدار، نصابِ زکوٰۃ کے برابر
ہے تو اس کی رقم پر $\frac{1}{2}$ فیصدی زکوٰۃ واجب ہوگی کہ کسی مستحق کو دیدی جائے۔

چوتھی مشرطہ دین سے محفوظ ہونا

ٹرکشر، کسان کے لیے آلاتِ زراعت میں ہے وہ اگر ایک لاکھ کا ہے تب بھی زکوٰۃ واجب
نہیں ہوگی۔

الف۔ جو قرض لیا گیا ہے اس سے حاجتِ اصلہ پوری کر رہا ہے اگر اس کے پورے
کاروبار پر وہ دین جاری ہے تو بچت کی رقم کے بغیر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

ب۔ فیکٹری اور کارخانے کے لیے جو قرض لیا گیا ہے وہ قرض اگر تجارت کی لاگت
سے زائد ہے تو زکوٰۃ واجب نہیں، اگر بچت اس سے فاضل ہے اور نصاب کے برابر ہے تو واجب ہے،

ج۔ اگر کاروبار کی لاگت ۲ کروڑ ہے اور قرض اگر دوڑ تو حاجتِ اصلہ سے فاضل
مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور جب دس لاکھ کی قسط ادا کر دے گا تو ایک کروڑ دس لاکھ کی زکوٰۃ دے گا
پھر بیس لاکھ کی اسی طرح چلتا رہے گا۔

د۔ اگر ایک کروڑ کی لاگت ہے اور ایک کروڑ قرض تو کوئی زکوٰۃ نہیں، وہ قرض اور
اس کا سود اس کی لاگت کو کھا جائے گا، بچت کا سوال ہی نہیں ہوگا، اس سے غنی نہیں ہو سکا۔

ه۔ اگر پچاس لاکھ کی لاگت ہے اور ایک کروڑ قرض تو قسط اور سود سے اس کا کاروبار
مکان اور جائداد کوئی محفوظ نہیں رہے گا، بہر حال خدا اس پر رحم کرے اس مالدار فقیر پر۔

کمپنی اور کارپوریشن پر زکوٰۃ

زکوٰۃ کے مخاطب وہ مسلمان ہیں جو مالک نصاب ہیں، اس لیے جس کمپنی کو آپ لوگ ایک کروڑ کی لاگت سے چلا رہے ہیں، اس کے جس حصہ دار کے حصے یا جس انداز کی رقم نصاب کو پہنچ جائے گی اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مشترک سرمایہ پر زکوٰۃ نہیں ہوتی، ذاتی مال پر ہوتی ہے۔

اہم اصول

۱۔ زکوٰۃ کا مدار ملکیت پر ہے جو ذاتی ہو، پس انداز ہو یا ضروریات سے فارغ ہو، اور پورے سال کا ہر موسم جھیل چکی ہو پھر بھی موجود ہو اور آپ کے قبضے میں ہو۔

۲۔ ہیرے جو اہرت اگر مال تجارت میں تو ملکیت پر زکوٰۃ ہے ورنہ کوئی زکوٰۃ نہیں۔
کَمَا قَالَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

اموال تجارت

سال پورا ہوا تو آپ کی دوکان میں جو مال ہے اس کی لاگت پر زکوٰۃ ہوگی پھر جب وہ فروخت ہوگا تو پتہ چلے گا کہ لاگت کیا تھی، نفع کیا ہوا۔ آج تک فروخت نہیں ہوا آپ کی لاگت والا مال ہے اس پر زکوٰۃ ہے۔

۱۔ آپ کی لاگت جتنی ہے اس پر زکوٰۃ ہے خواہ تبرک ہو یا پھنکر جیسی حیثیت ہو یا جیسی مالیت۔ مال کی تھوک یا خوردہ قیمت کا نہیں بلکہ جتنے ہیں وہ مال بار برداری کے بعد آپ کو پڑا ہے اس لاگت سے مالیت نکال کر زکوٰۃ دی جائے گی، پھر اس مالیت کو فروختگی میں نفع کی بنیاد بناتے ہیں۔

۲۔ جو زمین کا کاروبار کرتے ہیں، سال ختم ہونے پر جتنی زمین ان کے قبضے میں ہے اس کی لاگت والی مالیت پر زکوٰۃ ہوگی، کیوں کہ اس کے قبضے میں دی ہے، قوت خرید سے خریدار کو رغبت ہے بائع کو نہیں یہ معاملہ صرف بائع کی ذاتی حیثیت کا ہے جو اس وقت موجود ہے۔

محض کی زکوٰۃ

۱۔ آپ نے کسی کمپنی کے جو حصے خریدے ہیں وہ آپ کی ملکیت ہیں مگر آپ کے قبضے میں نہیں ہیں، لہذا اس پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب وہ حصہ واپس ہوگا یا اس کا بدلہ یا نفع ملے گا تو جتنا قبضے میں آئے گا، اتنی رقم اگر نصاب کے برابر ہے تو زکوٰۃ دیں گے ورنہ نہیں،

۲۔ محض کی جو بھی قیمت آپ کو مل جائے گی، اس کے تناسب سے زکوٰۃ ہوگی اگر کہلے گی تو کم پر زیادہ ملی تو زیادہ پر، فرق یہ ہوگا کہ محض آپ کے اصل پونجی کے اور اس کی کمپنی کا نام نفع نقصان ہوگا مگر اس کا اعتبار رقم کی واپسی پر ہوگا، چنانچہ بمبئی کا اسکندل اور لندن کے بینک کا اسکندل گواہ ہے کہ محض کا اعتبار اس وقت ہوگا جب وہ حصہ دار کے قبضے میں آجائیں، یہ اصول بہت وسیع ہے

باند

میں رقم کو میں نے دیا ہے اور بینک نے یا سرکار نے مجھے مدتی باند عطا کر دیا ہے یہ باند نوٹ نہیں ہے، نقد نہیں ہیں، بلکہ سرکاری رسید ہیں کہ تمہارا مال ہمارے مال میں اس لیے وہ رقم جو آپ کے قبضے میں نہیں ہے، اس پر آج زکوٰۃ واجب نہیں، اس وقت واجب ہوگی جب باند کمیشن ہو جائے گا اور ان تمام سالوں کی واجب ہوگی، جتنے سال سرکاری تحویل میں وہ رقم رہی ہے، وہ وہی ہے کہ ملک تمام نہیں، کیونکہ قبضہ نہیں ہے۔ اور چوں کہ آپ کے پاس گئی رسید ہے، اور سرکار کو الکار نہیں، اس لیے وہ منسار بھی نہیں ہے، اس لیے پوری مدت کی زکوٰۃ ہوگی۔

نصابِ زکوٰۃ

سوالات کے جوابات

۱۔ شرعاً چاندی اور سونا دونوں ثمن ہیں اور آپ کے ماننے نہ ماننے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ وہ ثمن غلطی ہی رہیں گے، اس لیے :

الف۔ اگر کسی کے پاس صرف چاندی ہے تو ۲۰۰ درہم سے نصاب شروع ہوگا، جہاں تک پہنچے نصاب ہی ملے گا۔

ب۔ اگر کسی کے پاس صرف سونا ہے تو ۲۰ مثقال سے نصاب شروع ہوگا، جہاں تک پہنچے۔

ج۔ اگر دونوں میں سے کسی کا نصاب مکمل نہیں ہے تو دونوں کو وزن یا قیمت کے لحاظ سے دیکھیں گے، اگر کوئی نصاب مکمل ہو جاتے ہیں تو زکوٰۃ واجب ہوگی نہیں تو نہیں ہوگی۔

د۔ رہا مال تجارت تو اگر کسی تاجر کے پاس اس کی حاجتِ اصلہ سے فاضل جو مالیت ہے وہ ۲۰۰ درہم سے زائد ہے تو وہ غنی ہے اس پر شرائط کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن اگر مال تجارت کی قیمت ۲۰۰ درہم سے کم ہے تو وہ مسلمان شرعاً فقیر ہے زکوٰۃ اس کو دیا جاسکتی ہے، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

ه۔ ایسا اس لیے ہے کہ فقیروں کے لیے یہ مقید ہے کہ چاندی کا نصاب مان لیا ہے ورنہ سونے کو محور بنایا جائے گا، تو تاجروں کو تھوڑا موقع اور مل جائے گا، مگر فقیروں کا نقصان ہوگا اور یہ فرق صرف ابتدا کرنے میں ہے کہ کہاں سے شروع کیا ہے ورنہ جب شروع ہو گیا تو ہر مالک نصاب دوسرے کے برابر ہے۔

و۔ سونے چاندی کی زکوٰۃ کا مسئلہ ہر مسلمان سے متعلق ہے خواہ ہمالیہ کی ترائی

کا ہو یا امریکہ کے بازار کا ۱۹۹۲ء کا ہو یا ۲۰۲۲ء کا۔ دوسرے یہ کہ من و ذہن سنگھ نے جو پالیسی اختیار کی ہے اس کے سونے کی وہ برتری خاک میں مل جائے گی، جو ہندوستان میں اس کو حاصل ہو گئی ہے، تیسرے یہ کہ اگر ثبوت غنا کے لیے سونا اور ثبوت فقر کے لیے پانندی کو معیار قرار دیں گے تو فقر و غنا کے درمیان ناقابل عبور خلیج پیدا ہو جائے گی، اور یہ طے نہیں ہو سکے کہ غنا کب اور فقر کب شروع ہوا اسی لیے شریعت نے دونوں میں سے ہر ایک کو ضمن قرار دے کر ماحول کو پابند کر دیا ہے، اور فقر و غنا کے درمیان کوئی واسطہ نہ رکھ کر کام آسان کر دیا ہے۔

مصارف زکوٰۃ

مہتمم یا ناظم یا منبر عطیہ یا زکوٰۃ دینے والوں کا دکیل ہے اس کی ذمہ داری ہے کہ زکوٰۃ دینے والوں کی رقوم کو مستحقین زکوٰۃ تک پہنچائے، مستحقین تو مصرف زکوٰۃ ہیں اور مہتمم دونوں کے درمیان واسطہ ہیں، الف — مہتمم کی طرف سے کسی مستحق کو جو رقم سپرد کر دی گئی وہ زکوٰۃ ادا ہو گئی، اور وہ شخص اتنی رقم کا مالک ہو گیا، اب ایسے شخص کو حق ہے کہ اپنے کھانے، کار ہائش، کایوشن، کا نظم و ضبط، کا خود انتظام کرے کیونکہ مال ان کے پاس ہے، وہ انجمن بنا کر اسے چلا لیں گے اور جہاں چاہیں گے کرایہ کا مکان لے کر رہیں گے، بس کو چاہیں گے مدرس رکھ کر پڑھائیں گے، پھر مہتمم صاحب کہاں جائیں گے؟ انہیں سوچ لینا چاہئے جیسے الہ آباد بورڈ کے مدرسین مالک مدرسہ ہیں اور کانٹھ کا، مہتمم نام کا، مہتمم — یہ فتنے کا گھر ہے اس دروازے کو نہ کھولے۔

ب — پھر جن لوگوں نے جالمداد، کمرے، سامان بطور اوقاف مدرسہ میں دیا ہے کہ ان کا آپ کو یا ان کے درشاہ کو ثواب ملتا رہے گا، یہ صدقہ جاریہ ہیں، اس کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، پھر تو سارا مال تجارتی سامان ہو گا، کرایہ کا مکان، کرایہ کی زمین، کرایہ کی سواری۔

ج — بہت سے علماء کو عطیات کی رقم سے تنخواہ لینے میں تردد ہوتا ہے اور آپ نے زکوٰۃ تنخواہ لینے اور طلباء کے ہاتھوں ذلیل کرنے کا راستہ نکال کر اداروں کی دینی حیثیت کو داؤں پر لگا دیا ہے اور اسکولوں کی طرح تجارت گاہ بنا دیا ہے، خدا رازم کیجئے دینی اداروں پر۔

د۔ ————— یہ صورت بہت اچھی ہے کہ طلباء کے خوراک اور وظیفے کی رقم ان کو نقد دیدی جائے اور وہ مطبخ میں جمع کر دیں، وہاں سے ساتھ انتظام ہوتے رہیں، اس سے تملیک بھی ہوتی رہے گی، انتظام بھی چلتا رہے گا۔

عاملین علیہا

رمضان وغیرہ میں اداروں کے جو مدرسین، ملازمین، نظماں اور اراکین چندہ وصول کرتے ہیں ان میں اکثر اداروں کے مستقل ملازم ہوتے ہیں، ان کی تنخواہ وغیرہ زکوٰۃ سے نہیں دی جاسکتی۔

الف۔ ————— ہاں پورے سال میں وہ زکوٰۃ سے وصول کر لاتے ہیں تو ایسی وصولی کے تناسب سے ان کی تنخواہ کا کوئی حصہ زکوٰۃ سے لیا جاسکتا ہے۔

ب۔ ————— زکوٰۃ کے مصارف بیان کرنے کا انداز انحصار کا ہے، "إشغال الصدقات" اس لیے جب تک مستحق زکوٰۃ ہوں گے دی جائے گی، جتنے مستحق زکوٰۃ ہوں گے اسی مقدار سے دی جائے گی اور عاملین علیہا کی اصطلاح بھی مستقل ملازمین کو شامل ہونے نہیں دیتی۔ ————— متکلم کی منشا کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔

ج۔ ————— کمیشن اہل علم کا کبھی دستور نہیں رہا نہ علمائے اہل علم نے اجازت دی ہے، اگر اس سے آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے، تو جو لوگ ۱۰ فیصدی کمیشن لیتے ہیں اور پھر مصارف سفر وصول کرتے ہیں اور اگر کوئی رقم کہیں باقی رہ گئی ہے تو اس کا بھی کمیشن لے لیتے ہیں، ان کو آپ کیا کہیں گے۔ بعض لوگ فرماتے ہیں کہ ہماری جیب سے کیا گیا؟ مگر انہیں معلوم نہیں کہ جتنی رسید آپ کے سفر نے کاٹ دی ہیں ان سب رقم کا آپ کو یہاں سے آخرت تک حساب دینا ہے، پھر خدا سے کیا معذرت فرمائیں گے؟

د۔ ————— جو ادارے کا کلرک ہے وہ بیت المال کا منشی ہے وہ رقم کی وصولی نہیں کرتا مگر اس رقم کے خرچ کا حساب لکھتا ہے، اس لیے "عاملین علیہا" کی مد میں شامل نہیں ہو سکتا (واللہ اعلم)۔

فی سبیل اللہ

قرآن، کتاب الہی، فرمان خداوندی اور بندوں کے نام احکام لے کر آیا ہے، قرآن نے عبادات و معاملات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی تعبیرات کے لیے اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ آپ ان اصطلاحوں کا معنوی تعین آج کی لغت سے نہیں کر سکتے، اس وقت کے فہم و ادراک سے کر سکتے ہیں۔

الف: — فی سبیل اللہ "قرآن کا اک اصطلاحی لفظ ہے، سوال یہ ہے کہ اس سے متکلم کا منشا کیا ہے؟ کیوں کہ متکلم کی منشا کا نام تفسیر ہے، ظاہر ہے کہ خدا کی منشا اگر معلوم ہوگی تو خود قرآن سے ہوگی، یا پیغمبر سے معلوم ہوگی، حد سے حد یہ ہے کہ صحابہ کرام کی زبانی معلوم ہوگی۔ — ہاں اگر ان میں سے کسی سے نہ معلوم ہو تو تفسیر کرنا ممکن نہیں، ہم لغت، محاورہ یا اصول کے ذریعہ اس کی تاویل کر سکتے ہیں، تفسیر نہیں کر سکتے ہیں۔ — یہاں تاویل کی اس لیے گنجائش نہیں کہ تفسیر موجود ہے اور جب خود حضور سے تفسیر موجود ہے تو لغت کیوں کر اس کا معارفہ کرنا خلاف اصول اور جرات ہے۔

ب: — حافظ ابن حجر نقل کرتے ہیں کہ فی سبیل اللہ کا استعمال عباد کے لیے ہوتا ہے۔ یہی بات عام مفسرین کہتے ہیں اور خود حضور نے "غازی سبیل اللہ" کہہ کر واضح کر دیا ہے کہ فی سبیل اللہ کا ترجمہ اور مطلب جہاد ہے۔ — نیز بخاری میں حضور کا شعر مروی ہے کہ انگلی زخمی ہو گئی تو فی سبیل اللہ فرمایا،

"ان انت الا اصبیح دمیث" و فی سبیل اللہ مالقیث

ج: — ان ہی دوہ سے مہر فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد جہاد لیا ہے اور بعض احادیث کے تقاضے سے امام محمد جیسے حضرات نے حج کو بھی فی سبیل اللہ میں صرف اس وجہ سے داخل کر دیا ہے کہ ان کے نزدیک حضور سے ثابت ہے، اور ویسے بھی ہو سکتا ہے کہ حضور نے حج کو عورتوں کا جہاد فرمایا ہے۔

د: ————— رہا اختلاف روپے یا اختلاف مسائل کا ختم کرنا تو یہ کوئی شرعی عذر نہیں ہے، نہ دلیل ہے نہ اس سے ان مسائل کا اختلاف ختم ہو سکتا ہے جو صدر اول سے پہلے آرہے ہیں، نہ اس کے لیے لغت اور ان کے لیے توسع سے کام نکالا جاسکتا ہے کیوں کہ اس سے صرف اتنا ہو گا کہ اک پانچویں رائے اور پیدا ہو جائے گی، کہ علامہ بھوپالی نے لغت کے سہارے زکوٰۃ کو عام کر دیا ہے کہ اک اجتہادی مسئلہ بن گیا ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ صدر اول میں فقہاء اور علماء نے قرآن و احادیث کے پر معافی امارت کی روشنی میں متعین کر رہے ہیں، ان کے دور کی رائے قبول کر لی جائے۔ ————— ہاں جو نئے مسائل پیدا ہوں، ان کے دلائل، اقوال اور علت و اسباب کا پتہ لگا کر کوئی رائے قائم کی جائے، ورنہ پرانے مسائل کو نئے رجحان سے ملے کرنا ایک خطرناک کھیل ہے اور بے سود محنت۔

۴: ————— علامہ کاسانی کا یہ استدلال بہت اچھا ہے کہ حضرت معاذ کو معجزاً عظیم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایت دی ہیں، اس میں بخاری و مسلم کی روایتوں میں ہے کہ:

”تَوَخَّذْ مِنْ اَغْنِيَا شَهْمٍ وَ تَوَخَّذْ اِلَى فُقَرَاءِ شَهْمٍ“

اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کے لحاظ سے انسانوں کی دو صفیں ہیں، ایک اغنیاء کی دوسری فقراء کی، اور زکوٰۃ کا مصرف وہ فقراء ہیں جن کی فہرست قرآن نے دی ہے، البتہ چوں کہ حدیث صحیح کی وجہ سے ”عالمین علیہا“ کے غناء کے باوجود دیا جائے گا۔ اس لیے اس فہرست میں ان کا اضافہ غالباً اس لیے ہے کہ زکوٰۃ جب تک جمع نہ کی جائے گی، اس فہرست کے مطابق تقسیم نہیں کی جاسکتی اس لیے غناء کے باوجود اجازت دی گئی ہے ورنہ اصل ہے فقر و حاجت وغیرہ، اس وجہ سے علامہ کاسانی نے فی سبیل اللہ میں اگر وسعت بھی رکھی ہے تو فقر کی قید لگا دی ہے اور شفہی طور پر ادا کرنے کی رعایت کی ہے۔

و: ————— بہتر ہو کہ جن مسائل کو ائمہ نے نصوص کی روشنی میں جمع کر دیا ہے اور جمہور فقہاء نے اسے قبول کر لیا ہے اس پر لغت اور محاورے کی مدد سے اضافہ نہ کیا جائے ورنہ دین باز پیکر اطفال بن جائے گا۔

سوالات کے جوابات

ان: مولانا محمد علاء الدین ندوی، فاضل دیوبند، پیر الطیف، ضلع کھگڑیا

مصارف زکوٰۃ یا صدقات واجبہ کے مصارف سے متعلق آنجناب نے اہل خیال کا حکم فرمایا ہے تو اس بارے میں عرض ہے کہ کیا میں اور کیا میری رائے اور کیا میرا مبلغ علم۔ لیکن پھر بھی ہر کس و نا کس کو کسی بھی طرح کی رائے قائم کرنے کا میرے خیال میں کچھ نہ کچھ حق ضرور ہوتا ہے، اگرچہ بہت ممکن ہے کہ اس کی وہ رائے ارباب علم و فکر کی نگاہوں میں کچھ زیادہ قابل اعتناء نہ ٹھہرے، لیکن اس سے رائے دہندہ کے حق رائے دہی پر غالباً کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اپنی رائے اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی جرأت و جسارت کر رہا ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دوں کہ مجھے اپنی بات یا رائے پر اصرار بہر حال نہیں ہے یہ رائے ہے اور صرف رائے۔ آیت کریمہ "انما الصدقات للفقراء" (البقرہ ۲۱۱) میں لفظ فی سبیل اللہ، میرے خیال میں کسی مخصوص متعین اور محدود معنی پر دلالت نہیں کرتا، اگرچہ متعینین و متاخرین مفسرین میں سے تقریباً سبھوں نے اس سے مراد مجاہدین یا مجاہدین کے لیے سامان جہاد خریدنا سمجھا اور یہی مراد بھی لیا ہے، قرآن و حدیث کے سلسلہ میں یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ یہ دونوں چیزیں قیامت تک کے لیے ہیں اور دونوں عہد نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر قیامت تک کے سرچشمہ ہدایت ہیں، ہر دور، ہر زمانہ اور ہر قسم کے حالات میں پیش آمدہ ضرورتوں اور مسائل کے حل کے لیے ہمیں بنیادی طور پر ان کی جانب ہی رجوع کرنا ہوگا، پھر حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، تابعین عظام اور ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ

کے اقوال و تفقہ سے استفادہ کرنا لازمی ہوگا۔

آج کا دور پرفتن جیسا کچھ ہے وہ کسی صاحب علم و بصیرت کی نگاہوں سے مخفی نہیں، جتنے فتنے ان دنوں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برپا کیے جا رہے ہیں، عالمی و ملکی پیمانے پر مسلمانوں کو مذہب سے دور رکھنے اور انہیں اس سے برگشتہ کرنے کی جس قدر سازشیں رہی جا رہی ہیں غالباً اس کی نظیر و مثال گذشتہ تاریخ میں نہ مل سکے، ان حالات میں یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی فرد واحد اپنے بل بوتے اور اسباب و وسائل کے ساتھ ان سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھے اور ان کا قلع قمع کر کے رکھ دے، البتہ یہ ممکن ہے کہ ملت اسلامیہ کے ارباب علم و فکر، دانشور اور دل دردمند رکھنے والے مکر بستہ ہوں، میدان عمل میں اتر پڑیں اور ایسے ادارے یا اکیڈمیاں قائم کریں جہاں سے قلمی اور تبلیغی جہاد اچھے پیمانہ پر علمی و فکری انداز سے شروع کیا جائے اور ملت کو ان مفاسد سے خبردار کرنے کے علاوہ اپنا تحفظ اور دین پر کاربند رہنے کی موثر طور پر تلقین کی جائے۔

لیکن اس کام کی ابتدا کرنے سے پہلے جو بات سب سے پہلے سامنے آتی ہے وہ سرمایہ کی ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کام جس نوعیت کا ہے اور اسے جس پیمانہ پر انجام دیا جانا چاہیے اس کے لیے ضرورت کثیر سرمایہ کی ہوگی، اور وہ کہاں سے آئے گا؟ کسی فرد واحد سے اس کی توقع نہیں کہ وہ تنہا اس بارگراں کا تحمل ہو سکے گا۔ ملت کا حال اور عالم یہ ہے کہ اس کے انتہائی محدود و مختصر افراد کی تعداد صدقات غیر واجبہ (نافلہ) کی جانب میلان رکھتی ہے۔ ہاں زکوٰۃ ادا کرتی ہے، لیکن مصارف زکوٰۃ میں اگر قدامت و تاخیر کی رائیں اختیار کی جائیں تو ایسے کاموں کے لیے اس رقم میں کوئی گنجائش نہیں نکلتی تو پھر آخر کون سی راہ اختیار کی جائے کہ علمی پیمانے پر کی جانے والی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سدباب ہو سکے اور ملت کو درپیش فکری ارتداد اور عملی گمراہی سے بچانے کی منظم طور پر باقاعدہ کوشش کی جاسکے۔

حالات کی سنگینی، ضرورت کی اہمیت و شدت اور ملت و وقت کی پکار کا تقاضا ہے کہ امام قفالؒ کے اس قول پر غور کیا جائے، جسے انھوں نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ امام موصوف نے اس قول کی نسبت بعض فقہاء کی جانب بھی کی ہے، اگرچہ ان کے ناموں کی صراحت نہیں کی ہے۔ اما رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے،

”واعلم ان ظاہر اللفظ فی قوله تعالیٰ ”وفی سبیل اللہ“ لایوجب

الفصل علی کل الفزاة فلهذا المعنی نقل القفال فی تفسیره عن
 بعض الفقهاء انهم اجازوا صرف الصدقات الى جميع وجوه
 الخیر من تكفین الموقف وبناء الحصون وعلوة المساجد لأن
 قوله فی سبیل اللہ عام فی الكل

ان کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور نواب صدیق حسن خاں صاحب
 مرحوم وغیرہ کی تحریروں سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آیت کریمہ ”انما الصدقات“ میں انما حصر کے لیے تو ہے
 لیکن یہ حصر حقیقی نہیں بلکہ اضافی ہے، اس کے علاوہ فی سبیل اللہ بھی عام ہے، اسے محدود و منحصر کس
 دلیل کی بنیاد پر کیا جائے۔

بہر حال میری رائے ہے کہ آج کا دور اس بات کا متقاضی ہے کہ اس طرح کے کاموں میں زکوٰۃ و
 صدقات واجبہ کی رقمیں صرف کی جاسکتی ہیں اور اگر کام بہتر طور پر اس رقم کے بغیر بھی چل سکتا ہو اور زکوٰۃ
 کی رقمیں لگانے سے بچا جاسکتا ہو تو احتیاط اسی میں ہے کہ اس سے بچا جائے۔

واللہ اعلم و علمہ اتم و احکم

سوالنامہ کا جواب

انہ: _____ مولانا عبد القیوم صاحب پالنپوری

ملک تمام سے متعلقہ سوالات کے جوابات

(۱) جس مال تجارت کی قیمت دے دی گئی ہے لیکن مال پر ابھی مشتری نے قبضہ نہیں کیا ہے، اس میں پیشگی ادا کردہ قیمت کی زکوٰۃ بائع پر — جو اس کا مالک ہو گیا ہے اور قبضہ بھی کر لیا ہے — واجب ہے، لانہا مملوكة ملكاً ویذا۔

اور وہ خریدار ہو مال تجارت جس پر مشتری نے ابھی تک قبضہ نہیں کیا ہے صحیح قول کے مطابق مشتری پر قبضہ سے قبل اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اور قبضہ کے بعد گزرے ہوئے سال کی زکوٰۃ بھی واجب ہے۔

”وذكر في المحيط ان البيع قبل القبض قيل لا يكون نصاباً، لان الملك ناقص — والصحيح أنه يكون نصاباً لانه عوض عن مال كانت يده ثابتة عليه وقد امكنه احتواء السيد على العوض فتعتبر يده باقية على النصاب باعتبار التمكن شرعاً ۱۱ - فعلى هذا قولهم لا تجب الزكاة معناه قبل قبضه واما بعد قبضه فتجب زكاته فيما مضى كالدين القيوي ۱۲“

(۲) کرایہ کی مد میں دی ہوئی پیشگی رقم کا شرعاً مالک مکان مالک ہو جاتا ہے، لہذا اس نے جو کرایہ کی پیشگی رقم وصول کی ہے اس کی زکوٰۃ اس مالک مکان پر واجب ہے۔
اس لیے کہ اس کا قبضہ بھی ہو چکا ہے اور وہ مالک مکان اس پیشگی وصول کردہ رقم کا مالک ہو گیا ہے جیسا کہ حسب ذیل جزئیہ سے ظاہر ہوتا ہے:

”رجل له الف درهم لامال له غيرها استأجر بها داراً عشر سنين لكل سنة مائة فذبح الألف ولم يسكنها حتى مضت السنون و الدار في يد الآخر من زكى الآخر في السنة الأولى عن تسع مائة وفي الثانية عن ثمان مائة إلا زكاة السنة الأولى ثم يسقط لكل سنة زكاة مائة أخرى بما وجب عليه بالسنتين الماضية لأنه ملك الألف بالتعجيل كلها فاذا لم يسلم الدار اليه سنةً انقضت الاجارة في العشر لأنه استهلك العقود عليه قبل التسليم فزال عن ملكه مائة وصار مصروفاً الى الدين وكذلك ولا زكاة على المستأجر في السنة الأولى والثانية لنقصان نصابه في الأولى ولعدم تمام الحول في الثانية الخ“ (۱)

ڈپوزٹ کی رقم رہن ہے اور شئی مرہن کی زکوٰۃ نہ راہن پر ہوتی ہے نہ مرہن پر، لہذا ڈپوزٹ کی رقم زکوٰۃ نہ موجب — مالک مکان یا دکان — پر واجب ہے اور نہ کرایہ دار پر واجب ہے:

”ولا في مرهون بعد قبضه اى لا على المرتهن لعدم ملك الرقبة ولا على الراهن لعدم اليد وإذا استرده الراهن لا يزكى عن السنين الماضية وهو معنى قول الشارح ”بعد قبضه“ ويبدل عليه قول البحر ومن موانع الوجوب الرهن وظاهره ولو كان الرهن ازيد من الدين“ (۲)

(۱) البحر الرائق ۲/۲۱۹ - وكذا في العالمگیریة ۱/۱۸۱-۱۸۲

(۲) شامی ۹/۲

(۳) اداروں اور مدارس وغیرہ میں جمع ہونے والی رقوم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔
 صدقات واجبہ میں عدم وجوب ظاہر ہے اس لیے کہ اگر خود معطین کے پاس وہ رقم رہتی تو ان
 پر زکوٰۃ اس رقم کی واجب نہ ہوتی اور عطیات کی رقم معطی کی ملک سے نکل جاتی ہے اور مدرسہ
 اور ادارہ کے ساتھ مختص ہو جاتی ہے۔

(۴) اگر وہ مال خالص حرام ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کے مالک معلوم ہیں
 تب تو واجب الرد ہے اور اگر معلوم نہیں تو کل واجب التصدق ہے۔

”وفی رد المحتار: فی القنیۃ لو کان الخبیث نصاباً لایلزمہ الزکاة
 لان کل واجب التصدق علیہ فلا یفید ایجاب التصدق ببعضہ اھ
 ومثله فی البزازیہ“ (۱)

لان المغصوب ان علمت اصحابہ اذ ورثتهم وجب ردہ علیہم والا وجب

التصدق بہ“ (۲)

اگر یہ حرام مال حلال بن میں مخلوط ہو (خواہ باہم تمیز مشکل ہو یا نہ ہو) تو دیکھا جائے گا کہ اگر مال حرام
 کی مقدار اس میں سے نکالی جاوے تو بقدر نصاب بچتا ہے یا نہیں، اگر بچتا ہے تو اس مقدار باقی میں زکوٰۃ
 واجب ہوگی، اگر نہیں بچتا تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

”قالوا لو ان سلطاناً غصب ما لا دخلطہ صار ملکاً لہ حتی وجبت علیہ
 الزکاة وورث عنہ علی قول ابی حنیفۃ رحمہ لان خلط دراهمہ بدراہم
 غیرہ عند استہلاک..... اھ۔ ہکذا ذکرنا وهو مشکل لانه
 وان کان ملکہ عند ابی حنیفۃ بالخلط فهو مشغول بالدين والشط
 الفراغ عنه فينبغي ان لا تجب الزكاة فيه علی قوله ايضاً ولذا شرط
 فی المبتغى بالمعجمه ان يبرأه اصحاب الاموال لانه قبل البراء مشغول
 بالدين وهو قيد حسن يجب حفظه“ (۳)

(۵) امام صاحب رحمہ کے نزدیک دیون کی تین قسمیں ہیں۔ قوی۔ متوسط۔ ضعیف۔
 دین قوی وہ دین ہے جو کسی مال تجارت یا سونے چاندی کے عوض میں کسی کے ذمہ واجب ہو اور
 دین قوی میں زکوٰۃ دائن ہی کے ذمہ ایام ماضیہ کی بھی واجب ہوگی، مگر ادائے کی لازم اس وقت
 ہوگی جب کہ بقدر چالیس درہم کے وصول ہو جائے۔

”وفی الدر المختار: فتجب زکاتہا اذا تم نصابها وحال الحال لکن لا فوراً
 بل عند قبض اربعین درهما من الدين القوی کفر من دبدل و مال
 تجارة الخ: (۱)“

دیون پر کسی حال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اگرچہ اس مال کو تجارت میں لگا کر فائدہ اٹھا رہا ہو۔
 ”وسببه ملك نصاب حولی تام فارغ عن دين له مطالب من
 جهة العباد: (۲)“

جس دین قوی کے وصول ہونے کی امید ضعیف ہو یا بالکل نہ ہو، قبل وصول دائن پر اس کی زکوٰۃ
 واجب نہ ہوگی اور وصول ہونے کے بعد سال گزرنے کے بعد (اگر دوسرا مال زکوٰۃ موجود نہیں ہے) اس پر
 زکوٰۃ واجب ہوگی، اور گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

”ولو كان الدين على مقر ملي أو على معسر أو مفلس ای محکوم بالافلاس
 أو على جاحد عليه بنیة وعن محمد لا زکاة وهو الصحيح (الدر المختار)
 دفعی رد المحتار: والحاصل فيه اختلاف التصحیح - (۳) - وفيه أيضاً
 وقد منّا اول الزکاة اختلاف التصحیح فيه و مال الرجعتی الى هذا وقال
 بل فی زماننا یقر المديون بالدين وسواء ته لا یقدر الدائن علی تخليصه
 منه فهو بمنزلة العدم: (۴)“

دین متوسط جو مال تجارت اور سونے چاندی کے علاوہ مال کا معاوضہ ہو، اور دین ضعیف جو مال کا

(۱) الدر المختار علی الشامی ۴/۲-۴۸ (۲) شامی ۵/۲-۶

(۳) رد المحتار ۱۲/۲ (۴) رد المحتار ۸۵/۲

معاوضہ نہ ہو، جیسے دین مہر یا بالکل معاوضہ نہ ہو جیسے حصہ میراث و وصیت، دین متوسط کا حکم امام صاحب سے اصح الروایتین کے مطابق اور دین ضعیف کا حکم یہ ہے کہ ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے بلکہ وصول ہونے کے بعد جب سال گزر جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی۔

”و عند قبض مأتین مع حولان الحول بعده ای بعد القبض من دین ضعیف و هو بدل غیر مال کھراخ —“ قال فی البدائع ان روایۃ ابن سماعة انه لازکاة فیہ (ای فی الدین المتوسط) حتی یقبض المأتین و یحول الحول من وقت القبض ہی الاصح من الروایتین عن ابی حنیفہ^(۱)

۵۔ و مثله فی غایۃ البیان و علیہ فحکمہ حکم الدین الضعیف الخ^(۲)

(۶) پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر قبل وصول زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور وصولیابی کے بعد جب سال گزر جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی، اور ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ (۳)
حاجت اصلہ کے تعین کے متعلق سوال واضح نہیں ہے۔

چوتھی شرط کے متعلق سوال کا جواب

(۱) حکومت سے حاصل کردہ قرض طویل الاجل کی صورت میں وجوب زکوٰۃ کے لیے پورے قرض کو اموال زکوٰۃ سے منہا کیا جائے گا، صرف سالانہ واجب الادا قسط وضع نہیں کی جاوے گی۔
”وفی الزیلعی ایضا لا یتحقق الغنی بالمال المستقرض ما لم یقبض“^(۴)

(۱) الدر المختار (۲) رد المحتار مع الدر المختار ۴۹/۲

(۳) پراویڈنٹ فنڈ کی رقم دین متوسط اور قوی میں داخل نہیں، اس لیے کہ یہ مال ہی کا بدل نہیں ہے، کیوں کہ یہ جرت تحرک کا جز ہے اور خدمت حرمال نہیں، لہذا دین ضعیف میں داخل ہے اور دین ضعیف کی طرح اس میں بھی سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی بلکہ وصول ہونے کے بعد سال گزر جائے تب زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر اس کے پاس زکوٰۃ کا نصاب پہلے سے موجود نہیں ہے۔

(۴) رد المحتار ۱۰/۲ مطبعہ استنبول

ومنها ان لا يكون عليه دين مطالب به من جهة العباد عندنا فان كان

فانه يمنع وجوب الزكاة بقدره حالاً كان او مؤجلاً - (٧٧)

حکومت سے لیے ہوئے قرضوں کے بارے میں عبارت زاد القہستاقی عن الجواهر والمجمع
انہ (ای الوجہ) غیر مانع۔۔۔ سے دھوکہ نہ ہونا چاہیے اس لیے کہ قرض میں شرعاً تا جیل صحیح نہیں ہے
لہذا شرعاً وہ مؤجل نہیں ہیں۔ کما فی رد المحتار: (۲)

قال في الهدايه فان تأجيله لا يصح ويؤيد ما في النهر

عن القنية التاجيل في القرض باطل

کمپنی پر زکوٰۃ

تجارت مشترکہ اور کمپنی وغیرہ میں احناف رح کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کے لیے ہر حصہ دار کے اپنے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا۔

“ لا تجب الزكاة عندنا في نصاب مشترك من سائمة ومال تجارة ” (٣)

المراد ان يكون بلوغه النصاب سبب الاشتراك وضم احد المالكين الى

الْأَخْرَجِيثَ لَا يَبْلُغُ مَالُ كُلِّ مِنْهُمَا بِاتِّفَادِهِ نَعْمًا بَأْ—^(٢٤) فَإِنْ بَلَغَ نَصِيبُ

احدهما نصائبا زكاه دون الآخر (٥)

جواہرات کی زکوٰۃ

جو لوگ ہیرے، جواہرات کی تجارت کرتے ہیں ان پر ان جواہرات وغیرہ کی زکوٰۃ یقیناً واجب ہے لیکن جو لوگ سرمایہ محفوظ کرنے کے لیے ہیرے، جواہرات خریدتے ہیں اور خریدتے وقت تجارت کی نیت نہیں ہوتی ہے ان پر ان جواہرات کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اسی طرح جو عورتیں تزیین و آرائش کے لیے

(١) شامي ٤/٢ (٢) رد المحتار ٢٣٥/٣ (٣) الدر المختار

(٣) رد المحتار (٥) شامی مع الدرر ٣٤/٢

استعمال کرتی ہیں ان پر بھی اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

” اما اليواقیت والسلائی والجواهر فلا زکاة فیہا وان کانت حلّیا الا ان تکرن

تجارة کذا فی الجوهره ۴ (۱)

اموال تجارت پر زکوٰۃ

تاجر اگر تھوک سے فروخت کرتا ہے تو سامان تجارت کو زکوٰۃ کی ادائے گی کے دن جس تھوک بھاؤ سے بیچا جا رہا ہے اس بھاؤ سے قیمت لگائے اور اگر تاجر پھنکر سے فروخت کرتا ہے تو پھنکر فروختگی کے بھاؤ کا اعتبار کرے۔ الحاصل عموماً خریدار جس قیمت سے لیتا ہے وہ معتبر ہے۔ جو لوگ زمینوں کی تجارت کرتے ہیں وہ اراضی عشر یا خراجی ہیں تو ان میں عشر یا خراج واجب ہے ان میں تجارت کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

” لما فی البدائع : قال اصحابنا رحمہم فیمن اشترى ارض عشر للتجارة واشترى

ارض خراج للتجارة ان فیہا العشر والخراج ولا تجب الزکاة التجارة مع

احدهما والردایة المشہورة عنہم ۴ (۲)

شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

کمپنیوں کے شیرز کی خرید اگر تجارت کی نیت سے ہی ہوئی ہے تو کمپنیوں کے یہ خاص حصص اموال تجارت ہونے کی وجہ سے ان کی پوری مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور وجوب زکوٰۃ کے دن مارکیٹ کا جو بھاؤ ہوگا اس کا اعتبار ہوگا۔

” واللازم فی وفی عمر من تجارة قیمته نصاب من ذهب او ورق ۴ (۳)

وجاز دفع القیمة وانہا تعتبر یوم الوجوب وقال یوم الاداء کما فی السوائم ۴ (۴)

(۱) عالمگیری ۱۸۰/۱ (۲) البدائع ۵۴/۲ - رد المحتار ۱۹/۲

(۳) تنویر الابصار - شامی ۳۱/۲ (۴) رد المحتار ۲۲/۲

اور اگر شیرز کی خرید تجارت کی نیت سے نہیں کی ہے تو وجوب زکوٰۃ کے دن کمپنی کے پاس ان شیرز کا جو حصہ تجارت میں لگا ہوا ہے اس حصہ اور نفع پر زکوٰۃ واجب ہوگی، خواہ وہ نفع اس کو پورا مل گیا ہو، خواہ کچھ تقسیم ہو کر بقیہ تجارت میں شامل ہو گیا ہو، اور جو حصہ عملات و آلات میں لگا ہوا ہے اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

”ولانی ثياب البدن ونحوها“ فی رد المحتار، وکالحوانیت والعقار۔^(۱)

وفی الدر ۱ وکذلك آلات المحترفين - (۲)

قرض دہندہ نے جو سرمایہ بونڈس میں لگایا ہے ان بونڈس کے کیش کرانے کے وقت (یعنی اس رقم کے وصول ہونے کے بعد) اس سرمایہ میں سابقہ تمام سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

”تجب زکاتہا اذا تم نصابا وحال الحال عند قبض اربعین درہما“

من الدین القری کقرمن ۵: (۳)

محورثانی نصاب زکوٰۃ

کسی شخص کے پاس صرف سونا ہے تو وجوب زکوٰۃ کے لیے سونے کے نصاب کا اعتبار کیا جائے گا مثلاً کسی کے پاس ۶ تولہ سونا ہے اور مال تجارت، چاندی، نقد روپے میں سے کوئی نہیں ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اگرچہ اس کی قیمت چاندی کے نصاب کی قیمت کے بقدر یا اس سے چند گنا زیادہ ہو جاتی ہو۔

”واجمعوا انه لا تعتبر القيمة في الذهب والفضة عند الانفراد في

حق التكميل النصاب حتى وكذلك اذا كان له آنية ذهب وزنها

عشرة وقيمتها لصاعتها ما تادرهم لا تجب فيه الزكاة باعتبار القيمة۔^(۴)

واما اذا كان له الصنفان جميعا فان لم يكن كل واحد منهما نصابا“

فانه يضم احدهما الى الآخر في حق تكميل النصاب عندنا۔^(۵)

(۱) الدر (۲) مشای ۱۶/۲ (۳) الدر ۱۱/۲ (۴) الدر علی الشامی ۳۶۲-۳۸

(۵) البدائع ۱۹/۲ (۶) ایضا ۱۹/۲

واما اموال التجارة فتقدر بالنصاب فيها بقيمتها من الدنانير والدرهم
فلا شيء فيها ما لم تبلغ قيمتها مائتي درهم او عشرين مثقالا من ذهب
فتجب فيها الزكاة (۷)

لو كان بالتقويم باحدهما يتم النصاب وبالاخر لا، فانه يقوم بما
يتم به النصاب نظرا للفقراء واحتياطا - (۲)

اذا كان مع عموم التجارة ذهب دفعة فانه يخصها الى العروص

ويقوم جملة لان معنى التجارة يشمل الكل - (۳)

ہاں اگر کسی کے پاس سونے کے علاوہ مال تجارت چاندی اور نقد روپے میں سے کوئی ہے تو ان کی
مالیت چاندی کے نصاب کے برابر ہو جاتی ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، یعنی اس صورت میں چاندی کے نصاب
کا اعتبار ہوگا، اسی طرح صرف مال تجارت یا صرف روپے یا دونوں ہیں اور ان کی مالیت چاندی کے نصاب
کی قیمت کے بقدر ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اسی طرح نصاب حرمت زکوٰۃ اور غنا کے مستحق ہونے کے لیے اگر کسی کے پاس صرف سونا ہے
اور مال تجارت، روپے، چاندی اور ضرورت سے زائد کوئی چیز بھی نہیں ہے تو سونے کے نصاب کا اعتبار
ہوگا، مثلاً کسی کے پاس ۶ تولہ سونا ہے اور اس کے پاس دوسری کوئی چیز ضرورت سے زائد مال تجارت
چاندی اور روپے وغیرہ میں سے نہیں تو ایسے شخص کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے حرام نہیں ہے، اس لیے کہ
یہ نصاب سے کم کا مالک ہے۔

لیکن اگر سونے کے علاوہ ان مذکورہ اشیاء میں سے کسی چیز کا مالک ہے تو اب چاندی کے نصاب کی
قیمت کا اعتبار ہوگا۔ اگر چاندی کے نصاب کی قیمت کے بقدر پہنچ جاتی ہے ان کی قیمت تو وہ غنی ہے اس کے
لیے زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہے۔ حاصل یہ ہے کہ حرمت زکوٰۃ کے لیے اگر اس کے پاس صرف سونا ہے تو سونے کا
نصاب کا اعتبار ہوگا اور اگر سونا نہیں ہے یا ہے لیکن دیگر مذکورہ اشیاء میں سے کسی ایک چیز کا بھی وہ شخص
مالک ہے تو چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔

”ولا إلى غنى يملك قدر نصاب فارغ عن الحاجة الأصلية من أئمة

مال كان الخ - (۱)

وبهذا يظهر أن الاعتبار بنصاب النقد من أئمة مال كان بلغ نصاباً من

جلسه اولم يبلغ اه - (۲)

روى عن محمد زوایتان في النصاب المحرم للزكاة هل الاعتبار فيه

القيمة أو الوزن ففي المحيط عنه الاول وفي الظهيرية عنه الثاني

..... والظاهر اعتبار الوزن في الموزون الخ - (۳)

مصارف زکوٰۃ

(۱) صورت مسئلہ میں بہتر اور جائز صورت یہ ہے کہ ہر طالب علم سے شروع مہینہ میں معاملہ طے کر دیا جائے اور ختم ماہ پر اس کو ۲۵۰ روپے کا مالک بنا دیا جائے پھر مدرسہ میں وہ روپے جمع کرادے یا اس سے وصول کر لے جاویں۔

مہتمم مدرسہ معطیین زکوٰۃ کا وکیل ہے اور مستحقین زکوٰۃ طلبہ کا وکیل نہیں ہے۔

(۲) مدرسہ کے سفراء اور چندہ حاصل کرنے والے العالمین علیہا میں داخل نہیں ہیں، نیز انہیں

شرح فی صد متعین کمیشن پر سفیر مقرر کرنا صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اجرت مجہول ہے۔

اسی طرح حساب آمد و خرچہ کے اندراج پر جو علمہ مقرر ہے ان کی ماہانہ تنخواہ مذکوٰۃ سے ادا کرنا

بھی جائز نہیں ہے۔

مصرف فی سبیل اللہ

فقہاء مجتہدین رحمہم اللہ کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن پاک میں مذکور مصارف ہی میں زکوٰۃ مصرف کی

جائے گی، ان کے علاوہ دوسری جگہوں میں مصرف نہیں کی جاوے گی۔ مصارف زکوٰۃ پر قیاس کر کے

(۱) الدر المختار مع الشامی ۸۶۶ (۲) رد المحتار ۸۶۶ (۳) ایضاً (۴) وأما العاملون علیہا فہم الزین فیصحبہم الامام بحبابة الصدقات الخ ۳۶۶

کر کے دوسری اشیا کو غلت کے اشتراک کی وجہ سے مصارفِ زکوٰۃ میں داخل نہیں کیا جائے گا، اور ان میں توسیع اور تعمیم کرنا صحیح نہیں ہے۔

”واتفقوا علی انه لا يجوز ان تخرج الزكاة الى بناء المسجد

وان كان من القرب لتعين الزكاة بما بينت له“ (۱)

ولا يجوز صرف الزكاة الى غير من ذكر الله تعالى من بناء المسجد

..... واشباه ذلك من القرب التي لم يذكرها الله تعالى“ (۲)

اور الخرشی میں ہے: (۳)

”ولا يجوز صرف شيء من الصدقات في غير الوجه المبيحة الخ-

وفي البدائع وعلى هذا يخرج صرف الزكاة الى وجوه البر من بناء المسجد

والرباطات انه لا يجوز“ (۴)

اور مہرور فقہاء و مفسرین کے نزدیک مصرف فی سبیل اللہ کا مصداق صرف غازی میں جو جہاد عسکری میں مشغول ہیں۔

”واما في سبيل الله فقال مالك ر: في سبيل الله مواضع الجهاد

والرباط وبه قال ابو حنيفة ر وقال غيره الجحاج والعمار وقال الشافعي

هو الغازی جاری الصدقة - (۵)

وفي الدر المختار: وفي سبيل الله وهو منقطع الغزاة وقيل الحاج - وفي

رد المحتار: هذا قول محمد ر والاول قول ابی یوسف ر وفي غایة

البيان انه الاظهر وفي الاسبجیابی انه الصحيح“ (۶)

اور فقہاء احناف کے نزدیک عالمین زکوٰۃ اور مولفہ قلوب کے علاوہ زکوٰۃ کے تمام مصارف میں استحقاق زکوٰۃ کے لیے فقر و احتیاج کی شرط ہے۔ -

(۱) الافصاح ۲۳۱/۱ (۲) المغنی لابن قدامة ۵۲۷/۲ (۳) الخرشی ۲۱۹/۲

(۴) ۳۹/۲ - حوالے منقول ہیں الفرقان لکھنؤ، اگست ۱۹۸۸ء ص ۵ (۵) بدایۃ المجتہد ۲۷۱/۲

(۶) رد المحتار ۸۲/۲

ادارة القرآن كراچى كى چند اهم اور مفيد مطبوعات

كيا آپ موت كيلئے تيار هين	الله كا خطاب (اهل ايمان س)
بنيا دى فقهي احكام	اشرف المكتوبات
اجتماعى ختم قرآن كى شرعى حيثيت	احكام و آداب طهارت، وضوء، نماز
جديد تجارتى تشكيلين	حج عمره اور انكے جديد مسائل
سوال و جواب (آپكے مسائل اور انكے حل كيلئے ج ۲)	شيراز اور كمپنى طريقه كار و احكام
ضرورت و حاجت كا احكام شرعيه ميں اعتبار	لڑكے اور لڑكيوں كے نكاح كا اختيار
وقف املاك كے شرعى احكام	ذكر سيد الكونين ﷺ
اهم فقهي فيصلے	طبي اخلاقيات
تعليم سیرت	مسند ابوداؤد و طبياسى ۲ جلد
بائبل قرآن سائنس	فضائل اعمال اعلیٰ
طشت جواهر	نكاح مشروط
جواهر حكيم الامت	نبیوں كى سچى كهانیاں
جديد فقهي مباحث ۷۱ جلد	JESUS (مسيح اسلام حضرت عيسى عليه السلام) The Authority of Sunnah (حجيت حديث) ISLAM AN INTRODUCTION (تعارف اسلام)
جو تم مسكراؤ تو سب مسكرائين	The Life and Message. (خطبات مدراس) SHAMAA-IL TIRMIDHI (شمائل ترمذى) BIBLE QURAN & SCIENCE (بائبل قرآن اور سائنس)
دل كى دنيا	"Life Example of P.U.H" (اسوہ رسول الكريم ﷺ) "The Islamic way in the Death" (احكام ميت) COMPENDIUM OF ISLAMIC LAW (مجموعه قوانين اسلامى)

ادارة القرآن والعلوم الاسلاميه

مجموعہ

قوانین اسلامی

(مسلم پرسنل لاء متعلق احکام شریعت کا دفعہ وار مرتب مجموعہ)

ادارۃ القرآن و احکام اسلام الاسلامیہ

ادارة القرآن کراچی کی چند اہم مفید عربی اردو مطبوعات

<p>المصنف لِلْحَافِظِ عَبْدِ الرَّزَّاقِ الصَّنْعَانِي ۱۲ جلد مع فہارس - قیمت = ۳۹۸۰/-</p>	<p>انجلا النبیات ظفر احمد عثمانی الشہانوی ۲۲ اجزاء ۱۸ جلد مع فہارس - قیمت = ۴۸۰۰/-</p>	<p>شرح الطبری مکتبۃ المصنّاع ۱۲ جلد مع فہارس - قیمت = ۳۸۸۰/-</p>
<p>الحکام القرآن مولانا طہر محمد عثمانی الشہانوی ۵ جلد مولانا طہر محمد عثمانی الشہانوی - قیمت = ۱۸۸۰/-</p>	<p>مکتبۃ النبیات ظفر احمد عثمانی الشہانوی ۳ جلد - قیمت = ۱۰۸۰/-</p>	<p>الفہرست التالار خانہ ۵ جلد - قیمت = ۱۳۸۰/-</p>
<p>جدید فقہی مباحث مولانا نجیب الاسلام قاسمی ۵ جلد - قیمت = ۸۱۰/-</p>	<p>التکوین الدینی محمد علی بن محمد علی ۳ جلد - قیمت = ۱۱۸۰/-</p>	<p>مسند ابو داؤد طیاسی ابو داؤد سلیمان بن داؤد ابن الجاروطیاسی ۲ جلد - قیمت = ۳۳۳/-</p>
<p>اسوۃ رسول اکرم ذکر محمد امین - اردو ۱۵۰/- - انگریزی ۱۲۰/-</p>	<p>دوشرف کے فضائل و آداب قیمت = ۹۰/-</p>	<p>دور نبوی کا نظام حکومت حضرت سید رضی الدین - قیمت = ۱۵۰/-</p>
<p>تحفہ سفیر مولانا سائز قیمت = ۲۰/- قیمت بڑا سا ۵۳/-</p>	<p>نبیوں کی پسمنی کہانیاں حضرت سید رضی الدین - قیمت = ۱۲۰/-</p>	<p>معلم الحجاج جدید مولانا سعید احمد - جدید المحدثین ۳ جلد - قیمت = ۱۵۰/-</p>
<p>درس ترمذی مولانا محمد تقی عثمانی کی تفسیر جامع ترمذی ۳ جلد - قیمت = ۵۸۸/-</p>	<p>تحفہ افواج اسلام کریم قاری یوسف الرحمن ۲ جلد قیمت = ۲۸۸/-</p>	<p>اسلامی عدالت مولانا نجیب الاسلام قاسمی قیمت = ۱۵۰/-</p>

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ادارۃ القرآن کراچی کی چند جدید اردو کتب

<p>شیرز اور کمپنی</p> <p>تعارف، طریقہ کار اور شرعی احکام</p> <p>ترتیب</p> <p>حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی</p>	<p>وقف املاک کے شرعی احکام</p> <p>ترتیب</p> <p>حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی</p>	<p>جدید تجارتی شکلیں</p> <p>ترتیب</p> <p>حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی</p>
<p>ضرورت و حاجت</p> <p>کا احکام شرعیہ میں اعتبار</p> <p>ترتیب</p> <p>حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی</p>	<p>لڑکے اور لڑکیوں کے نکاح کا اختیار</p> <p>ولایت نکاح کا تعارف، اسکی حدود اور شرعی احکام</p> <p>حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی</p>	<p>حج و عمرہ</p> <p>کے جدید مسائل اور نکاح حل</p> <p>ترتیب</p> <p>حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی</p>
<p>اشرف المکتوبات</p> <p>بنام حضرت تھانویؒ و دیگر اکابرین مع جوابات از ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ</p>	<p>آپ کے مسائل اور انکے حل کیلئے سوال و جواب</p> <p>مولانا قاری عبدالباسط مقیم جدہ۔ سعودی عرب</p>	<p>طشت جواہر</p> <p>(علوم و معارف کا خزانہ)</p> <p>جناب ثار احمد خان فتنی</p>
<p>جدید فقہی مباحث</p> <p>اتامے اکمل سیٹ</p> <p>مولانا مجاہد الاسلام قاسمی</p> <p>جدید اسلامی معیشت و تجارت و دیگر اہم موضوعات پر انتہائی قیمتی مباحث</p>	<p>زکوٰۃ اور مسئلہ تملیک</p> <p>☆ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ☆ مولانا عظیم احمد عثمانی تھانوی ☆ مولانا عبدالدامن جلالی مرحوم ☆ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم ☆ مولانا امین احسن اصلاحی ☆ مولانا یحییٰ احمد قاسمی</p>	<p>عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل کا شرعی حل</p> <p>رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ</p> <p>فقہ اکیڈمی کے فقہ فیصلے</p>

ناشران قرآن مجید و اسلامی، عربی، اردو، انگریزی کتب مرکز مطبوعات پاکستان، بیروت و بلاد عربیہ، تفسیر، حدیث، فقہ، اعلیٰ معیار کی عربی، اردو، انگریزی، فارسی کمپیوٹر کمپوزنگ، ڈیزائننگ اور ایڈنگ کی صورت میں بذریعہ پارسل پاکستان میں دستیاب کتب کی اندرون و بیرون ملک ترسیل کا انتظام ہے۔

ادارة القرآن كراچى كى چند اهم اور مفيد مطبوعات

عصر حاضر كے پيچيدہ مسائل كا شرعى حل	دور نبوى كا نظام حكومت
احكام ميت	درود شريف كے فضائل
اسلامى عدالت	رہنمائے سعادت
اسوۂ رسول اكرم ﷺ	متاع نور (سوانح مولانا نور احمد)
تلخيص حجة الله البالغة	معلم الحجاج طبع اعلیٰ
تحفہ افواج اسلام دو جلد	پردہ شرعى
مذاهب عالم كا انسائيكلو پيڈيا	تحفہ سفر
صحبت كے اثرات	طريقہ حج و عمرہ
قسطوں پر خريد و فروخت	حكايات صحابہؓ
برطانوى قوانين فردغ جرائم كے ذمہ دار ہيں	زكوٰۃ اور مسئلہ تملك
مجموعہ قوانين اسلامى	زكوٰۃ كے جديد مسائل ۲ جلد
عشر و خراج كے جديد مسائل ۲ ج	چالیس بڑے مسلمان
☆ مطبوعات پاكستان عربى، اردو، انگريزى كتب كى وسيع پيمانے پرايكتسپورٹ۔	ناشران قرآن مجيد و اسلامى، عربى، اردو، انگريزى كتب مركز مطبوعات پاكستان، بيروت و بلاد عربيه، تفسير، حديث، فقہ، اسلامى قانون، تاريخ اسلام، اصلاحى، تصوف، لغت، ادب عربى، اعلیٰ معيار كى عربى، اردو، انگريزى، فارسى كمپيوٹر كمپوزنگ
☆ بذريعہ رجسٹرڈ پارسل اندرون ملك و بيرون ملك ترسيل	
☆ ہر قسم كى اسلامى كتب كى طباعت كا انتظام۔	
☆ تفصيلى فہرست كتب مفت حاصل كريں۔	

ادارة القرآن والعلوم الاسلاميه

اُسُوۃُ رَسُوْلِ اِكْرَم

مؤلف

حضرت عارف باللہ ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب قسطنطنیہ

خليفة، مجاز

حکیم الامت مہذبہ دہلیت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ

مقدمہ: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
تأثرات: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ
وجاہت: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ العالی

أدارة القرآن والعلم الاسلامي

ادارة القرآن كراچى كى چند جديد و مفيد عربى مطبوعات

فقه المشكلات (عربى)	جامع احاديث الاحكام (متن اعلاء السنن ۲ جلد)
الفقه الحنفى وادلته ۳ جلد	اعلاء السنن ۱۸ جلد مع قهارس
شرح الزيادات للامام محمد ۶ ج	الاشباه والنظائر ابن ملقن ۲ جلد
جمع الفوائد من جامع الاصول ۴ ج	الاشباه والنظائر ابن نجيم ۳ جلد
مجموعه رسائل لكهنوى، ۶ جلد	شرح طبى ۱۲ جلد
انوار المحمود شرح سنن ابى داود ۲ ج	مصنف عبد الرزاق ۱۲ جلد
اعلام الاعلام بمفهوم الدين والاسلام	الفتاوى تاتارخانيه ۵ جلد
كتاب الرد على سير الاوزاعى	هدايه حاشيه عبد الحى لكهنوى ۴ جلد
شرح مقامات الحريرى للشريثى	مجموعه رسائل كشميرى ۴ جلد
شرح شرح المنار فى اصول الفقه	الكوكب الدرى ۴ جلد
فتح الغفار معجم رد المختار	احكام القرآن تھانوى ۵ جلد
مجموعه الخطب اللكنويه	جدید فقہی مباحث اٹاك (ارو)
معجم لغة الفقهاء	JESUS (پيغمبر اسلام حضرت عيسى) (تجيت حديث) The Authority of Sunnah (تعارف اسلام) ISLAM AN INTRODUCTION
مكتبة الامام ابو حنيفه بن المحدثين	(خطبات مدراس) The Life and Message. (شامل ترمذى) SHAMAA-IL TIRMIDHI (بائبل قرآن اور سائنس) BIBLE QURAN A SCIENCE
المدخل الى دراسة علم الكلام	(اسوة رسول كرم الله) "Life Example of P.U.H." (احكام ميت) "The Islamic way in the Death"

ادارة القرآن والعلوم الإسلامية